for text books and Re. 1 00 for over-night books per day shall be charged from those who return them late.

damage done to the book and will have to replace it, if the same is detected at the time of return.

مکارم الاخلاق

★

طبع اول : اکتوبر ۱۹۶۷ء

تعداد ۲۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقیِ ادب ، لاہور
طابع : شیخ نصیرالدین
مطبع : ریڈنگ پرنٹنگ پریس ، ۴ اردو بازار ، لاہور
سرورق : مطبع عالیہ ، ۵/۱۲۰ ٹمپل روڈ ، لاہور
قیمت : گیارہ روپے

1952

بعونِ صانعِ بیچون و مکان بفضلِ خلاقِ زمین و زمان
۷۹
اُردو کا کلاسیکی ادب
مکارمُ الاخلاق
از
شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی
ناشر
مجلسِ ترقیِ ادب
۲- نرسنگھ داس گارڈن
کلب روڈ
لاہور

فہرست

مقدمہ

حیات ذکاء اللہ

مکارم الاخلاق

باب اول

خدا تعالیٰ

باب دوم

تہذیب الاخلاق

باب سوم

علم و عمل و عقل

باب چہارم

کہنا سننا

باب پنجم

محبت و عشق

باب ششم

گناہ و توبہ

باب ہفتم

دنیا و محبت دنیا

باب ہشتم

معاملات دنیا

باب نہم

رذائل و فضائل اخلاق - صفات انسانی

باب دہم

عمر و وقت و موت

باب یازدہم

حکایات

باب دوازدہم

ضمیمۂ متفرقات

مقدمہ

از

احمد رضا

حیات ذکاء اللہ

خاندان :

شمس العلما خان بہادر مولوی محمد ذکاء اللہ کا خاندان عرصۂ دراز تک امیر تیمور گورگانی کے شاہی گھرانے کا اتابک (معلم اور اتالیق) رہا ہے ۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق سے جا ملتا ہے[1]۔ مولوی محمد اسماعیل صاحب پانی پتی نے مولوی ذکاء اللہ کے صاحب زادے مولوی عنایت اللہ کی سوانح عمری (صفحہ ۱) میں لکھا ہے کہ ان کا خاندان شیخ صدیقی کہلاتا تھا ۔ یہ خاندان سلطنت مغلیہ کی ابتدا میں غزنی سے ہجرت کرکے پنجاب میں وارد ہوا اور کچھ عرصہ لاہور میں قیام کرنے کے بعد ان کے جد امجد دہلی منتقل ہوگئے[2]۔ مسٹر اینڈریوز کےقول کےمطابق مولوی ذکاء اللہ کے جد اعلیٰ حافظ محمد علی کی وفات کے بعد ان کے بیٹے حافظ محمد ابراہیم اپنے باپ کے عہدے پر شاہی گھرانے کے معلم کی حیثیت سے فائز

---

۱ - مولوی ذکاءاللہ دہلوی: سی۔ ایف۔ اینڈریوز ، مترجمہ ضیاءالدین احمد برنی ، تعلیمی مرکز کراچی، صفحہ ۸۱ - مسٹر اینڈریوز پادری تھے۔ یہ مولوی ذکاء اللہ کے بڑے معتقد اور دوست تھے ۔ چنانچہ مولوی ذکاء اللہ کی وفات کے بعد انھوں نے ان کا تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جس کا ترجمہ ان کے (اینڈریوز کے) شاگرد ضیاء الدین احمد برنی نے اردو میں کیا ۔ اس ترجمے کو تعلیمی مرکز کراچی کی طرف سے انھوں نے خود ہی ۱۹۵۲ع میں شائع کیا ۔

۲ - اردو کے نام ور شعرا اور نثر نگار (Famous Urdu Poets and Writers) : سرعبدالقادر ، صفحہ ۱۹۰ (ذکاءاللہ پرمضمون) ۔

ہوئے۔ ان کے بعد ان کے سب سے بڑے صاحب زادے حافظ محمد بقاء اللہ اپنے باپ کے قائم مقام کی حیثیت سے شہزادوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ حافظ محمد بقاء اللہ، مولوی ذکاء اللہ کے حقیقی دادا تھے۔ جب انھوں نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی تو مولوی ذکاء اللہ کے والد حافظ ثناء اللہ کو یہ عہدہ منتقل ہو گیا[1]۔

سر عبدالقادر اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں کہ مولوی ذکاء اللہ کے والد بزرگوار ۱۸۵۷ع تک اس منصب پر سرفراز رہے[2]۔ حفاظ کا یہ خاندان اپنے وقت کے بلند مرتبہ علما اور صلحا میں شمار ہوتا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ کے ہم عصر، دوست، سوانح نگار مسٹر ایںڈریوز کا کہنا ہے کہ مولوی ذکاء اللہ اپنے باپ کی دوسری اولاد تھے۔ ان سے پہلے ایک لڑکی شیرخوارگی ہی میں انتقال کرگئی تھی۔ چنانچہ مولوی ذکاء اللہ، جو سب سے بڑے بیٹے تھے، ابتدا ہی سے شاہی محل میں معلم کی حیثیت سے باپ کی جگہ لینے کے لیے منتخب کر لیے گئے اور اسی نہج پر ان کی تعلیم کا آغاز ہوا، لیکن ۱۸۵۷ع تک ان کے باپ کا منصب پر رہنا ظاہر کرتا ہے کہ ذکاء اللہ تک نوبت نہ آئی۔

مولوی ذکاء اللہ کے دادا حافظ محمد بقاء اللہ اپنے تقوے اور دین داری کے لیے دہلی بھر میں مشہور تھے۔ بہتر (۷۲) برس تک متواتر وہ شاہی مسجد میں نماز با جماعت ادا کرتے رہے اور ایک دن بھی ناغہ نہیں کیا اور نماز ہی کی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے نوے سال سے زیادہ عمر پائی تھی۔

---

۱ - مولوی ذکاء اللہ دہلوی: سی - ایف - ایںڈریوز، صفحہ ۸۲ -
۲ - اردو کے نادر شعرا اور نثر نگار، مذکور (انگریزی): سرعبدالقادر، صفحہ ۱۶۰ -

مولوی ذکاء اللہ کے والد حافظ ثناء اللہ بھی دین‌دار اور متقی انسان تھے ۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی دورغ گوئی نہیں کی اور نہ کسی سے غلط طرز عمل اختیار کیا ۔ وہ اعتکاف میں بیٹھتے تھے اور گھنٹوں تلاوت کلام مجید میں مصروف رہتے تھے ۔ خدا پر بھروسے اور توکل کا یہ عالم تھا کہ کسی دولت مند کے سامنے ہاتھ پھیلانا تو درکنار ، کسی درویش سے دعا کی التجا تک کو گوارا نہ کرتے تھے ۔ وہ مرزا کوچک سلطان کے اتالیق تھے جو بہادر شاہ ظفر کے سب سے چھوٹے لڑکے تھے ۔ جب بہتر (۷۲) سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوا تو وہ جامع مسجد میں پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی کے ساتھ ادا کرتے تھے اور مرتے دم تک قرآن مجید کی آیات ان کی زبان پر تھیں[1] ۔ یہ ملخص مسٹر اینڈریوز کی کتاب سے ماخوذ ہے ۔ اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ع تک مولوی ذکاء اللہ کے والدین بقید حیات تھے ۔ مسٹر اینڈریوز نے مولوی ذکاء اللہ کے افراد خاندان کی وفات اور ولادت کے سنین نہیں دیے ، حالانکہ مولوی ذکاء اللہ کے قریب ترین دوست اور ان کے معاصر ہونے کی حیثیت سے وہ یہ کام بڑی خوبی سے انجام دے سکتے تھے ۔

مسٹر اینڈریوز نے مولوی ذکاء اللہ کی والدہ کا سنہ وفات نہیں لکھا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے والد اور والدہ میں سے کس کی وفات پہلے ہوئی اور کس کی بعد میں ، لیکن اسی کتاب میں مولوی ذکاء اللہ کے بیٹے مولوی عنایت اللہ کی ایک روایت سے مولوی ذکاء اللہ کی والدہ کا سنہ وفات معلوم ہو جاتا ہے ۔ مولوی عنایت اللہ ، اینڈریوز سے اپنی دادی کا ایک واقعہ بیان

---

۱ ۔ مولوی ذکاء اللہ دہلوی : سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز ، صفحہ ۸۳ تا ۸۷ ۔

کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"مجھے ان کا بڑھاپا خوب یاد ہے ، اس لیے کہ جب ان کا انتقال ہوا ہے ، میری عمر نو سال کی تھی[1]۔"

مولوی عنایت اللہ کا سال ولادت بقول[2] مولوی محمد اسماعیل صاحب پانی پتی ۱۵ نومبر ۱۸۶۹ع ہے۔ اس لحاظ سے مولوی ذکاء اللہ کی والدہ مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں ۱۸۷۷ع کے لگ بھگ وفات پاتی ہیں۔

مسٹر اینڈریوز کی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ذکاء اللہ کے دو بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ ان میں سے کسی کا نام انھوں نے نہیں لکھا۔ ان کا ذکر بھی مولوی ذکاء اللہ کی سیرت کے دوران میں برسبیل تذکرہ آ گیا ہے۔ مسٹر اینڈریوز لکھتے ہیں :

"انھوں نے (مولوی ذکاء اللہ نے) والدین کو اپنے خرچ سے حج کرا دیا تھا۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی تعلیم کے اخراجات کا بار بھی اٹھایا اور اپنی تینوں بہنوں اور دو بھائیوں کی شادی کے مصارف بھی خود ہی برداشت کیے[3]۔"

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ذکاء اللہ جب تک اپنے افراد خاندان کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہیں ہو گئے ، انھوں نے شادی نہیں کی۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

۱۔ ایضاً : صفحہ ۸۹۔

۲۔ نقوش ، شخصیات نمبر : مولوی عنایت اللہ پر مولوی محمد اسماعیل پانی پتی کا مضمون ، صفحہ ۱۴۳۔

۳۔ مولوی ذکاء اللہ دہلوی : اینڈریوز ، صفحہ ۱۹۴۔

ولادت :

مولوی ذکاء اللہ ۱۸۳۲ع میں دہلی کے کوچہ بلاقی بیگم میں متولد ہوئے[1]۔ یہ مکان شاہی مسجد اور قلعۂ معلٰی کے درمیان واقع ہے[2]۔ محمد یحیٰی تنہا لکھتے ہیں کہ ان کے والد کا مکان اب بھی (۱۹۲۷ع میں) کوچہ چیلاں میں موجود ہے۔ مسٹر اینڈریوز بھی اسی مکان میں مولوی صاحب سے ملنے جایا کرتے تھے[3]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں ان کے والد کوچہ بلاقی بیگم میں رہائش پذیر ہوں گے۔ پھر انھوں نے اپنا ذاتی مکان کوچہ چیلاں میں لے لیا ہوگا۔

جہاں تک مولوی ذکاء اللہ کی ولادت کے سال اور مہینے کا تعلق ہے، اس پر سب تذکرہ نگار متفق ہیں، لیکن تاریخ ولادت (یعنی دن) کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مسٹر اینڈریوز ۲۰۔ اپریل ۱۸۳۲ع لکھتے ہیں، جب کہ محمد یحیٰی تنہا ''سیر المصنفین'' میں یکم اپریل ۱۸۳۲ع ان کا سال ولادت قرار دیتے ہیں، اور ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے بھی اسی سے اتفاق کیا ہے[4]۔ ''یاد ایام'' کے مصنف محمد عبدالرزاق کانپوری (صاحبِ البرامکہ) ذکاء اللہ کے سال ولادت کے سلسلے میں رقم‌طراز ہیں :

۱۔ سیرالمصنفین : محمد یحیٰی تنہا، جامعہ ملیہ پریس، ۱۹۲۸ع، صفحہ ۲۰۴۔
۲۔ مولوی ذکاءاللہ دہلوی : صفحہ ۸۱۔
۳۔ سیرالمصنفین : تنہا، صفحہ ۲۰۴۔ مولوی ذکاءاللہ دہلوی : اینڈریوز صفحہ ۸۱۔
۴۔ سر سید احمد خاں اور ان کے نام ور رفقا : ڈاکٹر سید عبداللہ، صفحہ ۱۸۲۔

"غدر کے زمانے میں موصوف (ذکاء اللہ) کی عمر تخمیناً ۲۵ سال تھی - اس حساب سے ولادت کا سال ۱۸۳۲ع، ۱۸۳۳ع قرار پاتا ہے - جوانی افکار، آلام اور عسرت میں گزاری اور بڑھاپے میں فارغ البال تھے[1]۔"

میرے خیال میں مسٹر اینڈریوز کا بیان تاریخ ولادت کے سلسلے میں زیادہ قابل لحاظ ہے کیونکہ انھیں مولانا کی معاصرت کے علاوہ ان کی دوستی کا بھی شرف حاصل تھا - علاوہ ازیں مولوی ذکاء اللہ کے بیٹے مولوی عنایت اللہ، جو اینڈریوز کے تذکرۂ ذکا اللہ کے معتبر ترین راوی ہیں، انھوں نے بھی اینڈریوز کی اس سلسلے میں رہنمائی کی ہوگی -

بچپن:

علما اور حفاظ کے اس گھرانے میں، جو شاہی خاندان کا اتالیق بھی تھا، جس قسم کی تربیت درکار تھی، مولوی ذکاء اللہ بھی اس سے بہرہ مند ہوئے - مولوی ذکاء اللہ کی تربیت سے دلچسپی سب سے زیادہ ان کے دادا حافظ محمد ثناء اللہ کو تھی - وہ بڑھاپے میں اپنے پوتے کو ہدایت پابندی سے تعلیم دیتے تھے[2] -

سر عبدالقادر اپنی کتاب "اردو کے نام ور شعرا اور نثرنگار" (انگریزی، صفحہ ۱۶۱) میں لکھتے ہیں کہ مولوی ذکاء اللہ کی ذہانت اور ذکاوت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انھوں نے بچپن میں، جب کہ ان کی عمر صرف چھ برس کی تھی، گلستان سعدی جیسی مشکل کتاب پڑھنی شروع کر دی تھی -

اینڈریوز نے مولوی ذکاء اللہ کے بچپن کا نقشہ اس طرح

---

۱ - یاد ایام: محمد عبدالرزاق کانپوری، صفحہ ۲۸۶ -
۲ - مولوی ذکاء اللہ دہلوی: اینڈریوز، صفحہ ۹۰ -

کھینچا ہے :

”ذکاء اللہ بچپن میں نہایت ہی حسین تھے اور قلعے کے اندر
مغلیہ دربار کی بیگمات اُن سے بہت محبت سے پیش آتی
تھیں ۔ جب ان کی عمر چھ یا سات برس کی ہو گئی ، تو
اُن کے والد ، جو محل میں شہزادوں اور سہزادیوں کے
اتا٘لیق تھے ، تہواروں اور دوسرے مواقع پر **انھیں**
زرق برق لباس پہنا کر آتس بازی کا تماشہ دکھانے لے
جاتے اور وہاں وہ بیگمات انھیں تحفے دیتیں جن کی دعوت پر
وہ بہ طور خاص بلائے جاتے . . . چھوٹا بچہ نہایت جوش
کے عالم میں اپنی ماں کے پاس گھر جاتا اور جو تحفے
تحائف اسے ملتے ، انھیں دکھاتا ۔“

تعلیم :

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ چھ سال کی عمر میں مولوی ذکاء اللہ نے ’گلستان سعدی‘ پڑھنا شروع کر دی تھی[۱] ۔ ان کی ولادت کے حساب سے ۱۸۳۷ع یا ۱۸۳۸ع میں ان کی تعلیم کا آغاز ہو جاتا ہے ۔ چونکہ تعلیم یافتہ خاندان کے چشم و چراغ تھے اس لیے ان کی تعلیم ابتداءً گھر ہی میں شروع ہوئی ۔ ان کے استاد ان کے دادا حافظ بقاء اللہ تھے ، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ۔

حامد حسن قادری ”داستان تاریخ اردو“ (صفحہ ۳۴۶) میں لکھتے ہیں کہ مولوی ذکاء اللہ بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہو گئے تھے ۔ ان کے سنہ ولادت کے حساب سے دہلی کالج میں داخلے کا سال ۱۸۴۴ع متعین ہوتا ہے ۔ اس طرح چھ سال تک وہ گھر پر تعلیم حاصل کرتے رہے ۔ مسٹر اینڈریوز لکھتے

---

۱ ۔ اردو کے نام‌ور شعرا اور نثر نگار : سر عبدالقادر ، صفحہ ۱۶۰ ۔

ہیں کہ بارہ برس کی عمر میں مولوی ذکاء اللہ کو دہلی کے قدیم سکول (اس سے مراد دہلی کالج ہی ہے) سے پہلی مرتبہ انعام ملا[1] ۔ گویا مولوی ذکاء اللہ جس سال اسکول میں داخل ہوئے، اسی سال اچھی تعلیمی صلاحیت کی بنا پر انعام بھی حاصل کرلیا ۔ مولوی ذکاءاللہ کی اپنی ایک کتاب "تعلیم الاخلاق" کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں محکمۂ تعلیم کی طرف سے چھ سال تک تعلیمی وظیفہ بھی ملتا رہا ہے[2] ۔ اس زمانے میں جب کہ انگریزی تعلیم کو کفر و شرک سے تعبیر کیا جاتا تھا، ایک خالص مذہبی گھرانے کا اپنے بچے کو ایسے اسکول میں داخل کرانا حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن غالباً مولوی ذکاء اللہ کے والد کی دوربین نگاہیں سلطنت مغلیہ پر آنے والی مصیبت کا اندازہ کر چکی تھیں ۔ انگریزوں کے روز افزوں عروج کو دیکھتے ہوئے انھوں نے محسوس کر لیا ہوگا کہ شاہی خاندان کی ابالمی اب زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہے گی ۔ چنانچہ بچے کا مستقبل محفوظ کرنے کے خیال سے انھوں نے اسے دہلی کالج میں داخل کرا دیا ۔

حامد حسن قادری کے بقول جب مولوی ذکاء اللہ دہلی کالج میں داخل ہوئے تو مولوی محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کا ساتھ ہو گیا اور ان سے تعلقات استوار ہوگئے ۔ ماسٹر رام چندر ریاضی کے استاد تھے اور اپنے اس لائق ساگرد پر خاص عنایت فرماتے تھے ۔ ذکاءاللہ ہمیشہ اول نمبر پر کامیاب ہوتے تھے اور وظیفے

---

١ ۔ مولوی ذکاءاللہ دہلوی : اینڈریور ، صفحہ ٨٨ ۔

٢ ۔ تعلیم الاخلاق : ذکاء اللہ ، مطبع چشمہ فیض ، ١٨٩٢ع دہلی ، صفحہ١ ۔
یہ مولوی صاحب کا اپنا بیان ہے جو انھوں نے "التماس" کے عنوان سے قلم بند کیا ہے ۔

حاصل کرتے تھے ۔ انھوں نے اسی قابلیت کی بنا پر دو تمغے بھی حاصل کیے[1] ۔ سر عبدالقادر لکھتے ہیں :

"ابھی ان کی عمر سولہ سترہ برس کی تھی کہ انھوں نے High Proficiency کا امتحان پاس کر لیا اور دو چاندی کے تمغے حاصل کیے ۔ اس کے فوراً بعد اسی درس گاہ (دہلی کالج) میں ٹیچر کی حیثیت سے متعین کیے گئے[2] ۔"

محمد عبدالرزاق کانپوری اپنی تالیف "یاد ایام" میں لکھتے ہیں کہ مولوی ذکا اللہ دہلی کالج کے مشہور طلبہ میں تھے ۔ مولوی نذیر احمد ، مولوی محمد حسین آزاد ، مولوی ضیاءالدین اور شہامت علی ان کے ہم سبق تھے ... تمام علوم میں انھیں ریاضی ، سائنس اور علم ادب سے ذوق تھا ۔ طالب علمی کے زمانے سے ان کی ریاضی میں شہرت تھی ۔ فارسی علم ادب میں مولوی امام بخش صہبائی ان کے استاد تھے[3] ۔ اس زمانے میں ، جب کہ مولوی ذکاءاللہ کالج میں داخل ہوئے، مولوی امام بخش صہبائی بھی پڑھاتے تھے۔ مولوی صاحب صہبائی سے فارسی پڑھتے تھے[4] ۔

کسی تذکرہ نگار نے مولوی ذکاءاللہ کی تکمیل تعلیم کا سنہ درج نہیں کیا ۔ البتہ سر عبدالقادر کے گزشتہ بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سولہ سترہ برس کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے ۔ ان کے سنہ ولادت کے اعتبار سے ، جو ۱۸۳۲ع ہے ، تکمیل تعلیم کا سال

---

۱ ۔ داستان تاریخ اردو : حامد حسن قادری ، صفحہ ۴۴۶ ۔

۲ ۔ اردو کے نام ور شعرا اور نثر نگار (انگریزی) : سر عبدالقادر ، صفحہ ۱۶۲ ۔

۳ ۔ یاد ایام : محمد عبدالرزاق کانپوری ، صفحہ ۲۸۶ ۔

۴ ۔ مولوی ذکاءاللہ دہلوی : اینڈریوز ، صفحہ ۹۸ ۔

۱۸۴۹ع قرار پاتا ہے - خود مولوی ذکاءاللہ کا آئندہ بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے -

ملازمت :

سر عبدالقادر لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب فارغ التحصیل ہونے کے فوراً بعد دہلی کالج ہی میں ریاضی کے ٹیچر مقرر کر دیے گئے - تعلیم سے فراغت کا سال ہم نے ۱۸۴۹ع متعین کیا ہے، لہذا آغاز ملازمت کا سال بھی یہی قرار پائے گا - اس کی تائید مولوی ذکاءاللہ خود بھی کرتے ہیں - انھوں نے اپنی کتاب ''تعلیم الاخلاق'' میں ''التماس'' کے عنوان سے جو دیباچہ سپرد قلم کیا ہے، اس میں فرماتے ہیں :

> ''ممالک مغربی و شمالی و پنجاب کے سررشتۂ تعلیم میں میری ساری عمر بسر ہوئی ہے - اس کے احسانات عظیم میرے سر پر ایسے ہیں کہ میں کسی طرح ان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا - اس نے اپنی گرہ سے روپیہ خرچ کرکے مجھے سکھایا پڑھایا - خود چھ برس تک وظیفہ دار طالب علم رکھا - اسی نے چھتیس برس تک اپنا ملازم رکھا[1] -''

مولوی ذکاءاللہ ۱۸۸۵ع میں ریٹائر ہوئے - اگر ۱۸۸۵ع میں سے ۳۶ خارج کیے جائیں تو باقی ۱۸۴۹ع بچتے ہیں - چنانچہ وہ اسی سال سے اپنی ملازمت کا آغاز کرتے ہیں -

یہ ثابت ہوگیا کہ انھوں نے چھتیس برس تک محکمۂ تعلیم میں خدمات انجام دیں لیکن ان چھتیس برسوں میں وہ کہاں کہاں متعین رہے ؟ اس میں اختلاف پایا جاتا ہے، لہذا مناسب معلوم ہوتا

---

۱ - تعلیم الاخلاق : مولوی ذکاءاللہ، مطبع چشمۂ فیض دہلی، ۱۸۹۲ع - مملوکہ مجلس ترقی ادب لاہور، صفحہ ۱ -

ہے کہ یہ اختلاف اور تذکرہ نگاروں کی آرا مختصراً قارئین کے سامنے پیش کردی جائیں ۔

سب سے پہلے ''یاد ایام'' کے مصنف عبدالرزاق کانپوری کی رائے ملاحظہ ہو :

''تعلم کے بعد دلی کالج میں معلم ریاضی مقرر ہوئے ۔ بعد ازاں (آگرہ میں) اردو فارسی کے پروفیسر ہو گئے ۔ ۷ سال تک یہ خدمت انجام دی ۔ ۱۸۶۹ع میں نارمل اسکول دلی کے ہیڈماسٹر ہوئے اور ۱۸۷۲ع سے میور سنٹرل کالج الہ آباد میں پروفیسری عربی فارسی پر ممتاز ہوئے ۔ اور مسلسل ۳۸ سال کے بعد پنشن لے کر دلی آ گئے[1]''۔

اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دلی میں کب تک رہے اور آگرے کب گئے؛ خاص طور پر ان کی مدت ملازمت ۳۸ سال محل نظر ہے، کیونکہ مولوی ذکاءاللہ کا اپنا بیان ہم نقل کر چکے ہیں جس میں انھوں نے اپنی مدت ملازمت چھتیس سال بتائی ہے۔ علاوہ‌ازیں الہ آباد کی ملازمت کی مدت چودہ سال بنتی ہے۔ نیز آگرے میں وہ پروفیسر کیسے مقرر ہو گئے جب کہ ابھی انھوں نے پڑھانا شروع ہی کیا تھا ؟

اب حامد حسین قادری کا بیان ملاحظہ ہو :

''تعلیم سے فارغ ہو کر اسی کالج میں معلم ریاضی مقرر ہوگئے۔ پھر آگرہ کالج میں سات برس تک معلم فارسی و اردو رہے ۔ ۱۸۵۵ع میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے ۔ گیارہ سال یہ فرائض انجام دے کر ۱۸۶۶ع میں نارمل اسکول

---

۱ ۔ یاد ایام : عبدالرزاق کانپوری ، صفحہ ۲۸۷ ، ۲۸۸ ۔

دہلی کے ہیڈماسٹر ہوئے۔ تین سال بعد اورینٹل کالج کی
لکچرری کے لیے پروانۂ تقرر آیا ، لیکن اتفاق سے اس
کے ساتھ ہی میور سنٹرل کالج الہ آباد کی پروفیسری بھی
آپ کو پیش کی گئی۔ آپ نے الہ آباد کو ترجیح دی
اور ۱۵ سال اس کالج میں پروفیسر فارسی رہ کر ۱۸۸۵ع
میں پنسن حاصل کی[1]۔"

۱۸۵۵ع میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوتے ہیں اور اس سے پہلے
سات سال آگرے میں پڑھاتے ہیں۔ اگر ۱۸۴۹ع سے آگرے میں پڑھانا
شروع کریں جو ان کی آغاز ملازمت کا سال ہے ، تبھی ۱۸۵۵ع تک
سات سال مکمل ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ فرض کرنا پڑے گا کہ
دلی کالج میں انھوں نے ۱۸۴۹ع میں ملازمت کا آغاز کیا اور اسی
سال وہ آگرے بلا لیے گئے۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے "اردو کا بہترین انشائی ادب"
میں مولوی ذکاءاللہ پر حسب ذیل تعارفی نوٹ قلم بند فرمایا ہے :

"دہلی کالج میں تعلیم پائی ، معلمی سے ملازمت کا آغاز کیا۔
۱۸۸۵ع (صحیح ۱۸۵۵ع ہے) میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ،
۱۸۶۶ع میں نارمل اسکول دلی کے ہیڈماسٹر ، میور سنٹرل
کالج الہ آباد میں پندرہ برس فارسی کے استاد رہے ،
۱۸۸۵ع میں پنشن پائی[2]۔"

---

۱ - داستان تاریخ اردو ، حامد حسن قادری ، صفحہ ۴۴۶ ، ۴۴۷ -
حامد حسن قادری کا بیان 'سیرالمصنفین' سے ماخوذ ہے۔ دیکھیے جلد
دوم ، صفحہ ۲۰۴ -

۲ - اردو کا بہترین انشائی ادب : ڈاکٹر وحید قریشی ، میری لائبریری
لاہور ، صفحہ ۶۷ -

"یاد ایام" کے گزشتہ اقتباس کے مطابق مولوی ذکاء اللہ ۱۸۷۲ع میں میور کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ چنانچہ الہ آباد کی مدت ملازمت زیادہ سے زیادہ چودہ سال بنتی ہے کیونکہ وہ ۱۸۸۵ع میں ریٹائر ہو جاتے ہیں۔

مسٹر اینڈریوز نے صرف ان کی دلی اور الہ آباد کی ملازمت کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی برسبیل تذکرہ۔ انھوں نے الہ آباد کی ملازمت کے بارے میں ایک افسوس ناک غلطی کی ہے جس کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"الہ آباد میں ۳۷ سال تک کام کرنے کے بعد ان کی سبکدوشی کے معنی یہ نہیں تھے کہ وہ . . . ."[۱]

مسٹر اینڈریوز نے ان کی پوری مدت ملازمت الہ آباد میں محصور کردی ہے حالانکہ الہ آباد میں وہ صرف چودہ سال رہے ہیں، یعنی ۱۸۷۲ع سے ۱۸۸۶ع تک۔

آخر میں سر عبدالقادر کے بیان کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے جو بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بن سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"دہلی میں استاد کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا، ۵۵ سال تک محکمۂ تعلیم سے منسلک رہے۔ دہلی سے آگرے گئے اور آگرے سے پھر دہلی لائے گئے۔ کچھ عرصہ نارمل اسکول کے ہیڈماسٹر رہے اور اس کے بعد ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۲ع میں میور کالج الہ آباد گئے اور ۱۸۷۳ع تک اس خدمت پر مامور رہے۔ اس کے بعد پنشن پر ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ

۱۔ مولوی ذکاءاللہ دہلوی: مسٹر اینڈریوز، ترجمہ ضیاالدین احمد برنی صفحہ ۱۳۷۔

سے کچھ عرصہ پہلے انھیں ''خان بہادر'' اور ''شمس العلما''
کے خطاب دیے گئے[1] ۔''

اس بیان میں دو نہایت سنگین غلطیاں موجود ہیں ؛ ذکاء اللہ نے محکمۂ تعلیم کی خدمت بحیثیت ملازم ۵۵ سال نہیں بلکہ صرف چھتیس سال کی ہے جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے ۔ دوسرے میور کالج الہ آباد میں وہ ۱۸۷۲ع سے ۱۸۷۳ع تک نہیں بلکہ ۱۸۷۲ع سے ۱۸۸۷ع تک مامور رہے ہیں اور اس پر سب تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے ۔

مندرجہ بالا متضاد بیانات کی وجہ سے مختلف مقامات پر ان کی مدت ملازمت کا تعین دشوار معلوم ہوتا ہے ۔

سر عبدالقادر لکھتے ہیں کہ مولوی ذکاءاللہ پوری ملازمت میں (جو چھتیس سال بنتی ہے) صرف سولہ دن رخصت پر رہے[2] ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنے فرائض منصبی کا کس قدر لحاظ تھا ۔

سرسید سے روابط :

مولوی ذکاءاللہ سلسلۂ سرسید کے اہم رکن تھے ۔ وہ ورنیکلر یونیورسٹی کے بڑے موید تھے اور ''تہذیب الاخلاق'' کے نامور مقالہ نگار تھے[3] ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے ذکاءاللہ سے سرسید کے روابط کے متعلق صرف اتنا ہی لکھا ہے ۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب

---

۱ ۔ اردو کے نام ور شعرا اور نثر نگار (انگریزی) : سر عبدالقادر ، صفحہ ۱۶۳ ۔

۲ ۔ اردو کے نام ور شعرا اور نثر نگار : سرعبدالقادر ، صفحہ ۱۶۲ ۔

۳ ۔ سرسید احمد خان اور ان کے نام‌ور رفقا : ڈاکٹر سید عبداللہ ، صفحہ ۱۸۲ ۔

انھیں (مولوی ذکاءاللہ کو) سرسید کا پٹھو لکھتے ہیں[1] ۔ ''یاد ایام'' کے مصنف محمد عبدالرزاق کانپوری کو خود مولوی ذکاءاللہ بعض دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ میں نے سرسید احمد خان کو انگریزی کتابوں کے ترجمے کا مشورہ دیا جس کے نتیجے میں سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اور کالج کے معاملات میں سر سید کو بڑی امداد دی[2] ۔ سر عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں کہ ریٹائر ہونے کے بعد مولوی ذکاءاللہ ایک سال تک سر سید کے ہاں علی گڑھ میں مقیم رہے اور کالج کے معاملات میں ان کی مدد کرتے رہے[3] ۔ مولوی ذکاءاللہ کی ایک تصنیف ''تاریخ ہند'' (جلد اول) سرسید نے مدرسۃالعلوم کے نصاب کے لیے منظور کر لی تھی ۔ یہ بات کتاب کے سرورق سے معلوم ہوتی ہے ، جس پر سرسید نے اپنے قلم سے نوٹ لکھا ہے[4] ۔ ''خطوط سرسید'' مرتبہ سرراس مسعود میں مولوی ذکاءاللہ کے نام سرسید کے سات مکتوب ہیں اور ان کے بیٹے مولوی عنایت‌اللہ کے نام ستر خطوط ہیں[5] ۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کو اس خاندان سے گہری وابستگی تھی ، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مولوی عنایت اللہ

---

۱ ۔ سیر المصنفین : محمد یحییٰ تنہا (ذکاءاللہ پر ڈپٹی نذیر احمد کا مضمون) جلد دوم ، صفحہ ۲۱۳ ۔

۲ ۔ یاد ایام : محمد عبدالرزاق کانپوری ، صفحہ ۲۹۰—۲۹۳ ۔

۳ ۔ اردو کے نام‌ور شعرا اور نثر نگار : (انگریزی) سر عبدالقادر ، صفحہ ۱۶۲ ۔

۴ ۔ تاریخ ہند (حصہ اول) : ذکاء اللہ ، مطبع مرتضوی دہلی ، مخزونہ پبلک لائبریری لاہور ، دیکھیے سر ورق ۔

۵ ۔ خطوط سرسید : مرتبہ سر راس مسعود ، صفحہ ۱۲۹ ۔

کو سرسید نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا ۔ ان کی ذرا سی تکلیف سے سرسید پریشان ہو جاتے تھے ۔ مولوی محمد اسمعیل پانی پتی صاحب نے مولوی عنایت اللہ پر ''نقوش'' (شخصیات نمبر) میں ایک مضمون لکھا ہے[1] ۔ یہ مضمون اس خاندان سے سرسید کے تعلقات کی بہترین تصویر پیش کرتا ہے ۔

آخر میں مسٹر اینڈریوز کے بیان کا خلاصہ پیش کرتا ہوں جو سرسید اور مولوی ذکاءاللہ کے تعلقات کے بارے میں بہت اہمیت رکھتا ہے :

'' . . . علی گڑھ (کالج) کے بانی سرسید احمد خان کا نام سنتے ہی ان (مولوی ذکاءاللہ) کی آنکھوں میں چمک اور دل میں جوش پیدا ہو جاتا تھا . . . . ان کے نشست و برخاست کے کمرے میں سرسید کی تصویر عین مرکزی جگہ پر آویزاں تھی . . . . وہ ہمہ اوقات ان کا ذکر بڑے احترام اور تعریف کے ساتھ کرنے کے عادی تھے . . . . ذکاءاللہ رفتہ رفتہ تحریک علی گڑھ کے پرجوش مداح بن گئے تھے . . . . وہ اس کے قیام ہی کے زمانے سے ٹرسٹیوں کے بورڈ میں شامل تھے اور اپنی وفات تک اس کے ممبر رہے[2] ۔

کسی تذکرہ نگار نے بھی مولوی ذکاءاللہ اور سرسید کے تعلقات کے آغاز کا سنہ نہیں دیا اس لیے یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ قیاس چاہتا ہے کہ تعلقات کی ابتدا ۱۸۴۶ع یا اس کے

---

۱ ۔ نقوش (شخصیات نمبر) مولوی اسماعیل پانی پتی کا مضمون ''مولوی عنایت اللہ کی شخصیت پر'' ، صفحہ ۳۹۰ ۔

۲ ۔ مولوی ذکاءاللہ دہلوی : اینڈریوز صفحہ ۱۳۹ ۔

کچھ عرصہ بعد سے ہوئی ہوگی جب کہ سرسید فتح پور سیکری سے تبدیل ہو کر دہلی آ گئے تھے[۱] - دہلی میں وہ خاصا عرصہ رہے ، اس دوران میں مولوی ذکاءاللہ سے ان کے روابط ہو گئے ہوں گے - سرسید نے ۱۸۶۳ع میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی[۲] - 'یاد ایام' کے مطابق سرسید کو اس سوسائٹی کا مشورہ ذکاءاللہ نے دیا تھا[۳] - سرسید کے ساتھ مولوی ذکاءاللہ کے یہ عقیدت مندانہ اور دوستانہ روابط ان کی آخری عمر تک برقرار رہے - جب تک سرسید زندہ رہے (تاریخ وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ع) مولوی ذکاءاللہ کسی نہ کسی حیثیت سے ان کے ساتھ وابستہ رہے اور انھوں نے بھی اس عقیدت کا جواب محبت سے دیا -

اعزازات :

مولوی ذکاءاللہ کو محکمۂ تعلیم نے وقتاً فوقتاً جو اعزازات دیے تھے ، ان کی تاریخ کا تعین بہت مشکل ہے ، کیوں کہ کسی تذکرہ نگار نے اس کی نشان دہی نہیں کی - البتہ ان کی نوعیت کے متعلق تھوڑی بہت معلومات دستیاب ہوتی ہیں - سب سے پہلے مولوی ذکاءاللہ کا اپنا بیان ملاحظہ کیجیے - یہ بیان انھی کی ایک تالیف "تعلیم الاخلاق" کے پہلے صفحے پر موجود ہے - فرماتے ہیں :

> "ممالک مغربی و شمالی و پنجاب کے سر رشتۂ تعیم میں میری ساری عمر بسر ہوئی ہے - اس کے احسانات عظیم میرے سر پر ایسے ہیں کہ میں کسی طرح ان کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا - اسی نے اپنی گرہ سے روپیہ خرچ کرکے مجھے

---

۱ - داستان تاریخ اردو : حامد حسن قادری ، صفحہ ۲۵۵ -

۲ - ایضاً : صفحہ ۲۵۹ -

۳ - یاد ایام : صفحہ ۲۹۰ -

سکھایا پڑھایا ۔ خود چھ برس تک وظیفہ دار طالب علم
رکھا ۔ اس نے چھتیس برس تک اپنا ملازم رکھا ،
معلم، ڈپٹی انسپکٹر ، ہیڈ ماسٹر ، پروفیسر ، فیلو یونیورسٹی
بنایا ، خلعت ، تمغے ، سیکڑوں روپے انعام دیے ۔ خان
بہادر ، شمس العلما کے خطاب عطا کیے ۔ اسی نے مجھ سے
سو کتابوں کے قریب ، جن کے تخمیناً بیس ہزار صفحے
ہوں گے ، تصنیف و تالیف و ترجمہ کرائے ۔ ۔ ۔ ۔ "
مولوی صاحب کے اس بیان سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ
انھیں خلعت ، تمغے ، سیکڑوں روپے انعام اور خطابات ملے لیکن کب
ملے؟ اس کی وضاحت نہ انھوں نے کی ، نہ کسی دوسرے تذکرہ نگار
نے ۔ محمد یحییٰ تنہا سیرالمصنفین[1] میں رقم طراز ہیں :
"دہلی کالج میں لڑکوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اول پاس
ہونے پر وظائف دیے جاتے تھے ۔ مولوی ذکاءاللہ ان
وظائف کے زیادہ حق دار ٹھہرتے تھے ۔ آپ کو "اعلیٰ
قابلیت" کے دو تمغے بھی وہاں سے ملے ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو
بصلۂ تعلیم نسواں ڈپٹی انسپکٹری کے زمانے میں
گورنمنٹ نے خلعت مرحمت فرمایا ۔ ۔ ۔ ۔ سلسلۂ ریاضیات
کے لیے برٹش گورنمنٹ سے آپ کو پندرہ سو روپے کا
بیش قرار انعام عطا ہوا اور "خان بہادر" اور
"شمس العلماء" کے خطابات سے مخاطب کیے گئے ۔"
تنہا کے اس بیان کی روشنی میں مولوی ذکاءاللہ کو خلعت
ڈپٹی انسپکٹری کے زمانے میں ملتا ہے ۔ یہ عہدہ تنہا ہی کے بقول
۱۸۵۵ع سے شروع ہوتا ہے اور گیارہ سال تک یعنی ۱۸۶۶ع

---

۱ ۔ سیرالمصنفین : محمد یحییٰ تنہا ، صفحہ ۲۰۸ و ۲۰۹ ۔

تک رہتا ہے[۱] ۔ گویا اس خلعت کا زمانہ، جو تعلیم نسواں کے صلے میں انھیں ملا ، انھی سنین میں محصور ہے ۔

سرعبدالقادر کا بیان مولوی ذکاء اللہ کے خطابات کے زمانے کے تعین میں ہاری تھوڑی سی مدد کرتا ہے لہذا اسے درج کرنا ضروری ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''ریٹائرمنٹ سے کچھ عرصہ قبل انھیں ''خان بہادر'' اور ''شمس العلما'' کے خطابات عطا کیے گئے ۔ یہ دونوں خطاب ایک ہی سال میں دیے گئے[۲]۔''

مولوی ذکاءاللہ خود بھی اس کی تائید کرتے ہیں ۔ انھوں نے اپنی کتاب ''تعلیم الاخلاق'' پر (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) انگریزی میں "TO THE READER" کے عنوان سے ایک تعارفی نوٹ لکھا ہے جس میں فرماتے ہیں : ''کالج نے مجھے تمغے دیے ، میری تعلیمی خدمات کے پیش نظر خلعت دیا اور انعام میں معقول رقم دی ۔ مستعفی ہونے پر ''خان بہادر'' اور ''شمس العلما'' کے خطابات عنایت کیے'' ۔ (تعلیم الاخلاق ، صفحہ ۲)

سر عبدالقادر اور مولوی ذکاءاللہ کے بیانات میں یکسانیت پائی جاتی ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۸۸۵ع میں ، جو ان کی ریٹائرمنٹ کا سال ہے ، انھیں یہ خطابات دیے گئے ہوں گے ۔

شادی :

ذکاءاللہ کی شادی اور ازدواجی زندگی کے متعلق مسٹر اینڈریوز نے کوئی باقاعدہ عنوان قائم نہیں کیا ۔ انھوں نے یہ بھی نہیں بتایا

---

۲ - سیرالمصنفین : محمد یحییٰ تنہا ، صفحہ ۲۰۵ ۔

۳ - اردو کے نامور شعرا اور نثرنگار : (انگریزی) سرعبدالقادر ، مضمون ذکاءاللہ ، صفحہ ۱۶۳ ۔

کہ ان کی شادی کس سنہ میں ہوئی ۔ ضمناً کہیں کہیں شادی کا ذکر آ گیا ہے ۔ چنانچہ ایک مقام پر رقم طراز ہیں :

"بے حد تنگ دستی کی وجہ سے ، جو زیادہ تر مغلیہ دربار کے عام انحطاط کا نتیجہ تھی ، ذکاءاللہ ابتدائے زندگی میں شادی کرنے سے مجبوراً محترز رہے ۔ اس طرح انہوں نے اس رسم کے خلاف عمل کیا جو شمالی ہند کے مسلمانوں میں عام طور پر رائج تھی ۔ ان کے لیے یہ بہت بڑی قربانی اور ایثار کا سوال تھا ، اس لیے کہ وہ فطرۃً گھریلو زندگی کے شائق تھے اور بچوں سے انتہائی محبت کرتے تھے ، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ جب غدر ہوا تو ان کے اپنے بیوی بچے نہ تھے ۔ اب ان کی عمر پچیس سال کی ہو گئی تھی ۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتے تھے اور اپنی محبت اور علم کے زور سے ان کی کفالت کرتے تھے[1] ۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ۱۸۵۷ع تک مولوی ذکاءاللہ نے شادی نہیں کی تھی ۔ لیکن یہ بات کہ تنگ دستی کی وجہ سے شادی سے محترز رہے ، محل نظر ہے ۔ جو بات زیادہ قرین قیاس ہے اور جس کی طرف اینڈریوز صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے ، وہ یہ ہے کہ مولوی ذکاءاللہ پسند کی شادی کرنا چاہتے تھے اور غالباً ابتدا میں اس کے لیے حالات سازگار نہ ہوں گے ۔ چنانچہ اینڈریوز لکھتے ہیں :

"ان کی خانگی زندگی بڑی بہت جلد سدھر گئی ۔ اس کے بعد (یعنی ۱۸۵۷ع کی تحریک آزادی کے بعد) انہوں نے

---

۱ ۔ مولوی ذکاءاللہ دہلوی : اینڈریوز ، صفحہ ۱۰۶ ، ۱۰۷ ۔

(مولوی ذکاءاللہ نے) اپنی پسند کی شادی کی اور تازیست
اپنی انتخاب کردہ بیوی کے ساتھ گہری اور دلی محبت
رکھی [1]۔"

مولوی محمد اسماعیل صاحب پانی پتی "سوانح عمری مولوی عنایت اللہ" میں مولوی عنایت اللہ (مولوی ذکاء اللہ کے فرزند) سے روایت کرتے ہیں کہ ان کی (مولوی عنایت اللہ کی) والدہ سیدہ تھیں [2]۔

کسی سوانح نگار نے واضح طور پر یہ نہیں بتایا کہ مولوی ذکاء اللہ کی رفیقۂ حیات کب تک زندہ رہیں اور کس سنہ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا ۔ اینڈریوز لکھتے ہیں کہ مولوی ذکاء اللہ کی اہلیہ ان کی وفات سے بارہ سال پیشتر (تقریباً ۱۸۹۸ع میں) زندہ تھیں اور شدید علیل تھیں [3] ۔ ممکن ہے اسی علالت میں ان کا انتقال ہوگیا ہو ۔ اس صورت میں ان کی وفات کا سنہ ۱۸۹۸ع متعین ہوگا ۔

ان تمام بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ذکاء اللہ نے ۱۸۵۷ع کے بعد اپنی پسند کی شادی کی ۔ ان کی اہلیہ سید خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جو تقریباً ۱۸۹۸ع میں وفات پاگئیں ۔ ان کی ازدواجی زندگی نہایت خوش گوار اور پرسکون تھی ۔

اولاد :

مولوی ذکاء اللہ کی اولاد کے بارے میں سوانح نگاروں نے

---

۱ ۔ مولوی ذکاءاللہ دہلوی : اینڈریوز ، صفحہ ۱۱۷ ۔
۲ ۔ سوانح عمری مولوی عنایت اللہ: مولوی محمد اسماعیل پانی پتی، مطبوعہ ۱۹۳۹ع ، صفحہ ۲ ۔
۳ ۔ مولوی ذکاء اللہ دہلوی : اینڈریوز ، صفحہ ۱۹۳ ۔

کوئی تفصیلات فراہم نہیں کیں ۔ مسٹر اینڈریوز بھی ان کے صرف ایک لڑکے (مولوی عنایت اللہ) کا کہیں کہیں ضمناً ذکر کر جاتے ہیں ۔ مولوی عنایت اللہ کا شمار اپنے وقت کے نامور علما اور مترجمین میں ہوتا ہے ۔ مسٹر اینڈریوز نے مولوی ذکاء اللہ کی سوانح عمری مرتب کرتے وقت انھی سے مدد لی ہے ۔ لیکن تعجب ہے کہ ان کے متعلق انھوں نے کچھ بھی نہیں لکھا ۔ ان کے علاوہ ذکاء اللہ کی اولاد کے متعلق صرف اتنا لکھتے ہیں :

''جوں جوں خوشی کے سال جلدی جلدی گزرتے گئے ، ان کے یہاں لڑکے پیدا ہوتے گئے ۔ اب ان کا گھرانا لڑکوں پر مشتمل تھا اور انھیں ، جن کا دل بچے کا سا تھا ، ماں باپ بننے کی غیر محدود خوشی و مسرت عطا کر دی گئی تھی[1] ۔''

اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ان کے متعدد لڑکے پیدا ہوئے ۔ ان میں سے مولوی عنایت اللہ کو علیحدہ کرکے جن کا ذکر تفصیلاً کیا جائے گا ، باقی کسی لڑکے کے متعلق ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا ۔

مولوی عنایت اللہ کے اپنے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بڑا ایک اور بھائی بھی تھا ۔ وہ لکھتے ہیں :

''غالباً جولائی ۱۸۷۸ع کا زمانہ ہے کہ میرے والد (مولوی ذکاء اللہ) ، جو اس وقت میور کالج الہ آباد میں پروفیسر تھے ، گرمیوں کی تعطیل دہلی میں ختم کرکے الہ آباد واپس جانے لگے ۔ اس مرتبہ انھوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو ، جو مجھ سے تین برس بڑے تھے ، اپنے

---

۱ - مولوی ذکاء اللہ دہلوی : اینڈریوز ، صفحہ ۱۰۷ ۔

ہمراہ لے جانا چاہا تاکہ الہ آباد میں ہماری تعلیم کا
کوئی بندوبست کریں . . . میری عمر اُس وقت آٹھ برس
کی تھی[1]۔"

مولوی عنایت اللہ کی ولادت ۱۵ نومبر ۱۸۶۹ع کو ہوئی۔ اس حساب سے ان کے بڑے بھائی کی ولادت کا سال ۱۸۶۷ع قرار پاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے (اور مولوی عنایت اللہ کا مندرجہ بالا بیان اس کا مؤید ہے) کہ یہی مولوی ذکاء اللہ کا سب سے بڑا لڑکا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ سب سے بڑی اولاد بھی یہی ہو۔ ان کا نام مولوی عنایت اللہ نے نہیں لکھا لیکن غالب گمان یہ ہے کہ ان کا نام منشی عطاء اللہ ہوگا۔ میرے اس مفروضے کی تائید یوں ہوتی ہے کہ مولوی ذکاء اللہ کی اکثر مطبوعات کے سرورق پر اور اُن کی کتابوں کے اشتہار کے نیچے یہی نام نظر آتا ہے اور گھر کا پتا بھی انھی کا ہے، یعنی کوچہ چیلاں دہلی۔ چنانچہ "مکارم الاخلاق" کے سرورق پر مہتمم کا نام یوں درج ہے:

"شمس المطابع دہلی میں باہتمام منشی محمد عطاء اللہ کے
مطبوع ہوا۔"

ان کے نام کے قافیے کے علاوہ لفظ "منشی" بھی ہمارے خیال کی تائید کرتا ہے۔ ان کے علاوہ ذکاء اللہ کی اولاد کے تفصیلی حالات کے بارے میں ہمیں علم نہیں ہوتا اور نہ کسی تذکرہ نگار نے رہنمائی کی ہے۔ مولوی محمد اسماعیل صاحب پانی پتی کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کا ایک لڑکا اب تک کراچی میں بقید حیات ہے۔ مولوی ذکاء اللہ کے خلف رشید مولوی عنایت اللہ کی شخصیت

۱۔ نقوش (ادب عالیہ نمبر): سر سید پر مولوی عنایت اللہ کا مضمون، صفحہ ۳۹۰۔

جامع کمالات تھی ۔ ان کی زندگی پر مولوی اسماعیل پانی پتی نے نہایت محققانہ مضمون "نقوش" (شخصیات نمبر) میں قلم بند کیا ہے ، اس سے رجوع کرنا چاہیے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :

" دہلی کے محلہ قاضی واڑہ میں مولوی عنایت ۱۵ نومبر ۱۸۶۹ع کو پیدا ہوئے اور دیرہ دون میں ۱۹۴۳ع کو وفات پائی ۔ جوانی میں عروس ادب سے شادی کی اور ساری عمر اسی کی ناز برداری میں گزار دی ، اس لیے پیچھے نہ بیوی چھوڑی نہ بچے ، البتہ عروس ادب سے ساٹھ کے قریب اولادیں ہوئیں ۔ (ص ۱۴۳)....... ۱۸۸۰ع میں مڈل کا پرائیویٹ امتحان دیا مگر فیل ہو گئے .... ۱۸۸۱ع میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے (ص۱۴۴) ... بی ۔ اے ہونے کے بعد سرسید نے انھیں کالج کی لائبریری کا لائبریرین بنا دیا ۔ کچھ دن انھوں نے علی گڑھ میں ریاضی کا درس بھی دیا ۔ ایک سال تک 'تہذیب الاخلاق' کی ایڈیٹری کی ۔ ۱۹۰۰ع میں سیشن جج جونپور کے چیف سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے اور چودہ سال تک اس عہدے پر کام کیا ...... ۱۹۱۵ع میں سیکرٹری فنانس ہو کر ریاست گوالیار گئے (صفحہ ۱۴۶) ...... ۱۹۲۱ع کو انھوں نے نظامت دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کا چارج لیا ۔ تقریباً تین سو کتابیں ان کے زمانۂ نظامت میں دارالترجمہ نے شائع کیں ۔ چودہ سال تک اس عہدے پر فائز رہے اور ۱۹۳۵ع کو دہلی آ گئے ۔ ڈیرہ دون میں انھوں نے ذاتی کوٹھی خرید لی اور زندگی کے باقی دن یہیں بسر کیے" ۔ (صفحہ ۱۴۷) ۔

وفات :

مولوی ذکاء اللہ کو عمر بھر کوئی بیماری لاحق نہیں ہوئی لیکن جب بیمار ہوئے تو یہ بیماری ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اینڈریوز نے ان کے آخری ایام کے حالات پر خاصا لکھا ہے لیکن یہ پھر بھی نہیں بتایا کہ بیماری کیا تھی؟ اتنی طویل بیماری جس کے ساتھ شدید درد بھی شامل تھا، آخر اس کا کوئی نام تو ہوگا۔ سرعبدالقادر صرف اتنا لکھتے ہیں[1] کہ ڈاکٹروں کی رائے یہ تھی کہ ان کے اعضائے رئیسہ (vital organs) میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی بلکہ اصل تکلیف ضعیفی (natural decay) کی وجہ سے طاقت کی کمی تھی۔ مسٹر اینڈریوز ان کے آخری وقت کی تصویر بہایں الفاظ پیش کرتے ہیں :

”ایک دن شام کے وقت ، جبکہ میں انھیں تقریباً بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر آ گیا تھا ، مجھے میرے ایک مسلمان شاگرد کے ذریعے بلایا گیا جو اُن کے مکان کے قریب رہا کرتا تھا۔ اسے میرے پاس یہ اطلاع دینے کے لیے بھیجا گیا تھا کہ ذکاء اللہ سکرات کی حالت میں ہیں۔ میں فوراً انھیں دیکھنے کے لیے گیا اور جب میں اُس کمرے میں پہنچا جہاں وہ لیٹے ہوئے تھے ، میں نے انھیں وہ مختصر سی دعائیں اور کلمے بار بار پڑھتے ہوئے سنا جو تمام مسلمان موت کے وقت بالعموم پڑھا کرتے ہیں۔ اس کے بعد اُن پر کامل بے ہوشی اور غفلت طاری ہو گئی اور وہ اُس وقت تک رہی جب تک

---

۱ - اردو کے نام ور شعرا اور نثر نگار (انگریزی) : سر عبدالقادر ، صفحہ ۱۶۴ -

کہ اُن کا انتقال نہ ہوگیا'۔''

مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ مسٹر اینڈریوز نے جو ان کا سال وفات بھی غلط لکھا ہے۔ ''سیرالمصنفین''[۲] کے مصنف محمد یحیٰ تنہا اور سر عبدالقادر[۳] لکھتے ہیں کہ وہ (مولوی ذکاء اللہ) ۷ نومبر ۱۹۱۰ع کو فوت ہوئے۔ داستان تاریخ اردو کا ماخذ بھی سیرالمصنفین ہی ہے لیکن اس میں ۷ نومبر کی بجائے ۱۷ نومبر ۱۹۱۰ع لکھا ہے (صفحہ ۲۴۴)۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے غالباً داستان تاریخ اردو سے نقل کیا ہے لہذا انہوں نے بھی ۱۷ نومبر ۱۹۱۰ع لکھا ہے۔''یاد ایام'' (صفحہ ۲۹۳) میں صرف سال (۱۹۱۰ع) درج ہے، مہینہ اور تاریخ نہیں دی گئی۔ جامع اللغات میں سال وفات تو درست ہے لیکن ولادت کا سنہ (۱۸۳۰ع) غلط لکھا ہے۔

مسٹر اینڈریوز، مولوی ذکاءاللہ کے قریبی احباب میں تھے۔ انہوں نے مولوی ذکاءاللہ کا سال وفات ضمناً ایک مقام پر غلط درج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''منشی ذکاءاللہ اور مولوی نذیراحمد اُس زمانے میں جب کہ میں نووارد کی حیثیت سے مارچ ۱۹۰۴ع میں دہلی پہنچا، وہاں کے نہایت معمر اور نہایت محترم شہریوں میں شمار ہوتے تھے ... ان کی وفات ـــ ہر ایک نے تقریباً ۹۰ برس کی عمر پائی ـــ ۱۹۱۱ع اور ۱۹۱۲ع میں یکے بعد دیگرے

---

۱ - مولوی ذکاء اللہ دہلوی : اینڈریوز، صفحہ ۱۸۳ -
۲ - سیرالمصنفین : محمد یحییٰ تنہا، جلد دوم، صفحہ ۲۱۰ -
۳ - اردو کے نام ور شعرا اور نثرنگار : سر عبدالقادر، صفحہ ۱۶۴ -

واقع ہوئی[1]۔"

اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مولوی ذکاءاللہ نومبر ۱۹۱۰ع کو فوت ہوئے اور اس پر سب کا اتفاق ہے ۔ اینڈریوز صاحب نے نہ معلوم ۱۹۱۱ع کس بنا پر لکھ دیا ہے ۔ پھر ان دونوں حضرات (مولوی ذکاءاللہ اور ڈپٹی نذیر احمد) کی عمر نوے برس بھی نہیں بنتی ۔ مولوی ذکاءاللہ کی عمر (۱۸۳۲ع—۱۹۱۰ع) اٹھتر سال کے قریب ہوتی ہے اور ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۳۶ع میں متولد ہو کر ۱۹۱۲ع کو داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں[2] ۔ چنانچہ وہ چھہتر سال کے قریب عمر پاتے ہیں ۔

تصانیف :

مولوی ذکاءاللہ کی تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے ۔ انھوں نے متنوع موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے اور ہزاروں صفحات لکھے ہیں ۔ ان کے سوانح نگاروں کی متفقہ رائے ہے کہ مولوی ذکاءاللہ کے تصنیفی کام میں افکار عالیہ کی چمک اور روشنی بہت کم ہے ۔ اُن کے دوستوں ڈپٹی نذیر احمد اور الطاف حسین حالی وغیرہ نے علم و ادب کی دنیا میں جو شہرت اور ناموری حاصل کی ، وہ ذکاءاللہ کے حصے میں نہ آسکی ۔ وہ ہر لحاظ سے ایک اوسط درجے کے آدمی تھے اور خود انھیں بھی اس کا اعتراف تھا ۔ چنانچہ اکثر اپنی تصنیفات کی الماریاں دوستوں کو دکھا دکھا کر نہایت حسرت سے کہا کرتے تھے[3] کہ "ایک دن یہ سب خاک ہو جائیں گی اور

---

۱ ۔ مولوی ذکاءاللہ دہلوی : اینڈریوز ، صفحہ ۲۷ ، ۲۸ ۔
۲ ۔ داستان تاریخ اردو : حامد حسن قادری ، صفحہ ۳۶۱ ۔
۳ ۔ مولوی ذکاءاللہ دہلوی : اینڈریوز ، صفحہ ۱۳۴ ۔

اُن کی کوشش کو کوئی یاد کرنے والا بھی نہ رہے گا[1]"۔ چنانچہ ان کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ مولوی ذکاءاللہ کی کتابیں پڑھنا تو درکنار، آج ان سب کے نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ یہ کسی سوانح نگار نے ان کی تصانیف کی فہرست پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اُن کے علمی ذخیرے کے کیف و کم سے تقریباً نا آشنا ہیں۔

مولوی ذکاءاللہ نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا؛ ان میں ریاضیات سر فہرست ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ و جغرافیہ، ادب، اخلاقیات، طبیعیات، سیاست مدن، ہیئت وغیرہ لاتعداد موضوع ہیں جن پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے۔ مولانا حالی کے یہ قول ذکاءاللہ کی مثال بنیے کی دوکان کی ہے، جس نے جو چیز مانگی مل گئی[2]۔ ان کا بیشتر کام ترجمے کا ہے جو مدرسانہ ضروریات کے لیے کیا گیا ہے لیکن تصنیف و تالیف پر بھی انھوں نے خاصی توجہ دی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مولوی ذکاءاللہ کے تصنیفی کام کی کمیت کے متعلق سوانح نگاروں کی آرا پیش کی جائیں:

"سیرالمصنفین" (جلد دوم، صفحہ ۲۰۶) میں ان کی جملہ تصانیف کی تعداد ۱۴۳ بتائی گئی ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

ریاضیات: ۸۷۔ تاریخ و جغرافیہ: ۱۸۔ علم ادب: ۱۶۔ علم اخلاق: ۶۔ طبیعیات و ہیئت: ۹۔ سیاست مدن: ۷۔

عبدالرزاق کانپوری "یاد ایام" میں لکھتے ہیں:

"بیس برس کی عمر سے تقریباً پچھتر سال تک یہی علمی شغل جاری رہا۔ تصانیف و تراجم کے صفحات کی تعداد پچاس

۱۔ ایضاً: صفحہ ۱۴۴۔ علاوہ ازیں "یاد ایام" صفحہ ۲۹۲ بھی دیکھیے۔
۲۔ مولوی ذکا اللہ دہلوی: اینڈریوز، صفحہ ۱۳۴۔

ہزار سے کم نہ ہوگی جس کا بڑا حصہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے ۔ اخیر عمر میں ترجمے کے مخالف تھے[1]۔''

مسٹر اینڈریوز نے اپنے تذکرے میں مختلف مقامات پر مولوی ذکاءاللہ کی تصنیف و تالیف کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ، اس کا خلاصہ یہ ہے :

مولوی ذکاءاللہ نے ادبی مشغلے میں مجموعی طور پر اپنی زندگی کے تقریباً پچاس سال صرف کر دیے[2] ۔ ان کا پہلا پبلشر علی گڑھ انسٹیٹوٹ تھا[3] ۔ ابھی وہ طالب علم ہی تھے اور مشکل سے سترہ برس کے ہوں گے (یعنی ۱۸۴۹ع) کہ انھوں نے ریاضی پر اردو میں پہلی کتاب شائع کر دی جو صرف چار دن میں دہلی میں فروخت ہو گئی[4] ۔

اردو کے مصنفین میں یہی ایک واحد شخص ہیں جن کی زبان نے ان کی تالیف و تراجم کے کم وبیش ستر ہزار صفحات میں ایک لفظ کے لحاظ سے بھی لغزش نہیں کی ۔ جس دیوار کے ساتھ سر کی ٹیک لگا کر لکھتے تھے وہاں گڑھا پڑ گیا تھا[5] ۔

اخبارات اور رسائل میں ان کے جو مضامین شائع ہوئے ، وہ کئی ضخیم جلدوں کے برابر ہوں گے ۔ انھوں نے ''حسن'' حیدرآباد ''تہذیب الاخلاق'' ، ''سائنٹفک گزٹ'' علی گڑھ ، ''ادیب''

---

۱ ۔ یاد ایام : صفحہ ۲۹۲ ۔
۲ ۔ مولوی ذکاءاللہ دہلوی : اینڈریوز ، صفحہ ۱۳۵ ۔
۳ ۔ ایضاً : صفحہ ۱۳۴ ۔
۴ ۔ ایضاً : صفحہ ۱۰۴ ۔
۵ ۔ ایضاً : صفحہ ب (مقدمہ از ڈاکٹر سید سجاد صاحب) ۔ نیز داستان تاریخ اردو : صفحہ ۴۵۰ ۔

خیر آباد ، ''معارف'' علی گڑھ ، ''مخزن'' لاہور ، ''زمانہ'' کانپور، ''علی گڑھ منتھلی'' کے علاوہ متعدد رسائل میں مضامین لکھے[1] -

سر عبدالقادر کے بیان کا خلاصہ ملاحظہ ہو :

''مولوی ذکاءاللہ نے سب سے پہلے ہندوستانی کھیلوں یعنی تاش ، شطرنج وغیرہ پر کتاب لکھی - دوسری تصنیف حساب کی ایک چھوٹی سی کتاب تھی جو چھپ کر تین دن کے اندر دہلی میں بک گئی - اس وقت ان کی عمر انیس سال سے کم ہوگی - انھوں نے ستر ہزار صفحات کے قریب لکھے جو سو جلدوں میں چھپے - دس ہزار صفحات مضامین کی شکل میں شائع ہوئے - ابھی کئی ہزار صفحات پر مشتمل مسودات صندوقوں میں غیر مطبوعہ رکھے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا[2] -''

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۸۴۹ع سے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا - یہ وہ زمانہ ہے جب انھوں نے دہلی کالج میں تعلیم مکمل کرکے اسی کالج میں ملازمت کا آغاز کردیا تھا -

آخر میں مولوی ذکاءاللہ کا اپنا بیان ملاحظہ فرمائیے جو زیادہ وقیع ہے اور اُن کے تصنیفی کام کے سلسلے میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے - وہ اپنی ایک کتاب 'فرہنگ فرنگ کی تاریخ' کے 'ابتدائیہ' میں رقم طراز ہیں :

''مجھے اپنی انیسویں سال کی عمر سے ترجمے کرنے اور تصنیف

---

۲ - سیرالمصنفین : جلد دوم ، صفحہ ۲۰۸ -

۳ - اردو کے نامور شعرا اور نثر نگار (انگریزی) : سر عبدالقادر ، صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۳ -

و تالیف کرنے کا شوق دامن گیر ہے - ہر روز دو چار
صفحے سیاہ کرنے کی عادت طبیعت ثانیہ ہو گئی ہے -
اسی طرح میں ہر سال بہ حساب اوسط ایک ہزار صفحات
لکھا کرتا ہوں - اس کا نتیجہ ستر برس کی عمر آخر
۱۹۰۱ع میں یہ ہے کہ ایک سو چھیالیس کتابیں چھپ
چکی ہیں اور گیارہ قلمی کتابیں چھپی رکھی ہیں جن کا
مجموعہ ایک سو ستاون کتابیں ہوا - اخباروں رسالوں
میں صدہا مضمون چھوٹے بڑے چھپے ہیں اور بہت سے
ناتمام پڑے ہیں - غرض میرے ہاتھوں نے قلم سے سیاہی
و کاغذ کو ملا کر پریس میں باون ہزار صفحوں کے
سر کو دبایا ہے[1] -"

مولوی ذکاءاللہ کے اس بیان کے مطابق ۱۹۰۱ع تک وہ
۱۵۷ کتابیں، جن کے مجموعی صفحات کی تعداد ۵۲ ہزار بنتی ہے،
لکھ چکے تھے - نومبر ۱۹۱۰ع میں اُن کا انتقال ہوتا ہے - اگر
مزید دس سال کا تصنیفی کام شامل کیا جائے تو ان کے اپنے اندازے
کے مطابق کم از کم دس ہزار صفحات مزید شامل ہوتے ہیں،
جب کہ اینڈریوز کے بہ قول آخری عمر میں اُنھوں نے زیادہ
محنت شروع کر دی تھی اور اُن کے کام کی رفتار اور مقدار بڑھ
گئی تھی -

مولوی ذکاءاللہ کی تالیفات کی مکمل فہرست اب تک کسی
سوانح نگار نے پیش نہیں کی اور نہ ہی ایسا ممکن ہے - تاہم میں
نے ان کی کچھ کتابوں کا سراغ لگایا ہے - ان میں سے اکثر نایاب

---

۱ - فرہنگ فرنگ کی تاریخ : مولوی ذکاءاللہ ، مطبع مصلح المطابع دہلی
۱۹۰۱ع مخزونہ پبلک لائبریری ، صفحہ ۲ -

ہیں ۔ امید ہے میری یہ کوشش تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مفید ثابت ہوگی اور انھیں مولوی ذکاءاللہ کی مزید تالیفات کی تلاش و جستجو پر آمادہ کرے گی ۔

۱ ۔ تاریخ اسلام :

مولوی ذکاءاللہ کے تصنیفی کام میں یہ کتاب ایک کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے ۔ مولانا الطاف حسین حالی نے ''انسٹیٹیوٹ گزٹ'' علی گڑھ ۱۸۷۶ء میں اس کتاب کے دوسرے حصے پر تبصرہ کیا تھا ۔ مولوی اسماعیل صاحب پانی پتی اس تبصرے کے شروع میں اس کتاب کا تعارف ان الفاظ کراتے ہیں :

''اس کتاب کے تین حصے ہیں : (۱) عہد ہنود (۲) عہد اسلامیہ (۳) عہد انگلشیہ ۔

(۱) پہلا حصہ صرف ایک جلد میں تھا اور اسے بھی مصنف نے مختصر طور پر بیان کیا تھا ۔

(۲) دوسرا حصہ مسلمان بادشاہوں کی تاریخ سے متعلق تھا اور سب سے زیادہ طویل اور اہم یہی حصہ تھا ۔ یہ حصہ دس بہت موٹی موٹی جلدوں پر مشتمل تھا اور ابتدائے اسلام سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے حالات و کوائف نہایت تفصیل اور بڑی تشریح کے ساتھ ، تمام فارسی اور انگریزی تاریخوں سے لے کر تحریر کیے گئے تھے ۔ ان میں سے بعض جلدیں ہزار ہزار صفحے کی تھیں ۔

(۳) عہد انگلشیہ کا حصہ پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل تھا اور یہ پانچ جلدیں انگریزی تاریخوں سے مرتب کی گئی تھیں ۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے لے کر وکٹوریہ تک کے حالات ان پانچ جلدوں میں بڑی

تفصیل سے قلم بند کیے گئے ہیں[1]"۔

تاریخ اسلام کی سولہ جلدوں کو ایک کتاب قرار دے کر ہم ان کی دوسری تالیف کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ ان میں سے بعض کی تھوڑی بہت تفصیل بھی دے دی گئی ہے لیکن اکثر کے نام لکھ دے گئے ہیں :

۲ - فرہنگ فرنگ کی تاریخ : مطبع مصلح المطابع دہلی ، ۱۹۰۱ع ، ۱۶۰ صفحات ۔
۳ - مسلمانوں کے علوم طبیعیہ کی تاریخ : مطبع احمدی دہلی ، ۱۹۰۰ع ، ۶۲ صفحات ۔
۴ - علوم طبیعیہ کی تاریخ : مطبع احمدی دہلی ، ۱۹۰۱ع ، ۴۰ صفحات ۔
۵ - تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند : مطبع شمس المطابع دہلی، ۲۰۶ صفحات ۔
۶ - اہل یونان کے علوم طبیعیہ کی تاریخ ۔
۷ - آئین قیصری ۔
۸ - کرزن نامہ ۔
۹ - محاربات عظیم ۔
۱۰ - تاریخ عہد انگلشیہ ۔
۱۱ - تذکرۂ مولوی سمیع اللہ ۔
۱۲ - سوانح عمری حضرت علیا کوئین وکٹوریہ ۔
۱۳ - محاسن الاخلاق : مطبع چشمۂ فیض دہلی ، ۱۸۹۱ع ، ۵ حصے ، کل صفحات ۲۰۶ ۔
۱۴ - تہذیب الاخلاق : مطبع چشمۂ فیض دہلی ، ۱۸۹۱ع

---

۱ - مقالات حالی : مرتبہ مولوی محمد اسماعیل پانی پتی ، (زیر طبع)

۱۴۴ صفحات۔
۱۵ ۔ مکارم الاخلاق : مطبع مرتضوی دہلی، ۱۸۹۱ء ،
۳۵۲ صفحات ۔
۱٦ ۔ تعلیم الاخلاق : مطبع چشمۂ فیض دہلی ، ۱۸۹۲ء ،
۲۰۲ صفحات ۔
۱۷ ۔ دعاء الخصال : مطبع چشمۂ فیض دہلی ، ۱۸۹۱ء ،
۱۴۱ صفحات
۱۸ ۔ تعلیم الانتظام : مطبع شمس المطابع دہلی ، ۱۸۹۴ء ،
۱۱۰ صفحات ۔
۱۹ ۔ فلسفۂ اعمال ۔
۲۰ ۔ صحیفۂ فطرت ۔
۲۱ ۔ فلسفۂ اعمال و مصحف الاعمال ۔
۲۲ ۔ مذہب اور سائنس کی رزم و بزم
۲۳ ۔ فلسفۂ سیاست و مالیہ ۔
۲۴ ۔ مجلس مناظرہ ۔
۲۵ ۔ منتخب نظم و نثر ۔
۲٦ ۔ اردو تذکروں کا بیان ۔
۲۷ ۔ تقویم اللسان ۔
۲۸ ۔ مبادی الانشا (اس کتاب کے چار حصے ہیں) ۔
۲۹ ۔ اردو کی پہلی کتاب ۔
۳۰ ۔ اردو کی دوسری کتاب ۔
۳۱ ۔ اردو کی تیسری کتاب ۔
۳۲ ۔ اردو کی چوتھی کتاب ۔
۳۳ ۔ اردو کی پانچویں کتاب ۔
۳۴ ۔ اقلیدس ۔

۳۵ - تحریر اقلیدس -
۳۶ - شرح اقلیدس چار مقالہ -
۳۷ - منتر اقلیدس -
۳۸ - رسالۂ علم سکون -
۳۹ - معاون الحساب -
۴۰ - برنارڈ سمتھ کے اکسرسائز -
۴۱ - جغرافیہ -
۴۲ - ریاضیاتی جغرافیہ -
۴۳ - طبیعی جغرافیہ -
۴۴ - جغرافیہ مبتدیوں کے واسطے -
۴۵ - جغرافیہ کی تعریف اور فروع میں اس کی تقسیم -
۴۶ - حساب (عمل مرکب) -
۴۷ - زبانی حساب -
۴۸ - جبر و مقابلہ -
۴۹ - کسور -
۵۰ - مساحت (سوالات اور حل) -
۵۱ - منتہی الحساب (اس کے چار حصے ہیں) -
۵۲ - مثلث مستوی -
۵۳ - مثلث کروی -
۵۴ - پینسٹھ کاغذات امتحان -
۵۵ - طریقۂ استعمال جداول ریاضیہ -
۵۶ - الجبرا -
۵۷ - شرح جبر و مقابلہ -
۵۸ - مساحت (شرح خورد) -
۵۹ - علوم طبیعیہ کی الف بے تے -

۶۰ - حساب کی کتاب -
۶۱ - امثلۂ متفرقہ و سوالات -
۶۲ - علم آب (تین حصوں میں) -
۶۳ - عجائب الحساب -
۶۴ - رسالۂ کسور عامہ و اعشاریہ و جذر و جذرالمکعب -
۶۵ - رسالۂ اعمال تامہ -
۶۶ - رسالۂ علم حساب ، اعمال صحاح -
۶۷ - رسالۂ علم حساب ، اعمال مرکب -
۶۸ - رسالۂ کسور -
۶۹ - اہل عرب کا حمروسامہ -
۷۰ - رسالۂ معادلات -
۷۱ - رسالۂ تراشہائے مخروطی -
۷۲ - رسالۂ مساحت کلاں -
۷۳ - رسالۂ مساحت سور صنحت -
۷۴ - رسالۂ استعمال جدول علم مثلث -
۷۵ - رسالۂ علم بیمہ ذخیرہ -
۷۶ - رسالۂ علم حساب الجزئیات -
۷۷ - رسالۂ علم حساب الجنات -
۷۸ - رسالۂ چار عنصر علم کیمیا -
۷۹ - برنارڈ سمتھ کا علم حساب کا رسالہ -
۸۰ - شرح سوالات متفرقہ -
۸۱ - شرح باقی سوالات -

۸۲ - Differential Calculus
۸۳ - Plane co-ordinite Geometry
۸۴ - The Theory of Equations

مولوی ذکاء اللہ کی کتابوں کی مذکورہ فہرست نامکمل ہے ۔
کم و بیش اتنی ہی کتابیں اور ہوں گی جن کے نام معلوم نہیں
ہو سکے ۔ یہ فہرست میں نے مختلف لائبریریوں اور خود مولوی
ذکاء اللہ کی کتابوں سے حاصل کی ہے ۔ تاریخ ادب کی بعض کتابوں
میں بھی ان کی کچھ کتابوں کے نام تھے جو میں نے نقل کر لیے
ہیں ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مولوی ذکاء اللہ کی زندگی اور
علمی کارناموں پر تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے ایک مفصل
کتاب لکھی جائے تا کہ ان کے علمی کارناموں کی صحیح اور مکمل
تصویر سامنے آ سکے ۔

مکارم الاخلاق :

محکمۂ تعلیم نے غالباً ۱۸۹۰ع کے لگ بھگ ایک رزولیوشن پاس
کیا جس کی رو سے سرکاری مدارس میں ایسی کتابیں پڑھانے کی ہدایت
کی گئی جن میں اخلاق کی اعلیٰ درجے کی باتیں بیان کی گئی ہوں ۔
چونکہ سرکاری مدارس میں ہر قوم و ملت کے بچے تعلیم حاصل
کرتے تھے اس لیے اس بات کا خاص التزام کیا گیا کہ ان کتابوں
میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جو تمام قوموں میں قدر مشترک
کی حیثیت رکھتی ہوں ۔ شاید اسی رزولیوشن سے متاثر ہو کر
مولوی ذکاء اللہ نے اخلاقیات کے موضوع پر قلم اٹھایا ۔ انھوں نے
علم اخلاق پر چھ کتابیں تالیف کیں جو مختلف مذاہب کی کتب سے
ماخوذ ہیں ۔ انگریزی ، عربی ، فارسی ، ہندی ، سنسکرت اور اردو کی
بیسیوں کتابیں کھنگال کر انھوں نے یہ کتابیں مرتب کی ہیں ۔ وہ
اپنی ایک کتاب کے شروع میں رقم طراز ہیں :

''جب سے گورنمنٹ کا رزولیوشن یہ پاس ہوا ہے کہ مدارس
سرکاری میں ایسے علم اخلاق کی کتابوں کا درس جاری
ہو جو کسی خاص مذہب و ملت سے مخصوص نہ ہوں

بلکہ عموماً کل مذاہب کے طلبہ اُن کو بہ خوشی پڑھ سکیں ، تو میں نے اس قسم کی تین کتابیں : تہذیب الاخلاق و مکارم الاخلاق و محاسن الاخلاق ، ہندوؤں اور مسلمانوں اور انگریزوں کی اعلیٰ درجے کی کتبِ اخلاق سے مضامین انتخاب کرکے تحریر کیں ، جن کے مضامین گیارہ سو نو ہیں اور اُن کے صفحے ۱۲۲۸ ہیں - ان کو چھاپ دیا ۔ بعد ازاں تین رسالے : تعلیم الاخلاق ، تعلیم الحصال ، تعلیم الانتظام لکھے ۔"
(تعلیم الاخلاق ، مطبوعہ مطبع چشمۂ فیض دہلی ، ۱۸۹۲ع (صفحہ ۱ ، ۲) -

آگے چل کر لکھتے ہیں :

"مجھے ان کتابوں کی تصنیف میں یہ خیال نہیں آیا کہ مدارس سرکاری کے اندر درس و تدریس میں وہ داخل ہو جائیں گی ۔ مجھے یقین ہے کہ ان کتابوں کو بہت سے طلبہ ، خواہ کسی مدرسے یا مکتب کے اور کسی مذہب کے ہوں ، ضرور مطالعہ کریں گے" ۔ (تعلیم الاخلاق مذکور ، صفحہ ۲) -

جیسا کہ مولوی ذکاء اللہ نے خود فرمایا ہے ، انھوں نے اخلاقیات پر سب سے پہلے جو تین کتابیں لکھیں ، ان میں سے پہلی "تہذیب الاخلاق" ہے جو ہندومت کی علم اخلاق کی کتابوں سے ماخوذ ہے ۔ دوسری کتاب "مکارم الاخلاق" ہے (جسے شائع کیا جا رہا ہے) یہ اخلاقیات پر اعلیٰ درجے کی اسلامی کتب سے ماخوذ ہے ۔ تیسری کتاب کا نام "محاسن الاخلاق" ہے ۔ یہ کتاب سب سے زیادہ ضخیم ہے اور اس کے دو حصے ہیں ۔ اس کا ماخذ انگریزی کتابیں ہیں ۔ مولوی ذکاء اللہ نے اپنے مقدمے میں ان

تینوں کتابوں کے مجموعے کو ایک کتاب ظاہر کیا ہے۔

مکارم الاخلاق کے ماخذ:

اس کتاب میں بہت سے اخلاقی مضامین ہیں جو عربی اور فارسی کی اعلیٰ درجے کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ ان ماخذ کی تعداد (۲۰) تو ایک اشتہار کے ذریعے (جو اسی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں درج ہے) معلوم ہو جاتی ہے لیکن نام نہیں ملتے۔ مضامین کی کثرت اور تنوع کے باعث ان ماخذ کا سراغ لگانا امر محال ہے۔ قرآن مجید کی مختلف آیات کے ترجمے سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر احادیث نبوی، اقوال صحابہ اور صوفیائے کرام کے ارشادات شروع ہو جاتے ہیں۔ شیخ سعدی کے اشعار بہ کثرت ملتے ہیں۔ عربی فارسی کے اشعار اور ضرب الامثال سے بھی مضامین اخلاق کو آراستہ کیا گیا ہے۔ اکثر مضامین کو متعدد مرتبہ عنوان بنایا گیا ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چونکہ ''مکارم الاخلاق'' بہت سی کتابوں سے ماخوذ ہے اس لیے اسے طبع زاد تصنیف کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ خود مولوی ذکاءاللہ نے بھی ''خاتمۃ الطبع'' میں اسے ترجمہ یا تالیف کا نام دیا ہے اور خود کو مولف کا درجہ دیا ہے۔

مکارم الاخلاق کے ماخذ اور مضامین کا تعارف اس کے ۱۸۹۱ع کے ایڈیشن میں اسی کتاب کے اشتہار کے ذریعے یوں کرایا گیا ہے:

''استہار مکارم الاخلاق

نہایت مستند و معتبر اعلیٰ درجے کی علم اخلاق کی بیس عربی فارسی کتابوں سے انتخاب کرکے ۲۳۶ مضامین اخلاق، گیارہ بابوں میں لکھے ہیں اور ایک باب میں دس مضامین متفرق لکھے ہیں۔

[illegible]ول سے خدا تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ

اور اُس کا فضل و کرم ، جو انسان پر ہے ، معلوم ہوتا ہے ۔ باب دوم سے تہذیب اخلاق کے اصول ۔ باب سوم سے علم و عمل و عقل کی کیفیت ۔ باب چہارم سے کھنے منے کا حال ۔ باب پنجم سے عشق و محبت ۔ باب ششم سے گناہ و توبہ کا حال ۔ باب ہفتم سے دنیا اور محبت دنیا کی کیفیات ۔ باب ہشتم سے معاملات دنیا کے حالات ۔ باب نہم سے رذائل و فضائل اخلاق ۔ باب دہم سے وقت ، عمر ، موت کا حال ۔ باب یازدہم سے حکایات ۔"

کتاب کی طباعت و اشاعت :

"مکارم الاخلاق" غالباً سب سے پہلے ۱۸۹۱ع میں طبع ہوئی اور اسی ایڈیشن کو ہم نے اپنے متن کی بنیاد بنایا ہے ۔ دوسری مرتبہ یہ کتاب ۱۸۹۳ع میں شائع ہوئی ۔ لیکن پہلے اور دوسرے ایڈیشن کے متن میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے ۔ البتہ پہلے ایڈیشن میں مولف نے بغیر عنوان کے جو چار صفحات کا مقدمہ کتاب کے شروع میں لکھا ہے ، وہ دوسرے ایڈیشن میں شامل نہیں ہے ۔ پہلے ایڈیشن میں کتاب کے آخر میں "فہرست مضامین" اور "صحت نامہ" بھی ہے جسے دوسرے ایڈیشن سے خارج کر دیا گیا ہے ۔ طبع اول کا متن بھی ۴۴۳ صفحات کا ہے اور طبع دوم کا بھی ۔ مولف نے طبع اول کے آخر میں ۶ جنوری ۱۸۹۱ع کو جو "خاتمہ الطبع" لکھا ، وہ طبع دوم (۱۸۹۳ع) میں اُسی تاریخ کے ساتھ موجود ہے ۔ طبع اول کے مہتمم حافظ عزیز الدین ہیں اور طبع دوم کے منشی عطاء اللہ ۔ طبع اول مطبع مرتضوی اور دوم شمس المطابع ۔

طبع اول و دوم کے متن میں جو مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے ، اس کی توجیہ یہ کی جا سکتی ہے کہ مولانا نے ۱۸۹۱ع میں حسب ضرورت کتاب چھپوا کر پتھر کی سلیں محفوظ کروا لی ہوں گی

جنھیں ۱۸۹۳ء میں دوبارہ استعمال کیا گیا ہو گا۔ مقدمہ اور فہرست وغیرہ دوسرے ایڈیشن میں کسی وجہ سے شامل نہ کیے جا سکے۔ خاتمۃ الطبع سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے خود ہی کتاب کی کاپیاں پڑھیں اور ان کی تصحیح کی۔ چھپنے کے بعد نظر ثانی کی تو 'صحت نامہ' بھی لگانا پڑا لیکن اس احتیاط کے باوجود کتاب میں کتابت کی اچھی خاصی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ میں نے حتی المقدور ان اغلاط کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور حواشی میں ان کی نشان دہی کر دی ہے۔ بعض قدیم الاملا الفاظ کے جدید املا کو میں نے ترجیح دی ہے لیکن قدیم املا کا حوالہ بھی حواشی میں دے دیا ہے۔ اصل کتاب میں توقیف نہ ہونے کے برابر تھی اور پارہ بندی نہیں کی گئی تھی۔ میں نے ان دونوں باتوں پر خاص طور پر توجہ دی ہے تاکہ قارئین کو کتاب کے مطالعے میں سہولت ہو۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کتاب کل کتنی مرتبہ طبع ہوئی۔ مولوی ذکاءاللہ کا بیان ہم اس سے پہلے درج کر چکے ہیں۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اسے نصاب تعلیم میں سامل کر لیا گیا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ کتاب متعدد بار شائع نہ ہوئی ہو۔ مولوی ذکاءاللہ نے اپنی بیشتر تصانیف خود ہی شائع کیں۔ یہ کتاب بھی انھوں نے خود ہی چھپوائی ہو گی۔

مقدمے کی تالیف اور کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں جن حضرات نے میری رہنمائی فرمائی، میں ان کا شکرگزار ہوں۔ خصوصاً سید عابد علی عابد صاحب، ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، کلب علی خان فائق صاحب، مولوی محمد اسماعیل پانی پتی صاحب، گوہر نوشاہی صاحب، سردار مسیح گل صاحب اور یونس جاوید صاحب کا ممنون ہوں کہ اگر ان حضرات کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو

شاید میں یہ کام اس خوبی سے نہ کر سکتا۔

مہتمم مطبوعات عبدالغفار احمد صاحب نے کتاب کی طباعت میں جو غیر معمولی دلچسپی لی ، اس کے لیے میں اُن کا ممنون ہوں۔

آخر میں میں جناب سید امتیاز علی تاج (ستارۂ امتیاز) ناظم مجلس ترقی ادب لاہور کا سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس اہم کام کا اہل سمجھا اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

احمد رضا

مجلس ترقی ادب ، لاہور

۷ - مارچ ۱۹۶۷ع

مکارم الاخلاق

از

شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی

*

مرتبہ

احمد رضا

نامہ[1] سیاہ محمد ذکاءاللہ ملقب بہ شمس العلماء، خان بہادر، ارباب علم کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ دنیا میں سچے، نیک، مفید خیالات کا مجموعہ ایسا ہے کہ جس نے بنی آدم کو تاریکی جہالت سے نکال کر روشن دماغ اور روشن ضمیر بنایا ہے اور وہ کسی سچے خیالات کے اثر کا مخالف و مزاحم نہیں ہے بلکہ اس مجموعے کے تمام خیالات کی اصل واحد ہے اور وہ باہم موافقت اور اتحاد رکھتے ہیں اور آپس میں کھٹ پٹ نہیں کرتے ہیں۔ ان کا حال مینہ کی بوندوں کا سا ہے کہ گو وہ جدا جدا برستی ہیں مگر سب آپس میں مل کر دریا میں ایک ہو جاتی ہیں، اور بڑی دھار کے چلانے میں مدد کرتی ہیں۔ اسی طرح یہ خیالات گو مختلف قوموں اور مذہبوں اور طریقوں کے ہیں، مگر وہ انسان کی تہذیب نفس و تکمیل عقل کے لیے یکساں اثر رکھتے ہیں، کسی خاص مذہب اور گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی ان کے پڑھنے سے معلوم ہو گی۔ ہر انسان، خواہ وہ کوئی مذہب اور طریقہ رکھتا ہو، ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

ہر ملک میں ایسے ارباب عقل و ہوش و نام ور و صاحب کمال

۱۔ مکارم الاخلاق طبع دوم مطبوعہ شمس المطابع دہلی ۱۸۹۳ع میں مولوی ذکاءاللہ کا یہ مقدمہ شامل نہیں ہے۔ طبع اول مطبوعہ مطبع مرتضوی ۱۸۹۱ع میں موجود ہے۔ مرتب

گزرے ہیں کہ انھوں نے پہلے خیالات کے خزانے میں اپنے نیک خیالات کا سرمایہ بڑھایا ہے ؛ اس طرح خیالات کا مخزن ہمیشہ بڑھتا رہا ہے اور بڑھتا رہے گا ۔ جیسے سمندر سے پانی کے بخارات اوپر جانے میں اپنی تلخی اور کھاری پن کو نیچے چھوڑ جاتے ہیں اور ستھرے میٹھے ہو کر صاف پانی کی جھڑی برسا کر ہم کو نہال کرتے ہیں ، ایسے ہی جب انسان کے نیک اور سچے خیالات بلند ہوتے ہیں تو وہ تمام حماقتوں کی کدورتوں سے الگ ہو کر نفیس ، لطیف ، لذیذ ہو جاتے ہیں اور انسان کے دل و دماغ پر اپنی جھڑی برسا کے ان میں دین و دنیا کی نیکیوں کی پود کو شاداب کرتے ہیں ۔ جیسے آتشی شیشے کے نقطۂ ماسکہ پر حرارت اور روشنی کے جمع ہونے کا اثر ہوتا ہے ، ایسا ہی دلوں کے منور کرنے میں ان نیک خیالات کا اثر ہوتا ہے ۔ جب تک کہ انسان کا دماغ دانائی کے خیالات کا مختصر مجموعہ نہیں بنتا ، وہ روشن دماغ اور روشن ضمیر نہیں ہو سکتا ۔

نیک سچے خیالات کیا ہیں ؟ سچی دولت کے خزانے ، آبِ حیات کے چشمے ، نور کے فرشتے ، جواہر کے حقے جن کی چمک کبھی ماند نہیں ہوتی ، خوش نما و معطر پھولوں کے گلدستے جن پر کبھی پژمردگی نہیں آتی ۔ خصائل و عادات انسانی کے سپر ، ساری قوموں کے حصن حصین ، دل و دماغ کے زیور ، علم و عمل کے بیجوں کی اصل ، تہذیب اخلاق کے سانچے ، انسان کو اشرف المخلوقات کے تخت پر بٹھانے والے ، سیرت و طینت و نیت کو پاک بنانے والے ۔ ان سے زیادہ عمدہ کوئی ورثہ زمانے کے ہاتھ سے انسان کو اب تک نہیں ملا ۔ نیک اور حق خیالات پر سیاہی کے قطرے بھی اعجاز کرتے ہیں ۔ جب وہ الفاظ کا لباس زیب تن کرکے ہوا میں اڑتے ہیں تو یہ قطرے اوس کی طرح پڑ کر ان کی صورت کو ایسا

پائدار کر دیتے ہیں کہ وہ ایسے ان مٹ ہو جاتے ہیں کہ جن کی مدتوں تک زمانہ زیارت کیا کرے اور ارباب خیال اپنے ذہن کو اُن سے پُر کیا کریں -

جب میں نے دیکھا کہ انسان کی تعلیم و تہذیب کی تکمیل جب تک نہیں ہوتی کہ اُس کا دماغ سچے ، حق خیالات کا مخزن نہ ہو تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ اپنی زبان میں اُن حالات کو بیان کروں - اس اپنے مطلب کے واسطے میں نے اُن مشہور کتابوں کا باغ اپنے ذہن کی آنکھوں کے روبرو لگایا کہ جن کے اندر ایسے خیالات بلند موجود تھے کہ جن کو زمانۂ دراز سے بے شمار آدمی پڑھتے چلے آتے ہیں ، اور معلوم نہیں کب تک پڑھتے چلے جائیں گے - جب یہ باغ مرتب ہو گیا تو میں نے اول اپنے ذہن سے کہا کہ تو اس باغ میں باغبان بن کے جا - جو پھول تجھ کو پسند آئیں ، اُن کو مع شاخ اور پتوں کے قلم کرکے اپنے تاگے سے باندھ کے اُن کا گلدستہ بنا دے (یعنی اصل خیالات کو انتخاب کرکے اپنی زبان میں نقل کر دے) - پھر میں نے اس سے کہا کہ اب تُو گل فروش بن کر اُس باغ میں جا اور اپنے پسند کے پھول توڑ اور اُن کا گہنا ، بدھی ، سہرا ، ہار ، گجرا بنا (یعنی خیالات کی کچھ صورت بدل) - بعد ازاں میں نے کہا کہ تُو شہد کی مکھی بن کے جا اور گلگشت کرکے پھولوں کا رس چوس اور اپنے معدے میں شہد بنا (یعنی خیالات کی ایسی نئی صورت بنا دے کہ کوئی پہچانے نہیں کہ پہلے ان کی کیا صورت تھی) - مگر مجھے معلوم نہیں کہ اُس نے شہد بنایا یا موم - اہل مذاق اس کو انگلی لگا کے زبان پر رکھیں - اگر اُن کو لذیذ معلوم ہو تو اس کی لذت اٹھائیں ، نہیں تھوک دیں -

ذہن نے مجھ سے یہ بھی فرمائش کی کہ اب مجھ کو مکڑی بن کر

جانے کی[1] اجازت دیجیے کہ میں اپنے معدے سے مادہ نکال کر جال پھیلاؤں۔ میں نے اسے منع کیا کہ جو جالا تو خود تنے گا وہ ہوا کے جھونکوں میں اڑ جائے گا۔ خود اس میں پھنس کر مردے کی طرح لٹکے گا۔ مکھیاں بھی معلوم نہیں اس میں پھنسا سکے گا یا نہیں (کوئی جال اپنا اصلی میں نے نہیں لکھا) ہاں میں نے ان خیالات کے باغ میں مضامین کی قلمیں تراشیں (یعنی پڑھا)، پھر ان کو ہضم کیا (دل بہلایا)، ان کا ذخیرہ اپنے حافظے میں ایک بلند مقام پر جمع کیا اور اس کی شیرینی کے ایسے مزے اڑائے کہ جس سے میری زندگی کی تلخیاں کم ہو گئیں۔ پس یہ ثمرہ مجھے اپنی ریاضت کا مل گیا۔ اسی پر قناعت کرتا ہوں، کچھ اور زیادہ طمع نہیں کرتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ میں نے ان خیالات کے بیج بتا دیے ہیں کہ جن سے اول خیال نئے خیالات کے کھیت کے کھیت ہرے بھرے، پھولے پھلے جتنے بڑے زرخیز چاہیں، لگائیں۔

میں نے اس کتاب میں مشرقی و مغربی خیالات کی دو تصویریں ایسی بنائی ہیں کہ پیٹھ سے پیٹھ لگائے بیٹھی ہیں؛ ایک مشرق کی طرف دیکھ رہی ہے، یعنی پیچھے کی طرف، اور دوسری مغرب کی طرف، یعنی آگے۔ یوں وہ دونوں اپنی صورتوں سے اگلے پچھلے خیالات کو بیان کر رہی ہیں۔ گو خیالات بہت سے اقسام کے ہو سکتے ہیں مگر میں کتاب کا آغاز ان خیالات سے شروع کرتا ہوں جو اخلاق کی تہذیب و تحسین سے متعلق ہیں، اور ان کے وہ اصول بیان کرتا ہوں کہ جن میں قانون قدرت اور سنت الٰہی کی طرح تبدیل اور تحویل نہیں۔ نہ کبھی زمانہ ان کو بدل سکا، نہ بدل

۱۔ طبع اول مطبوعہ مطبع مرتضوی دہلی، ۱۸۹۱ع میں ایک ''کی'' زائد ہے۔ مرتب

سکے گا۔ تہذیب اخلاق کے خیالات بداخلاق پر لعنت کرتے ہیں اور خوش اخلاق کی نخوت پر ملامت کرتے ہیں، اس لیے انسان کو بالطبع وہ ایسے ناگوار معلوم ہوتے ہیں، جیسے کہ عیب بتلانے والے آدمی؛ مگر جب تک اپنے بچپنے کی بے وقوفیوں کی جوانی میں اور جوانی کی شہوت پرستیوں کی بڑھاپے میں اصلاح نہیں کرتا، وہ پیرانہ سالی میں لڑکوں کا سا احمق اور جوانوں کا سا شہوت پرست رہتا ہے۔ اس لیے تہذیب نفس اور تزکیۂ قلب کے لیے ان خیالات کی تقدیم ضرور ہے۔

تہذیب اخلاق میں مذہب کو بڑا دخل ہے۔ ہر قوم کا اخلاق اس کے مذہب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ میں نے مذہب کو چھوڑ دیا اور نتیجے کو لے لیا، آم کھائے اور پیڑ نہیں گنے۔ اصل درختوں کو چھوڑ دیا، پھلوں کو لے لیا، یعنی احکام و عقائد مذہبی بیان کرکے دوزخ و بہشت کی راہ نہیں بتلائی؛ نہ کسی کو جنت میں بھیجا، نہ کسی کو دوزخ میں ڈالا، بلکہ بدیوں کی برائیاں اور نیکیوں کی خوبیاں بیان کیں اور یہ بتایا کہ من کی کٹلتا[1] دور ہونے سے اس سنسار میں آدمی کو کیا ہاتھ لگتا ہے۔

اس کتاب[2] کے پہلے حصے کا نام "تہذیب الاخلاق آریاء ہند" ہے۔ اس میں آریاء ہند، یعنی ہنود کی مقدس و معتبر و مستند کتابوں سے ایک سو اڑتیس مضمون انتخاب کرکے لکھے ہیں۔

---

۱ ۔ کٹلتا: کجی، ٹیڑھا پن، (ہلاٹ) ۔ مرتب

۲ ۔ مولوی ذکاءاللہ کی یہ کتاب جس کے تین حصوں کی الگ الگ ناموں سے انھوں نے نشان دہی فرمائی ہے، دراصل تین مستقل کتابیں ہیں اور علٰحدہ علٰحدہ چھپی ہیں۔ ان کی تفصیل مرتب کے مقدمے میں ملاحظہ فرمائیے ۔ مرتب

دوسرے حصے کا نام "مکارم الاخلاق" ہے - اُس میں مضامین مسلمانوں کی کتابوں سے انتخاب کرکے لکھے ہیں -

تیسرے حصے کا نام "محاسن الاخلاق" ہے - اُس میں مضامین اہل فرنگ کی کتابوں سے اخذ کرکے لکھے ہیں - ہر حصے کے آخر میں ضمیمے لکھے ہیں جس میں متفرق مضامین ہیں ہر حصے علاحدہ علاحدہ ہیں ، کچھ ایک دوسرے پر موقوف نہیں ، اور وہ ایک مجموعے میں بھی شامل ہیں - مضامین کے بزرگ مصنفوں[1] کا نام بھی میں نے اول لکھ دیا ہے جس سے مضامین کی عظمت ہو - جب تک لوگ مضمون کے مصنف کو نہیں جانتے ، اس کی قدر و منزلت نہیں کرتے - اس میں تو شبہ نہیں کہ خیالات ایسے مقدس بزرگوں کے ہیں کہ وہ لوگوں کے دلوں پر تاثیر ضرور کریں گے ، مگر کلام اس میں ہے کہ میں نے بھی اُن کا حق اپنی زبان میں ادا کیا یا نہیں - میں نے خواہ حق ادا کیا ہو یا نہ کیا ہو ، مگر طالب العلموں کو اُن مضامین کے پڑھنے سے یہ ایک نئی طرح کی بصیرت حاصل ہوگی کہ ہزاروں تشبیہات و استعارات و تمثیلات و محاورات مشرق و مغربی زبانوں کے ایسے معلوم ہوں گے جو پہلے کبھی اُن کے کانوں نے نہ سنے ہوں گے - اور مشرقی و مغربی خیالات اور طرز ادا پر علم ہوگا - وہ اُن کے ازدواج سے عمدہ اولاد مضامین کی پیدا کر سکتے ہیں ، کیوں کہ قاعدہ ہے کہ مختلف نسلوں کے اختلاط سے اچھی اولاد پیدا ہوتی ہے - فقط

---

۱ - زیر ترتیب کتاب (مکارم الاخلاق) سے مولانا کے اس قول کی تصدیق نہیں ہوتی - طبع اول و دوم میں کہیں مکارم الاخلاق کے مآخذ کے مصنفین کی فہرست نہیں ملتی - مرتب

باب اول

خدا تعالیٰ[1]

۱ - خدا کی تعریف

خدا تعالیٰ اپنی ذات میں اکیلا ہے ، کوئی اُس کا شریک نہیں - یکتا ہے ، کوئی اُس جیسا نہیں ؛ صمد ہے ، کوئی اُس کا مقابل نہیں ؛ قدیم ازلی ہے ، جس کی اول و ابتدا نہیں ؛ ابدی ہے جس کی آخر و انتہا نہیں ؛ قیوم ہے جس کا انقطاع نہیں ؛ دائم ہے جس کو کبھی فنا نہیں ؛ ہمیشہ سے ہے ، ہمیشہ رہے گا - وہی اول ہے ، وہی آخر ہے ، وہی مبداء ہے ، وہی معاد ہے ؛ وہی ظاہر ہے ، وہی باطن ہے -

خدا کی نہ صورت ہے ، نہ جسم ہے ، نہ اجسام کے مشابہ ہے ؛ نہ وہ کسی موجود کے مشابہ ہے ، نہ کوئی موجود اُس کے مشابہ ہے - وہ ہر موجود چیز کے قریب ہے - وہ مکان و زمان بننے سے پیش تر موجود تھا - وہ اب بھی ویسا ہی ہے ، جیسا کہ پہلے تھا - وہ بدلنے اور انتقال سے پاک ہے - فنا اور زوال سے اُس کی ذات منزہ ہے - اپنی صفات کے کمال میں کامل ہونے کے لیے کسی زیادتی کی اُس کو حاجت نہیں - خدا تعالیٰ زندہ ، قادر ، جبار ،

۱- نسخۂ اول میں 'خدا تعالیٰ' کے ساتھ 'باب اول' ، اوپر جلی لفظوں میں 'مکارم‌الاخلاق' اور اس سے اوپر 'بسم اللہ الرحمن الرحیم' لکھا تھا - مناسب ترمیم کی گئی - مرتب

قاہر ہے ۔ نہ اُس کو ماندگی عارض ہو ، نہ قصور ، نہ غفلت ہو ، نہ خوف ؛ نہ فنا اُس پر آوے ، نہ موت ۔ مخلوقات ساری اُس کی مٹھی میں ہے ۔ پیدا کرنے اور اختراع میں وہ نرالا ہے ۔ ایجاد و ابداع میں وہی یکتا ہے ۔ خلق کو اور اس کے اعمال اور اقوال کو پیدا کیا ۔ کوئی قدرت کی چیز اُس کے قبضے سے جدا نہیں ۔ اُس کی قدرت اور اُس کی معلومات بے انتہا ہے ۔ خدا تعالیٰ سب معلومات کو جانتا ہے ۔ زمین کے ذروں سے لے کر آسمانوں کے اوپر تک جو کچھ ہوتا ہے ، سب پر اُس کا علم موجود ہے ۔ آسمان و زمین میں ایک ذرہ بھی اُس کے علم سے چھپ نہیں سکتا ۔ کالی رات میں سخت پتھر پر چیونٹی[1] کے رینگنے کو ، اور ہوا کے بیچ میں ذرے کے چلنے کو جانتا ہے ۔ چھپی اور کھلی بات کو معلوم کر لیتا ہے ۔ دلوں کے وسوسوں اور خطروں کی حرکات کو اور باطن کے پوشیدہ اسرار پر مطلع ہوتا ہے ۔ اس کا علم قدیم ، ازلی ہے ۔

خدا تعالیٰ نے کائنات کو اپنے ارادے سے بنایا ۔ جس چیز کو چاہا ، وہ ہوئی اور جس کو نہ چاہا ، وہ نہ ہوئی ۔ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے ؛ کوئی اُس کے حکم کا روکنے والا نہیں ، کوئی اُس کی قضا کا پیچھے ہٹانے والا نہیں ۔ جن وقتوں میں جن چیزوں کے ہونے کو اپنے ارادۂ ازلی میں مقرر فرمایا ، وہ اُنھی وقتوں میں بے تقدیم و تاخیر کے موجود ہوئیں ۔ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہے ؛ سنتا ہے ، دیکھتا ہے ۔ کوئی سننے کی چیز کیسی ہی خفیہ ہو اور دیکھنے کی چیز کیسی ہی باریک ہو ، اُس کے سننے اور دیکھنے سے بچ نہیں سکتی ۔ نہ دوری اُس کے سننے کو مانع ہو ،

---

۱ ۔ نسخۂ اول میں 'چینٹی' قدیم املا ہے ۔ مرتب

نہ تاریکی اُس کے دیکھنے کو مزاحم - دیکھتا ہے مگر حدقۂ چشم اور پلک سے منزہ ہے - سنتا ہے مگر کانوں اور اُن کے سوراخ سے مبرا ہے- خدا کی ذات اور صفات ہماری سی نہیں کہ علم کے لیے دل و دماغ ہو ، گرفت کے واسطے اعضا ہوں ، پیدا کرنے کے لیے آلات و اسباب ہوں -

جو چیز سواء اُس کے موجود ہے ، وہ اُسی کے فعل سے حادث ہے اور اُسی کے عدل سے فیض یاب ہے - اور اکمل اور اتم اور اعدل طور پر اُسی کا ظہور ہوا ہے ، اور وہ اپنے افعال میں حکیم اور اپنے احکام میں عادل ہے - اُس نے اپنی قدرت سے انسان ، حیوان ، زمین ، آسمان ، جمادات ، نباتات ، جوہر ، عرض ، مدرک ، محسوس ، سب عدم سے اختراع کیے ؛ پردۂ نیستی سے نکل کر ہست فرمایا ، کیوں کہ ازل میں وہ اکیلا موجود تھا ، دوسرا کوئی اُس کے ساتھ نہ تھا - اُس نے اپنے فضل سے خلق کو موجود کیا ، اُس کو خلق کی طرف کوئی حاجت نہیں تھی ، نہ اُس پر یہ کام کرنے واجب تھے - انعام اور اصلاح میں وہ صرف اپنی جود کو کام میں لاتا ہے ، نہ اس طور سے کہ اُس کے ذمے لازم ہو - فضل و احسان ، نعمت و منت سب اُسی کے لیے سزاوار ہے -

۲ - خدا کی رحمت

خدا تعالیٰ نے ہمارے ہی لیے ساری چیزیں بنائی ہیں - وہی ہماری حفاظت کرتا ہے ، وہی ہم کو روزی دیتا ہے ؛ دشمنوں سے بچاتا ہے ، موذیوں سے پناہ میں رکھتا ہے ؛ مصیبت کے وقت کام آتا ہے ، درد کی حالت میں ہم پر رحمت بھیجتا ہے - جو کچھ ہم کو ضرورت ہوتی ہے ، پیش از سوال اُس کو رفع کر دیتا ہے - دکھ رنج کو ٹال دیتا ہے - انسان اپنے تئیں اشرف المخلوقات کہتا

ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں خدا کے[1] اخلاق کی پیروی کرتا ہوں مگر وہ بڑا ہی ظلم کرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض و خفا ہوتا ہے، اوروں کو تکلیف پہنچاتا ہے، اوروں کی خطاؤں اور قصوروں کے معاف کرنے میں دریغ کرتا ہے، مگر خدا ہماری نافرمانیوں اور گناہوں سے چشم پوشی کرتا ہے۔ ہر وقت ہمارے اوپر نظرِ رحم رکھتا ہے، ہم پر ماں باپ سے زیادہ شفقت کرتا ہے۔

۳ ۔ خدا کی عظمت

اگر تم خدا کی عظمت کا دیدار دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے آئینۂ دل کو بدی کے زنگ و رنگ سے صیقل کرو۔ صیقل کرنا یہی ہے کہ خدا کی محبت دل میں کرو۔ اگر تم اس آئینۂ دل کو کژ[2] کرو گے یا روشن نہ رکھو گے تو تمھارا حال نور آفتاب اور بوم و خفاش کا سا ہوگا کہ اپنے ضعفِ چشم کے سبب سے وہ اس نور کو نہیں دیکھ سکتے۔ تو آفتاب ایسا روشن ہے لیکن سحاب کے حجاب ہونے سے وہ سیاہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

ایسے ہی دل پر بری عادتوں اور حرصوں کا پردہ پڑا ہوا ہے جس نے اس کی روشنی کو روک دیا ہے۔ کبھی حق، باطل سے علاحدہ نہیں ہوتا۔ حجر[3] کو آئینہ بنا کر، اگر برہنہ یا یوسف رو منہ دیکھے تو کیا معلوم ہو۔ پس آئینۂ دل ہی کی جلا تم کو خدا کی عظمت دکھائے گی۔ اس عظمت کے دیکھنے کے واسطے ایک نردبان پر چڑھنا پڑتا ہے جس کے پائے[4] علم و عمل ہیں۔ پھر علم کے ساتھ حلم ضرور ہے کیوں کہ علم بے حلم شمعِ بے نور ہے۔

---

۱ ۔ نسخۂ اول میں 'کی' ہے۔ ۲۔ کژ: کج ۔ ۳۔ اصل میں 'حجر' ہے۔
۴ ۔ اصل میں 'پایہ' غلط ہے۔ مرتب

لیکن آدمی نے تو کاہلی اختیار کر رکھی ہے - کاہلی کی برابر کوئی بری چیز نہیں - وہ رستم کو بھی حیز[1] بنا دیتی ہے - جو دن کو بےکار رہتا ہے اور رات کو تن آسانی کرتا ہے ، اُس کو کچھ حاصل نہیں ہوتا -

بادشاہوں کو ملکوں کے لینے کے لیے تو دستۂ گرز اور قبضۂ شمشیر کی ضرورت ہے ؛ وہ بے حلم و محنت، کب حاصل ہوسکتے ہیں - ایسے ہی جب تک آدمی علم کو حلم و محنت کے ساتھ کام میں نہیں لائے گا ، خدا کی عظمت و تنزیہ و تقدیس کے دیدار سے محروم رہے گا - لوہا جو تیرہ ہوتا ہے ، وہ صیقل کرنے سے آئینہ بن جاتا ہے اور عیب و صواب دکھاتا ہے ؛ دل کیوں صیقل کرنے سے منور نہ ہوگا اور خدا کی عظمت کا دیدار نہ دکھائے گا ؟

۴ - خدا کا لطف و قہر

دین دار خدا کے لطف کے شاکر ہوتے ہیں ، کفار اُس کے قہر کے شاکی - اُسی کے لطف سے جنوں کو آرام پہنچتا ہے ، اُسی کے قہر سے جادوں میں آگ لگتی ہے - اُسی کے لطف سے بندے کو سرور حاصل ہوتا ہے ، اُسی کے قہر سے مرد کو غرور ہوتا ہے ، اُسی کے قہر سے نازنین مردہ ہو جاتے ہیں - اُس کے لطف سے بے نوا زندہ ، اُس کا لطف مردہ کو زندہ اور قہر زندہ کو مردہ بناتا ہے - اُس کا قہر باسے کو پشہ بناتا ہے ، بادشاہوں کو خاک میں ملاتا ہے ، گردن کشوں کی گردن اُڑاتا ہے ، سرکشوں کے منہ میں لگام دیتا ہے - اُس کا لطف ضعیفوں کو قوی کرتا ہے - اس کا عفو گنہ پر سبقت کرتا ہے ، تائب گناہ گار کو پناہ دیتا ہے - گناہ‌گاروں کا وہ پردہ دار ہے ، ہماری طرح پردہ در نہیں - وہ ہمارا حافظ ہے

---

۱ - حیز : مخنث - مرتب

مگر ہم بے عقل و ظالم و جاہل اُس سے غافل ہیں - ہم اپنے اوپر ایسے مہربان نہیں ، جیسا وہ ہم پر مہربان ہے - وہ ہمارے ساتھ لطف و[1] مہربانی کرتا ہے جو ماں فرزندوں کے ساتھ نہیں کرتی - وہ نا کسوں کو اپنی مہربانی سے لائق بنا دیتا ہے - وہ عالم الغیب ہمارے عیب چھپاتا ہے ، اپنی عفو سے اُن کو دھوتا ہے - ہمارے کام برے ، اُس کے کام بھلے ہیں - وہ غیب داں ، ہم عیب دار - اگر اُس کی عنایتِ پاک ہم پر نہ ہوتی تو یہ انسان مشت خاک تاج دار کیسے ہوتا - گناہ کے جنگل میں اُسی کی عفو کی منزل ہے - ہم جفا کرتے ہیں وہ وفا کرتا ہے - ہم اپنے ساتھ ایسے وفادار نہیں جیسا وہ ہمارے ساتھ ہے - اُسی کا لطف ہم بے کسوں کی دست گیری کرتا ہے -

۵ - خدا کی قدرت

جو عاقل ہیں ، وہ خدا کی قدرتِ بالغہ اور حکمتِ کاملہ ان کاموں سے سمجھتے ہیں کہ اُس نے زمین کو بچھونا بنایا ، اُس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑیں کہ زلزلوں کے صدموں سے وہ پراگندہ نہ ہو - اُس پر آسمان کو بنایا ، اُس میں قمر کا نور ، شب افروز کیا اور آفتاب کا چراغ روشن کیا - اُس سے دن کو اجالا دیا ، یوں رات دن کو بنایا - وہ متواتر ایک دوسرے کے بعد آتے جاتے رہتے ہیں - رات کو ہمارا لباس بنایا ، دن کو ہماری معاش کے لیے بنایا - پھر ہم کو جوڑے جوڑے بنایا - نیند بنائی جس سے ہماری ماندگی رفع ہو - بادل پانی سے بھرے ہوئے بنائے جن سے پانی کے ریلے زمین پر اترتے ہیں اور مردہ زمین کو زندہ کرتے ہیں اور سبزہ اور اناج اُگاتے ہیں ، باغوں کو سبز پتوں کا لباس

---

۱ - اصل میں واؤ نہیں ہے - مرتب

اڑھاتے ہیں - سب قسم کے جانور زمین پر پھیلائے - دریا پر کشتی کو چلایا جو اُن چیزوں کو لے کر چلتی ہے جس سے آدمیوں کو فائدہ ہوتا ہے - ہوا کو آسمان و[1] زمین کے درمیان چلایا - اب تم دیکھو! پانی جس کو تم پیتے ہو ، تم نے اُس کو بادل سے اُتارا ہے یا خدا نے ؟ آگ جو سلگاتے ہو، اُس کا درخت کیا تم نے لگایا ہے یا خدا نے ؟ موت جو بنائی ہے ، وہ تم نے بنائی ہے یا خدا نے ؟ تمھارے بدلے کے جو آدمی پیدا ہوتے رہتے ہیں ، تم پیدا کرتے ہو یا خدا ؟ جو تم بوتے ہو ، اُس کو تم اُگاتے ہو یا خدا ؟

یہ خدا کو اختیار ہے کہ تمھاری کھیتی کو ملیامیٹ کر دے اور تم یوں ہی دیکھتے رہو - یہ ساری نشانیاں خدا کی ہیں - جس شخص کو ادنیٰ شعور بھی ہے ، وہ ان زمین و آسمان کی عجائب مخلوقات الٰہی میں اپنی نظر کو گردش دے اور حیوانات اور نباتات کی پیدائش نادرہ دیکھے ، تو جان لےگا کہ اس کارخانۂ عجیب و غریب اور اس ترتیبِ محکم کا بنانے والا ضرور ہے ، جو اُس کو منتظم و محکم رکھتا ہے اور وقتاً فوقتاً ان کو مقدر کرتا ہے اور تدبیر سے بدلتا رہتا ہے - انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کو مانے -

وہ کارگر ہے ، ہم آلۂ کار ہیں - اُسی کے سبب سے یہ سب چین و آرام عالم میں ہیں - درخت کو وہی ہلاتا ہے ، نہ ہوا - وہی تشنہ کی تشنگی دور کرتا ہے ، نہ پانی - وہی مستوں کو خوش کرتا ہے ، نہ شراب - اُس کے بغیر نہ غنچہ باغ میں کھلے ، نہ میوہ شاخ میں لگے - تجھے چاہیے کہ اپنے دل کو سب خیالات سے سادہ بنا اور سینے کو سب چیزوں سے دھو ڈال ، جس سے تجھے

---

۱ - اصل میں واؤ نہیں ہے - مرتب

کمج بقا ہاتھ لگے اور اُس کے روے دل آرا کا پرتو پڑے - وہ ہو ظاہر ہے مگر تو ہی کور بصر ہے - وہ حاضر ہے مگر تو ہی دور نگر ہے - اگر اُس کا نور نہ ہو تو تیری چشم بینا اور دلِ دانا کسی کام کا نہیں - تو اُسی کے تخم محبت کو دل میں بو ، اُسی کے[1] ابرِ عنایت سے اپنی کِل پر پانی ڈال ، اُسی کے[1] کاشانۂ قربت میں قدم رکھ ، اُسی کے میخانۂ وحدت سے شراب پی -

۹ - خدا کا رزق پہنچانا

ابھی ہمارا وجود ظاہر نہ ہوا تھا ، رحمِ مادر ہی میں موجود تھے کہ حکیم نے چوں سے ہمارا رزق خون سے مقرر کر دیا - جب دو مہینے گذر گئے تو یہ رزق کا دروازہ بند کر دیا اور پستان کے دو چشمے رواں ہمارے لیے کھول دیے - جب اس پر دو برس گذر گئے تو یہ دو دروازے رزق کے بند کر دے اور دو ہاتھ اور دو پاؤں دے دے کہ جن میں سے ایک سے رزق کی طرف جائیں اور دوسرے سے رزق کو لے لیں - جب اجل آئی تو یہ چاروں ہاتھ پاؤں کے در ہوئے ، لحد میں وہ چاروں بند ہوئے ، تو یہ رزق کے چاروں دروازے چھوڑ دیے - بہشت کے آٹھ دروازے رزق کے لیے کھول دیے - خدا بھی کیا رزاق ہے اور کس کس حکمت سے رزق پہنچاتا ہے ! جانوروں کے آگے دسترخوان بچھا رکھا ہے اور اتنا کھانا اس پر چنا ہے کہ وہ کھا نہیں سکتے - سب کو روز روزی پہنچاتا ہے - اس کے انبار خانے پر مہر نہیں لگی ہوئی ، ہر ایک اس سے اپنی روزی لے لیتا ہے - خواہ کافر ہو یا مومن ، یا سعید ہو یا شقی ، وہ سب کو روزی اور حیات دیتا ہے - ابھی حلق سے حاجت نہیں نکلنے پاتی کہ اُس کی جیمِ جود ، روزی خلق کو

---

۱ - نسخۂ اول میں دونوں جگہ 'کی' ہے - مرتب

دے دیتی ہے۔ غرض نان و جان اُس کے خزانے سے ہم کو ملتی ہے۔ ہماری روزی اگر ملک چین میں ہو تو وہاں ہمارا کسب کا اسب زین کسے کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی ہم رزق کے پاس جاتے ہیں ؛ اگر ہم اُس پاس نہیں پہنچ سکتے تو وہ ہمارے پاس شتاب آ جاتا ہے، خواہ ہم خواب میں پڑے سوتے ہی کیوں نہ ہوں۔

خدا جان بے نان کے کسی کو نہیں دیتا اس لیے کہ جان کا قیام نان پر موقوف ہے۔ روزی کا خوف وہ سفلے کرتے ہیں جو خدا پر بھروسا نہیں کرتے۔ خدا تجھ کو روزی دے گا، تو کیوں امیر اور وزیر سے لڑائی لڑتا ہے۔ خدا کے دروازے سے تیری روزی ملتی ہے، تو کیوں اس کے لیے حلق و زبان و دندان سے فریاد کرتا ہے۔ تجھ کو خدا پر اعتماد چاہیے۔ اگر ایک سال مینہ نہیں برستا تو تو خستہ حال و پریشان ہوتا ہے۔

ایک بڑھیا نے پردے سے سر نکال کر جو اپنے کھیت کو خشک دیکھا تو کہا ''اے خدا رزق! تیرے ہاتھ ہے، کچھ گریۂ ابر اور خندۂ کشت پر موقوف نہیں ہے۔ میں تجھ کو جانتی ہوں کہ بے سبب رزق دیتا ہے۔ جان و نان میری تیرے ہی اختیار میں ہے۔ تیرا ایک اَوروں کے ہزاروں اور لاکھوں سے زیادہ ہے۔ تیرا تھوڑا تھوڑا نہیں ہے۔ تیرا ایک شعلہ ہزار ستاروں سے بڑھ کر ہے۔ تیرا ایک قطرہ صد ہزار دریا سے زیادہ ہے'' بس مرد ہو کر اس عورت سے کم تر ہو کر روزی کا غم نہ کھا۔ تجھے اس کا یقین کرنا چاہیے کہ خدا رزق دے گا۔ خدا وہ مکرم اور با احسان ہے کہ وہ گبر و مسلمان کے ساتھ یکساں کرم کرتا ہے۔ خدا ہی کے ساتھ دل لگانے سے تو غم کی بند سے آزاد ہوگا۔ خدا ہی کو یار بنا اور خلق کو شمار میں نہ لا۔ اگر تو راہ نیاز سے خبردار نہیں تو مغز پیاز کی طرح حجاب میں ہے۔ جب تک تیری

جان ہے ، مال تیرے ساتھ ہے -

ایک حدا پرست عورت کا خاوند حج کرنے چلا گیا تو لوگوں نے بڑی دل سوزی سے اُس عورت سے پوچھا کہ خاوند تیرا دیا تیرے لیے نقد چھوڑ گیا ہے ؟ اُس نے کہا ''جو کچھ چھوڑ گیا ہے میں اُس سے راضی ہوں ، جتنا میرا رزق ہے وہ میرے پاس ہے'' - اُس سے پھر لوگوں نے پوچھا کہ کتنا تیرا رزق تیرے پاس ہے جو تو قانع و خرسند اُس پر ہے ؟ اُس نے کہا کہ جتنی میری عمر باقی ہے اتنا رزق خاوند مجھے دے گیا ہے - لوگوں نے کہا '' اُس کو تیری عمر کی خبر کیا تھی کہ اتنے دنوں جیے گی کہ اُس کے موافق تیرا رزق دے گیا ہے ؟' اُس نے کہا کہ میرا روزی دینے والا جانتا ہے کہ جب تک میری جان ہے ، وہ میرا رزق بند کرے گا - لوگوں نے کہا کہ خدا تو بے سبب رزق نہیں دیتا - جیسے بید بن سے رطب نہیں دیتا - کوئی ظاہری[1] سبیل تیرے رزق کی نہیں ہے تو خدا تیرے پاس کوئی زنبیل نہیں بھیج دے گا - اس عورت نے کہا کہ تمھاری کیا عقل تیرہ ہے ؟ اُس کو زنبیل کی حاجت کیا ہے جس کے پاس زمین کثیر و قلیل ہو ، آسمان و زمین اُس کے پاس ہوں - جو کچھ وہ چاہتا ہے لوگوں کے پاس پہنچا دیتا ہے ؛ کبھی زیادہ کر دیتا ہے ، کبھی کم کر دیتا ہے ، بس خدا پر توکل چاہیے -

۷ - خدا سب کے دلوں سے آگاہ ہے

خدا نے تیرا دل پیدا کیا ہے - جو کچھ اُس میں ہے ، وہ جانتا ہے - اگر تو یہ جانے کہ میرے دل سے خدا آگاہ ہے تو پھر کاہے کو تیری طبیعت گدھے کی طرح کیچڑ میں پھنسی رہے -

---

۱ - اصل میں 'ظاہر ہی' غلط ہے - مرتب

بدکرداری سے تو ضرور منہ پھیر لے۔ ہاں خدا کا حلم تجھے مغرور بناتا ہے، تیرے دل میں انار بجائے نور کے پیدا کرتا ہے۔ اگر تو اُس کے علم کو نہیں دیکھا تو حلم سے اُس کے کچھ طمع نہ رکھ۔ علم اُس کا عقل کا چراغ روشن کرتا ہے، حلم اُس کا انسان کو گناہ سکھاتا ہے۔ اگر اس کا حلم پناہ نہ ہوتا تو انسان کا کیا زہرہ تھا نہ گناہ کرتا۔ وہ اپنی خلق کی مصلحت کو جانتا ہے۔ جو ضمیر میں تیرے راز آیا نہیں، اُس نے جانا نہیں۔ ابھی لفظ تیرے منہ سے نہیں نکلا کہ وہ اُس کو جان جاتا ہے۔ جو تیرے دل میں کہنے کا ارادہ ہے، خدا رازدار اور رازداں تیرا ہے۔ اگر چیونٹی[۱] اندھیری رات میں پتھر پر چلے تو وہ اُس سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ قعرِ آب میں اگر پتھر ہلے تو اندھیری رات میں اُس کو دیکھ لیتا ہے۔ اگر پتھر کے اندر ذرا سا بھی چھوٹا کیڑا ہو تو اُس کے راز پنہانی کو وہ جان جاتا ہے۔ تو ہمیشہ اپنے تمام کام یہ سمجھ کر کر کہ خدا ضمائر سے مدام آگاہ ہے۔ وہ ہم حاجت نہیں رکھتے تھے جو اُس نے ہمارے لیے آراستہ کر دیا۔ جب تو گناہ کرتا ہے تو دو حال سے خالی نہیں؛ کیا تو یہ جانتا ہے کہ خدا اُس کو نہیں جانتا؛ تو کافر مطلق ہے اور اگر یہ جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے تو بڑا شوخ، گستاخ، بیہودہ و فرومایہ ہے۔ بس تجھ کو اپنے افعال شنیع سے توبہ کرنی چاہیے تا کہ خدا کے آگے تجھے خجالت کے دریا میں ڈوبنا نہ پڑے۔

۸ - خدا کی راہ میں حال لڑکے کا سا بنانا چاہیے

خدا کی راہ میں بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے تئیں

---

۱ - اصل میں 'چینوٹی' ہے۔ اس سے پہلے 'چیونٹی' آ چکا ہے۔ موجودہ املا کو ترجیح دی گئی۔ مرتب

لڑکا سانے ۔ جب لڑکا پڑھنے میں تقصیر کرتا ہے ، تو اول لطف و نوازش سے اُس کو سمجھاتے ہیں ۔ اُس کے پاس سودے اور مٹھائی لاتے ہیں تاکہ وہ راضی ہو جائے ، کوئی جفا اُس پر نہیں کرتے ہیں ۔ لیکن جب وہ اس طرح نہیں پڑھتا تو پھر اُس کی پیٹھ ہوتی ہے اور تسمہ ، کان اینٹھے جاتے ہیں ، اُستاد سے تہدید کے لیے کہا جاتا ہے ، گوشمالی کی تاکید ہوتی ہے ۔ اگر اس پر نہیں مانتا تو موش‌خانہ میں بند کیا جاتا ہے جہاں موش اُس کا گو کھرے ہیں ۔ بس آدمی کو چاہیے کہ پہلے خدا کی راہ میں اپنے نفس سمجھائے کہ اُس کی عبادت سے بہشت ملے گی ۔ اور اگر یوں نہ مانے تو پھر دوزخ کے موش‌خانہ سے ڈرانا چاہیے ۔ تجھے چاہیے کہ انبیا کی کتابوں میں سے کچھ پڑھا کر تاکہ تیری جہالت دور ہو ۔ اس جہان خراب اور پر ضرر میں جہالت سے بدتر کوئی چیز نہیں ہے ۔

۹ ۔ خدا کی عبادت

عبادت الٰہی اسے کہتے ہیں کہ خدا کی عظمت کے آگے اپنی فروتنی اور بندگی کو ظاہر کرے ۔ سارا دل اُس کی ہیبت اور سطوت سے بھرا ہو اور تمام ہوائے نفسانی اور دنیا کی محبت کے خیال سے اور اپنے تصور سے خالی ہو ۔ عبادت کے بھی اجزا ایسے ہیں جیسے انسان کے اعضاء ۔ آدمی کے بعض اعضاء ایسے ہیں کہ جن کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا ؛ جیسے کہ دل ، جگر ، دماغ ۔ بعض اعضا ایسے ہیں کہ اُن کے نہ ہونے سے زندگی تو نہیں جاتی مگر مقصود زندگی فوت ہو جاتے ہیں ؛ جیسے آنکھ ، ہاتھ ، پاؤں ۔ بعض اعضا ایسے ہیں کہ جن کے نہ ہونے سے نہ جان جائے ، نہ مقصود زندگی فوت ہو مگر خوب صورتی جاتی رہتی ہے ؛ جیسے کہ بھویں ، ڈاڑھی ، پلکیں ، رنگ کی خوبی ۔ بعض ایسے

ہیں کہ اصل خوب صورتی نہیں جاتی مگر خوب صورتی کا کمال جاتا رہتا ہے ، جیسے بھووں کا خم دار نہ ہونا ، پلکوں کا سیاہ نہ ہونا ، اعضا میں تناسب کا نہ ہونا ، رنگ کا سرخ و سفید نہ ہونا۔ عبادت کے لیے اعضائے ظاہری کی حرکات ضرور ہیں۔ بس عبادت کا جزو اعظم سجدہ ہے جو بہ منزلہ دل و جگر و دماغ کے ہے۔ سجدہ یہ بتاتا ہے کہ سر جو تمام اعضاء میں اونچا ہے ، وہ نیچے جھک کر دل کو عاجزی و فروتنی پر متنبہ کرتا ہے ، اور اعضاء کی حرکات ظاہری جو تعظیم و آداب کے اظہار کے لیے ہوتی ہیں ، وہ بہ منزلہ اور اعضاء کے ہیں۔ عبادت کی جان بھی ایسی ہے جیسے انسان کی روح۔ وہ کیا ہے ؟ خصوع و خشوع و حضوریِ قلب۔ حضوریِ قلب سے ہماری مراد یہ ہے کہ جس کام کو آدمی کر رہا ہو ، یا جس کلام کو بول رہا ہو ، اس کے سوائے دوسری چیز سے دل فارغ ہو۔ بس عبادت میں حضوریِ قلب سے یہ مطلب ہے کہ دل سر تا پا اس میں محو ہو۔ خدا کی یاد ، اس کی عظمت و جاہ و جلال بالکل دل کو گھیرے ہوئے ہوں ، اور اس سے اپنے نفس کی حقارت[1] پیدا ہو ، جس سے خشوع و خضوع پیدا ہو۔

جب تک خدا تعالیٰ کے جلال کی معرفت سے نفس کی حقارت نہ ہوگی ، معرفت نہیں پیدا ہوگی ، خدا کی تعظیم کی اور اس کے آگے بندگی کی حالت منتظم نہیں ہوگی۔ جب تک دل میں یہ یقین نہیں پیدا ہو کہ خدا نے جو وعدے وعید کیے ہیں ، وہ سچے ہیں اور ان کے موافق ہم کو عذاب ثواب ہوگا ، خدا کے لطف و کرم و رحم کے ایسے بڑے حقوق مجھ پر ہیں کہ میں اپنے نفس کی برائیوں کے سبب سے ان کی بجاآوری سے عاجز ہوں

---

۱ - حقارت بہ معنی تحقیر - مرتب

اور اس کی بندگی نہ کرنے سے مجھے کہاں شرمندگی ہے ، خدا کی عظمت ہمت ، اپنے نفس کی حقارت ، خوف و رجائے نفس ، حیا ، یہ سب باتیں دل میں جمع نہ ہوں ، خدا کی سچی عبادت نہیں ہوسکتی -

عبادت تین طرح کی ہو سکتی ہے :

ایک سچے خدا کی سچی عبادت ، دوم[1] جھوٹی عبادت ، سوم جھوٹے خدا کی سچی عبادت - ہم خدا کی سچی عبادت کا صرف بیان کرتے ہیں -

جو عابد پاک ہوتے ہیں ، وہ صبح کو جہاں آفتاب نے مصلیٰ نور کا بچھایا ، محراب کی طرف دوڑتے ہیں - اور چمگادڑ چور کی طرح منہ چھپا کے خواب میں آرام نہیں کرتے ، خاک پر سر رکھ کر سجدے کا داغ اس پر رکھتے ہیں - بعض عابد عبادت کرتے ہیں مگر ان کا دل عبادت میں ذرا نہیں ہوتا - وہ صرف زبان سے الفاظ اڑاتے ہیں اور اعضا سے چند حرکات کرتے ہیں ، اس کو عبادت کہتے ہیں - یہ نہیں جانتے کہ زبان کا ہلانا اور بعض اعضا کو حرکت دینا کیا مشکل بات ہے - حضوریِ قلب سے مافی الضمیر کا اظہار نطق کے ذریعے سے جناب کبریا کے حضور میں ہوتا ہے -

عبادت سے مقصود خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اپنی تضرع و دعا ہوتی ہے - اگر دل غافل ہے تو وہ اپنے مخاطب کو ، جو اللہ تعالیٰ ہے ، نہیں پہچانے گا اور نہیں سمجھے گا کہ میں اس کے سامنے کھڑا ہوں ؛ عادت کے موافق گو وہ زبان ہلائے گا مگر عبادت کے مقصود سے محروم رہے گا - خدا تعالیٰ دل کو دیکھتا ہے کہ وہ میری تعظیم کرتا ہے ، مجھ سے ڈرتا ہے ، مجھ سے توقع

---

۱ - یہاں کچھ الفاظ رہ گئے ہیں - غالباً پورا جملہ یوں ہوگا : "سچے خدا کی جھوٹی عبادت"- مرتب

رکھتا ہے ، اپنے گناہوں اور تقصیروں سے نادم ہوتا ہے - عبادت کے وقت انھی باتوں کا دھیان ہو اور اُن سے دل نہ ہٹا ہو -

جب آدمی عبادت کی نیت کرے تو زبردستی اپنے نفس کو اس بات پر آمادہ کرے کہ اس وقت میں سوائے خدا کے ماسواء کا دھیان نہیں کروں گا - جو زبان سے کہوں گا ، وہ میرے دل میں ہوگا -

زبان سے جو آدمی کہتا ہے ، اس کی تین صورتیں ہیں : اول زبان متحرک ، دل غافل - دوم زبان ہلتی ہے اور دل زبان کی پیروی کرتا ہے اور اس کے الفاظ کو اس طرح سمجھتا اور سنتا ہے کہ گویا دوسرا شخص اُس سے کہہ رہا ہے - سوم دل اول معانی کی طرف دوڑتا ہے اور پھر دل کی زبان تابع ہو کر اُن معانی کا ترجمہ الفاظ میں کرتی ہے - اس بات میں بڑا فرق ہے کہ دل کی ترجمان زبان ہو یا دل کی معلم زبان - سچی عبادت مین دل کی ترجمان و تابع زبان ہوتی ہے ، دل اُس کا تابع نہیں ہوتا -

ہر چیز کا ایک حق ہوتا ہے ؛ وعدے کا حق رجا ، وعید کا حق خوف ، امرونہی کا حق ارادۂ مصمم اُس کی تعمیل کا ، نصیحت کا حق اس سے پند حاصل کرنے کا ، احسان کا حق اُس کے شکر بجا لانے کا - ان سب حقوق کا ادا کرنا عبادت ہے - اصل عبادت دل کے خشوع کا نام ہے ، کیونکہ خشوع ایمان کا نتیجہ و ثمرہ ہے - اس کو یقین ہے کہ خدا تعالیٰ بندے کے حال پر مطلع ہے - بندہ خدا کی عظمت اور اپنی ذلت کو پہچانتا ہے -

انسان کا دل راعی ہے اور اعضا رعیت ہیں - راعی اور رعیت دونوں کی درستی ساتھ ہوتی ہے - ہر کام فکر دل کی مناسبت سے ہوتا ہے - پس جن کی طبیعت فکر عبادت سے مناسبت رکھتی ہے ، وہ سب طرح حق عبادت ادا کرتے ہیں - دل کے ساتھ اعضا بھی عبادت میں

مصروف ہوتے ہیں ۔ جن کا دل مجلیٰ ہوتا ہے ، اُس میں عبادت کا پرتو پورا پڑتا ہے ، جن کے دل پر میل کی تہیں جم رہی ہیں ، اُن میں کوئی ہدایت کا پرتو نہیں پڑتا ۔ کچھ اُس منعم حقیقی کی طرف سے بخل نہیں ہوتا ۔

یہ بھی یاد رکھو کہ عبادت الٰہی کا حال اور دنیا کی چیزوں کا سا نہیں ہے کہ اُن کی تکرار اور مداومت اور واقفیت سے دل پر سے اُس کا اثر اُتر جائے ، بلکہ عبادت جتنی دفعہ اور جتنی مدت تک زیادہ کی جاتی ہے ، اس کا اثر دل پر زیادہ ہوتا جاتا ہے ۔ دل پر انوار الٰہی کی تجلی بڑھتی جاتی ہے ، انتظام عالم کے اسرار کھلتے جاتے ہیں ، مخلوقات کے عقدے حل ہوتے جاتے ہیں ۔ ہر شے میں پروردگار کی قدرت و حکمت زیادہ سمجھ میں آتی جاتی ہے ۔ کچھ اور ہی عالم اُن کی نظروں میں سما جاتا ہے ۔ وہی وہ ہر طرف نظر آتا ہے ، جیسے کہ سمندر میں پانی کی لہریں اُٹھتی ہیں ، خدا پرستوں کے دل میں خدا کی ستائش کا جوش اُٹھتا ہے ، جیسے کہ سورج کی ان گنت کرنیں زمین پر پڑتی ہیں ، ایسے ہی اُن کے دلوں میں خدا کی حمد و ثنا کے نور کی کرنوں کا ہجوم ہوتا ہے ۔ خدا کے جلال و جمال پر جو نقاب پڑا ہے ، اُس کا اُٹھانا اُن عارفان کامل ہی کا کام ہے ۔

۱۰ ۔ خدا جسے رکھے اُسے کون چکھے

آدمی منہ میں نوالہ رکھتا ہے اور اُس میں سے ثابت گندم نکال کر الگ رکھتا ہے ۔ اس گیہوں کے دانے کو نہ ٹڈیوں نے کھایا ، نہ مرغ نے چگا ، نہ چکی نے پیسا ، نہ توے اور تنور کی گرمی نے اُس پر اثر کیا ۔ پس اسی طرح جس کی جان و مال و آبرو کو خدا تعالیٰ بچاتا ہے ، اُس پر کوئی آفت نہیں لا سکتا ۔ وہ اُس دانے کی طرح بچا رہتا ہے ۔

۱۱ - خدا تعالیٰ کی معرفت

انسان بہ جز اپنے نفس اور اپنی ایسی صفات کے ، جو اُس کو اُس وقت حاصل ہوں ، اور چیز کا ادراک نہیں کر سکتا - یا کوئی صفت جو اُس کو پہلے حاصل تھی ، اُس کے قیاس سے دوسری چیز کو سمجھتا ہے - پھر کبھی اس بات کو مانتا ہے کہ میری صفت اور دوسرے کی صفت میں شرف و کمال کی رو سے فرق ہے ؛ مثلاً آدمی کی طاقت میں صرف اتنی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کے لیے وہ باتیں ثابت کرے جو کہ اُس میں خود موجود ہیں ؛ یعنی فعل و علم ، قدرت و ارادہ وغیرہ - وہ اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے کہ خدا میں یہ صفات کامل تر اور اشرف ہیں -

غرض انسان کی بڑی دوڑ یہی ہے کہ اپنی صفات کے گرد پھرا کرے اور جس بزرگی اور جلال کے ساتھ خدا تعالیٰ خاص ہے ، اُس تک رسائی نہ ہو - اسی لیے حقیقت کے ساتھ خدا تعالیٰ کو خود اس کی اپنی ذات پاک جانتی ہے - انسان اس کی معرفت سے عاجز ہے - خدا کی ہزاروں صفات سے انسان جاہل ہے - وہ تو اس کی انھی صفتوں کو جان سکتا ہے جو اُس میں خود ہیں ، اسی لیے خدا کی بڑی معرفت یہی ہے کہ انسان یہ کہے کہ میں اُس کو نہیں پہچان سکتا -

۱۲ - خدا سے ارادت

دنیا میں وہم و خیال نے جال پھیلا رکھا ہے - تُو اُس کے اندر عادتوں کے پھندوں میں پھنسا ہوا ہے - جو منشور سعادت حق نے تجھے دیا ہے - اُس کے خلاف تو نے اپنی عادت کر رکھی ہے -

آنکھیں تجھے اس لیے دی گئی ہیں کہ تو صنائع کو دیکھ ، صانع کو پہچان ، مگر اُن سے تو معشوق رعنا کا انتظار دیکھتا

ہے اور اُن کی زلف و رخسار کا تماشا کرتا ہے - کان اس لیے دیے گئے تھے کہ تو احکام یزدانی سن ، مگر تو نے اُن کو ایک روزنہ بنا رکھا ہے کہ جس میں چنگ و نے کی آوازیں اور غزل و ٹپے[1] کی تانیں آتی ہیں - ہاتھ اس لیے دیے گئے تھے کہ کسب حلال بے رنج و ملال تو حاصل کر ، مگر تو اس پر شراب کا پیالہ لیے بیٹھا ہے جو تیرے ہاتھ پر آبلہ معلوم ہوتا ہے - پاؤں اس لیے دیے تھے کہ اہل صفا کے ساتھ راہ وفا میں چل ، تو آفات اور خرابات کی راہ میں چلنے لگا - لب و دندان و زبان و قوتِ نطق و بیان اس لیے دیے گئے تھے کہ صدق و صواب کے باب میں متکلم ہو کر لوگوں سے خطاب کرے ، مگر تو سخن سنج اس طرح ہوتا ہے کہ خلق کو رنج پہنچتا ہے -

یہ سب عادتیں تیری بد ہیں ، خرد کے موافق نہیں - تو ان عادات کے پردے کو اُٹھا دے اور وہ خو اختیار کر جس سے سعادت حاصل ہو ، خدا کے ساتھ رشتۂ ارادت مستحکم ہو -

۱۳ - خدا کی تعریف اور توحید

خدا وہ قادر مطلق و صانع برحق ہے جس کے قبضۂ قدرت میں ، از فرش تا عرش ، مرکز زمین سے لے کر محیط فلک تک ساری چیزیں ہیں - اُس نے ہزاروں عجائب و غرائب اشیا سے آسمان اور زمین کو آراستہ کیا اور ایک ایک ذرے میں اپنی قدرت

---

۱ - ''ٹپہ'' گانے کا ایک اسلوب ہے جس میں تان پلٹنا کثرت سے ہوتا ہے - پہلے پنجاب سے مخصوص تھا ، اب ہر جگہ گایا جاتا ہے - موجودہ ٹپہ مشہور ترین ہمیر کا ہے جس کے بول ہیں : آویں میاں مینڈڑا یار'' - رسولن بائی بنارس والی کا غنائی خاندان ٹپے میں مہارت تام رکھتا ہے - (مرتب)

کو ظاہر کیا ۔ کوئی ذرہ آسمان و زمین میں ایسا نہیں کہ جو اس کی قدرت کاملہ پر شہادت نہ دیتا ہو ۔ کوئی برگ درخت نہیں جو اس کی حکمت بالغہ پر دلالت نہ کرتا ہو ۔ کوئی دانہ زمین سے نہیں اُگتا کہ اپنے بونے والے کی توحید پر ہزار زبان سے اقرار نہ کرتا ہو اور اپنے اُگانے والے کی قدرت پر ہزار طرح سے شہادت نہ دیتا ہو ۔ ہر درخت کا پتّا اُس کی وحدانیت کا مقرّ ہے ۔ جس ورق پر غور کیجیے، اُس کی معرفت کا دفتر ہے ۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

پھول کی نزاکت اور رنگت میں ،کانٹے کی خلش میں ، کھیت کے دانے میں ، ریت کے ذرے میں ، جھاڑ جھنکاڑ میں ، خزاں و بہار میں ، صانع قدرت کی ایک قلم کاری ہے ۔

تو اجرام فلکی کی جنبش و آرام کو دیکھ کہ اُن کی شکل و ترتیب اور سیر ایک ہی حال پر رہتی ہے ۔ کوئی اپنی صورت میں نہیں بدلتا ،کوئی اپنی گردش کو نہیں چھوڑتا ، سب اُن کے دوائر مدار ہم وضع ، سلک عناصر منتظم باہم سب ایک صفت و آئین پر؛ جو زیر ہے وہ زیر ، جو بالا ہے وہ بالا ، اور شام و سحر و سال و ماہ وہ اپنی گردش آمد و شد ایک ہی قاعدے کے موافق کرتے ہیں ۔ ہر سال میں وہی فصلیں جاڑے گرمی برسات کی پیدا کرتے ہیں ۔ موالید ثلاثہ (حیوانات ، نباتات ، جمادات) سے سارا جہان بھرا پڑا ہے ۔ جو ان کی انواع نہاں خانۂ ابداع سے ظہور میں آئے، وہ کم و بیش نہیں ہوتیں ۔

پس جس کارگاہ کا یہ نظم و نسق ہو ، وہ ایک ہی کارگزار کا کام ہے ۔ دو کشور دو بادشاہوں سے آباد نہیں ہوتے ، نہ طفل دو دایہ سے پلتا ہے ، نہ سپاہ پر دو سپہ سالار حکومت کرسکتے ہیں،

نہ ایک مریض کو دو طبیب اچھا کر سکتے ہیں۔ کیسے اہرمن و یزدان اس دنیا کا کام چلا سکتے ہیں؟

انسان کہتا ہے کہ میرا دل صدف ہے اور گوہر توحید سے پر ہے اور میرے[1] کان توحید سے پر ہیں، مگر یہ زبانی لاف ہے، اس پر عمل نہیں۔ جو کچھ تقریر سے ترتیب دیتے ہو، صورت حال اس کی تکذیب کرتی ہے۔ جس بات کو اپنی گفتگو سے فروغ دیتے ہو، تمھارا حال اس کو مضمون نہ دروغ کر دیتا ہے۔ یہ راستی و راست روی نہیں ہے۔ جیسا راست کہو ویسا کرو۔ غرض آدمی نے اپنی ہوائے نفسانی کے ہزاروں بت بنا رکھے ہیں، انھیں توڑو اور خدا کی توحید کو اختیار کرو۔

۱۴ - یقین کے معنی اور خدا پر یقین ہونے کے نتیجے

نفس جو کسی چیز کی تصدیق کرتا ہے اس کے چار مقامات ہیں:

ایک یہ کہ تصدیق و تکذیب برابر ہوں، اس کو شک کہتے ہیں۔

دوم، نفس دونوں باتوں میں سے ایک طرف مائل ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ دوسری بات بھی ہو سکتی ہے، مگر اس کا ہو سکنا ایسا ہے کہ وہ اول کی ترجیح کا مانع نہیں، اس کو ظن کہتے ہیں۔

سوم، نفس کسی چیز کی تصدیق کی طرف اس طرح مائل ہو جائے کہ وہ تصدیق نفس پر چھا جاوے کہ اس کا خلاف دل میں نہ گزرے۔ اور اگر گزرے تو نفس اس کے قبول کرنے سے انکار کرے، مگر یہ تصدیق معرفتِ واقعی کے ساتھ نہ ہو اور نفس میں گنجائش شبہے کے ممکن ہونے کی ہو تو اسے اعتقاد قریب یقین کے

---

[1] - نسخۂ اول میں 'میری' ہے۔ مرتب

کہتے ہیں ؛ جیسا کہ عوام کا اعتقاد مذہب کی طرف ہوتا ہے کہ وہ صرف سننے سے اُن کے دلوں میں جم جاتا ہے ، یہاں تک کہ ہر مذہب والا اپنے مذہب کے صحیح ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے ، اور اپنے مرشد و پیشوا کو جانتا ہے کہ وہی ٹھیک کہتے ہیں ۔ اگر کوئی اُن کے سامنے کہے کہ تمھارے پیشوا سے خطا بھی ہو سکتی ہے تو اس بات کو قبول نہ کریں گے ۔

چوتھی تصدیق معرفت حقیقی سے ہوتی ہے ؛ جو دلیل سے حاصل ہوتی ہے کہ جس میں نہ خود شک ہو ، نہ دوسرے کا شک میں ڈالنا متصور ہو ، تو جب اُس میں شک کا ہونا اور نہ ہوسکنا دونوں نہ ہوویں تو وہ یقین کہلاتا ہے ، مثلاً ایک سے زیادہ دو ہیں ۔

جب آدمی کو خدا کی صفات پر یقین ہوگا تو ہر صفت کے یقین سے وہ اپنی حرکات و سکنات میں برائی سے بچنے میں مبالغہ کرے گا ۔ اور جس قدر یہ یقین غالب ہوگا اُسی قدر گناہوں سے احتراز اور طاعات کے لیے زیادہ تر تیار ہوگا ۔

جب آدمی کو یہ یقین ہو کہ میرا خدا رزاق ہے ، تو طلبِ رزق جائز طور پر کرے گا ۔ کوئی چیز اُس سے فوت ہو جائے گی تو اُس کا افسوس نہیں کرے گا ۔ حرص و آز کا دامن دراز نہیں ہونے دے گا ۔

اگر انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ خدا منصف ہے تو وہ یہ جانے گا کہ طاعات کو ثواب سے ایسی نسبت ہے جیسے کہ پیٹ کو روٹی سے ، اور گناہوں سے عذاب کو ایسی نسبت ہے جیسے کہ زہروں اور سانپوں کو ہلاکت سے ۔ بس جیسے شکم سیر کرنے کے لیے روٹی کا حریص ہوتا ہے اور تھوڑی بہت جتنی ملتی ہے ، اُس کی حفاظت کرتا ہے ، اسی طرح وہ طاعتوں کا حریص ہو گا اور تھوڑی بہت بجا لانے کا مشتاق ۔ جس طرح قلیل و کثیر زہر سے اجتناب

کرتا ہے ، اسی طرح ادنٰی اور اعلٰی گناہوں سے پرہیز کرے گا۔
جب خدا کے عالم الغیب ہونے کا یقین ہوگا تو جانے گا کہ وہ میرے ہر حال پر مطلع ہے ؛ دل کے وسوسوں اور خفیہ خطروں اور فکروں سے واقف ہے ، تو وہ سب اپنے کاموں کو تنہائی میں بھی ادب سے کرے گا۔ جیسے کوئی شخص کسی بڑے بادشاہ کی نظروں کے سامنے بیٹھا ہو کہ ہر وقت گردن جھکائے اپنے سب افعال میں ادب کا لحاظ رکھتا ہے اور ہر حرکت سے ، جو مخالف ادب کے ہو ، احتراز کرتا ہے۔

پس اس طرح جب یہ یقین ہے کہ اللہ تعالٰی میرے باطن پر ایسا مطلع ہے جیسے کہ خلق کے لوگ میرے ظاہری کاموں پر ، تو وہ ظاہر سے زیادہ اپنے باطن کی صفائی و زینت و پاکی میں اہتمام کرے گا ، کیونکہ جانتا ہے کہ وہ خدا تعالٰی کے روبرو ہے۔ ظاہر کے[1] بناؤ و سنگار کو تو خلق کے روبرو جانتا ہے۔ پس اس یقین سے حیا[2] ، خوف، انکسار ، ذلت ، مسکنت ، خضوع اور بعض اور عمدہ اخلاق پیدا ہوں گے ، اور یہ اخلاق خدا کی طاعات کا سبب ہوں گے۔ یہ یقین بہ منزلہ درخت کے ہے اور یہ اخلاق اس کی شاخیں ہیں جو اس سے نکلتی ہیں۔ اور اعمال و طاعات جو اخلاق سے صادر ہوتے ہیں ، وہ بہ منزلہ پھلوں اور کلیوں کے ہیں کہ شاخوں سے نکلتی ہیں۔

غرض یقین اساس ہے جس پر طاعات اور نیک اخلاق کا محل تعمیر ہوتا ہے۔ جب آدمی کو یقین ہو کہ یہ چاند ، سورج ، ستارے ، جمادات ، حیوانات ، نباتات اور تمام مخلوقات خدا کے امر

---

۱ - نسخۂ اول میں 'کی' ہے۔
۲ - نسخۂ اول میں 'حیات' غلط ہے۔ مرتب۔

کی ایسی مسخر ہیں جیسے کہ کاتب کے ہاتھ میں قلم ؛ اُسی کی قدرت ساری چیزوں کی مصور ہے ، تو اُس کے دل میں اس قدرت کے سبب سے کیوں نہ توکل ، رضا ، تسلیم کا غلبہ ہوگا ۔ اور غفلت ۔ کینہ ، حسد ، بدخلقی ، یہ سب اُس کے دل سے بھاگ جائیں گے ،

۱۵ - تضرع و زاری بہ درگاہ جناب باری

اے خدا! تو سب تنومندوں کی جان ہے ، آرزو مندوں کا آرزو بخش ہے ، تو ہی میرے کاموں کو نیک بنانا ہے ۔ مجھ پر مجھ سے زیادہ مہربان ہے ، تیری رحمت و نعمت بے انتہا ہے ، تو مجھے اپنا دین دے اور اپنی رضا سے قرین کر ۔ میرا دل ایسا بنا دے کہ دین کی یاد پاک کیا کروں ۔ یہ میری سرشت ، جو باد و خاک سے ہے ، اُس کو آگ لگا دے ۔ تو گناہ کا بخشنے والا اور دولت کا دینے والا ہے ۔ میں لغزندہ اور افتادہ ہوں ، میں تیرے خشم و خوش نودی کے آگے عاجز ہوں ۔ میرا دل گم راہ ہو گیا ہے ، وہ تیری کارسازی پر ناز نہیں کرتا ۔ میری آنکھیں گناہ جوئی کرتی ہیں، وہ تیری بے نیازی سے خوف نہیں کرتیں ۔ تو جس کھانے کو منع کرتا ہے وہ میں کھاتا ہوں ۔ تو جس کام کو منع کرتا ہے ، وہ میں کرتا ہوں ۔ تو مجھے بدی سے پاک کر، ہلاکت سے نجات دے ؛ تیرے قبول کرنے سے میری بدی بھی نکی ہو جائے گی ، تیری گرفت سے میری نیکی بھی بدی ہو جائے گی ۔ میں تو بد کرنے سے بدکار ہوں ، مگر تجھ کو میرے ساتھ نیکی سزاوار ہے ۔ کوئی تیری عنایت بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ، کوئی تیرے بغیر رعایت کے زیست نہیں کر سکتا ۔ تو ہی دین دیتا ہے ، تو ہی یقین دیتا ہے ۔

اے ہم امیدواروں کی امید! تو ہم کو وہ چیز دے جو تیرے نزدیک ہمارے لیے بہتر ہے ۔ ہماری اُمید ساری تیری رحمت پر ہے ۔ جان اور روزی ہماری تیری نعمت ہے ۔ جو کچھ تیری قضا نے

میرے لیے لکھا ہے، وہ خوب ہے ، زشت نہیں ہے - تیرے سوا کوئی مجھ کو نہیں چھڑا (چھڑا) سکتا - تو میری سیرت کو اسرار کی صورت سے بچا - تیرے خوف سے بہشت بھی دوزخ بن جاتی ہے - جو تیرے حکم کے خلاف کرتا ہے ، وہ اپنے دل پر غفلت کا غلاف چڑھاتا ہے - تو مجھے دل دے ، میری دلیری دیکھ ، تو مجھے اپنا روشن بنا ، پھر میری شیری دیکھ - اپنے تیروں سے میرے ترکس کو بھر دے ، پھر دیکھ لے کہ کوہ قاف کی کمر توڑتا ہوں -

جو خود بین ہے ، وہ خدا بین نہیں ہو سکتا - جو مرد دین بننا چاہتا ہے ، اس کو خود بینی سے دور ہونا چاہیے - اے خدا! تو اپنا ورد میرا مقصد بنا - تیرے ہی حضرت میں سب کی بازگشت ہے ، خواہ وہ عاصی ہو یا عالم ہو، محکوم ہو یا حاکم ہو - تیرے ہی امر سے سب زبر و زیر ہوئے ہیں - آدمی تو خیر و شر سے غافل ہے ، جو کچھ ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا ، وہ تیرا ہی حکم ہے - جو آنکھ تیرے نور سے روشن ہوئی ، وہ آفتاب کو بھی تیرے نور کے سامنے تاریک دیکھتی ہے - جس کو تیری درگاہ کا شوق پیدا ہوا ، اس سے بغض و حسد دور ہوا - غضب و حقد و حشم و صلح و حسد سے تیری ذات احد دور ہے - بندوں پر تیری رحمت ہی رحمت ہے - انسان ہی تیرے در توحید کا صدف ہے - جو اس موتی کو کھوتا ہے وہ مفلس ہوتا ہے ، جو اس موتی کو حفاظت سے رکھتا ہے ، وہ ایسا مسرور بنتا ہے کہ اس کو خلق سے زیان نہیں پہنچتا ہے - وہی زمانے میں سرافراز ہوتا ہے - قضائے ازل کا ناز بنتا ہے - کوئی شخص بے ریاضت کے مقصود نہیں پاتا ہے - جب تک کوئی جلاتا نہیں ، بید و عود برابر ہیں - جب جنگل سے باز کو صید کرتے ہیں تو اس کی گردن اور پاؤں کو قید کرتے ہیں ، آنکھوں پر ٹوپی چڑھاتے ہیں ، پھر اس کو شکار کرنا سکھاتے ہیں ؛ وہ تھوڑے سے

طعمے پر راضی ہوتا ہے اور اپنا طعمۂ ماضی بھول جاتا ہے - جب اس طرح کی ریاضت کرتا ہے تو بادشاہوں کے ہاتھوں پر بیٹھتا ہے - اگر یہ ریاضت نہ کرتا تو وحشی رہتا - جو کوئی اُس کو دیکھتا ، آگے سے بھگاتا - پس اگر تجھ کو ناز کرنا منظور ہے تو ریاضت کر -

۱۶ - خدا نے بندے کو کرنے یا نہ کرنے کا اختیار کیا دیا ہے ؟

بندے کو کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے ، مگر یہ اختیار خدا کا پیدا کیا ہوا اور دیا ہوا ہے اور انسان اُس میں مجبور ہے ؛ مثلاً خدا تعالیٰ نے آدمی کا ہاتھ صحیح و سالم پیدا کیا اور لذیذ کھانے کو پیدا کیا ، اور معدے میں خواہش کھانے کی پیدا کی ، اور دل میں یہ واقفیت پیدا کی کہ اُس کھانے سے خواہش کو تسکین ہوگی ، اور یہ تردد پیدا کیا کہ باوجود تسکینِ خواہش کے اُس کھانے میں کچھ ضرر ہے یا نہیں - اور اُس کے مقابل یہ تردد پیدا کیا کہ اُس کھانے کے ساتھ کوئی ایسا امر مانع ہے یا نہیں جس سے غذا کا کھانا معذور نہ ہو - پھر یہ علم پیدا کیا کہ کوئی مانع نہیں -

پس جب اتنے اسباب جمع ہوئے تو ارادہ کھانے کا پکا ہوتا ہے - یہی ارادہ پکنا بعد ان ترددات کے اور بعد غلبۂ خواہش کے اختیار کہلاتا ہے - اور جب اُس کے سبب پورے ہو جاتے ہیں تو وہ بھی ضرور ہی موجود ہوتا ہے ؛ مثلاً جب خدا تعالیٰ کے پیدا کرنے سے ارادے میں پختگی آتی ہے ، اُس وقت ہاتھ کھانے کی طرف ضرور بڑھتا ہے ، کیونکہ بعد تمام ہونے ارادے اور قدرت کے فعل کا برروے کار آنا ضرور ہے ، اس لیے ہاتھ کو حرکت ہوتی ہے - تو جب حصول قدرت اور پختگیِ ارادہ خدا کے پیدا کرنے سے تھیں تو ہاتھ کی حرکت بھی اُسی کی مخلوق ہوئی - اور پختگیِ ارادہ

جب ہوتی ہے کہ اول خواہش صحیح اور موانع کے نہ ہونے کا علم ہو چکے ، اور یہ دونوں بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ لیکن ان مخلوقات میں ایک ترتیب خاص خداوند کریم نے رکھ دی ہے کہ خلق میں ایسی ترتیب اور عادت کے موافق ہمیشہ انتظام رہتا ہے ؛ مثلاً ہاتھ میں حرکت لکھنے کے لیے نہیں پیدا کرتا جب تک کہ اس میں قدرت اور حیات اور ارادۂ مصمم نہیں پیدا کرتا ، اور ارادۂ مصمم نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ خواہش اور رغبت نفس میں نہیں پیدا کرتا ، اور یہ رغبت جب تک خوب نہیں اٹھتی جب تک اس بات کا علم نہیں پیدا کر دیتا کہ لکھنا نفس کے موافق ہے۔ اور علم کو بھی جو پیدا کرتا ہے تو اور اسباب سے پیدا کرتا ہے جن کا مآل حرکت اور ارادہ اور علم پر آ رہتا ہے۔

غرض کہ علم اور خواہش طبع کے بعد پکا ارادہ ہوتا ہے اور قدرت اور ارادے کے بعد حرکت واقع ہوتی ہے۔ اور ہر فعل میں اسی طرح کی ترتیب ہے اور یہ سب چیزیں خدا کی پیدائش کی ہیں۔ لیکن بعض مخلوقات بعض کے واسطے شرط ہیں ، اس لیے بعض کا مقدم ہونا اور بعض کا موخر ہونا واجب ہے ؛ مثلاً ارادہ بعد علم ہی کے پیدا ہوتا ہے اور علم بعد حیات کے اور حیات بعد جسم کے ، تو جسم کی پیدائش شرط ہے حدوث حیات کے لیے ، نہ یہ کہ حیات جسم میں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور حیات کی پیدائش شرط ہے علم کی پیدائش کے لیے ، نہ یہ کہ علم حیات سے نکلتا ہے۔ بلکہ محل قبول استعداد جب ہوتی ہے جب وہ زندہ ہو۔ اس طرح علم کی پیدائش شرط ہے پختگی ارادہ کی ، نہ یہ کہ علم سے پختگی ارادہ نکلتی ہے۔ بلکہ ارادے کو وہی جسم قبول کرتا ہے جو زندہ اور قائم ہو۔

غرض کہ ممکن کے سوا کوئی چیز وجود بنیادی میں داخل نہیں ہوتی۔ اور امکان میں ایسی ترتیب ہے جس میں تبدیل نہیں

ہوتی ، اس واسطے کہ اُس کی تبدیل محال ہے ۔ پس کسی وصف کی شرط پائی جاتی ہے ۔ اس شرط کے سبب سے محل میں لیاقت وصف کے قبول کرنے کی ہو جاتی ہے ۔ پھر وہ وصف خدا کی عنایت اور قدرت ازلی سے لیاقت آ جانے کے بعد موجود ہو جاتی ہے ۔ اور چونکہ شرطوں کے سبب سے لیاقت میں ترتیب ہوتی ہے ، تو خدا تعالیٰ کے کرنے سے ممکنات کے موجود ہونے میں یہی ترتیب ہوگی اور بندہ ان ترتیب ممکنات اور حوادث کے لیے محل ہے ، اور یہ حوادث قضاے الٰہی میں ترتیب کلی سے مرتب ہیں جن میں تبدیل نہیں ہوتی ۔ اُن کا ظہور تفصیل وار متعلق حکم و اندازۂ الٰہی سے ہے کہ اُس سے تجاوز نہیں کرتے ۔

۱۷ ۔ خدا کی حکمت سے انسان کی غفلت

ایک احمق نے اونٹ سے پوچھا کہ تیری کوئی کل سیدھی نہیں ۔ اونٹ نے جواب دیا کہ چپ لگا ۔ میری صورت کو عیب نہ لگا ۔ تو میری کجی پر نگاہ نہ کر ، مجھ سے راہ راست چلنی سیکھ ۔ میری ساری کجی میں خدا تعالیٰ نے راستی رکھی ہے ۔ صورت میں عیب بتانا مصور کو عیب لگانا ہے ۔ تو نہیں جانتا کہ گوش خر اُس کے سر کے درخور خدا نے بنائے ہیں ۔ جو کچھ خدا تعالیٰ نے بنایا ہے اُس میں عیب نہ نکالو ۔ ساری بد و نیک میں سوا اس کی نیکی کے نہ سمجھو ۔ عاقلوں کے نزدیک جو زشت و نیک ہے وہ بہت ہی نیک ہے ۔ خدا کی شان ہی سے نہیں کہ وہ بد بنائے؛ خواہ کیسی ہی کوئی چیز زشت تم کو معلوم ہو ، مگر اُس کو سمجھ لو کہ خدا نے اُس کو نیک ہی بنایا ہے ۔ جسم کو رنج و راحت دونوں ہوتے ہیں ، روح کو راحت گنج معلوم ہوتی ہے ، جس کے سر پر شکنج کا مار بیٹھا ہے ، جس کی سرکوبی کے واسطے خرد کے ہاتھ پاؤں برابر موجود ہیں ۔

ایسا ہی حال ایک احول[1] لڑکے کا ہے کہ اس نے باپ سے کہا میں نے سنا ہے کہ احول ایک کے دو دیکھتا ہے مگر مجھے تو کوئی چیز زیادہ نہیں دکھائی دیتی ، آسماں پر دو چاند ہیں ، وہ چار مجھے نظر نہیں آتے - یہ غلط مشہور ہے کہ احول طاق کو جفت دیکھتا ہے -

بس یہی حال کج بحثی کا دین کے طریق میں ہے ، وہ ایسی ہی حجتیں بناتے ہیں جیسے کہ بہشت کے باب میں اوپر بیان ہوئیں - جو صاحب عقل ہیں ، وہ خدا تعالیٰ کی صنعت بے خلل کو اپنا قبلہ بناتے ہیں ، اس کو بے مثال جانتے ہیں - ان کی روح کو خرد سے شرف دیا ہے - جب ان کی دعا اجابت نہیں ہوتی تو اس کو جانتے ہیں کہ خدا کی حکمت اس کی مانع ہے - جیسے کہ طبیب گل خوار کو ، جس کا دل گل کھانے کو بہت چاہتا ہے ، اس سبب سے گل نہیں دیتا کہ وہ اس کی عمر کو گھٹائے گی ، اسی طرح ہماری دعاؤں کو خدا نہیں قبول کرتا کہ وہ ہمارے حق میں مضر ہوں گی - وہ ہر انسان کو ہر چیز دیتا ہے جو اس کی حکمت اور داد کے نزدیک مناسب ہوتی ہے - غرض جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی حکمت مقدر کرتی ہے مگر ہماری عقل بوسیدہ ان کو بے سبب و حکمت جانتی ہے -

خدا کی حکمت دیکھو کہ اگر ہاتھی کے پوست کو پشہ کاٹتا ہے تو اس کے اڑانے کا سامان بھی خدا نے ہاتھی کو دیا ہے - اگر جوئیں آدمی کے بدن میں پڑیں تو ان کے مارنے کے لیے ناخن بھی موجود ہیں - اگر پہاڑ میں سانپ بہت ہو جائیں تو ان کے مارنے کے لیے پتھر بھی ہیں اور ان کے علاج کے لیے تریاک بھی پہاڑ میں بہت ہیں - بچھو کے لیے کفش و نعل موجود ہیں - اگر

---

۱ - احول : بھینگا - مرتب

دنیا میں درد فراواں ہیں تو اُن میں سے ہر ایک کے لیے درماں ہے۔ معدہ و شریان سے جگر و دل نے تن میں آب و ہوا رواں کی تاکہ جسم میں ایک کی جنبش سے ، دوسرے کے سکون سے بذریعۂ خون جان باقی رہے۔ انسان نے زشت و خوب نام رکھ چھوڑے ہیں ورنہ خدا نے تو کوئی بری چیز بنائی نہیں۔ اُس کی شان سے بعید ہے کہ کوئی بدی اُس سے وجود میں آئے۔ تو اُس کے زہر کو بھی نوش جان ، اُس کے قہر کو بھی لطف سمجھ۔ ہاں اگر مٹھائی دے تو مہربانی سمجھ ، اگر پچھنے لگائے تو اُس کی محبت سمجھ۔ تو نہیں دیکھتا کہ جب بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو دایہ کبھی اُس کو گہوارے میں جھلاتی ہے، کبھی اپنی بغل میں ، گود میں لیتی ہے ، کبھی اُس پر سختی کرتی ہے ، کبھی نرمی ، کبھی اپنے سے دور لٹا دیتی ہے ، کبھی اُس کے رخساروں پر بوسہ دیتی ہے۔ اُس کے بوجھ کو لیے پھرتی ہے ؛ کبھی اُس کو مارتی دھاڑتی ہے ، غصے ہوتی ہے۔ مرد بیگانہ یہ دیکھ کر دایہ پر غصے ہوتا ہے کہ وہ بچے کے ساتھ بے التفاتی کرتی ہے ، مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ دایہ اُس پر سراسر مہربانی کرتی ہے اور کوئی کام اُس کے ساتھ نہیں کرتی جس میں شفقت و محبت نہیں ہوتی۔

پس یہی حال ہمارے کردگار کا ہمارے ساتھ ہے کہ جو ہمارے لیے مناسب جانتا ہے ، وہ روزی دیتا ہے۔ کبھی محرومی ہے ، کبھی پیروزی (فیروزی) ، کبھی سر پر موتیوں کا تاج رکھتا ہے ، کبھی کوڑی کو محتاج کرتا ہے۔

خدا نے جب آفاق پیدا کیا ہے تو اُس میں کوئی چیز ایسی نہیں پیدا کی کہ جس پر بد کا اطلاق ہو۔ ایک کے واسطے زہر کو غذا بناتا ہے ، دوسرے کے واسطے مرگ۔ خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ جو کچھ تیرے واسطے خدا کرے ، اُس کو

یہ سمجھ کہ میرے حق میں یہی بہتر تھا ۔ تو حق کا فرماں بردار رہ ۔ تجھے جو اپنی مصیبت میں نعمت نظر نہیں آتی تو اُس کا سبب یہ ہے کہ تیری عقل اندھی ہے ۔ خدا ہی کو حکم و حکمت سزاوار ہے ۔ وہی بے نیاز ہے ، تو اس کا نیازمند بن ۔ وہی پاس دار ہے ، تو اُس کا سپاس گزار ہو ۔ وہ تیرا راعی ہے مگر تو گرگ پسند ہے ، وہ تیرا داعی ہے ، تو اُس کا حاجت مند ہے ۔

۱۸ ۔ رضا و تسلیم الٰہی

جان شریف کے لیے جو حکم خدا دیتا ہے اُس میں صنع لطیف ہوتی ہے جو خردہ داں ہیں وہ اس دید کو سمجھے ہیں ، جو خدا کرتا ہے وہ خیر ہی ہوتی ہے ۔ جو ایک گوسپال دیتا ہے وہ ہی تاج سر ہوتی ہے ۔ اگر پہلو میں درد ہو یا بیماری کا رنج یا پاؤں میں کانٹا چبھے ، ان سب کو تو کرم اور محض کرم جان ۔ وہ اس تیرے رنج کو ضائع نہیں کرے گا ۔ اگر تو دعا مانگتا ہے اور وہ قبول نہیں ہوتی تو جان لے کہ کوئی حکمت اُس کی مانع اجابت ہے ۔ ہم نے اور تو نے نیک و زشت نام رکھ چھوڑے ہیں ، خدا تو سوائے نیکی کے کچھ نہیں کرتا ۔ خدائے عزوجل کا سارا عالم ہے ، تجھ کو اُس میں کیا دخل و محل ہے ۔

ایک چیز سب طرح سے ظاہر میں خوب ہے مگر باطن میں سب طرح معیوب ہے ۔ تجھے اُس کی کیا خبر ہے ، تیری عقل اُس کا ادراک نہیں کرسکتی ۔ جو کچھ خدا کرتا ہے وہ خوب نیک ہی ہوتا ہے ۔ خدا کی دانش کے آگے پیدا و نہاں سب یکساں ہے ۔ جو دنیا میں سوز و ساز ہیں اُس میں خدا کے راز ہیں ۔ بہت سے شیر تیرے واسطے زبوں[1] ہیں ، بہت سے درد تیرے واسطے دارو ہیں ۔

---

۱ ۔ زبوں : کمزور ، ضعیف ، لاغر ۔ (جامع اللغات) مرتب

جو گمراہ ہوتا ہے وہی اُس کی قضا پر آہ کرتا ہے ، جو قضا پر رضا نہیں رکھتا وہ بہ خدا خدا کو نہیں پہچانتا ۔ قضا و قدر کی مے سے جان کو مست رکھنا چاہیے ۔ اُس کے واسطے خدا کے سو شکر بھیجنے چاہئیں ۔

خدا کے کسی حکم کو بلا نہیں جاننا چاہیے، ہمیشہ عطاے خیر کرتا ہے ۔ وافع رنج ، فاتح گنج کرامات تو تسلیم و رضا کو جان ؛ جو تلخی پیس آئے ، اُس کو دل پر شیریں بنا ۔ قضاے الٰہی پر راضی رہنا اپنا آئین ٹھہرا ۔ جو ریاضت پیش آئے اُس پر راضی رہ ، اُسی سے روضۂ رضوان تجھے ہاتھ آئے گا ۔ اگر سر پر تیرے ارّہ بھی چلے تو تُو اُس کو شانہ سمجھ ، بلکہ دل کارآگاہ پر اُس کو افسر شاہ جان ۔ تُو گلِ خنداں کی طرح خرم رہ ، غنچے کی طرح درہم برہم نہ ہو ۔ دل سے گرہ نےؔ کی طرح کھول دے ، ہوس سے گرہ پر گرہ نہ لگا ۔ خوب جان لے کہ کوئی چیز غیر خدا سے نہیں ظہور میں آتی ۔ جو بند و کشاد ہے ، وہ اُس کی طرف سے سمجھ ، اُس کو اپنی عین مراد جان ۔ تو دل سے سب طرح خوش ہوگا ، رنج و غم کم ہوگا، بندگی میں آزادی سے زیست ہوگی ، اندوہ و الم میں بھی شادی ہوگی ۔

جو رنج پسند ہے اُس کو کوئی رنج اور گزند نہیں پہنچتی ۔ غرض اقلیمِ رضا کی طرف گھوڑا دوڑا اور رنج و عنا کی تنگناے سے باہر نکل ۔

۱۹ - نکتہ

اے جوان مرد! تو اس نکتے کو یاد رکھ کہ جو خزانہ تیرے پاس ہو اس کو خدا کے حوالے کر دے، وہ تجھ کو پھر دے دے گا۔ اگر تو اپنے پاس رکھے گا، کھو بیٹھے گا۔ سونے کو آگ میں ڈالتے ہیں تو کھوٹ دھل جاتی ہے، زر صافی نکل آتا ہے۔ اسی طرح جو تیرے پاس ہے، وہ اس آسن آرا کو دے دے جو اس کو خالص بنا دے گا۔ تیرے خزانے کے واسطے وہی بہتر خازن ہے۔

باب دوم

تہذیب الاخلاق

۱ - تمہید

افسوس ہے کہ اکثر طالب علموں کی یہ عادت پڑ گئی ہے کہ جو مضامین پڑھتے ہیں ، اُن کو سوچتے سمجھتے نہیں ۔ اُن میں اصطلاحات و محاورات و الفاظ جو آتے ہیں ، اُن کا مفہوم ذہن میں اپنے صحیح صحیح نہیں جاتے ۔ مثلاً عقل ، وہم ، خیال کے الفاظ پڑھیں گے تو اُن کے معانی ذہن میں یہ ہوں گے کہ ''عقل چہ کتی است کہ پیش مرداں بیاید'' ، ''وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس'' ، ''دنیا خواب و خیال ہے'' ۔

ظاہر ہے کہ ایسے محاوروں کے معانی نہ[1] سمجھنے سے وہ ہمارے مضامین سمجھنے کا حق کماحقہ نہیں ادا کر سکتے ، اس لیے میں نے اول الفاظ و اصطلاحات و محاورات کے معانی بالتفصیل لکھ دیے ہیں کہ اگر طلبہ اُن کو ذہن میں محفوظ رکھیں گے تو مغز سخن کو پہنچیں گے ۔

۲ - قلب ، روح ، نفس ، عقل

ان الفاظ کے مختلف معانی زبان کے محاورے میں مستعمل ہیں ؛ جیسے 'اُن کی باتوں سے میری روح تنگ ہوتی ہے'۔ 'میری اور اُن کی صفائی قلب نہیں' ۔ 'میرا نفس نہیں قبول کرتا کہ میں اُن کے پاس اپنی التجا لے کر جاؤں' ۔ 'عقل کے ناخن لو' ۔ ایسے محاوروں میں

---

۱ - اصل میں 'نہ' نہیں ہے - مرتب

جو معانی اُن الفاظ کے ہیں ، وہ ہمارے مضامین میں مقصود نہیں ہیں بلکہ جو اصل مطلب ہے وہ ہم بیان کرتے ہیں ۔

قلب کے دو معنی ہیں :

ایک وہ گوشت کا ٹکڑا جو سینے کے اندر ہے ، جس کے اندر سے خون سارے بدن میں دورہ کرتا ہے اور پھر وہیں آ جاتا ہے ، مگر اس معنی سے ہم کو کام نہیں پڑے گا ۔

قلب کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ قدرتِ مدرکہ ہے جو حزن و ملال و انبساط و مسرت کو ادراک کرتی ہے ۔ اس پیکرِ مخروطی کو قفس اور قلب کو طوطی جانو ۔ طوطی و قفس میں ہمیشہ تمیز کرو ۔ قلب بادشاہ ہے ، یہ اُس کا خرگاہ ہے ۔ بادشاہ جدا ہے اور خرگاہ جدا ۔

روح : ایک معنی اس کے بخار لطیف کے ہیں کہ جوفِ قلب میں نضج[1] پاکر اور وہاں سے بذریعہ شریانوں کے تمام اعضائے بدن میں پھیلتا ہے ۔ اُس کا حال ایسا ہے جیسا کہ گھر میں چراغ کا روشن ہونا جس سے چاروں طرف مکان میں روشنی پھیلتی ہے ۔ اسی کے سبب سے ہمارے تمام اعضاء و حواس کام دیتے ہیں ۔ اگر وہ نہ ہو تو یہ بدن ہمارا مٹی ہے ۔ دوم معنی وہ شے جو انسان کے بدن میں غیر فانی ہے ۔

نفس : وہ شے انسان میں ہے کہ قوت غضب اور شہوت کی جامع ہے ، یا یہ کہو کہ نفس انسانی بذات خود ادراک کرتا ہے اور بدن محسوس میں بہ توسط قویٰ و آلات کے تدبیر و تصرف کرتا ہے ۔ اب اس نفس کی کئی قسمیں ہیں :

---

۱ ۔ نضج : میوے کی پختگی ۔ اطبا کی اصطلاح میں خلط فاسد کا غلیظ یا رقیق ہو کر نکلنا ۔ (فرہنگ آصفیہ) مرتب

نفس مطمئنہ : یہ نفس صفات مختلفہ کے ساتھ موصوف ہوتا ہے ؛ جب شہوات سے مزاحمت کرتے کرتے اس کا اضطراب دور ہو جاتا ہے اور فرماں بردار ہو جاتا ہے تو اُس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں -

نفس لوّامہ : مگر جب نفس کو سکون نہیں ہوتا ، وہ ہمیشہ شہوانی حرکتوں سے روکتا رہتا ہے اور اُس پر ملامت کرتا ہے تو نفس لوّامہ کہتے ہیں -

نفس امّارہ : جب نفس شہوات کا مطیع و منقاد ہو ، اُس کو نفس امّارہ کہتے ہیں -

عقل : وہ ایک قوت ہے جو حقائق امور کو ادراک کرتی ہے اور علوم کی مدرک ہے - اُس کا نام نفس ناطقہ بھی ہے - یعنی نفس کی وہ حالت یا ملکہ جو خواہش دلاتا ہے ، بھلائی اور نفع خیز چیز کی طرف ، اور بچاتا ہے شرور اور مضرت کی چیزوں سے - یہی قوت ہے جو نظام امور معاش و معاد میں کوشش کرتی ہے - اگر وہ مستحسن طور پر عمل کرتی ہے تو وہ عقل معاش و معاد کہلاتی ہے اور ممدوح ہے - اگر وہ اپنا عمل امور باطلہ میں کرتی ہے تو مذموم ہے - غرض یہ چاروں شے ایسی ہیں کہ اُن کو ذاتاً و فعلاً مادے سے کچھ تعلق نہیں ہے اور اُن میں صفت ادراک مشترک ہے -

۳ - تہذیب اخلاق و حواس ظاہری و باطنی

(۱) ہر علم کا موضوع ہوتا ہے کہ جس سے اُس علم میں بحث ہوتی ہے - پس تہذیب اخلاق ایک علم ہے کہ جس کا موضوع نفس انسانی ہے - اس میں اسی سے بحث ہوتی ہے کہ نفس انسانی کیوں کر ایسے خلق کو اکتساب کرے کہ تمام افعال اُس کے جو ارادے سے صادر ہوں ، وہ نیک و محمود و جمیل ہوں - نفس انسانی سے برے بھلے افعال صادر ہو سکتے ہیں -

(ب) حواس ظاہری و باطنی :

نفس انسانی جو ادراک کرتا ہے ، وہ دو طرح کا ہوتا ہے :

ایک حواس ظاہری ؛ باصرہ ، سامعہ ، شامہ، ذائقہ، لامسہ ہے۔

دوم حواس باطنی ہے جو یہ پانچ بہ تفصیل ذیل ہیں :

حس مشترک ، خیال ، فکر یا قوت متخیلہ یا متفکرہ ، وہم ، ذکر ۔ (حافظہ) ۔

اول حس مشترک یہ کام کرتی ہے ، جو شے حواس ظاہری سے محسوس ہوتی ہے ، وہ اُس کو لے لیتی ہے ۔

دوم خیال : یہ حس مشترک کا خزانہ ہے ، یعنی جو صورتیں حس مشترک لے لیتی ہے ، اُن کو خیال میں رکھ دیتی ہے۔

سوم فکر یا قوت متخیلہ یا متفکرہ : اُس کا کام یہ ہے کہ جو صورتیں خیال میں جمع ہوں اُن کو کبھی باہم مرکب کرتی ہے اور کبھی ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے ۔ کبھی آدمی کے دس سر بنا کے راون بنا دیتی ہے ، کبھی بن سر کا کرکے غول بیابانی ۔

چہارم حس وہم : اُس کا کام یہ ہے کہ خاص صورتوں میں خاص معنی دریافت کرتی ہے جیسے کہ بھیڑے کی عداوت بکری سے ۔

پنجم ذکر جس کو حافظہ بھی کہتے ہیں ، وہ وہم کا خزانہ ہے جیسے خیال حس مشترک کا خزانہ ہے ۔

۴ ۔ خوش خلقی و بدخلقی کی حقیقت

خوش خلقی و بدخلقی کے بیان کرنے میں اکثر اُس کی حقیقت نہیں بیان کرتے بلکہ اُس کے ثمرات اور نتیجے بیان کرتے ہیں ۔

مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ فلاں شخص بڑا خوش خلق ہے اس لیے کہ وہ کشادہ پیشانی رہتا ہے ، اپنی دولت بہت دیتا ہے ، کسی کو ایذا نہیں پہنچاتا ۔ دوسرا شخص کہتا ہے کہ فلاں شخص بڑا خوش خلق ہے کیوں کہ مرنج و مرنجان

ہے - تیسرا شخص کہتا ہے کہ فلاں شخص خوش خلق ہے کہ وہ محرمات سے بچتا ہے ؛ حلال روزی کمانے میں کوشش کرتا ہے، اہل و عیال کی پرورش کرتا ہے ، بردبار ایسا ہے کہ کسی سے انتقام نہیں لیتا ہے ، ظالموں تک کی معفرت کے لیے دعا کرتا ہے -

یہ سب باتیں خوش خلقی کے ثمرات ہیں - اب تم خوش خلقی کی حقیقت سنو کہ دو لفظ ہیں : ایک خَلق ، دوسرا خُلق - جب کہتے ہیں کہ فلاں شخص خوش خَلق اور خوش خُلق ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ حسن ظاہری اور حسن باطنی دونوں رکھتا ہے - خَلق سے صورت ظاہری مراد ہوتی ہے ، خُلق سے صورت باطنی -

انسان دو چیزوں سے مرکب ہے ؛ ایک تو بدن ہے جو آنکھ سے سوجھتا ہے - دوسرا نفس ہے جو بصیرت و عقل سے معلوم ہوتا ہے - ہر ایک کے لیے ایک صورت ہوتی ہے ، خواہ اچھی ہو یا بری ہو -

خُلق کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایک ہیئت راسخہ نفس میں ثابت ہو جس سے کہ افعال بہ آسانی بلا فکر و تامل صادر ہوں - پس اگر یہ ہیئت ایسی ہے کہ اس سے ایسے افعال صادر ہوں جو عقلاً محمود ہوں تو اس ہیئت کا نام خُلق خوش یا حسن خُلق ہے - اگر اُس سے برے افعال صادر ہوں تو اُس ہیئت کا نام خلق بد یا سوء خلق ہے - ہم نے اس ہئیت کے ساتھ راسخ اور ثابت ہونے کی قید اس لیے لگائی ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی فعل نیک اتفاقیہ صادر ہو تو وہ خوش خلق نہیں کہلائے گا - مثلاً کوئی شخص اتفاقاً کسی سبب سے بہت سے روپے اٹھا ڈالے تو اُس کا خلق سخاوت نہیں کہلائے گا ، جب تک کہ یہ بات اُس کے دل میں بالکل نہ

جم جاوے ۔ اور صدور فعل میں[1] بلا تامل و فکر کی قید اس لیے لگائی ہے کہ اگر کوئی شخص بڑے فکر و تامل سے بہ تکلف مال خرچ کرے یا اپنے غصے کو دور کرے تو اس کو سخی اور حلیم نہیں کہیں گے ۔

غرض خُلق، نفس کی ہیئت اور صورت باطنی کا نام ہے ۔ جس طرح کہ صرف ایک عضو مثلاً آنکھوں کے اچھا ہونے سے آدمی حسین کامل نہیں ہوتا ، بلکہ اس کے ساتھ آنکھ ، ناک ، منہ ، رخسار وغیرہ سب کے عمدہ ہونے سے حسن ظاہری پورا ہوتا ہے ، اسی طرح باطن کے حسن کے لیے بھی چار ارکان ہیں ؛ جب ان میں حسن ہوگا تو خوش خلقی پوری ہوگی ، یعنی جب آدمی میں چاروں ارکان درجۂ اعتدال پر مناسب رہیں گے تو وہ خوش خلق کہلائے گا ۔ وہ چاروں ارکان یہ ہیں : قوت علم ، قوت غضب ، قوت شہوت ، قوت عدل ، (یعنی ان تینوں قوتوں کو اعتدال پر رکھنے کی طاقت) ۔

قوت علم کی صحت یہ ہے کہ آدمی اس کے سبب سے اقوال کا صدق و کذب و اعتقادات میں حق و باطل اور اعمال میں بد و نیک جانے ۔ اس علم کا ثمرہ حکمت ہے ۔

قوت شہوت، قوت غضب کی خوبی یہ ہے کہ یہ دونوں حکمت کے موافق ہوں اور اس کے اشارے پر چلیں ؛ یعنی جو عقل تجویز کرے اسی پر عمل کریں ۔

قوت عدل سے مراد یہ ہے کہ غضب و شہوت کو عقل کا پابند کر دے ۔

غرض جس شخص میں یہ چاروں رکن درجۂ اعتدال پر ہوں گے

---

۱ ۔ اصل میں "بلا تامل" سے پہلے ایک "قید" زائد تھا ۔ مرتب

وہ مطلق خوش خلق کہلائے گا اور جس شخص میں صرف ایک ہی جزو یا دو جزو حد اعتدال پر ہوں گے، تو وہ صرف اُسی اعتبار سے خوش خلق ہوگا ؛ جیسے کسی کے چہرے میں بعض چیزیں اچھی ہوں تو وہ اُسی اعتبار سے خوش صورت کہلاتا ہے ۔

قوت غضبی جو دفع غیرملائم کا مبدء ہوتا ہے، اُس کے اعتدال اور حسن کا نام شجاعت ہے ، اور قوت شہوت جو جلب ملائم کا مبدء ہے، اُس کے اعتدال کا نام عفت ہے ۔ اگر قوت غضبی حد اعتدال سے زیادہ ہوگی تو اس کا نام تہوّر ہے اور اگر کم ہوگی تو اُس کا نام جُبن ہے ۔ اور قوت شہوت زیادہ ہوگی تو وہ شرہ و حرص کہی جائے گی اور کم ہوگی تو خمود یعنی سبکیِ طبیعت ۔

غرض افراط و تفریط دونوں مذموم اور رذیل ہیں ۔ اوسط درجے میں فضیلت و عمدگی ہے ۔ ارسطو کا قول ہے کہ تمام نیکیاں اوسط درجے میں ہیں ۔ قوت عدل میں کمی و بیشی کچھ نہیں ہوتی ، اُس کی ضد صرف ظلم ہے کہ جب عدل نہ ہوگا تو ظلم ہوگا ۔ قوت علمیہ کے حسن و اعتدال ، یعنی حکمت میں اگر زیادتی خراب مطلبوں میں ہو تو اُس کا نام مکرو فریب ہوتا ہے ، اور اگر اُس کی کمی ہو تو بے وقوفی و بلادت[1]۔

اس سے معلوم ہوا کہ اخلاق کی اصل چار چیزیں ہیں : حکمت ، شجاعت ، عفت ، عدل ۔ حکمت سے غرض وہ نفس کی حالت ہے جس سے کہ سب احوالِ اختیاری میں صحت اور غلطی کو معلوم کرتے ہیں ۔ عدل سے مراد وہ حالت نفس ہے کہ جس سے غضب و شہوت کو قابو میں رکھے اور اُن کا ترک کرنا اور روکنا مقتضائے حکمت کے موافق ہو ۔ شجاعت سے یہ غرض ہے کہ

---

۱ ۔ بلادت : کند ذہنی ۔

قوت غضب عقل کی منقاد ہو ، جہاں وہ اقدام کو کہے وہاں کرے۔ عفت سے یہ غرض ہے کہ قوتِ شہوت ، عقل کی تادیب کے بموجب کاربند ہو۔

پس ان چاروں اصول کے اعتدال کے ماتحت سب نیک اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ اور افراط اور تفریط سے اخلاق بد ؛ قوت عقلی کے اعتدال سے حسن تدبیر ، تیزیِ ذہن ، رائے صائب ، دقائق اعمال اور نفس کی آفات پوشیدہ کا معلوم کرنا ۔ اس کی افراط سے مکر و فریب ، حقد ، خبث باطن پیدا ہوتے ہیں اور کم ہونے سے ناتجربہ کاری بے شعوری ، حمق ، جنون ۔ ناتجربہ کاری سے یہ غرض ہے کہ باوجود سلامتی عقل کے تجربہ نہ ہو۔ حمق و جنون میں یہ فرق ہے کہ احمق کا مقصود تو صحیح ہوتا ہے مگر اس تک پہنچنے کا راستہ اس کو نہیں معلوم ہوتا اور یہ نہیں جانتا کہ کس طریق سے غرض تک پہنچوں گا ۔ اس کا طریق فاسد ہوتا ہے ۔ جنون یہ ہے کہ جو بات قابل اعتبار نہیں ہے اس کو اختیار کرلے۔ پس اس کے اختیار ہی میں سرے سے فساد ہوتا ہے اور مقصود ہی صحیح نہیں ہوتا ۔ قوت غضبی کے اعتدال سے ، یعنی خلق شجاعت سے یہ صفات پیدا ہوتی ہیں : کرم ، دلیری ، شہامت ، کبر نفس ، حلم ، استقلال ، غصے کا فرو کرنا ، وقار وغیرہ ؛ یہ سب باتیں اچھی ہیں ۔ اس کی زیادتی تہوّر ہے جیسے کبر ، سیخی ، غصے سے جل مرنا ، عُجب وغیرہ۔ اور اس کی کمی سے جبن ، خواری ، ذلت ، خوف ، خست ، پست حوصلگی ، واجبی بات سے منقبض ہونا ۔ قوت شہوت کے اعتدال سے ، یعنی عفت سے یہ افعال صادر ہوتے ہیں : سخاوت ، حیا ، صبر ، چشم پوشی ، قناعت ، پرہیز ، لطافت ، حوصلہ ، قلت طمع ۔ اور اس کی افراط و تفریط ، یعنی کمی بیشی کی صورت میں حرص ، بے حیائی ، خبث ، اسراف ، گھر والوں پر کم خرچ کرنا ، ریا ،

بے حرمتی ، فحش ، لغو ، خوشامد ، حسد ، شماتت ، تونگروں میں ذلیل بننا ، فقیروں کو حقیر جاننا ۔

خلاصہ یہ ہے کہ محاسن اخلاق کے اصول چار : حکمت ، شجاعت ، عفت ، عدل ہیں اور باقی اور فروع ہیں ۔

اس اوپر کے مضمون کو یوں بھی بیان کرتے ہیں کہ نفس انسانی میں تین قوتیں متمائز ہیں کہ انھی سے انسان کے سارے افعال اور آثار بہ مشارکت ارادہ صادر ہوتے ہیں اور جب ان قوتوں میں سے ایک غالب ہو جاتی ہے تو باقی کی یا مغلوب ہو جاتی ہیں یا مفقود ۔

اول قوت ناطقہ ہے کہ اس کو نفس ملکی کہتے ہیں اور وہ فکر و تمیز و حقائق امور میں شوق نظر کا مبداء ہوتا ہے ۔

دوم قوت غضبی ہے ، اس کو نفس سبعی کہتے ہیں ۔ وہ غضب و دلیری و ہولناک چیزوں پر اقدام کا شوق اور تسلط ، ترفع و مزید جاہ کا مبداء ہوتا ہے ۔

سوم قوت شہواتی کہ اس کو نفس بہیمی کہتے ہیں ۔ وہ شہوات و شوق التذاذ ، کھانے پینے ، نکاح کا مبداء ہوتا ہے ۔ بس فضائل نفس کی تعداد اسی تعداد کے موافق ہوتی ہے ۔ جس وقت حرکت نفس ناطقہ کی اعتدال کے ساتھ ہوتی ہے ، اپنی ذات میں اور معارف نفسی کے اکتساب میں ، اس سے فضیلت علم پیدا ہوتی ہے جس کی تبعیت میں فضیلت حکمت لازم ہو جاتی ہے ۔ اور جس وقت نفس سبعی کی حرکت اعتدال کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ نفس عاقل کا مطیع ہوتا ہے اور اسی پر اس کو قناعت ہوتی ہے جو نفس عاقلہ اس کا حصہ مقرر کرے اور کوئی بے وقت تہیج اور اپنے احوال میں اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتا ، اس حرکت سے فضیلت حلم پیدا ہوتی ہے جس کی تبعیت میں شجاعت لازم ہوجاتی ہے ۔ جس وقت حرکت نفس بہیمی کو اعتدال کے ساتھ ہو اور وہ نفس عاقلہ

کا مطیع ہو ، جو نفس عاقلہ اُس کی خواہشوں میں سے حصہ مقرر کرے ، وہ اس پر صبر کرے اور اُس کی مخالفت نہ کرے ، ایسی حرکت سے فضیلت عفت پیدا ہوتی ، جس کی تبعیت میں فضیلت سخاوت لازم ہوتی ہے ۔ جب یہ فضیلتیں آپس میں ایک اعتدال کی حالت پیدا کرتی ہیں تو اس سے فضیلت عدالت پیدا ہوتی ہے ۔ پس یوں چار فضائل : حکمت ، شجاعت ، عفت ، عدالت پیدا ہوتی ہیں ۔ ہر ایک کا بیان جدا جدا آگے ہوگا ۔

۵ ۔ اخلاق تغیر پزیر ہے یا نہیں

بعض ارباب دانش کی رائے ہے کہ اخلاق میں تغیر نہیں ہو سکتا اور اس دعوے کی دو وجہ بیان کرتے ہیں ؛ اول یہ کہ خُلق صورتِ باطنی کا نام ہے جیسا کہ خَلق صورت ظاہری کا نام ہے ۔ صورت ظاہری کی تبدیل ممکن نہیں : مثلاً بونا آدمی اپنے قد کو بڑھا نہیں سکتا ، نہ لم‌ٹنکو اپنی ٹانگوں کو گھٹا سکتا ہے ، نہ بد صورت خوبصورت بن سکتا ہے ، نہ اُس کا عکس ہو سکتا ہے ۔ پس خُلق کی ، یعنی صورت باطن کی بھی یہی کیفیت ہے کہ اُس کی برائی ، بھلائی نہیں بن سکتی ۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حسن خلق چاہیے کہ شہوت و غضب کا استیصال کرے ، طول مجاہدہ سے امتحان کیا گیا کہ یہ چیزیں مزاج اور اور طبیعت کے اقتضا سے ہوتی ہیں ۔ پس اُس کے استیصال کے درپے ہونا بےفائدہ عمر کا ضائع کرنا ہے ۔

وجہِ اول کے جواب میں تو ظاہر تجربہ جانوروں کا ہے کہ باز کی وحشت کیسی اُنس کے ساتھ بدل جاتی ہے ۔ بلی کبوتروں کے ساتھ ایک پٹارے میں بند ہو جاتی ہے ۔ شکاری کتا کیسا تعلیم سے مؤدب ہو جاتا ہے کہ شکار کو صرف پکڑ لیتا ہے ، کھانے کی حرص مطلق نہیں کرتا ۔ چوگان بازی میں گھوڑا کیسا غریب ہو

جاتا ہے ۔ پس اگر یہ اخلاق کا تغیر نہیں ہے تو کیا ہے ۔

اصل حال یہ ہے کہ موجودات میں بعض اشیا تو ایسی ہیں کہ اُن پر انسان کا اختیار نہیں چلتا ہے ، جیسے آسمان ہر ستارے یا اعضاً ظاہری و باطنی انسان یا حیوان کے ہیں ۔ اُن کا وجود ایسا کامل ہے کہ اُس میں کسی تبدیل کی ضرورت نہیں ۔ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ وہ انسان کے اختیار میں ہیں ؛ ان کا وجود ناقص ہوتا ہے ، کامل ہونے کی استعداد ہوتی ہے ۔ اگر شرائط کمال پائی جائیں تو وہ درجۂ کمال کو پہنچ جائیں ۔ اور وہ شرائط کبھی انسان کے اختیار میں ہوتی ہیں ، مثلاً آم کی گٹھلی ہے ۔ نہ کونپل ہے، نہ پیڑ ہے مگر اُس کی پیدائش اس طرح کی ہے کہ پیڑ ہو سکتی ہے ، بشرطیکہ خدمت معمولی کی جائے ۔ پس جیسے گٹھلی انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ اُس کو بدل کر پیڑ اور پھل بنا سکتا ہے ، اسی طرح انسان اپنی غضب و سہوت کے اوپر اختیار رکھتا ہے کہ اُن کو بدل دے ۔ ہاں ان کا اس طرح استیصال کرنا کہ بالکل اثر نہ رہے ، اُس پر ہمارا قابو نہیں ہے ، مگر اُن کا دبا دینا ہمارے اختیار میں ہے ۔

نفس میں خلق کے وجود کے دو سبب ہوتے ہیں : ایک طبیعت ، دوسری عادت ۔

طبیعت یہ کہ کسی شخص کے مزاج کی اصل فطرت میں یہ ہو کہ اُس میں کسی خاص کیفیت کی استعداد زیادہ ہو اور وہ ادنیٰ سبب سے اُس کیفیت کے ساتھ متکیف ہو ، جیسے کسی کے مزاج کی اصل فطرت ایسی ہو کہ غصہ بہت آتا ہو یا شہوت اُس کو بہت ہو یا بلادت[1] ہو ۔

عادت یہ ہے کہ ابتدا میں کسی فعل کی مزاولت کی جائے

---

۱ ۔ بلادت : کند ذہنی ۔

اور بار بار اُس کو کیا جائے کہ پھر اُس کے کرنے میں سہولت ہو ، اور کچھ اُس کے کرنے میں فکر و تامل کرنے کی ضرورت نہ پڑے ۔ پس جو خلق طبعی ہے ، اُس کا بدلنا مشکل ہے کیوں کہ جس چیز کو بدلنا چاہتے ہیں ، وہ دیرپا ہے اور پیدائش کے ساتھ پیدا ہوئی ہے ۔ مثلاً شہوت ، غضب ، تکبر ہر ایک انسان میں موجود ہیں ۔ ان سب میں شہوت کا بدلنا مشکل ہے کیوں کہ وہ ابتدائے پیدائش سے ساتھ ہوتی ہے ۔ غصہ و تکبر تو مدت کے بعد آدمی میں پیدا ہوتے ہیں ۔ دوم جو خلق عادت ، یعنی کثرت عمل سے پیدا ہو . . . لوگ عادت کی مقتضا کے موافق کام کرتے ہیں اور اُس کی طاعت میں سرگرم رہتے ہیں اور اُسی کو پسندیدہ اور عمدہ سمجھتے ہیں ۔ اب اُس کے چار درجے ہیں ۔

اول یہ کہ آدمی جیسا پیدا ہوا ہے ویسا ہے ۔ حق اور باطل اور اچھے اور برے میں تمیز نہ کر سکے ، سب اعتقادات سے خالی اور غافل ہو اور نتائجِ لذات سے شہوت بھی کامل نہ ہوئی ہو ، تو ایسے شخص کا علاج جلد ہو سکتا ہے ۔ نفس اس کا لوحِ سادہ ہے آسانی سے اس پر نقش کوئی اُستاد یا مرشد جما سکتا ہے ۔

دوم یہ کہ عمل بد کو تو جانتا ہے مگر عمل صالح کا عادی نہیں ، عمل بد ہی اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ اس امر میں اپنی شہوت کا تابع ہے اور رائے صواب سے منحرف ہے ۔ مگر اپنے عمل کے قصور سے واقف ہے ؛ جانتا ہے کہ میں برا کرتا ہوں ، تو ایسے شخص کو روبراہ لانا پہلے آدمی کی نسبت مشکل ہے ، اس لیے کہ یہاں دو کام کرنے پڑیں گے ، ایک بری عادت کا مٹانا ، دوسرا بھلی عادت کا ڈلوانا ، مگر ایسا شخص بھی قابل تاثیر ہے ۔

سوم یہ کہ اخلاق بد پر اُس کو یہ اعتقاد ہو کہ یہ بہت اچھے ہیں اور ان کا کرنا واجب ہے اور انھی پر اُس کی پرورش

بھی ہوئی ہو ، تو ایسے شخص کا علاج قریب بہ محال ہے اور اُس کی اصلاح کی توقع نہیں ، کیوں کہ گم راہی کے اسباب بہت سے ہیں -

چوتھا یہ کہ باوجود رائے فاسد پر نشو و نما پانے اور اعمال بد پر پرورش ہونے کے یہ بات بھی ہو کہ بہت سے شر کرنے کو اور لوگوں کے تباہ کرنے کو باعث فضیلت اور فخر جانتا ہو اور خیال کرتا ہو کہ ہماری عزت اُس میں ہے - بس یہ درجہ سب سے زیادہ سخت ہے - ع

تربیت نااہل را چوں گردگاں برگنبد است

ان چاروں میں اول تو جاہل محض ، دوسرا جاہل اور گمراہ ، تیسرا جاہل گمراہ فاسق ، چوتھا گمراہ فاسق شریر -

جو لوگ حسن خلق سے یہ مراد جانتے ہیں کہ شہوت و غضب دونوں کا بالکل استیصال ہو ، اُن کی غلطی ہے ، کیوں کہ حسن خلق کے لیے تو اُن کو اعتدال پر لانا ضرور ہے - اگر بالکل اُن کو نیست و نابود کر دے تو جو فائدے اُن سے خلقت انسانی میں رکھے گئے ہیں ، وہ نابود ہو جائیں گے - اُن کو تو اوسط درجہ رکھنا حسن خلق میں داخل ہے - افراط و تفریط سے نفس کو بچانا چاہیے ، سخاوت کرنی چاہیے ، اسراف اور بخل سے بچنا چاہیے ، شجاعت کرنی چاہیے - اُس کی افراط تہوّر اور تفریط جبن چھوڑنا چاہیے - روزمرہ کے تجربے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہ توسط تعلیم و تادیب و صحبت نیک کے نفس انسانی خیر کو قبول کرتا ہے اور شر کو چھوڑتا ہے اور اُس کے برعکس بھی - اگر اخلاق میں تغیر نہ ہو تو پھر ساری قوموں کی تادیب اور جوانوں کی تہذیب اور اخلاق و عادات کی تقویم جو عاقلوں نے اپنے تجربوں سے مقرر کی ہے ، وہ سب باطل ہوتی ہے - یہ بات تو آنکھوں کے سامنے ہے کہ روز لڑکوں

کو دیکھتے ہیں کہ اُن کے اخلاق میں کیا کیا تغیر و تبدل ہوتے ہیں ۔ ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ بعض تعلیم و تربیت کو جلد قبول کر لیتے ہیں ، بعض دشواری سے دیر میں ؛ اسی لیے ماں باپوں پر فرض ہے کہ حسن خلق کی تعلیم و تادیب کریں اور اُن کی اصلاحِ عادات طرح طرح سے کریں ۔ کسی کو پیار سے ، کسی کو مار سے ؛ غرض جیسی اُن کی قابلیت و حالت ہو ۔

۶ ۔ حسن خلق کیوں کر حاصل ہوتا ہے

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حسن خلق سے اعتدال قوت عقل اور کمال حکمت اور اعتدالِ قوتِ غضب و شہوت اور اُن کا منقاد ہونا عقل کا مقصود ہے ۔ پس یہ حسن خلق دو وجہ سے حاصل ہوتا ہے : اول داد الٰہی ہے کہ آدمی ابتدائے پیدائش سے کامل العقل ، خوش خلق پیدا ہو اور شہوت و غضب کا غلبہ اُس پر نہ ہو بلکہ یہ دونوں عقل کے منقاد ہوں ۔ دوسرے یہ کہ ریاضت و محنت سے حاصل کرے ، یعنی نفس سے کام لے جس سے کہ خلق مطلوب حاصل ہو جائے ۔ مثلاً ایک شخص خلق سخاوت حاصل کیا چاہتا ہے تو وہ[1] یہ تکلف اہل سخاوت کا فعل ، یعنی بذل اختیار کرے اور ہمیشہ اپنے نفس پر زور ڈال کر یہ کام لیتا رہے ۔ یہاں تک کہ یہ امر اُس کی عادت ہو جائے اور طبیعت میں جم جائے ، تو اس بات سے سخی ہو جائے گا ۔

اسی طرح خلق تواضع کو حاصل کیا چاہے اور اس پر کبر غالب ہو تو اس کو چاہیے کہ اول مدت مدید تک اہل تواضع کے افعال پر بہ تکلف و مجاہدہ مواظبت[2] کرے ، یہاں تک کہ وہ افعال اُس پر

---

۱ ۔ اصل میں "اس کو" ہے ۔ مرتب

۲ ۔ مواظبت : ایک کام ہمیشہ کیے جانا ۔ مرتب

آسان ہو جائیں اور خلق اور طبیعت بن جائیں ۔ اور باقی اور اخلاق بھی اسی طرح حاصل ہوسکتے ہیں ۔ اور اُس کی انتہا یہ ہے کہ اُس کام میں آدمی کو لذت معلوم ہونے لگے؛ مثلاً سخی اُسی کو کہتے ہیں کہ جو مال خرچ کرے اور اُس میں اُس کو لذت ملے ۔ اگر کوئی خرچ کرے مگر اُس کو برا معلوم ہو تو وہ سخی نہ ہوگا ۔ اسی طرح متواضع وہ آدمی ہوگا جس کو تواضع میں مزہ ملے ۔

غرض حسن خلق جب آدمی جانے کہ مجھے حاصل ہوا کہ نفس کو اچھی عادتوں میں لذت آئے اور بری عادتوں سے نفرت ہو ۔ اگر کوئی شخص بری عادتیں چھوڑ دے اور نیک عادتوں میں لذت نہ پائے تو اُس کے حسن خلق کو کامل نہیں کہیں گے ۔ لذت کسی خلق میں جب ہی آتی ہے کہ اس میں مدت دراز تک برابر مواظبت کرتا رہے ، مثلاً جواری مفلس جوئے میں کیسا خوش ہوتا ہے اور مزہ پاتا ہے ، حالانکہ قمار بازی میں مال سب جاتا رہتا ہے ،گھر خراب ہوتا ہے ، پھر بھی محبت اور چسکا جوے کا لگا رہتا ہے ۔ سبب اس کا یہ ہے کہ کھیلتے کھیلتے اُس سے اُلفت ہو جاتی ہے ۔ چور اُچکوں پر کیسے کیسے کوڑے پڑتے ہیں اور قید خانے میں کیسی کیسی سختیاں اُٹھاتے ہیں ، مگر وہ لوگ اُس کو اپنا فخر سمجھتے ہیں اور سختی کی برداشت سے خوش ہوتے ہیں ، یہاں تک کہ اگر اُن کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو ، تو بھی نہ مال کا نشان دیں گے ، نہ اپنے ساتھیوں کا نام لیں گے ۔ ایسی سختیوں کا سہنا اور سزاؤں کا خیال میں نہ لانا اس وجہ سے ہے کہ اپنے اعتقاد میں ایسے کاموں کو سمجھ لیا ہے کہ وہ کمال شجاعت و بہادری کے ہیں ۔ اسی طرح مخنث ، کنجر ، حلال خور ، اپنے اپنے پیشے میں فخر و مباہات کرتے ہیں ، جیسے کہ حکما و سلاطین ۔ پس یہ امور عادت سے متعلق ہیں کہ جب ایک بات پر مدت تک

مواظبت ہوتی ہے اور ہم جولیوں میں وہی مشاہدہ ہوتی ہے تو اپنے نفس کو اچھی لگتی ہے۔

پس جب عادت کے سبب امر باطل سے لذت حاصل ہوتی ہو اور نفس اُس کی طرف راغب ہوتا ہو، تو امر حق پر اگر مواظبت مدت مدید تک رہے گی، اُس سے کیوں نہ لذت حاصل ہوگی۔

غرض اخلاق حسنہ کا اکتساب ریاضت سے ہوسکتا ہے۔ یعنی اول بہ تکلف اُن کے مرتکب ہونے سے، آخر کو وہ امور طبعی اور خلقی ہو جاتے ہیں۔

پس اخلاق حسنہ کبھی تو فطرت و خلقت کے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی عمدہ اعمال کے عادی ہونے سے، اور کبھی صلحا اور ارباب خیر کے افعال دیکھنے سے، کیونکہ ایک طبعت دوسری طبیعت سے شر اور خیر دونوں چراتی ہے۔ پس اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ جس میں تینوں جہات جمع ہوگئے ہوں؛ یعنی طبعاً اور عادۃً اور تعلم سے فضیلت کو پہنچا ہو، تو ایسا شخص نہایت درجہ فضیلت رکھتا ہے۔ اور جو شخص طبعت کا اچھا نہ ہو اور اسباب شر کے مہیا ہونے سے اُس کا عادی ہو گیا ہو اور صحبت والے بھی اُس کے خراب ہوں، تو وہ پرلے درجے کا ردیل اور ذلیل ہے۔ اور جس میں اُن جہات[1] کا اختلاف ہو، یعنی کوئی بات پائی جائے اور کوئی نہ پائی جائے تو اُس کا رتبہ ان دونوں مرتبوں کے درمیان ہے۔

۷۔ تہذیب اخلاق کے طریق

نفس اور بدن کی صحت اور مرض کا حال یکساں ہے؛ جیسے کہ اعتدال اخلاط سے صحت بدن کو رہتی ہے، اسی طرح اعتدال اخلاق سے صحتِ نفس رہتی ہے، اور جیسے اخلاط کی بے اعتدالی سے

۱۔ نسخۂ اول میں 'جبات' غلط ہے۔ مرتب

بدن میں امراض پیدا ہوتے ہیں ، ایسے ہی قوائے باطنی کی بے اعتدالی سے نفس میں سقم اخلاق پیدا ہوتا ہے - جیسے بدن کی صحت کی صورت میں فقط صحت کی حاجت اور مرض کی حالت میں علاج کی ضرورت ہے ، ایسی نفس کی صحت[1] کی صورت میں فقط صحت کی اور نفس کے مرض کی صورت میں علاج کی ضرورت ہے -

ہر مرض کا علاج بالضد کیا جاتا ہے - اگر مزاج میں حرارت ہو تو سرد دوائیں دی جاتی ہیں اور اس میں شدت ، ضعف ، دوام اور اتفاق ، کثرت ، قلت کی رعایتیں کی جاتی ہیں - اور دواؤں کے درجے کے موافق ان کی مقدار ، وزن ، احوال بدن کے مناسب ، مریض کے سن و سال کے موافق اور مرض کی شدت و ضعف کے بموجب ہوا کرتی ہے - ان سب باتوں پر خیال کرکے طبیب حاذق نسخہ لکھتا ہے اور ایسی محرور دوائیں نہیں دیتا کہ حرارت پیدا ہو جائے بلکہ حرارت و برودت میں اعتدال پیدا کرنا ہے -

پس اسی طرح استاد یا مرشد ، جو شاگردوں یا مریدوں کے معالج امراض نفسانی ہیں ، ان کو چاہیے کہ وہ پہلے ان کے اخلاق اور امراض نفسانی کی تشخیص کریں اور ان کے مزاج سے واقف ہوں اور پھر علاج بتدریج شروع کریں - اگر بہت سے مرضوں میں مبتلا ہو تو پہلے جو مرض سب سے زیادہ سخت ہو اس کا علاج کریں - مثلاً شاگرد جاہل ہو تو اس کو علم سکھائیں ، اگر کوئی بخیل ہو تو اس کو مال خرچ کرنے کی تحریص دلائیں ، مگر نہ اتنی کہ اسراف کے درجے پر پہنچ جائے - اگر کوئی متکبر ہو تو اس کو فروتنی بتلائیں ، مگر اعتدال کے ساتھ - جو کھلنڈرے لڑکے ہوں ، ان کو مکتب میں اول ترغیب گیند بلا وغیرہ کی دیں ،

---

۱ - نسخۂ اول میں ہے ''نفس کی صورت صحت میں'' - مرتب

پھر کھیل سے عمدہ کپڑوں کی ترغیب ، بعد اس کے ریاست اور
جاہ کی ترغیب ، پھر اُن سب کے بعد جاہ و ریاستِ آخرت کی طرف
برانگیختہ کیے جائیں -

غرض جو لوگ مرض روحانی میں مبتلا ہوں ، اُن کا علاج
بہ تدریج اور حکمت سے کیا جائے - امراض جسمانی تو اکثر ظاہر
معلوم ہوتے ہیں ، بعض ہی اُن میں ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بیمار کو
نہیں معلوم ہوتے ، مگر امراض قلب آدمی کو بہت کم معلوم ہوتے
ہیں - اسی واسطے آدمی اُن سے غافل رہتا ہے اور اگر جان بھی جاتا
ہے تو اُس کے علاج کی تلخی پر صبر مشکل ہے ، اس لیے کہ دوا
اُس کی شہوات کی مخالف ہے جس کو وہ جان کندنی سے کم نہیں
سمجھتا - اور نفس میں صبر بھی پاتا ہے تو کوئی معالج حاذق نہیں
ملتا کہ اُس کا علاج کرے -

امراض قلبی کے طبیب علما ہیں ، وہ خود اُس مرض میں مبتلا
ہیں - پس جب وہ اپنا ہی علاج نہیں کرتے تو کسی دوسرے کا
علاج کیا کریں گے - ع

خود گمرہ است کرا رہبری کند

اسی جہت سے امراض قلوب لاعلاج ہوگئے ہیں - اُن کا علم
لوگوں میں بہت کم رہا ہے - بہت ہی کم ایسے امراض کی تشخیص
کرنے والے رہ گئے ہیں -

۸ - حسن خلق کی علامات

انسان کو اپنے عیوب سے خبر نہیں ہوتی - جب وہ اپنے میں
دیکھتا ہے کہ میں نے بڑے بڑے گناہ کرنے چھوڑ دیے ، تو وہ
جاننے لگتا ہے کہ میں مہذب ہو گیا اور مجھ میں حسن خلق پیدا
ہوگیا ، اس لیے ہم حسن خلق کی علامات بتاتے ہیں کہ جب آدمی
اپنے میں اُن کو نہ دیکھے تو وہ جان لے کہ مجھ میں ابھی سوء خلق

باقی ہے -

حسن خلق جس آدمی میں ہوگا ، وہ کثیرالحیا ، کثیرالصلاح ، کم آزار ، کم سخن ، غیر فضول ، کثیرالعمل ، کم لغزش ، راست گفتار ، نیکوکار ، صاحب وقار ، صابر شاکر ، راضی ، حلیم ، رفیق ، پارسا ، شفیق ، بشاش بشاش ہوگا - اور بدگفتار ، دشنام دہندہ ، چغل خور ، غیبت کنندہ ، جلد باز ، کینہ ور ، بخیل ، حاسد نہ ہوگا - بغض و غضب اللہ کے ہی واسطے اس میں ہوگا اور حب و رضا اللہ ہی کے واسطے - اتنی باتوں سے خوش خلق ہوتا ہے -

بعض بزرگان دین نے لکھا ہے حسن خلق کی دس علامتیں ہیں : قلت خلاف ، حسن الصاف ، انتقام نہ لینا ، گناہوں کا برا جاننا ، عذر کرنا ، ایذا سہنا ، نفس کو ملامت کرتے رہنا ، دوسروں کے عیوب سے قطع نظر کرکے اپنے عیوب کو پہچاننا ، چھوٹے بڑے سے بہ کشادہ پیشانی پیش آنا ، اپنے سے ادنٰی اور اعلٰی کے ساتھ نرمی سے بولنا -

بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ حسن خلق میں اول دین ، دوم عقل ، سوم علم ، چہارم حلم ، پنجم جود ، ششم فضل ، ہفتم بِر ، ہشتم صبر ، نہم شکر ، دہم لینت (نرمی) -

جس میں حسن خلق ہوتا ہے وہ مومن ہوتا ہے ، جس میں نہیں ہوتا وہ منافق ہے - مومن فکر و غیرت میں مشغول رہتا ہے اور منافق حرص و امل میں - مومن سوائے خدا کسی سے توقع نہیں رکھتا اور منافق بہ جز خدا کے سب سے متوقع رہتا ہے - مومن سوائے اللہ تعالٰی کے سب سے مامون اور بے خوف رہتا ہے ، منافق سوا خدا کے سب سے خائف رہتا ہے - مومن مال دیتا ہے دین نہیں دیتا ہے ، منافق دین دیتا ہے مال نہیں دیتا - مومن حسنات کرکے روتا ہے ، منافق گناہ کرکے ہنستا ہے - مومن کو خلوت و تنہائی

اچھی معلوم ہوتی ہے، منافق کو جاؤ اور جماعت اچھی لگتی ہے۔ مومن کھیتی کرتا ہے اور اس کے بگاڑ سے ڈرتا ہے، منافق سخ کنی کرتا ہے اور توقع خرمن کی رکھتا ہے۔

حسن خلق کا اول امتحان ایذا پر صبر کرنے سے ہوتا ہے۔ پس جو کوئی دوسرے کی بدخلقی کی شکایت کرے، وہ اسی کی بدخلقی کی دلیل ہے، کیوں کہ حسن خلق ایذا اور جفا کی برداشت کا نام ہے۔

ابو عثمان حیری کو کسی شخص نے بہ طور امتحان دعوت کے بہانے بلایا۔ جب آپ اس کے گھر گئے تو کہا "اس وقت تو مجھ سے کھانا تیار نہیں ہو سکا" آپ وہاں سے واپس چلے گئے۔ جب بہت دور نکل گئے تو وہ شخص پھر آیا اور کہا "جو اس وقت کھانا موجود ہے اس پر ماحضر کیجیے"۔ جب وہ اس کے گھر آئے تو وہی بات پھر کہی جو پہلے کہی تھی۔ وہ پھر اٹھ چلے گئے۔ اسی طرح کئی بار بلایا اور پھر پھیر دیا مگر آپ اس سے ذرا مکدر نہیں ہوئے۔ تو وہ شخص پاؤں پر گر پڑا اور کہا میں آپ کو آزماتا تھا۔ سبحان اللہ! کیا حسن خلق ہے! آپ نے فرمایا کہ جو بات تو نے میری دیکھی، وہ تو صفت کتے کی ہے کہ جب بلاؤ چلا آوے اور ہنکاؤ تو ہٹ جاوے۔

انہی آتھی کا ذکر ہے کہ وہ ایک گلی میں سوار جاتے تھے کہ اوپر سے کسی شخص نے اُن پر راکھ پھینک دی، تو انہوں نے اُتر کر خاک جھاڑی اور سجدہ شکر ادا کیا۔ جب لوگوں نے کہا کہ راکھ پھینکنے والے کو آپ نے جھڑکا نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ جو شخص آگ کا مستحق ہو، اُس پر راکھ پڑے تو اُس کو غصہ نہیں کرنا چاہیے۔

انسان کا بڑا حسن خلق یہ ہے کہ تقدیرات الٰہی پر راضی

رہے ، اور پرلے درجے کا خلق بد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے کام کو اچھا نہ جانے اور اس پر راضی نہ ہو ۔

غرض جب تک اپنے نفس میں یہ علامات نہ پائے ، وہ اپنے تئیں جان لے کہ مجھ میں حسن خلق نہیں پیدا ہوا ۔ اس کو ریاضت اور محنت حسن خلق کے حاصل کرنے میں کرنی چاہیے۔ فقط ۔

۸ ۔ لڑکوں کی ریاضت اور تادیب اور تحسین اخلاق

لڑکا ماں باپ پاس ایک امانت ہے ۔ اس کی تہذیب نہایت ضرور ہے ۔ اس کا قلب ہر نقش و صورت سے خالی ہوتا ہے ، وہ ہر ایک نقش کے قبول کرنے کی قابلیت رکھتا ہے ۔ ''لوح سادہ برائے ہر نقش آمادہ'' ۔ جس طرف کو مائل کرو ، اس طرف میلان کے لائق ہوتا ہے ۔ مثلاً اگر تعلیم خیر کی پاوے اور اس کا عادی کیا جاوے تو بڑا ہو کر بھی ایسا رہے گا اور اگر برائی کا عادی ہوگا اور جانور کی طرح بے غور چھوڑ دیا جائے گا ، تو تباہ ہوگا ۔

غرض ماں باپ کا یہ فرض ہے کہ اولاد کو تہذیب اور محاسن اخلاق سکھائے اور صحبت بد سے بچائے ۔ زینت اور بناؤسنگار اور لذت اور آرام طلبی اس کی نظروں میں حقیر کرے تاکہ بڑے ہونے پر ان کی طرف اس کی رغبت نہ ہو ۔

سب سے پہلے لڑکوں پر کھانے کی خواہش غالب ہوتی ہے تو اسی کے ادب اس کو سکھانا[1] چاہئیں کہ دہنے ہاتھ سے کھائے ، کھانے میں 'بسم اللہ' کہے اور اپنے سامنے سے کھائے ۔ دوسروں سے پہلے کھانا نہ شروع کرے اور کھانے کی طرف گھورے نہیں ، اور نہ کسی کے کھانے کی طرف تاکے ، اور جلدی جلدی نہ

---

۱ ۔ اصل میں ''سکھانے چاہیے'' ہے ۔ مرتب

کھائے ، اچھی طرح چبا چبا کے کھائے ، اور نوالے ہو نوالہ منہ میں نہ رکھتا چلا جائے ، ہاتھ اور کپڑے نہ بھرے ۔ کبھی اُس کو کھانے پر ضد نہ کرنے دے کہ یہ ہم کھاتے ہیں اور یہ نہیں کھاتے ، بلکہ اُس کو عادت ڈلوانی چاہئے کہ روکھی سوکھی روٹی اور دال دلیا ، جو کچھ میسّر ہو ، اس[1] پر قناعت کرے ۔ اُس کو زیادہ کھانے سے منع کرنا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ زیادہ کھانا چوپایوں کا کام ہے ۔ اُس کے ہاتھ سے کھانا بھوکوں کو دلوانا چاہیے ۔

بعد کھانے کے کپڑا پہننا ہے ۔ اُس کو سفید سادے کپڑوں کے پہننے کی رغبت دلانی چاہیے ۔ رنگین اور ریشمی باریک کپڑوں کی طرف اُس کو رغبت نہ دلانی چاہیے اور کہنا چاہیے کہ یہ عورتوں کا لباس ہے ۔ اُس کو ایسے لڑکوں کی صحبت سے بچانا چاہیے جن کو شوق اور عادت آرام طلبی اور عمدہ پوشاک کی ہو ، اور ایسوں سے بھی نہ ملنے دے جن کے کہنے سے اُس کے دل میں ان باتوں سے رغبت ہو جائے ۔ اس لیے کہ ابتدا میں اگر لڑکے کی خبر گیری نہیں ہوتی تو اکثر بری عادتیں اُس میں پیدا ہوتی ہیں ؛ جھوٹا ، جھگڑالو ، چغل خور ، بیہودہ گو ، ہنسوڑ ، مکار ، بے پروا ہو جاتا ہے ۔

مکتب میں کسی نیک اُستاد پاس بٹھانا چاہیے کہ اول وہ فرائض مذہبی سکھائے ۔ اکثر اُس کو نیک آدمیوں کی حکایات کا سبق دے ، اشعار جن میں عشق اور عاشق و معشوق کا ذکر ہو ، اُس کو ہرگز پڑھنے نہ دے ، بلکہ اُن لوگوں سے بھی نہ ملنے دے جو ایسے اشعار کو ظرافت اور لطافت جانتے میں ۔ یہ

---

۱ ۔ اصل میں ''ان پر'' ہے ۔ مرتب

اشعار دل میں فساد کا بیج بوتے ہیں ۔

جب لڑکا کوئی عمدہ کام کرے تو چاہیے اس کو کچھ انعام دے ، جس سے وہ خوش ہو اور لوگوں میں اُس کی تعریف ہو ۔ اگر وہ ایک دو مرتبہ خلاف کرے تو اُس سے تجاہل اختیار کرے ، لڑکے کو یہ معلوم ہو کہ باپ کو خبر ہی نہیں ہوئی ۔ اگر اُس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ باپ پر ظاہر ہونے پر بھی کچھ نہیں ہوا تو آئندہ کو اُسے برے کام کرنے کی جرات ہوگی اور بات کے کھل جانے کی کچھ پروا نہ ہوگی ۔ پھر اگر دوبارہ وہی حرکت کرے تو پوشیدہ اُس پر عتاب کرے اور تاکید سے کہے کہ اگر آئندہ ایسا کروگے تو سزا پاؤگے اور لوگوں میں تمھاری فضیحتی ہوگی ۔

ہر وقت عتاب کرنا نہیں چاہیے ۔ اُس سے ملامت کا عادی ہو جاتا ہے ۔ بری باتوں کے کرنے کی جرات بڑھ جاتی ہے ، تنبیہ کی تاثیر دل سے اُٹھ جاتی ہے ۔

ماں باپوں کو چاہیے کہ اولاد سے کلام لحاظ کے ساتھ کیا کریں ۔ کبھی کچھ گھرک دیا ۔ ہر وقت گھرکی اور جھڑکی رہے گی تو مساوات ہو جائے گی ۔

دن کو سونے کی عادت نہیں ڈلوانی چاہیے ۔ بچھونے بھی تکلف کے نہیں دینے چاہئیں ۔

غرض سب باتوں میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ لڑکے کو آرام طلبی کی عادت نہ ہو ۔ کوئی کام اُس کو چھپا کے کرنا نہیں چاہیے کیوں کہ جس کام کو وہ چھپا کے کرے گا ، اس کو برا جانتا ہوگا ، تو چھپا کر کرے گا ۔ پس اگر اُس کو علانیہ کام کرنے کی عادت ہوگی تو برے افعال سے باز رہے گا ۔

دن کو کوئی وقت اُس کے پھرنے اور چلنے اور تفریح کا

مقرر کرنا چاہیے جس سے سستی کا غلبہ نہ ہو۔ یہ بھی اُس کو منع کرنا چاہیے کہ وہ اپنے باپ کا فخر ہم جولیوں کے سامنے نہ کرے ، کھانے پہننے کی چیزوں پر اِتراوے نہیں۔ جس سے وہ ملے ، تواضع اور اکرام کے ساتھ۔ کلام ملائمت سے کرے اور لڑکوں سے کوئی چیز نہ لے۔ اگر امیر زادہ ہے تو اُس کو لینا نہیں چاہیے ، دینا چاہیے ، لینے میں کسر شان ہے؛ اور اگر فقیر زادہ ہے تو لینا طمع اور دلت میں داخل ہے۔ کتے کی عادت ہے کہ لقمے پر دوڑتا ہے اور دُم ہلاتا ہے۔

زیادہ ولنے سے بھی منع کرنا چاہیے کیوں کہ وہ بے حیائی کی نشانی ہے۔ کمنے آدمی زیادہ بکا کرتے ہیں۔ قسم خواہ سچی ہو یا جھوٹی ، کبھی نہیں کھانی چاہیے تا کہ بڑے ہونے پر قسم کھانے کی عادت نہ پڑے۔ جب کوئی پوچھے تو جواب دے ، زیادہ بک بک نہ کرے۔ کبھی لغو و لعنت و فحس و دشنام نہ بولے ، بلکہ جو ایسے ہوں کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہوں ، اُن کی صحبت سے بچانا چاہیے۔

جب اُستاد مارے تو زیادہ شورش نہ کرے۔ نہ کسی کی سفارش ڈھونڈے بلکہ صبر کرے۔ اُس سے کہہ دیں کہ صبر کرنا مردوں کا کام ہے۔ زیادہ رونا پیٹنا عورتوں اور غلاموں کا کام ہے۔

مکتب سے آنے کے بعد اُس کو کسی اچھے کھیل کی اجازت دینی چاہیے جس سے کہ مکتب کی مشقت سے راحت ملے ، مگر کھیل بھی اتنا کھیلے کہ تھک نہ جائے۔ اگر کھیل کی اجازت نہ ہوگی ، تعلیم میں کمال سخت گیری ہوگی ، تو لڑکے کا دل بجھ جائے گا ، تیزی طبیعت جاتی رہے گی ، زندگی تلخ ہو جائے گی؛ پھر وہ ایسے حیلے ڈھونڈنے لگے گا کہ جس سے بالکل کچھ نہ سیکھے گا۔ سب سے مقدم کام یہ ہے کہ وہ اپنے والدین اور اُستاد کی اطاعت

کیا کرے -

خلاصہ یہ ہے کہ لڑکے[1] کی تربیت ابتدا میں بہت ضروری ہے کہ اُس وقت اُس میں سب طرح قابلیت ہوتی ہے ؛ خیر و شر دونوں سیکھ سکتا ہے - اور اُس کا اختیار ماں باپ کو ہے کہ پہلے سے اُس کی تربیت اچھی کریں تاکہ نیک باتیں اُس کے دل میں پتھر کی لکیر ہوجائیں ، نہیں تو پھر اُس کا اثر کچھ نہ ہوگا ؛ جیسے کہ خشک مٹی دیوار پر نہیں ٹھہرتی ، اُتر جاتی ہے -

۹ - عدالت

اُوپر بیان ہوا ہے کہ عدالت اُس حالت و قوتِ نفس کا نام ہے کہ شہوت و غضب اُس کے محکوم ہوتے ہیں اور وہ اُن کی حاکم ہوتی ہے ، اور حکمت و اعتدال کے موافق اُن قواء کا انضباط کرتی ہے - پس عدالت تمام فضائل سخاوت ، شجاعت و عفت کی جان ہے - عدالت کے تحت بارہ انواع ہیں :

اول صداقت : جو عبارت دوستیِ صادق سے ہے اور صدق محبت کی علامت یہ ہے کہ جو انسان اپنے لیے نہ پسند کرے وہ دوست کے لیے بھی نہ پسند کرے اور جو اپنے حق میں چاہے وہ اُس کے حق میں بھی چاہے -

دوم الفت ؛ وہ یہ ہے کہ کسی طائفے کی آراء اور عقائد ایک دوسرے کی معاونت میں متألف[2] اور موافق ہوں -

سوم وفا ؛ یہ ہے کہ وعدے کو پورا کریں اور حقوق کو ادا -

چہارم شفقت ؛ وہ عبارت اس سے ہے کہ جب کسی پر کوئی

---

۱ - اصل میں "لڑکوں" ہے -

۲ - متألف : سازگار - مرتب

ناملائم بات واقع ہو تو اُس سے انفعال ہو اور اُس کے دور کرنے میں قصور ہمت نہ ہو اور یہ سمجھیں کہ :

بنی آدم اعضاے یک دیگراند — کہ در آفرینش زیک جوہراند
چو عضوے بہ درد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار
تو در محنت دیگراں بے غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

پنجم صلۂ رحم ؛ اُسے کہتے ہیں کہ اپنے یگانوں کو ثروت و رفاہیت میں اپنے ساتھ شریک کرے ۔

ششم مکافات : یہ ہے کہ جو نفع کسی سے پہنچے ، مثل اُس کے یا اُس سے زیادہ اُس کے مقابل میں پہنچائے ، اور اگر ضرر پہنچے تو کم تر بدلہ لے ۔

ہفتم حسن شرکت : یہ ہے کہ معاملات اس طرح کرے کہ شرکا کی انحرافِ خاطر کا سبب حتی‌الامکان نہ ہو اور قانون عدالت کی محافظت ہو ۔

ہشتم حسن قضا : یہ کہ آدمیوں کے حقوق ادا کرے اور اپنے تئیں منت و مذمت سے دور رکھے ۔

نہم تودد : یہ ہے کہ برابر والوں اور بڑوں کی دوستی طلب کرے بہ‌طیب کلام و انعام و اکرام اور اَور اسباب سے کہ جس سے جلب محبت ہو ۔

دہم تسلیم : احکام الٰہی اور نوامیس[1] شرعی سے راضی ہو، گو وہ طبیعت کے ناموافق ہوں ۔

یازدہم توکل : جن امور میں کہ بشر کو مقدرت نہ ہو اور جن میں اندیشے کو مجال تصرف نہ ہو ، اس میں زیادت و نقصان و تعجیل و تاخیر نہ طلب کرے اور توکیل بہ نعم‌الوکیل کرکے

---

۱ - نوامیس : جمع ناموس - مرتب

خیالات فضول سے کنارہ کرے ۔ ارادت حق کے ساتھ اپنی ارادت کو قائم رکھے ، وساوس نفسانی سے دل کو خالی کرے ۔

دوازدہم عبادت : کہ خدا تعالیٰ کی تمجید و تعظیم کرے اور معاصی سے احتراز کرے ۔

اب انتظام معاش کے امور تین طرح کے ہوتے ہیں : اول متعلق قسمت اموال و کرامات سے ۔ دوم متعلق معاملات و معاوضات سے ۔ سوم متعلق تادیبات (تعلیات) سیاسات (تعزیرات) ۔ عدالت میں حفظ مناسبت جو وحدت کی طرف راجع ہو ، ہوتی ہے ۔

ان تینوں صورتوں میں مناسبت اس طرح دیکھی جاتی ہے کہ اول میں یہ دیکھتے ہیں کہ یہ شخص اس مال یا کرامت سے ایسی نسبت رکھتا ہے جیسا کہ کوئی اور شخص ہم رتبہ اس کا مثل اس کے نسبت مال یا کرامت[1] سے رکھتا ہے ۔ پس اگر یہ کرامت اس کا حق ہو اور اس میں زیادتی یا نقصان واقع ہو ، تو اس کا تلافی و تدارک ہونا چاہیے ۔ دوسرے میں یہ مناسبت ہوتی ہے کہ اس نجّار کی نسبت اس کرسی سے ایسی ہے جیسے کہ اس بزاز کو اس جامے سے ، تو کرسی اور جامے کے معاوضے میں کوئی ظلم نہیں ہے ۔ یا یوں کہیں کہ اس کرسی کی زر سے ایسی ہی نسبت ہے جیسے کہ اس زر کی نسبت جامے سے ، یا کرسی کی زر سے وہ نسبت ہے جو جامے کو زر سے ، تو کرسی و جامے کے معاوضے میں کوئی ظلم نہیں ہے ۔ سوم یہ کہیں کہ اس شخص کو اپنے رتبے سے وہ نسبت ہے جو دوسرے شخص کو اپنے رتبے سے ۔ پس اگر شخص اول کو دوسرے شخص سے ضرر پہنچے یا اس پر ظلم ہو تو ایسے سبب سے مکافات و تدارک کرنا چاہیے کہ جس سے عدالت قائم رہے ۔

---

۱ ۔ اصل میں "کرمت" ہے ۔ مرتب

پس عدالت کے قائم رکھنے کے تین طریقے ہیں : اول شریعت الٰہی ؛ چونکہ انسان مدنی الطبع ہے ، اس کا تعیش بے معاونت و مشارکت کے[1] صورت پزیر نہیں ہوتا ، مشارکت و معاوضت ضرور ہے ۔ درزی جلاہے کے واسطے کپڑا سیے اور جلاہا درزی کے واسطے کپڑا بنے اور علی ھذاالقیاس ۔ جب یہ اشیاے مختلف الماہیت آپس میں بے توسط کسی اس وجدانی کے کہ محک اعتبار دونوں طرف کا ہو ، منتظم نہیں ہونا اس لیے حاجت توسط روپے کی ہوئی ؛ اُس کو عادل متوسط کہتے ہیں ۔ لیکن یہ عادل صامت ہے ، وہ عادل ناطق کا محتاج ہے ۔ وہ بادشاہ عادل ہے ، جس کی تائید شمشیر کرتی ہے ۔ اگر کوئی عدالتِ دینار کا مطیع نہیں ہوتا اور اور اپنے حق سے زیادہ طلب کرتا ہے اور اپنی حدِ مستقیم سے باہر قدم رکھتا ہے تو شمشیر قاطع اُس کو سربراہ کرتی ہے ۔ پس فقط عدالت کی تین صورتیں ہیں ؛ ایک شریعتِ مقدسۂ الٰہی ، دوم بادشاہ عادل ، سوم دینار ۔ چنانچہ حکما کہتے ہیں کہ ناموس اکبر شریعتِ الٰہی ہے ۔ ناموس دوم سلطان کہ تابعِ شریعت ہو ۔ مشہور ہے کہ 'الدین و الملک تواماں[2]' ۔ ناموس سوم دینار ۔ ناموس کے معنی لغت میں تدبیر و سیاست کے ہیں ۔ اس طرح سے جائر ، یعنی جور کرنے والے تین ہیں : اول جائرِ اعظم یعنی جو ناموس الٰہی کی اطاعت نہیں کرتا ، وہ کافر و فاسق ہے ۔ دوم جائرِ اوسط کہ بادشاہِ زمان کی اطاعت نہیں کرتا ، اُس کو باغی طاغی کہتے ہیں ۔ سوم جائرِ اصغر کہ راہِ عدالت ، جو مقتضاے دینار ہے ، نہیں چلتا اور اپنے حق سے زیادہ طلب کرتا ہے ، اُس کو خائن و سارق

---

۱ ۔ اصل میں "کی" ہے ۔ مرتب

۲ ۔ بادشاہ اور دین جڑواں ہیں ۔ مرتب

کہتے ہیں۔

ارسطاطالیس کا قول ہے کہ عدالت فضیلت کا جزو نہیں بلکہ کل فضیلتیں ہیں۔ اور جور جو اُس کے مقابل ہے، وہ رذیلت کا جزو نہیں بلکہ کل رذیلتیں ہیں۔ اول عدالت متعلق بذات شخصی اور اُس کے قواء کی ہے۔ دوم شرکاء اور اہل منزل (جو لوگ اُس کے ساتھ گھر میں رہتے ہیں) کی، سوم اہل مدینہ (جو اُن کے ساتھ شہر میں رہتے ہیں) کے ساتھ۔

حکماء تمثیل کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ جو چراغ اپنے نزدیک کی چیزوں کو روشن نہیں کر سکتا، بطریق اولیٰ دور تر کو روشن نہیں کر سکے گا، یعنی جو شخص اپنے نفس کی اصلاح حال نہیں کر سکتا، قوائے بدن و جوارح و آلاتِ جسمانی میں عدالت سے عاجز ہو، اس سے اہل منزل و مدینہ کے ساتھ عدالت متصور نہیں ہو سکتی۔ جب کوئی شخص اپنے بدن اور اپنے قواء میں عدالت کر سکتا ہے اور افراط اور تفریط سے مجتنب رہتا ہے، وہ بنی نوع جو اہل منزل و مدینہ ہوں، اُن کے ساتھ بطریق عدالت مسلوک ہو سکتا ہے، وہ خلیفۂ الٰہی ہو سکتا ہے۔

حکما کہتے ہیں کہ جب مصالح انام کی زمام ایسے بزرگوار کے قبضۂ اقتدار اور اختیار میں ہوتی ہے تو زمانہ نورانی ہوتا ہے۔ اور اُس کے روزگارِ ہمایوں کے میامن سے کھیتی و نسل میں برکت ہوتی ہے۔ ارسطاطالیس نے عدالت کو تین طرح سے تقسیم کیا ہے: ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی عبودیت کے حق ادا کرنے کے واسطے ہو کہ جس کے جود نے خلعت وجود، بے سابقہ استحقاق، ہر موجود کو پہنایا ہے۔ ذرات ممکنات کو لطف اللہی کے خزانے سے نعمتیں نامتناہی عطا فرمائی ہیں۔ اس لیے عدالت کا مقتضا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے جو حقوق بندے پر ہیں، اُن کو بطریق افضل ادا کرے۔

رسوم عبودیت کی عادت میں کوئی دقیقہ نامرعی نہ رکھے - دوم جو بنی نوع کی مشارکت سے متعلق ہے ، جیسے تعظیم سلاطین و تکریم علماء اور ائمہ دین اور ادائے امانات اور معاملات کے انصاف سے متعلق ہے - سوم حقوق اسلاف کے ادا کے قیام کے واسطے جو بجا ہیں ضروری ہوں ، جیسے قرضوں کا ادا کرنا ، اُن کی وصیتوں کا نافذ کرنا ، اسی قسم کی اور باتیں - عدالت سے بہتر کوئی فضیلت نہیں ہے اس لیے حدیث مصطفوی ہے کہ "عدل ساعة خیر من عبادت سبعین سنة" یعنی ایک ساعت کا عدل ستربرس کی عبادت سے افضل ہے - کیوں کہ ایک ساعت کے عدل کا اثر تمام عباد و بلاد میں پہنچتا ہے اور مدتوں رہتا ہے -

عبداللہ بن المبارک[1] کا قول ہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ میری ایک دعا قبول ہو گی تو میں وہ اصلاح حال بادشاہ کے لیے کروں تاکہ اُس کا نفع عموم خلائق کو پہنچے -

عدالت[1] کی اساس ان دس قاعدوں پر بادشاہ کو رکھنی چاہیے:

اول جب کوئی قضیہ واقع ہو تو بادشاہ یہ فرض کر لے کہ میں رعیت ہوں اور دوسرا بادشاہ اس سبب سے ، جو اپنے اوپر نہ گوارا کرے گا ، وہ رعیت پر جائز نہ رکھے گا -

دوم ارباب حاجات کو منتظر نہ رکھے اور اُس سے پرحذر رہے - ارسطو نے سکندر کو نصیحت کی تھی کہ اگر تو خدا تعالیٰ کی اعانت چاہتا ہے تو فریاد خواہوں کی داد رسی میں جلدی کر -

سوم شہوات و لذات جسانی میں مستغرق نہ ہونا چاہیے ، کیونکہ ملک میں یہی سبب فساد کا قوی تر ہوتا ہے - بلکہ

---

۱ - اصل میں "بنا عدالت کی اساس" ہے - مرتب

اوقات راحت اور فراغت میں سے بھی کچھ مملکت و مصلحت رعیت میں خرچ کرنا چاہیے۔

ایک حکیم نے بادشاہ کو نصیحت کی تھی کہ خواب غفلت میں تو ایسا نہ سو کہ ملک میں آور لوگ جاگیں اور تیری شکایت خدا کی درگاہ میں کریں۔ اتنا مت سو کہ عمر تباہ ہو جائے۔ دولت اور عمر کا حال آفتاب کا سا ہے کہ صبح کو کسی دیوار پر اور شام کو کسی دیوار پر۔ ایسا کر کہ دنیا کو تو کھائے، نہ یہ کہ دنیا تجھے کھائے۔

چہارم، یہ کہ بنائے کار کو رفق اور مدارا پر رکھے، نہ عنف[1] و قہر پر۔

پنجم، رضائے خلق رضائے حق میں طلب کرے۔

ششم، رضائے خلق کے لیے حق سے مخالفت نہ کرے۔

ہفتم، جس وقت خلق، حکم طلب کرے تو عدل کرے۔ جب رحمت طلب کرے تو عفو۔

ہشتم، اہل حق کی صحبت پر مائل ہو۔ مواعظ و نصائح سے منقبض نہ ہو۔

نہم، ہر شخص کو اپنے استحقاق پر قائم رکھے اور فقط اسی پر قناعت نہ کرے کہ آپ ظلم نہ کرے، بلکہ سیاست ملک میں ایسی رکھے کہ عمال و لشکری اور رعایا آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کر سکیں۔

عدالت کے بعد فضل و احسان ہے۔ اب اس میں لوگ گفتگو کرتے ہیں کہ تفضل[2] محمود نہیں ہے اور عدالت نہیں۔ اس واسطے

۱۔ عنف: درشتی، تندی، جھگڑالو پن۔

۲۔ اصل میں "بفضل" ہے۔ مرتب

کہ عدالت کے معنی مساوات کے ہیں اور تفضل کے معنی زیادت کے ہیں ۔ اور حد اعتدال سے خارج ہونا ، خواہ افراط کی طرف ہو یا تفریط کی طرف ، مذموم ہے، اس لیے چاہیے کہ تفضل مذموم ہو ۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ تفضل عدالت کی احتیاط کا نام ہے کہ جس سے وقوع نقصان سے انسان ایمن ہوتا ہے ۔ توسط میں احتیاط تمام ملکات میں ایک طرح سے ہوتی ہے ۔ مثلاً سخا میں جو وسط اسراف و بخل کے درمیان ہے ، زیادہ کی طرف میل سخا کی احتیاط کی رعایت ہے اور ایسے ہے عفت کہ شرہ و خمود[1] کے درمان وسط ہے ، میل نقصان کی طرف عفت کی احتیاط ہے ۔ نفضل جب تک متحقق نہیں ہوتا کہ اس میں شرائط عدالت کی رعایت نہ پائی جائے ۔ اول استحقاق کی رعایت کی جاتی ہے ، پھر اس میں احتیاط اور استظہار کے واسطے زیادتی[2] کی جاتی ہے ۔ اگر تمام مال بغیر مصرف استحقاق صرف کرے تو وہ متفضل نہیں کہلائے گا بلکہ مبذّر ۔ پس تفضل اس عدالت کا نام ہے جو احتلال سے ایمن ہو اور متفضل وہ عادل ہے جو عدالت میں محتاط ہو ۔ اس کو شرف اسی سبب سے ہے کہ اس سے عدالت میں مبالغہ اور احتیاط دونوں ہوتے ہیں ۔ وہ عدالت سے خارج نہیں ہوتا ۔

حکما کی ایک جماعت کا قول ہے کہ اگر آدمیوں میں علاقۂ مودت و رابطۂ محبت مستحکم ہوتا تو سلسلۂ عدالت کی احتیاج نہ ہوتی ؛ اس واسطے کہ اہل معاملہ محبت باہمی کے سبب سے ایثار ایک دوسرے پر کرتے اور غیر کے حق میں طمع نہ کرتے ۔ حقیقت میں رابطۂ محبت اتم رابطۂ عدالت سے ہے ، کیوں کہ ایک

---

۱ ۔ خمود : آگ کا بجھ جانا ۔

۲ ۔ اصل میں 'زیادتی' کے بعد ''اس میں'' زائد تھا ۔ مرتب

ـدت جبلی طبعی ہے ، یعنی محبت بہ مقتضائے طبع ہے اور اکتساب
، اُس کو تعلق نہیں ہے ۔ اور عدالت وحدت قہری قسری[1] ہے ،
ی طبیعت کو اُس پر بہ‌زور لاتے ہیں اور خوگر کرتے ہیں ۔ اُس
صادر ہونا انسان کے اختیار میں ہوتا ہے اور وہ امر طبعی سے
اوب ہوتی ہے ۔

عدالت بے محبت کے منتظم نہیں ہوتی ۔ پس بادشاہ کو مطلق
ت ہونا چاہیے اور عدالت کو اُس کا نائب بنانا چاہیے ۔ عدالت
مع جمیع کمالات کی ہے اور ظلم کہ اُس کے مقابل ہے ، جمیع
نُص کا جامع ہے ۔

شیخ عبداللہ انصاری کا قول ہے کہ ''ہر چہ نہ آزار نہ گناہ''
، واسطے کہ گناہ ظلم ہوتا ہے ؛ یا اپنے نفس پر یا دوسرے پر :

مباش درپئے آزار ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

غرض سب اکابر کا اس پر اتفاق ہے کہ راحت پہنچانے کے
حسان پر اور آزار پہنچانے کے منع کرنے پر قدرت ، عدالت سے
صل ہوتی ہے ۔ عادل اپنی[2] تمام قوتوں کی تعدیل کرتا ہے ۔
ں سے تمام افعال اُس کے بہ حکم عقل نہج اعتدال پر واقع ہوتے
، ۔ کوئی قوت اُس حصے سے کہ عقل نے اُس کے واسطے تجویز
یا ہے ، نہیں بڑھتی اور ایک دوسرے پر غلبہ نہیں کرتیں ۔ اور
د ازاں بنی نوع کے ساتھ تمام معاملات میں رعایت کا طریقہ اختیار
رتی ہیں ۔ اکثر اوقات نظر اُس کی فضائل کے حاصل کرنے پر

۔ قسری : بہ معنی دور و حرکت چیزے کہ محرک آں دیگرے باشد (غیاث) ۔

۔ اصل میں ''اپنے'' ہے ۔ مرتب

رہتی ہے ، کوئی امر مقصود نہیں ہوتا مگر یہ طبیعت یہ اُس وقت میسر ہوتا ہے کہ نفس کو ہیئات نفسانی حاصل ہو کہ مقتضاے تادیب کلی ہوا ہو کہ تمام آثار و افعال اُس کے حلیۂ اعتدال سے متحلی ہوں اور عیب اختلال سے خالی ہوں ۔ اُن آدمیوں کو عادل نہ جانو جو ریا و سمعت[1] کے سبب سے یا جلب قلوب عوام کے لیے یا ازدیاد جاہ و مال کے لیے عدل کرتے ہیں ۔

عربی زبان میں اصل معنی ظلم کے بے جا کام کرنے کے اور عدل کے معنی بجا کام کرنے کے ہیں ۔ میزان حق کی درست رکھنے کو بھی عدل کہتے ہیں ۔ خود اپنی ذات اور دوسرے شخص کے درمیان یا دو غیر شخصوں کے درمیان کوئی معاملہ و متنازعہ ہو تو نفس الامر میں حق کی حد سے آدمی پاؤں باہر نہ رکھے، اور نہ اپنی ذات کی ، نہ متخاصمین[2] میں سے کسی شخص کی طرف داری بہ سبب رشوت کے یا آشنائی و دوستی یا کسی اور نسبت کے سبب سے کرے[3] ۔ اور یہ سمجھے کہ ایک شخص کی دوستی کرنا خدا کو دشمن بنانا ہے اور ایک کی طرف منہ کرنا خدا کی طرف پیٹھ کرنی ہے ۔ اپنے اسباب عیش کے درست کرنے کے واسطے لوگوں کو دل شکستہ نہ کرے اور اپنے نفس کی مراد کے بر لانے میں اوروں کو نامراد نہ کرے ۔ اپنی کام زندگانی کی شیرینی کے لیے اوروں کی ناکامی سے زندگی تلخ نہ کرے ۔ غرض جو کچھ اپنے اوپر نہ پسند کرے وہ دوسرے پر روا نہ رکھے ۔ اور خلق خدا کے ساتھ اپنا حساب پاک رکھنے کے لیے حق تلفی

---

۱ ۔ سمعت : سنانے کے لیے ۔
۲ ۔ متخاصمین : صیغۂ تثنیہ ، دو جھگڑنے والے ۔
۳ ۔ اصل میں 'نہ کرے' ہے ۔ مرتب

نہ کرے اور اپنا داغ کسی کے دل میں نہ لگائے۔

۱۰ - شجاعت

قوت غضبی کے انقیاد کے[1] ملکے کا نام شجاعت ہے کہ نفسِ ناطقہ کو مہالک و مخاوف میں ثابت قدم رکھے، تزلزل کو اس میں راہ نہ دے اور رائے صحیح کے مقتضا کے موافق عمل کرے۔ اُس کی افراط کا نام تہوّر اور تفریط کا نام جُبن ہے۔

اب شجاعت کے ماتحت یہ گیارہ صفتیں ہیں :

اول، کبر نفس کہ آدمی کا نفس سب حالتوں میں یکساں رہے؛ نہ بزرگی و خواری کی پروا کرے، نہ تونگری و تنگ دستی کا خیال۔ غنی و فقیر میں اُس کی مدح و[2] ذم کی جائے تو متاثر نہ ہو اور احوالات کے انقلاب سے تبدل و انتقال و تاثر و انفعال کو اپنے میں راہ نہ دے۔ یہ ایسا ملکۂ شریف ہے کہ معارج پر عروج اسی کے سبب سے ہوتا ہے۔

دوم نجدت[3]، وہ وثوقِ نفس کا نام ہے اپنے ثبات پر کہ خطروں کے وقت اور ہول ناک واقعات میں جزع فزع نہیں کرتا اور حرکات[4] نا منتظم اس سے صادر نہیں ہوتیں۔

سوم علوِ ہمت یہ کہ جمال حقیقی و کمال نفسانی کی طلب میں نفس کو[5] منافع و مکارہ اس دنیا کے ملحوظ نظر اعتبار نہ ہوں؛ نہ اُن کے پانے سے شادمانی، نہ اُن کے جاتے رہنے سے غمگین ہو۔ یہاں

---

۱ - اصل میں 'کی' نہ ہے۔

۲ - اصل میں 'و' نہ دارد۔

۳ - نجدت : شجاعت، دلیری۔

۴ - اصل میں 'برکات' ہے۔

۵ - اصل میں : 'کو' نہ دارد۔ مرتب

تک کہ مرنے کا بھی خوف نہ ہو۔

چہارم ثبات ؛ آلام اور شدائد کی مقاومت کی قوت ایسی[1] ہو کہ ان کی تاثیر زیادتی کے ساتھ نہ ہونے دے۔

پنجم حلم ، مغلوبِ غضب جلد نہ ہو ، یا بالکل نہ ہو۔

ششم سکون ، خصومات و محاربات میں کہ حرمت دین و ملت یا حشمتِ نفس و عصبیت کے لیے ضرور ہوں ، اس میں خفت نہ کرے۔

ہفتم شہامت ، وہ نفس کی حرص کا نام ہے جو ایسے امور عظام کے سبب سے ہو کہ ذکر جمیل اور اجر جزیل ملے۔

ہشتم عمل ، آلات بدنی کو اکتساب فضائل حمیدہ و شمایل پسندیدہ میں بے تکلف استعمال میں لانے کا ملکہ ہو۔

نہم تواضع ، کہ جو لوگ جاہ میں اپنے سے فروتر ہوں ، ان سے اپنے تئیں برتر نہ سمجھے اور یہ جانے کہ افرادِ انسانی امور فطری میں اشتراک رکھتی ہیں اور نقص و افتقار[2] و صفات عجز و اضطرار میں سب ایک ہیں۔

دہم حمیت ، مذہب اور اپنی حرمت کے رکھنے میں آدمی ڈھیل نہ کرے اور سعی پرلے درجے کی کرے۔

یازدہم رقّت ، اس ملکے کا نام ہے کہ اپنے ہم جنسوں کے درد اور رنج کے دیکھنے سے نفس اثر پزیر ہو اور دل میں درد ہو مگر افعال میں کوئی اضطراب نہ پیدا ہو۔

شجاع حقیقت میں وہ شخص ہوتا ہے کہ افعال شجاعت بمقتضائے حکم عقل اس سے صادر ہوتے ہیں۔ غرضِ اصلی اس کی

---

۱ - اصل میں 'ایسی' ہے - مرتب
۲ - افتقار : فقر -

نفس (کی) فضیلت ہوتی ہے۔ اُس کو امر قبیح کے ارتکاب کا خوف مرنے کے خوف سے زیادہ ہوتا ہے اور قتل جمیل اُس کے نزدیک حیات مذموم سے اچھا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں 'آگ قبول ہے، ننگ قبول نہیں' جیسے زن حسین کا مہر آدمی پر گراں نہیں ہوتا، ایسا ہی اُس کے نزدیک امور بزرگ و عالی کے لیے جان دینی کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اگرچہ ابتدا میں شجاعت کی لذت کچھ نہیں معلوم ہوتی بلکہ ہلاکت کا خوف ہوتا ہے لیکن آخر میں لذتیں اور منافع اُس کے دیکھنے میں آتے ہیں۔ خصوصاً حمایت دین اور تقویت شرع مبین میں آدمی اپنی جان لڑا دیتا ہے۔

عاقل جانتے ہیں کہ جنگ میں بھاگنے سے جان نہیں بچتی۔ بزدل[1] فرار میں اُس چیز کی بقا طلب کرتے ہیں کہ قابلِ بقا نہیں ہے۔ اگر بالفرض چند روز مہلت زندگی ہوگئی تو نامردی و جُبن کا ننگ و عار اور بے عزتی اور ہم سروں کی طعن و تشنیع عیش و حیات کو تلخ و مکدر کر دیتی ہے۔ مرگ فضیلت شجاعت و ذکر جمیل و اجر جزیل کے ساتھ اُس زندگانی سے بہتر ہے کہ ننگ و عار کے ساتھ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے: ''اے آدمیو! جو تم قتل نہ ہو گے تو بھی تحقیق مرو گے۔ قسم ہے خدا کی کہ ہزار ضرب شمشیر اپنے سر پر کھانی اُس سے بہتر ہے کہ آدمی بستر پر مرے۔ مردوں کی طرح جان کا دے دینا عورتوں کی طرح جینے سے اچھا ہے۔''

شجاع کی تعظیم و تکریم ہر شخص پر واجب ہے؛ خصوصاً بادشاہوں پر، کیوں کہ یہ کریم النفس بازار کارزار میں معاملات

۱۔ اصل میں 'بدول' ہے۔ مرتب

کرتے ہیں ، جان کو سپرِ تیرِ بلا بناتے ہیں ، اعدائے دولت سے مقابلہ و مقاتلہ کرتے ہیں ۔ بادشاہوں کو چاہیے کہ اموال اور اسباب میں اُن سے مضائقہ نہ کرے اور اُن کی تھوڑی سی خطا پر عتاب نہ فرمائے ۔ وہ لوگ کہ خوف فقر سے یا زوال مال و جاہ سے یا اور مصیبتوں کے رنج و تعب کے سبب سے خودکشی کرتے ہیں وہ شجاع نہیں ہوتے بلکہ بزدل ہوتے ہیں ۔ کیوں کہ شجاع سب حال میں صابر ہوتا ہے ۔ تحمل شدائد پر قادر ، ہر صورت میں اضطراب سے متحفظ ۔

خودکشی مقتضائے جبن و ضعف ہے ۔ بعض اوقات افعال شجاعت کے مشابہ فعل غیر شجاعوں سے بھی سرزد ہوتے ہیں ۔ ایک جماعت ایسی ہوتی ہے کہ خطرناک جنگوں میں اور خوف ناک کاموں میں قیام کرتی ہے ۔ اس سے غرض طلب مال یا جاہ یا اور اسی قسم کے مطلب ہوتے ہیں اور ان کاموں کے کرنے کا باعث حرصِ مطلوب ہوتی ہے، نہ ملکۂ شجاعت ۔ بعض عیار تحمل ضرب شدید اور حبس مدید کرتے ہیں بلکہ قطع اعضا اور اپنا قتل کرتے ہیں تاکہ اُن کا نام اُن کے ابنائے جنس میں ہو جائے جو اُن کے ساتھ رذائل میں شریک ہیں ۔ یا بعض وقت اقارب کی دفع ملامت کے واسطے یا خوف سلطانی سے یا مثل اُس کے اَور سببوں سے اُن افعال پر اقدام کرتے ہیں ۔ یا بعض دفعہ اتفاق سے ظفریاب ہو جاتے ہیں ۔ یہ لوگ شجاع نہیں ہوتے ۔ بلکہ شجاع وہ شخص ہے کہ اس کا مقصد سوا اس ملکۂ فاضلہ کے کوئی اور نہ ہو ۔ سباع و شیر وغیرہ کے افعال بھی شجاعت سے مشابہت رکھتے ہیں لیکن وہ شجاعت سے جدا ہیں ؛ اول اس سبب سے کہ اُن کو اپنے تفوق و غلبہ پر وثوق ہوتا ہے اور بالطبع مشتاق غلبے کے ہوتے ہیں ۔ پس اُن کا اقدام افعال پر بہ تبعیت غلبہ و قدرت کے ہوتا ہے ؛ (نہ) بہ تبعیت شجاعت ۔ سوا

سوا اس کے وہ ہمیشہ محاربہ اپنے سے کم زور سے کرتے ہیں جن سے وہ قویٰ و سلاح میں زیادہ ہوتے ہیں ۔ یہ کام افعالِ شجاع میں داخل نہیں ۔

۱۱ ۔ جواں مردی

اے جواں مرد! تُو جو راہِ سود و زیاں میں سر پر کھیل کر میدانِ جنگ میں بستہ میاں جاتا ہے ، تو صدق نیت سے خدا کے واسطے جا ۔ نہ کسی غرض و طمع کے لیے ، نہ اس لیے کہ تُو لاف و غرور کیا کرے ۔ اپنی تعریف میں دم مارنا اور شور و فغاں کرنا مردانگی نہیں ہے ۔ اگر یہ بہادری ہو تو بازار میں ایک زال بھی رستم سے بہتر ہے ۔ تو میدان جنگ میں دشمنوں کی صفوں کی جان نکال مگر اُس کو زبان پر نہ لا ۔ زبانِ تیغ کو دیکھ کہ جو کچھ وہ کرتی ہے ، کچھ نہیں کہتی ۔ یہ ادب تلوار سے سیکھ ؛ جیسے ایک نیام میں دو تلواریں آدمی نہیں رکھ سکتا ، اسی طرح ایک شخص تیغِ آہنی اور تیغِ گوسنین (زبان) کو نہیں چلا سکتا ۔ جو کیا ہو اُس کی شیخی نہیں مارنی چاہیے ؛ نہ یہ کہ نہ کیا ہو ، اُس کی لاف زنی کرو ۔ باز بن کر بادشاہ کے ہاتھ پر بیٹھو جو سو چند کرتا ہے اور کچھ نہیں کہتا ہے ۔ مرغیاں بن کر غل نہ مچاؤ جس سے خاک میں لوٹو ۔

بعض ڈینگ مارنے والے سپاہی جب شراب پیتے ہیں تو پیلِ مست اپنے تئیں کہتے ہیں ، مگر جب حریف کے سامنے آتے ہیں تو ستون کی طرح لڑکھڑا کر گر پڑتے ہیں ۔ نشے میں شیر گیر ہونے سے کچھ نہیں حاصل ہوتا ، معرکۂ جنگ میں شمشیر گیر ہو ۔ جو مست کوچہ گلیوں میں لاف جنگ مارتے ہیں ، وہ لڑکوں کے ہاتھ سے زخم سنگ کھاتے ہیں ۔ مرد مردی سے نر ہوتا ہے اور اپنی قوم و مذہب کو بر تر کرتا ہے ۔ جواں مردانِ غیور اپنی جان کی

پروا نہیں کرتے اور اس سے کوئی غرض و طمع نہیں رکھتے - کچھ اپنی دخل و آمدنی کی افزائش کے واسطے نہیں لڑتے - وہ تلوار منہ پر کھاتے ہیں اور خنجر کے آگے بید بن جاتے ہیں تا کہ زندگیِ جاوید حاصل ہو - وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو اعمال نامہ ہمارا دریا سے سفید نہیں ہو سکتا ، وہ تلوار سے، جو ہمارا ایک قطرۂ خون نکلے گا، اسے دھو دے گا - اگر میدانِ مصاف میں یہ نہ ہو اور صرف لاف ہو تو وہاں کا مرنا مردار ہونا ہے - یہ جو سپاہی اور غازی رسمی ہوتے ہیں ، وہ تجارت کے لیے جنگ میں جاتے ہیں - اُن کا حال ایسا ہے جیسے حاجی کا جو تجارت کے لیے جائے - تجارت گاہ کے رستے میں کعبہ آیا ، حج بھی کر لیا - اگر غزا کی جزا چاہتے ہو اور اس میں کوئی غرض و مطلب رکھتے[1] ہو تو وہ ایک غارت‌گری ہے ، مردانگی اور دلاوری نہیں - جو جواں مرد ہیں ، وہ خود بیں اور خود نما نہیں ہوتے بلکہ خدا کو دیکھتے ہیں - مرد اگر سر و تن کو زیبائش دیں تو ہرزنِ آراستہ بہمن ہے - جو دلیر ہیں ، وہ اسباب جنگ کی پروا نہیں کرتے ، اُن کے دو ہاتھ ہی بڑے اسباب جنگ ہیں - اگر اُن کے پاس تیر نہ ہو تو وہ اپنی انگلی ہی کو تیر بناتے ہیں - اگر تیغ مشت میں نہ ہو تو مشت ہی اُن کی تلوار ہے - اگر جواں مرد اپنی عروسانہ آرائش کریں تو تلوار اُن کے واسطے آئینہ اور نیزہ تکلا ہے - جو مرد آہنی دل اور روئیں تن ہیں ، نہ اُن کو زرہ کی حاجت ہے ، نہ جوسن کی - وہ تلوار اور شیر کی طرح برہنہ کارزار میں جاتے ہیں[2] - اگر مرد کے بازو ہتھیاروں کے لوہے کے بوجھ سے سو من کے ہو جائیں تو اُس سے کیا کام نکلتا ہے - جب

---

۱ - اصل میں 'نہ رکھتے' تھا -

۲ - اصل میں 'ہیں' ندارد - مرتب

میدان جنگ میں جاؤ تو ایسے ہلکے ہتھیار لے جاؤ کہ جس سے تم
خود بوجھ کے نیچے نہ دب جاؤ اور دشمن کے ہاتھ سے سر اُڑوا دو۔
گوزن کے سینگ تین گز کے ہیں، شیر کے ایک انگشت ناخن ہیں۔
نہنگ بے جوشن ہے مگر پانچ سو من کی مچھلی اُس کا کچھ نہیں
کرسکتی۔ کچھوے کا دل ترساں ہے اس لیے وہ سر درگریباں ہوتا ہے۔

جو شخص میدان جنگ میں لڑائی سے زرد و کبود[1] ہوتا ہے،
اُس کو خودِ زر اور تیغِ کبود سے کیا حاصل ہے۔ میدان کارزار
میں ایک آدمی کا زرد رُو ہونا سو جنگ جُو کو زرد بناتا ہے۔
جس مرد کا رُو جنگ سے زرد ہو وہ عورت ہے، اُس کے منہ پر
غازہ مل کر سرخ رو بنانا چاہیے۔ نامردوں کا منہ اس سبب سے
زرد ہوتا ہے کہ اُن کے رخ سے خون، خوف کے مارے بھاگ
جاتا ہے۔ پس جس کے چہرے سے خون بھاگ جائے وہ میدان جنگ
میں کیا ٹھہر سکتا ہے۔ کم حوصلہ آدمیوں کے ہاتھ میں تیغ، تیر،
سپر، لرزنے لگتی ہیں۔ وہی صف کے سردار ہونے کے لائق ہے
جو تلوار کے واسطے ہمہ تن سر دن جاتا ہے۔ بادشاہوں کی حمایت
سے میدان جنگ میں روباہِ لنگ بھی شیر ہو جاتی ہے۔ جو لڑائی
میں ایستادہ ہے، وہ اگرچہ ضعیف ہے مگر توانا تر ہے۔ بیضہ اگر
اپنے نینس پر کھڑا ہو تو ہاتھی کے پاؤں سے بھی نہیں ٹوٹتا۔ یاد رکھ
حملۂ بے صرفہ لڑائی میں نہ کر، اس سے نامرد دشمن بھی مرد
ہو جاتا ہے۔ اگر تو جنبشِ کودکانہ دشمن پر کرے گا تو تجھ
پر دوست لعن و طعن کریں گے اور دشمن طعن[2] ماریں گے۔ دشمن
ناچیز کو خوش ہنجاری سے مارنا چاہیے۔ پشّے کو ہاتھ سے مارنا

۱۔ کبود : لیلا، نیلگوں، منقش۔
۲۔ طعن : نیزے کا وار۔ مرتب

چاہیے ، نہ گرز سے - جب پشہ تجھ پر نیش زنی کرے اور تو اُس کو خنجر سے مارے تو تو اپنے تئیں ضرور پہنچائے گا - کرگس کو تیر سے مارنا چاہیے ، باز کے مارنے کے واسطے تو تھوڑا سا مرکہ کافی ہے -

جو مردِ میدان ہیں وہ میدان کارزار کو گلزار سوسن و گل کا جانتے ہیں اور روزِ وغا میں اپنے جلوے دکھاتے ہیں اور شاہین کی طرح اُڑتے ہیں - ان کی پیٹھ نہیں دکھائی دیتی - اگر وہ دلاور پیٹھ بھی دکھاتے ہیں تو اوروں کے منہ سے زیادہ کام کرتے ہیں - پیٹھ دکھانے میں وہ دشمن کو دھوکا دیتے ہیں - افسوس ہے اُس مرد پر کہ وہ اوروں کی مدد نہ کرے یا میدان جنگ سے بھاگ کر عورت بن جائے - جو تجھ سے مغلوب ہو جائے ، اُس کو مارنا مردانگی نہیں - جو شجاع فرزانہ ہے ، وہ عاجزوں کے مارنے کو مردانگی نہیں جانتا - جو بہادر بستہ ہو ، اُس کو نہ مار - مردِ نبردآزما اُسی کو مارتا ہے جس کے مارنے میں رضائے خدا جانتا ہے -

۱۲ - عفت

جنس عفت کے ماتحت بارہ نوع ہیں :

اول حیا : اُس سے مراد یہ ہے کہ جب نفس کو قبحِ قبیح سے آگاہی ہو تو اُس قبیح امر کے ارتکاب کے پاس نہ پھٹکے جس سے وہ نکوہش و ملامت کا سزاوار نہ ہو -

دوم رِفق : اُس انقیادِ نفس کا نام ہے کہ جس سے لوگوں پر احسان ہو -

سوم حسن ہدیٰ : وہ نفس کی کمال رغبت استکمال کی طرف ہے -

چہارم مسالمت : جب آرائے مختلف اور خواہشں ہائے متفرقہ ہوں تو اُس وقت ایسی باتیں کرے کہ باہم صلح ہو -

پنجم ہمت : وہ سکونِ نفس ، حرکتِ شہوت کے وقت ہے -

ششم صبر : مقاومت نفس کا نام ہے جو ہوائے نفسانی سے کرتی ہے تاکہ لذات قبیحہ کی مزاولت اس سے نہ صادر ہو ۔ صبر کی دو قسمیں ہیں کہ صبر مطلوب سے ، دوم صبر مکروہ پر[1]۔

دوسری قسم کا صبر قوتِ غضبی سے تعلق رکھتا ہے ۔ حدیثیں مشہورہ ہیں کہ ''الصبر[2] مفتاح الفرح''، ''النصر مع الصبر''۔ حکمائے فرس اپنی ہیاکل و معابد میں لکھ کر لٹکاتے ہیں کہ آہن طبعاً عاشقِ مقناطیس ہے ؛ ایسے ہی ظفر طوعاً طالب صبر ہے ۔

ہفتم قناعت : وہ استخفافِ نفس کا نام ہے جو ماکل[3] و مشارب و ملابس وغیرہ میں ہو اور بہ‌قدر ضرورت پر اکتفا ہو ۔ بہ وجہِ استہانت نہ بہ وجہِ حرصِ جمعِ مال کہ جس کو تقصیر کہتے ہیں وہ شرعاً و عقلاً مذموم ہے ، بہ خلاف اول کے کہ وہ بہ کمال محمدت[4] موسوم ہے ۔

ہشتم وقار : وہ اطمینان نفس کا نام ہے کہ آدمی شتابی سے پرہیز کرے ۔

نہم ورع : وہ افعالِ پسندیدہ و اعمالِ نیک کے ساتھ نفس کی ملازمت کا نام ہے ۔

دہم انتظام : نفس کو تقدیری امور پر حسبِ لیاقت و حسبِ مصلحت ملکہ حاصل ہو ۔

یازدہم خیریت : مکاسبِ جمیلہ سے اکتساب مال پر اور مال کے صرف کے مصارفِ فائقہ پر قدرت حاصل ہو، اور مکاسبِ ذمیمہ

---

۱ ۔ کذا ۔

۲ ۔ یعنی صبر فرحت کی کنجی ہے ۔ صبر سے مدد حاصل ہوتی ہے ۔

۳ ۔ ماکل ، مشارب ، ملابس : کھانے ، پینے اور پہننے کی چیزیں ۔

۴ ۔ محمدت : ستائش ۔

کے اور مصارف قبیحہ کے صرف پر امتناع کی طاقت ہو -

دوازدہم سخاوت ہے ؛ وہ ایک ملکہ ہے کہ جس سے آدمی مال کو جہاں چاہے اور جتنا چاہے ، خرچ کرتا ہے -

ایک جماعت ایسی ہوتی ہے کہ لذاتِ دنیوی سے اعراض کرتی ہے تاکہ جو جنس اُن پاس ہو ، اُس سے اور زیادہ ہو جائے - اکثر زہاد کا حال یہ ہے کہ اظہار زہد کو دام تزویر بنا کے عوام کو صید کرتے ہیں اور اس وسیلے سے اغراضِ فاسدۂ دینیہ اور اغراض کاسدۂ دنیویہ کے لیے توسل ڈھونڈتے ہیں ، یا ان کو لذات دنیاوی سے آگاہی نہیں ہوتی ؛ جیسے کہ اہل جبال اور رساتیق[1] ہوتے ہیں کہ شہروں سے دور رہتے ہیں - اکثر تناول اور تعاطی کے سبب سے لذتوں سے دل بھر گیا ہوتا ہے - یا اصل فطرت میں یا کسی حرص کے عارض ہونے سے نقصان شہوت ہوتا ہے یا آلام و امراض و اطلاع مردم کے خوف سے وہ پرہیز کرتے ہیں ؛ اس سے لوگ عفیف نہیں ہوتے -

۱۳ - سخاوت

ایک سخاوت کی تعریف ہم نے اوپر کی ہے - بعض اُس[2] کی تعریف ترکِ لذاتِ شہوت کرتے ہیں مگر سخاوت کا اطلاق ہم اکثر روپے پیسے یا کسی اور چیز کے دینے پر کرتے ہیں - تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ سخا سے بہتر کوئی پیشہ نہیں - آدمیوں کے ہاتھ میں سیم و زر دینا اس سے بہتر ہے کہ خاک میں دبایا جائے - جو چیز خاک میں دبتی ہے ، وہ خاک ہی ہو جاتی ہے - عطائے درم سے درِ راحت فقرا پر کھول - ہاتھ میں زر کو

---

۱ - اہل جبال : پہاڑ میں رہنے والے - رساتیق : آزاد منش ، وارستگان -

۲ - اصل میں 'اس کے کی' ہے - مرتب

غنچے کی طرح نہ بند کر ، بلکہ گل کی طرح کھول کر خرچ کر۔ جمع درم سے قبض ہوتا ہے ، بذل و کرم سے بسط و طرب۔ اپنا حال حقہ[1] کا سا کر کہ وہ زر و مال سے پُر ہو یا خالی ہو ، ایک حال پر رہتا ہے۔ ہمیانی نہ بن کہ زر و بے زری سے فربہی و لاغری تجھ کو ہو۔ ہمیانی جو سیم و زر سے بھری ، تیری کمر میں بندھی ہے ، وہ زریں کمر بند ہے۔ بس اس کمر بند کو حاجت مندوں کی خدمت کے سوا نہ باندھ۔ اگر کسی کے سر سے بارِ فقر تو اتارے تو اس کی گردن پر اپنا بارِ منت نہ رکھ۔ کاہ کو اتارنا ، کوہ کو رکھنا مناسب نہیں۔ خدا کی طرح عطا بخش ہو کہ کسی شخص پر بارِ منت اپنا نہ رکھے۔ جو مال و زر تو دے ، اس کو بہ وجہِ پسندیدہ دے۔ یہ نہیں کہ ستم کرکے سیم لے اور کمینوں کے آگے خوانِ کرم بچھائے۔

اس سے بہتر کرم یہ ہے کہ دست ستم کو کھینچ لے۔ جو قحبہ کسبِ زنا سے یا راشی رشوت کے روپے سے زر بخشے ، اس سے بخل سو درجے بہتر ہے۔ اس کی جود شرارت کا شرر ہے اور بخل اس کا سعادت ثمر کا ہے۔

بہتر ہے کہ دُزد ، محتاج کو کچھ نہ دے ، بہ نسبت اس کے کہ وہ زرِ تاراج لا کر دے۔ ابر کو چاہیے کہ وہ صحرا میں برسے کہ جس سے سبزہ و گل اُگے۔ دریا میں اس سے کیا فائدہ ہے کہ وہ اس کو آبلہ زد کرے۔

کریم کو چاہیے کہ وہ مسکین کو دے۔ اگر تونگر کو دے گا تو گویا موتیوں کو دریا میں پھینکے گا۔ اہل کرم پُر کو پُر نہیں کرتے اور کم کو کم نہیں دیتے۔ وہ تونگر کو کم دیتے ہیں

---

۱ ۔ حقہ : ڈبیا ۔

گدا کو زیادہ۔ ایسے ہی اگر تو اپنا روپیہ دے کر فاسق کو دل شاد کرے تو تو خانۂ فسق کو آباد کرتا ہے۔ ظالم کو زر دینا اُس کی تیغ ظلم کا زراندود کرنا ہے۔ غرض جو مستحق ہو اُس کو دو۔ اگر تم اس نظر سے کسی کو دو کہ اُس سے کچھ لو، تو یہ سخاوت نہیں ہے بلکہ بیع و شرا یا تجارت ہے۔ جال میں دانہ اس لیے ڈالو کہ مرغ پھنسیں، وہ مرغوں کے لیے انعام نہیں بلکہ دام ہے۔ تجھے آفتاب کی طرح عطا کرنی چاہیے کہ وہ سب نشیب و فراز میں نفع پہنچاتا ہے اور خود کسی سے متمتع نہیں ہوتا۔ تو اپنی عطاء سے حرا و صیت[1] و آوارۂ تنا نہ چاہ۔ مردِ کریم کبھی زر نام کے واسطے نہیں دیتا۔ جو[2] سائل کی مدح و ثنا پر زر دیتا ہے، وہ زر دے کر حر ںتا ہے۔ سخی کا نام تو خود پروار کرتا ہے۔ اُس کا نام خاص و عام کی زبان پر ہوتا ہے۔ مگر اُس نام وری سے مغرور نہ ہو، بلکہ جان لے کہ خدا کے واسطے کرم کرتا ہے۔ خدا اُس کی مزد[3] دے گا اور نیک نامی اُس کی ماسواء ہے۔ جو دونگر دیتا ہے وہ عاقبت میں پھل دے گا۔ جو قطرۂ باراں کھیت میں گم ہوتا ہے، وہ خود گندم دیتا ہے۔ سخاوت انسان کے ساتھ مخصوص ہے، باقی اور جانور اُس سے محروم ہیں۔ ہر ایک ان میں اپنا ہی پیٹ بھرتا ہے۔ مگر آدمی اور ہزاروں آدمیوں کو شکم سیر کرتا ہے۔

پس جو آدمی اوروں کو بے غم نہیں کرتا، وہ آدمی نہیں۔ عطا سب جگہ دل کش ہے مگر خوش وہاں ہے جہاں وہ درستی کے ساتھ ہوتی ہے۔ آنکھوں میں سرمہ دینا سلائی سے اچھا معلوم

---

۱ - صیت : شہرت۔ ۲ - اصل میں 'جو' ندارد۔
۳ - اصل میں 'مژد' ہے - مرتب

ہوتا ہے ، چمچے سے برا ۔ مکرم کا دینا شرف ہے ، مسرف کا دینا مسخراپن ہے ۔ اگر ایک شخص (کے) پاس ایک ہی کپڑے ہوں ، وہ کسی کو دے دے تو احمق ہے ۔ اگر فقیر اپنے کپڑے آتار کو کسی کو دے دے اور وہ مرجائے تو مرنے دے ۔ جو شخص زروماِل سے تونگر ہے، اگر وہ سب کچھ دے دے تو اسراف مال ہے ۔ دو میں ایک دینا چشم کرم کا نور ہے اور تین سے ایک دینا خیرالامور ہے ۔ سخاوت اپنی طاقت کے موافق چاہیے ۔ قرض لے کر سخاوت کرنی حماقت ہے ۔ جو شخص شراب پی کر بخشش کرتا ہے ، وہ قرض ستاں ، بد رہ و بدخو ہے ۔ دیوانے ، طفل ، مست کی بخشش ہنسی کے قابل ہے ۔ یہ سب بے خرد ہیں ۔ کمینے آدمی جود وسخا[1] سے دوز ہوتے ہیں جیسے خس غرق ہونے سے اور خر تیرنے سے ۔

۱۳ ۔ سخاوت

ایک جماعت ایسی ہوتی ہے کہ شہوات سے تمتع حاصل کرنے کے لیے ُمال خرح کرتی ہے ۔ یا ریا کے سبب سے یا جاہ و جلال کی زیادتی کے سبب سے یا دفعِ ضرر کے لیے غیر محلِ استحقاق میں مال صرف کرتے ہیں ۔ بعض انفاق میں زیادہ خرج کرتے ہیں ۔ اس واسطے کہ وہ مال کی قدر نہیں جانتے ، مواقع احتیاج سے غافل ہوتے ہیں ۔ یہ اُس جماعت کا حال اکثر ہوتا ہے جس کو میراث میں یا کسی اور طرح سے مال ہاتھ لگ گیا ہو اور وہ صعوبتِ اکتساب سے بے خبر ہوں ۔ مال کا مدخل دشوار ہے اور مخرج آسان ہے ۔ حکما نے کہا ہے کہ مال کا جمع کرنا ایسا ہے جیسا کہ بڑے پتھر کا پہاڑ پر چڑھانا ، اور خرچ کرنا ایسا ہے جیسے کہ پتھر کا اُوپر سے لڑھکا دینا ۔ تدبیر معاش میں مال کی ضرورت

---

۱ ۔ اصل میں 'غرا' ہے ۔ مرتب

ظاہر ہے اور اظہار فضیلت میں بھی اُس کو مدخل عظیم ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول ہے کہ حکمت تونگری کے ساتھ بیدار ہے اور درویشی کے ساتھ خواب میں۔ جب دانا کے پاس دینار نہ ہو تو خلق اُس سے منتفع نہیں ہو سکتی، بلکہ خود بھی مصالحِ ضروری پر توجہ کرنے سے بہت سے کمالات سے باز رہتا ہے:

مرا بہ تجربہ معلوم گشت آخر حال
کہ قدر مرد بہ علم است و قدر علم بہ مال

مال کا وجوہِ ستودہ سے حاصل کرنا مشکل ہے، اس لیے کہ مکاسبِ جمیلہ قلیل ہیں اور ان پر چلنا احرار کو دشوار ہے۔ بس ایسے شخص سخی نہیں ہوتے، بلکہ سخی حقیقت میں وہ شخص ہے کہ مال کو خرچ کسی غرض کے لیے نہ کرے بلکہ اس سبب سے کہ سخاوت ایک ملکۂ شریف ہے، اُس کی لذتیں مطلوب ہیں۔ اگر اس کے سوا کوئی اور وجہ اُس کے قصد کی ہو تو وہ بالعرض ہو، نہ بالحقیقت۔

۱۵ - سخاوت و بخل کی تعریف اور اُس کی حقیقت

ہر انسان اپنے عندے میں اپنے تئیں سخی جانتا ہے، حالانکہ غیروں کی نظروں میں بخیل ہوتا ہے۔ یا ایک آدمی سے کوئی کام سرزد ہو تو اُس میں لوگوں کا قول مختلف ہوتا ہے؛ بعض کہتے ہیں کہ یہ بخل ہے اور بعض کہتے ہیں بخل نہیں۔ علاوہ اُس کے آدمی کا نفس مال کی محبت سے خالی نہیں۔ اس محبت کے باعث مال کی حفاظت کرتا ہے اور اس میں امساک[1] کرتا ہے۔ اگر امساک ہی بخل ہوا کرے تو اس سے کوئی بھی خالی نہیں۔ اگر امساک سے بخل نہ ہو تو پھر بخل کے معنی کیا ہیں؟ بخل تو امساک ہی

---

۱ - امساک: کمی، روکنا، کفایت۔

کا نام ہے۔

بخل کی تعریف میں اقوال مختلف ہیں؛ بعض بخل کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ حقِ واجب کے نہ دینے کا نام بخل ہے۔ بس جو شخص حقوقِ واجبہ اپنے ذمے کے دیتا رہے وہ بخیل نہ ہوگا۔ مگر یہ تعریف کافی نہیں اس لیے کہ بہت سی مثالیں ایسی ہیں کہ آدمی حقوقِ واجبہ کو ادا کرتا ہے مگر پھر بھی بخیل کہلاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص قصائی سے گوشت اور نان بائی سے روٹی مول لیتا ہے اور اُسے کم قیمت پر واپس کرتا ہے، یا ایک شخص نے جو اپنے اہل و عیال کے واسطے روزینہ مقرر کر رکھا ہے، اگر وہ اس سے زیادہ ایک کوڑی بھی لے لیں تو وہ اُس کو کاٹ لیتا ہے، یا آدمی اس خیال سے کہ کوئی میرے ساتھ کھانا آن کر نہ کھانے لگے، چھپ کر کھاتا ہے؛ لوگ ہر صورت میں ایسے آدمی کو بخیل کہتے ہیں، باوجودیکہ وہ حق واجب ادا کرتا ہے۔

بعضوں کا قول ہے کہ بخیل وہ ہے جو دینے کو سخت جانے۔ یہ تعریف بھی ناقص ہے کیونکہ اگر اس سے یہ غرض ہے کہ سب قسم کا دینا اُس پر سخت ہو تو بہت سے بخیل ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کو تھوڑا سا دینا گراں نہیں گزرتا، البتہ زیادہ دینا گراں گزرتا ہے۔ یا یہ غرض ہو کہ بعض دہش اُس کو ناگوار گزرتی ہے تو یہ بات سخی میں بھی موجود ہے۔ مثلاً کسی کو سب مال یا اُس کا بڑا حصہ دینا ناگوار گزرے تو وہ شخص بخیل نہیں کہلائے گا۔

اسی طرح سخاوت اور جود کے باب میں اقوال مختلف ہیں؛ بعض کہتے ہیں بدون مانگے کسی کو دے اور یہ تصور کرے کہ تھوڑا دیا۔ بعض یوں کہتے ہیں کہ سائل کو دیکھ کر خوش ہونا اور اپنے دینے سے فرحت کرنے کا نام جود ہے۔ کچھ

لوگ یہ فرماتے ہیں کہ مال کو اس خیال سے دینا کہ مال بھی خدا کا ہے اور بندہ بھی اُس کا ، تو بندہ خدا کا مال خدا کو دیتا ہے ، فقروفاقہ سے نہیں ڈرتا ، اُس کا نام جود ہے ۔ اور کچھ یوں کہتے ہیں کہ جو شخص کچھ مال تو دے دے اور کچھ باقی رکھے۔ وہ اہل سخاوت ہے ، اور جو زیادہ تو دے ڈالے اور تھوڑا سا اپنے لیے رہنے دے ، وہ اہل جود ہے ، اور جو خود تکلیف اٹھائے اور دوسرے کی تمنا پوری کر دے ، وہ صاحب ایثار ہے ، اور جو کچھ بھی خرچ نہ کرے وہ بخل والا ہے ۔

یہ تمام اقوال اس باب میں ہیں مگر حقیقت بخل و جود کی کسی سے صاف نہیں معلوم ہوتی ۔ اس واسطے ہم اُس کو مفصل لکھتے ہیں ۔

اصل یہ ہے کہ مال ایک حکمت اور مقصود کے لیے پیدا ہوا ہے ؛ یعنی حاجاتِ خلق کی درستی کے لیے بنا ہے اور یہ بات ممکن ہے کہ جس چیز میں اُس کا صرف کرنا چاہیے ، اُس کا امساک کیا جاوے ۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جن اشیا میں اُس کا خرچ کرنا اچھا نہیں ، اُنھی میں اٹھا دیا جائے ۔ اور ان دونوں باتوں کے بیچ میں یہ بات بھی ممکن ہے کہ اُس کا خرچ عدل کے ساتھ ہو ، یعنی جہاں روکنا ضرور ہے ، وہاں روکا جائے ، جہاں خرچ ضروری ہو وہاں خرچ کیا جائے ۔ پس خرچ کی ضرورت کی جگہ پر روک رکھنا بخل ہے اور روک رکھنے کی ضرورت کی جگہ پر خرچ کرنا اسراف ہے اور اُن دونوں کے درمیان میں خرچ و امساک کرنا اچھا ہے اور اس رتبۂ اوسط کا نام جود و سخاوت ہے ۔ مگر اُس کے ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ دل بھی اُس پر راضی ہو اور تکرار نہ کرے ۔ اگر کوئی شخص جہاں خرچ کرنا مناسب تھا ، وہاں خرچ کرتا ہے ، مگر نفس اُس سے نزاع کرتا ہے اور یہ

اُس پر صبر کرتا ہے ، تو ایسے شخص کو سخی نہ کہیں گے بلکہ تکلف سے سخی بننے والا کہلائے گا ؛ اس لیے ضرور ہوا کہ اُس کے دل کو مال کے ساتھ صرف اتنا علاقہ رہنا چاہیے کہ اخراجاتِ ضروریہ میں اُس کو صرف کر دے، اور کوئی علاقہ نہ ہو ۔

اب رہی یہ بات کہ کون سے اخراجات واجب ہیں ؟ دو طرح کے ہیں : ایک مذہبی ، دوسرے دنیاوی ، جو بہ لحاظ ضرورت و عادت واجب ہیں ۔ سخی وہ ہے کہ جو نہ مال کو ضروریات مذہبی سے روکے ، نہ ضروریات مروت سے ۔ اگر ایک کو ان دونوں میں سے فروگذاشت کرے گا تو بخیل کہلائے گا ۔ اب بخل کی برائی اور سخاوت کی بھلائی اشخاص اور اُن کے حالات کے لحاظ سے ہوتی ہے ؛ مثلاً بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن میں تونگر کی تنگ گیری بری معلوم ہوتی ہے ، فقیر کی نہیں ۔ اگر آدمی اپنے اہل و عیال و اقارب سے تنگ گیری کرے تو بری معلوم ہوتی ہے ، اجنبیوں سے بری معلوم نہیں ہوتی ۔ ہمسایوں سے تنگ گیری بہ نسبت دور والوں کے بری معلوم ہوتی ہے ۔ غرض[1] تنگی برتنے میں چار چیزوں کے اختلاف سے اُس کے احکام مختلف ہوتے ہیں ۔

اول جس کام میں تنگی کی جائے، جیسے ضیافت و داد و ستد وغیرہ ۔

دوم جس چیز کی تنگی کی جائے ، جیسا کپڑا اور کھانا وغیرہ اس لیے کہ جیسے کھانے میں تنگی بری معلوم ہوتی ہے ، ایسی اور چیزوں میں نہیں ہوتی ۔

سوم جس کے ساتھ تنگی کی جائے ؛ مثلاً دوست یا بھائی کے ساتھ یا قریب یا زن و فرزند یا اجنبی کے ساتھ ۔

چہارم جو شخص تنگی کرتا ہے ، وہ لڑکا ہے یا عورت یا

---

۱ ۔ اصل میں 'غرض' کے بعد 'نہ' بھی ہے ۔ مرتب

بڈھا یا جوان یا عالم یا جاہل یا مال دار یا مفلس۔

پس بخیل اُس شخص کو کہتے ہیں کہ مال کو ایسی جگہ خرچ کرنے سے روکے جہاں بہ حکم شریعت یا باقتضاے مروت روکنا نہ چاہیے۔ اور اُس کی کچھ مقدار معین نہیں ہو سکتی۔ جو شخص مال کی محبت کے سبب سے مروت کو توڑتا ہے، وہ بخیل ہے۔ جو شخص واجب شرعی اور واجب مروت کو ادا کر دے تو وہ بخل سے بری ہو گا۔ ہاں جود و سخا کی صفت سے خب ہی موصوف ہوگا، جب اُس مقدار سے زیادہ خرچ کرے اور اُس سے دل بنی خوش ہو۔ کسی طمع اور توقع کے، خدمت یا تمنا یا مکافات یا شکر و ثنا کے لیے نہ ہو۔ کیونکہ جو شخص شکر و ثنا کی تمنا رکھتا ہے، وہ سخی نہیں بلکہ اپنے مال سے ثنا کو مول لیتا ہے۔ اُس کو سوداگر کہنا چاہیے کہ خرچ مال سے اُس کا مقصود مدح ہے جو کہ مرغوب اور معلوم بات ہے۔ اور جود اُس خرچ کو کہتے ہیں جو بدوں غرض کے ہو۔ مگر واقعے میں اُس طرح کی جود بجز ذات پاک خدا تعالیٰ کے اور شخص میں نہیں ہو سکتی۔ آدمی پر جو جود کا اطلاق ہوتا ہے، فقط مجازاً، اس لیے کہ آدمی کا کوئی سا خرچ غرض سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر خرچ کا سبب صرف ثواب آخرت ہے اور یہ نہیں ہے کہ لوگوں کی ملامت سے ڈرتا ہے یا جس کو دیتا ہے اُس سے نفع کی توقع ہو، تو یہ جود میں داخل نہیں، کیونکہ یہ چیزیں گویا اُس کو سردست عوض میں ملتی ہیں اور وہ اسی غرض سے خرچ کرتا ہے۔ پس عوض لینے والا ہوا، جواد نہ ہوا۔

ایثار اُسے کہتے ہیں کہ باوجود اپنی حاجت کے دوسرے کو مال دے ڈالے۔ اُس کا درجہ سخاوت سے بڑھ کر ہے، اس لیے کہ سخاوت میں تو آدمی اپنی حاجت سے جو بچتا ہے، اُسے دیتا ہے؛

جس چیز کی اپنے تئیں حاجت نہ ہو، اس کا دے ڈالنا آسان ہے مگر جس چیز کی حاجت ہو اسے دے ڈالنا دشوار ہے -

دنیا ایک کشت زار ہے اور اس میں اصناف و طبقات خلائق بہ منزلۂ اراضی و قطعات کے ہیں ، مال آب رواں ہے - ہر قطعۂ اراضیِ کشت زار میں پانی کچھ پہنچتا ہے جس سے وہ خرم و تازہ ہوتا ہے - اسی طرح اصافت خلائق کا ساز و برگ اور نسو ونما مال سے ہوتا ہے : اسی سے برگ معیشت ہوتا ہے ، سبزۂ حیات اگتا ہے ، احتیاج کی پیاس بجھتی ہے ، چہرے پر رنگِ خرمی آتا ہے ، زمینیں بلند و پست ہوتی ہیں - بلند زمینیں بہ قدر حاجت پانی کو پی کر پانی کو پست زمینوں کی طرف بھیج دیتی ہیں اور یہ پست زمینیں پانی کو جمع کرتی ہیں - پس اسی طرح بلند قدر و عالی ہمت مالِ دنیا پر بہ قدر حاجت اکتفا کرتے ہیں اور باقی سب زیر دستوں میں خرچ کر دیتے ہیں - پس جو پستیِ ہمت اور دناءت مرتبت سے موصوف ہوتا ہے وہ مال کو اس طرح جمع کرتا ہے جیسے کہ مغاک پانی کو گھیر لیتا ہے کہ پھر اس سے باہر نہیں جاتا - جیسے کہ زمینوں کی بلندی و پستی پانی کی روانگی اور ایستادگی سے معلوم ہوتی ہے ، اسی طرح ہمتوں کی بلندی و پستی مال کے خرچ و امساک سے معلوم ہوتی ہیں :

با ہمت والا زر دنیا نشود جمع
باران کہ بکہسار رسد بند نہ گردد

پس بخیل و خسیس یہ نہ سمجھیں کہ مال کے جمع کرنے سے ہم معزز ہوتے ہیں بلکہ وہ نہایت ذلیل و خوار ہوتے ہیں -

ان چند طریقوں کی رعایت کرنے سے حسن وسخا و جود کا آب و رنگ اور زیادہ ہو جاتا ہے -

اول یہ کہ بذل و جود میں اہلیت اور استحقاق منظور نظر رکھے ۔ نا اہلوں کے ساتھ احسان کرکے اُس کو ضائع نہ کرے ۔ حق شناس عاقبت اندیشوں کے نزدیک کرم بے موقع اور بخشش بےجا اور بخل یکساں ہیں ۔ بخل حرص و شرہ کے سبب سے ہے اور جود بےجا حماقت و سفہ کے سبب سے ۔ اگر وہ گراں جانی کے سبب سے ہے تو یہ بے سک طفلی و نادانی کے سبب سے ۔ بے کس و بے بس محتاجوں کو چھوڑ کر دولت مندوں کے ساتھ سلوک کرنا پیاسے کھیت کو چھوڑ کر دریا میں پانی لے جانا ہے ۔ دردمند شکستہ دلوں کے ساتھ عطاء کا ترک کرنا اور مرفہ الحالوں کو مال دینا ایسا ہے کہ عضو مجروح کو چھوڑ کر عضو صحیح پر مرہم رکھنا ۔

اہلیت اور استحقاق سے فقط عسرت اور پریشانی مراد نہیں ہے بلکہ یہ غرض ہے کہ جس کے ساتھ عطا کرے اُس کے لیے جہاتِ شائستہ میں سے کوئی جہت تلاش کرے ۔ شریروں پر نیکوں کو ، فاسقوں پر صلحا کو ترجیح دینی چاہیے ۔ بے شروں پر اہل خیر کو ، نادانوں پر دانشوروں کو تقدیم چاہیے ۔ داد و دہش شائستگی اور اہلیت پر مبنی ہونی چاہیے ، نہ فقط اظہار ہمت کے لیے ۔ جیسا کہ اکثر احمقوں کا قاعدہ ہے کہ وہ سخی نما اس طرح بنتے ہیں کہ بزم شراب میں اور مجالس لہو و لعب میں ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہیں اور نقد و جنس فواحس[1] کو دے دیتے ہیں ۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی محتاج کی[2] پیشانی سے علاماتِ مرض ، اور درد مند کے چہرے سے پریشانی ظاہر معلوم ہو تو

۱۔ فواحش : غالباً یہاں فاحشہ عورتیں مراد ہیں ۔ مرتب

۲ ۔ اصل میں 'کے' ہے ۔ مرتب

اُس کے درد کی درمان کی چستی و جلدی ایسی کرے کہ اضطرار سے اظہار حال نہ کرنے پائے۔ اس واسطے کہ[1] بعد اظہار و طلب کے جو کچھ اُس کو دیا جائے گا وہ اُس کے اظہار کی اُجرت ہے اور اُس کی آبرو کی قیمت ہے۔ عطا بعد از طلب سخا نہیں بلکہ حیا ہے؛ اس واسطے کہ آدمی کو شرم آتی ہے کہ سائل کی حاجت نہ روا کرے۔ پس یہ عطا محض اختیار و رغبتِ طمع کے سبب سے نہیں بلکہ بہ تقاضاے شرم۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ محتاج کی حاجت اس طرح روا کرے جس سے وہ شرمندہ نہ ہو اور اُس کی پردہ دری نہ ہو۔ مثلاً کسی غریب کو نقد لینے سے شرم آتی ہو تو اُس کو جنس سے بدل دے۔ اگر کسی شخص کو زکاۃ و صدقہ لیتے ہوئے شرم آتی ہو تو اُس کو تحفہ و ہدیہ کے نام سے دے۔ اگر کسی کو لوگوں میں لینے سے شرم آتی ہو تو اُس کو خلوت میں دے۔ اگر تیرے ہاتھ سے لینے میں شرم آتی ہو تو اُس کے پاس بھیج دے۔ کسی عزیز پر عسرت و خواری رکھنی بے دردی ہے۔ سائل کے چہرے پر اثر ذلت دیکھنا خلافِ شیوۂ جواں مردی ہے۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ عطاے بے منت ہو۔ فتوت یعنی جواں مردی چار چیزوں کا نام ہے: تواضع بادولت، عفو باقدرت، نصیحت باعداوت، عطاے بے منت۔

پانچواں طریقہ یہ ہے کہ خواہ کتنی بڑی عطاے کرو، اُس کو حقیر جانو۔

چھٹا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی درویش و محتاج سے وعدۂ عطا ہو تو اُس میں تاخیر نہ کرو۔ جہاں تک جلد ہو سکے

۱۔ اصل میں 'کہ' ندارد۔ مرتب

وعدے کو پورا کرو ، کیونکہ عطا میں تعلیل اور عذر کرنا بخل کی نشانی ہے -

اہل عرب کا قول ہے : ''وعدالکریم نقد و تعجیل و وعداللئیم مقل و تعطل'' - یعنی وعدۂ کریم نقد ہے اور جلدی سے پورا ہوتا ہے اور وعدۂ لئیم میں تعویق اور تاخیر ہے اور ہر روز اُس کے واسطے عذر کرتا ہے -

ایک عرب کا شاعر کہتا ہے :

فان تجمع الافات فالبخل شرہا وشر من البخل الوعید و العطل

یعنی اگر تمام مرض اور آفتیں جمع ہو جائیں تو مرضِ بخل اُن میں بدتر ہے اور بخل سے بدتر دروغ وعدے ہیں جن کے وفا کرنے کے لیے ہر روز دوسرے روز کا وعدہ کیا جاتا ہے -

۱۶ - بخل کا علاج

بخل کا سبب مال کی محبت ہے - مال کی محبت کے دو سبب ہیں : ایک تو شہوات کی محبت کہ بدون مال کے وہ حاصل نہیں ہو سکتیں اور اسی میں طول امل ، یعنی توقع اپنی عمر کی زیادتی کی[1] بھی داخل ہے - اگر آدمی یہ جان لے کہ میں کل مر جاؤں گا تو غالب ہے کہ مال کا بخل نہ کرے - بعض اوقات طولِ امل اس سبب سے ہوتا ہے کہ آدمی اپنی زندگی کی زیادہ توقع نہیں کرتا مگر صاحبِ اولاد ہونے کے سبب سے طولِ امل کا قائم مقام فکرِ اولاد ہوتا ہے جن کے جینے کو اپنی زندگی سمجھتا ہے اور اُن کے لیے مال کو روکتا ہے -

دوسرا سبب یہ ہے کہ خود مال ہی اچھا معلوم ہوتا ہے ، یہاں تک کہ اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو جاتا ہے - بیمار پڑیں

---

۱ - اصل میں 'کی' نہیں ہے - مرتب

تو علاج میں بالکل خرچ نہ کریں ۔ زمین میں گاڑ کر مال کو رکھتے ہیں ۔ باوجودے کہ جانتے ہیں کہ ہمارے مرنے پر مال ضائع ہو جائے گا یا دشمنوں کے ہاتھ پڑے گا ، پھر بھی اُس کے کھانے کو یا اُس میں سے ایک حبّہ خیرات کرنے کو دل نہیں چاہتا ۔ اور یہ دل کا مرض ایسا ہے کہ اُس کا علاج بہت مشکل ہے ، خصوصاً بڑھاپے میں تو پرانے مرضوں کی طرح لاعلاج ہی ہے ۔

اس مرض والے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی کسی پر عاشق ہو اور اس کے سبب سے اُس کے ایلچی کو بھی چاہنے لگے ۔ پھر پیام بر سے اتنی محبت کرے کہ محبوب کو بھول جائے ۔ اس نہج سے روپیہ پیسا بھی حاجتوں کا ایلچی ہے کہ زر کے سبب سے حاجتیں روا ہوتی ہیں ۔ اسی جہت سے زر محبوب ہوتا ہے ، مگر بعض اوقات حاجتوں کا خیال ہی نہیں رہتا ، صرف زر ہی محبوب ہو جاتا ہے ، اور حضرت شیخ سعدی کے اس کلام کا خیال نہیں ہوتا :

زر بہر خوردن بود اے پسر ز بہر نہادن چہ سنگ و چہ زر

یہ مال کی محبت کے اسباب ہیں ۔ ہر بیماری کا علاج اس کے سبب کے ضد کرنے سے ہوتا ہے ۔ شہوات کی محبت کا علاج تو یہ ہے کہ تھوڑی سی چیز پر قناعت اور صبر کرے ۔

کار دنیا کسے تمام نہ کرد ہرچہ گیرید مختصر گیرید

طولِ امل کا علاج یہ ہے کہ ہر دم موت کو یاد کرے اور اپنے ہم سروں کے مرنے کو لحاظ کرے کہ مال کے جمع کرنے میں کیسے کیسے دکھ اٹھائے اور مصیبتیں سہیں ، آخر خالی ہاتھ چلے گئے اور وہ سب تباہ ہو گیا ۔ اولاد کا خیال اگر دل میں ہو تو یہ سوچے کہ اگر وہ صالح ہے تو خدا اُن کا کفیل

ہے اور اگر فاسق ہے تو یہ پیارا مال اُس کے حق میں اُور زہر ہوگا۔ بعض اولاد جن کے وارثوں نے کچھ باقی نہیں چھوڑا ، وہ اپنے ماں باپ سے اچھی حالت میں ہیں ، اور بعض اولاد جن کے وارثوں نے مال چھوڑا ، وہ تباہ و خستہ حال ہیں۔

ایک مفید علاج یہ بھی ہے کہ بخیلوں کے حالات پر زیادہ غور کرے اور اُن سے نفرت کرے اور اُن کو برا جانے ، کیونکہ کوئی ایسا بخیل نہیں جو دوسرے کے بخل کو برا نہ جانے۔ پس یہی اپنا تصور کرے[1] کہ اگر میں بخل کروں گا تو سب کی نظروں میں حقیر اور ذلیل ایسا ہوں گا جیسے کہ اُور بخیل میری نظروں میں معلوم ہوتے ہیں۔

ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ مال کو بہ قدر حاجت رکھ لے اور باقی کو خرچ کر ڈالے۔

ایک اُور بھی بخل کے دور کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ بہ تکلف خرچ کرنے کی عادت ڈالے ؛ جیسے عشق جب تک نہیں جاتا کہ معشوق پیش نظر رہتا ہے۔ ہاں اگر اُس کے مقام سے مفارقت اختیار کرے اور اُس جدائی پر بہ تکلف صبر کرے تو رفتہ رفتہ دل کو تسکین ہو جاتی ہے۔ پس اسی طرح جو مال محبوب تھا ، نظر سے محجوب ہوگا تو اس سے محبت بھی کم ہو جائے گی۔

ایک اُور بخل سے بچنے کی تدبیرِ لطیف یہ ہے کہ آدمی اپنے دل کو سمجھائے کہ دینے سے نیک نام اور سخی مشہور ہوگا۔ اس بہانے سے بہ قصد ریا خرچ کرے ، یہاں تک کہ جود کی صفت پیدا کرنے کی طمع کے سبب سے خرچ کرنا ناگوار نہ گزرے۔

اس طرح بخل تو دور ہوگا مگر ریا پیدا ہوگا۔ پھر ریا کو

۱۔ اصل میں 'کرکے' ہے۔ مرتب

دور کرنے کی تدبیر کرے ۔ جیسے لڑکے کا جب دودھ چھٹاتے
ہیں تو کھیل کی طرف رغبت دلاتے ہیں کہ دودھ کو یاد نہ
کرے ۔ جب وہ دودھ بھول جاتا ہے تو اُس کھیل سے بھی اُس
کو علیحدہ کر دیتے ہیں ۔ اسی طرح صفات خبیثہ میں بھی بعض
کو بعض پر تسلط کرکے تیزی ایک دوسرے کی کم کی جاتی
ہے ۔ جو اُن میں ضعیف ہو ، اُس کو قوی کی غذا کرتے جائیں ،
یہاں تک کہ آخر کو ایک رہ جائے ۔ پھر اُس ایک کے دور کرنے
کا علاج یہ ہے کہ اُس کی غذا روک دی جائے ۔ اور غذا کا روکنا
اُن صفات سے یہ ہے کہ اُن کے مقتضا کے موافق عمل نہ کیا
جائے ، یعنی صفت خبیث جو باتیں چاہے[1] ہرگز نہ کرے ۔ جب
اس طرح اُس کا خلاف کیا جائے گا تو خواہ وہ صفت مضمحل
ہو کر مر جائے گی ۔ بخل کی صفت کا اقتضا یہ ہے کہ مال کو
روکے اور خرچ نہ کرے ۔ پس جب آدمی اُس کے خلاف کرے گا
اور نفس پر مجاہدہ کرکے بار بار خرچ کرتا رہے گا ، تو بخل کی
صفت مر جائے گی اور صفت[2] بذل طبعی ہو جائے گا ۔ پھر اُس میں
دشواری نہیں رہے گی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ بخل کا علاج یا[3]
تو اُس علم سے ہوتا ہے کہ آدمی بخل کی آفات اور سخاوت کے
فائدوں کو جانے ، یا اس عمل سے ہوتا ہے کہ داد و دہش بہ تکلف
کرے ، جب تک مقصود حاصل نہ ہو ۔ مگر بعض اوقات صفت
بخل ایسی قوی ہوتی ہے کہ اور[4] آدمی کو اندھا اور بہرا کر دیتی

---

۱ ۔ اصل میں 'چاہتے ہو' ہے ۔
۲ ۔ اصل میں 'صف' ہے ۔
۳ ۔ اصل میں 'کیا' ہے ۔
۴ ۔ 'اور' بہ معنی 'مزید' ۔ مرتب

ہے کہ اُس کی آفت کچھ نہیں سوجھتی ، نہ کچھ جود کا فائدہ معلوم ہوتا ہے ۔ ایسی صورت میں بخل کا مرض لاعلاج ہے۔

۱۷- خیرات

جو صاحبِ مال تونگر دولت مند ہے اس پر عقلاً اور مذہباً یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ حصہ خیرات کرے ۔ ہندو اُس کو دان پُن کہتے ہیں۔ مسلمان اُس کو زکاہ و صدقہ کہتے ہیں (زکاۃ کے اصلی معنی نمو و افزونی کے ہیں ، اس لیے زکاۃ کو زکاہ کہتے ہیں کہ اس سے مال میں برکت اور افزونی ہوتی ہے) ۔

خیرات ان تین سببوں سے ہر انسان پر فرض ہوتی ہے :

اول خیرات سے خدا تعالیٰ کی محبت کا امتحان ہوتا ہے ۔ خلائق کے نزدیک مال بہت محبوب ہے کہ دنیا کی ساری کاربرآری کا ذریعہ وہی ہے ۔ اُس سے مال دار کو بڑا اُنس ہوتا ہے ۔ پس جب وہ اس دولت کو ، جو اُس کی معشوق و منظور نظر ہے ، راہ خدا میں دے دیتا ہے تو اُس کی محبت الٰہی کی صداقت ہوتی ہے ۔

دوسرا امر یہ ہے کہ ایسے مال‌دار کی ذات سے بخل کی صفت دور ہوگی ۔ بخل بد بلا ہے ۔ بخل کی برائی تو اسی طرح دور ہو سکتی ہے کہ آدمی دے ڈالنے کا عادی ہو ۔ کیوں کہ کسی چیز کی محبت جدا نہیں ہوتی ، جب تک کہ نفس کو اُس کی مفارقت پر زور نہ دیا جائے ، یہاں تک کہ اُس سے جدا ہونے کا خوگر ہوجائے ۔

سوم پروردگار نے جو اُس کو دولت کی نعمت دی ہے ، اُس کا شکر الٰہی مال دینے سے ہو جاتا ہے ۔ وہ شخص بڑا خسیس ہے جو فقیر کو دیکھے کہ اُس پر روزی تنگ ہے اور میرا[1] محتاج ہو کر آیا ہے ، اس پر بھی وہ خدا تعالیٰ کا شکر اُس کو دے کر

---

۱ - اصل میں 'اپنا' ہے - مرتب

نہ ادا کرے کہ مجھ کو سوال سے غنی کیا ، دوسرے کو میرا دست نگر بنایا ۔

نہ خواہندہ ای بر در دیگراں بشکرانہ خواہندہ از در مراں

اب تنقیح طلب یہ امور ہیں کہ خیرات کن کو دے ؟ کس قدر دے ؟ کس طرح دے ؟ جو خیرات لیں وہ کیوں کر لیں ؟ اُس کے عوض میں کیا کریں ؟ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی خیرات کے دینے کے لیے ایسے آدمی ڈھونڈے جن میں ان چھ صفتوں میں سے ایک صفت یا زیادہ پائی جائیں ۔

اول وہ فقیروں کو دے ۔ فقیر اُس کو کہتے ہیں کہ جس کے پاس مال نہ ہو اور نہ کمانے پر قادر ہو ۔ جس شخص کے پاس ایک روز کے لیے غلہ اور لباس ہو، وہ فقیر نہیں ۔ غرض جس پاس سردست وہ اشیا نہیں جن کی اُس کو حاجت ہے اور اُن کے حاصل کرنے سے عاجز ہے ، اُس کو فقیر سمجھنا چاہیے ۔ اب یہ فقیر دو طرح کے ہوتے ہیں ؛ ایک تو وہ جو پرہیزگار اور دنیا سے روگرداں اور صرف آخرت کی تجارت میں مشغول ہوں ۔ وہ محتاج اس لیے ہیں کہ خدا کی طاعت میں ریاضت زیادہ کرتے ہیں ۔

دوم وہ لوگ فقیر ہیں جو سوال کرتے پھرتے ہیں ۔ چوں کہ سوال کرنا کوئی کمائی کا پیشہ نہیں ہے ، اس لیے یہ سائل بھی زمرۂ فقرا سے خارج نہیں ۔ مگر اُس صورت میں کہ کمانے پر قادر ہوں ، تو فقیروں کے زمرے سے خارج ہو جائیں گے ۔ اگر وہ اوزاروں سے کمانے پر قادر ہو تو اُس کو اوزار اپنے مال سے خرید دے ۔ اگر ایسے پیشے پر قادر ہو جو اُس کی شان کے لائق نہیں ہے اور اُس سے بعید ہے ، تو بھی اُس کو فقیر تصور کرے ۔ غرض جہاں تک ہوسکے ، ایسے فقیروں سے پیشہ کرانے میں صرفِ زر چاہیے کیوں کہ پیشہ کرنا صدقہ لینے سے بدرجہا بہتر ہے ۔

پس ایسے فقیر جن سے کچھ ہو ہی نہیں سکتا ، اُن کو خیرات دے ؛
باقی فقرا سے پیشہ کرانے کی امداد میں روپیہ صرف کرے۔
دوم مساکین کی اعانت اپنے مال سے کرے۔ مسکین وہ
شخص ہے جس کی آمدنی خرچ کو کافی نہ ہوتی ہو۔ کوئی شخص
ایسی تنگی سے رہتا ہو کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں ، کپڑا ہے تو
روٹی نہیں ؛ سر ڈھکا تو پیر ننگے، پاؤں ڈھکے تو سر کھلا ۔ ایسے
آدمیوں کی امداد اپنے روپے سے کرنی چاہیے۔

تیسرے اُن اہل علم کی خدمت اپنی دولت سے کرنی چاہیے
جو علم کی تعلیم میں مدد کرتے ہیں۔ علم کے برابر کوئی نعمت نہیں
ہے ۔ خاص اس فرقۂ علما کی اور اُن کے مدارس کی بہت فیاضی سے مدد
کرنی چاہیے ۔ اگر عالم کا دل اپنی کسی حاجت میں مصروف ہو گا
تو وہ علم کی ترویج کے لیے مہلت نہیں پائے گا ۔ ان کو دینا حقیقت
میں علم کے لیے اُن کو فارغ کر دینا اور فرصت نکال دینی ہے ۔
تعلیم ایک حاجت ضروری ہے ۔ مدارس میں جس قدر ہو سکے خیرات
دے ۔ سب سے اچھی خیرات یہی ہے ۔

چوتھے اُن لوگوں کو خیرات دے جو کثیرالعیال ہوں ، یا
کسی مرض میں گرفتار ہوں ، یا کسی بلائے ناگہانی میں کسی سبب
سے مبتلا ہو گئے ہوں ؛ ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے ہوں ، یا کسی اور طرح
اپاہج ہو گئے ہوں ، یا ایسے قرض دار ہو گئے ہوں کہ قرض نہ ادا
کر سکتے ہوں ، یا مسافرت میں محتاج ہو گئے ہوں ۔

پانچویں عزیز اقارب اور ذوی الارحام میں ، جو محتاج ہوں
اور بعد اُن کے جو واقف کار، دوست آشنا تنگ دست ہوں ، اُن کو
خیرات دینا چاہیے اور اُن کے دلوں کو آسائش پہنچانی چاہیے ۔

اب دوسری بات یہ ہے کہ کس قدر دے ؟ مسلمانوں کے ہاں
تو مقرر ہے کہ زکاۃ میں مال کا چالیسواں حصہ دیتے ہیں ۔ اور

قوموں میں کوئی اُس کی حد مقرر نہیں ۔ مسلمان اگر اس حصۂ معینہ سے کم دیں گے تو وہ معصیت میں اپنے مذہب کے موافق گرفتار ہوں گے ۔ غرض خیرات آدمی کی اپنی ہمت پر موقوف ہے ۔ مگر اُس کو چاہیے کہ جو چیز دے ، وہ اچھی اور تحفہ دے ۔ موئی بچھیا باہمن کے سر اور دبلا گھوڑا درگاہ کی نذر نہ کرے ۔

تیسری بات یہ کہ کس طرح دے ؟ سب عاقلوں کے نزدیک پوشیدہ دینا اچھا ہے کیوں کہ اس میں نمود اور شہرت اور ریا سے آدمی دور رہتا ہے ۔ خیرات دینا اس کا نام ہے کہ اُس کے بائیں ہاتھ کو خبر ہی نہ ہو کہ اُس کے دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے ۔ اس گپت دان[1] سے آدمی شہرت اور ریا کی آفت سے چھوٹتا ہے ۔ جو شخص اپنی خیرات کو کہتے پھرتے ہیں ، وہ فقط شہرت کے طالب ہیں ۔ جو لوگوں کے مجمع میں دیتا ہے ، وہ ریا کا طالب ہے ۔ پوشیدہ دینے میں ان دونوں آفتوں سے بچاؤ ہے ۔ بعض آدمی پوشیدہ خیرات کرنے میں یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ لینے والا دینے والے کو نہ پہچانے ؛ اندھے کے ہاتھ میں پیسا رکھ دیتے ہیں اور فقیروں کو راستے میں دور سے اس طرح روپیہ پیسہ پھینک دیتے ہیں کہ وہ اُس کو دیکھ لیں مگر اُن کو نہ دیکھیں ؛ سوتے ہوئے فقیروں کے پلے میں باندھ دیتے ہیں ، دوسرے شخص کے ہاتھ بھجوا دیتے ہیں ۔ مسکین اگر دینے والے کو پہچانے تو اُس میں شہرت و ریا اور احسان تینوں ہیں ۔ درمیانی آدمیوں کے ذریعے سے دینے میں فقط ریا ہی ہے جس صورت میں دینے والے کو شہرت مقصود ہو تو اُس کا عمل لغو ہوگا ، کیوں کہ خیرات بخل کے دور کرنے اور مال کی محبت کم کرنے کے لیے ہوتی ہے ، مگر مال

---

۱ ۔ گپت دان : مخفی خیرات ۔ مرتب

کی محبت سے زیادہ جاہ کی محبت نفس پر چھائی ہوئی ہے - پس اگر دینا افزائش جاہ کے لیے ہو تو خیرات کرنا ایک برائی سے بچ کر دوسری برائی میں پڑنا ہے - سائل کو جو چیز دو ، اس طرح دو جیسے کوئی دوست کو ہدیہ دیتا ہے -

کبھی ہاتھ میں رکھ کر پیش کش کے طور پر ایسی جگہ ظاہر بھی خیرات دینی چاہیے کہ وہاں اور لوگوں کو خیرات دینے کی ترغیب اس کے اتباع سے ہو - اگر کوئی شخص مجمع میں سوال کرے تو اس کو خیرات دے دے ، مگر اپنے نفس کو ریا سے روکے - گو مجمع میں دینے سے سوائے ریا اور احسان کے اور خرابی بھی ہے کہ سائل کی پردہ دری ہوتی ہے مگر جب سائل خود ہی اپنی پردہ دری کرتا ہے تو اس میں خیرات کرنے والے کا کیا گناہ ہے -

سب سے بڑی بات خیرات دینے میں یہ ہے کہ من و اذیٰ نہ ہو - 'من' کے معنی سائل پر اپنا احسان خیرات کا جتانا اور اس کا ذکر کرنا - 'اذیٰ' کے معنی یہ ہیں کہ سائل کو سوال پر زجر و توبیخ کرنا - آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو نہ سمجھے کہ میں نے فقیر پر کیا احسان کیا یا انعام دیا ، بلکہ یہ سمجھے کہ میں خدا کی نعمت کا قرض دار تھا ، وہ قرض ادا کیا - اس سائل نے یہ احسان مجھ پر کیا کہ میرا قرض چکا دیا - قرض کا ادا ہونا اپنے حق میں فائدہ دیتا ہے ، نہ دوسرے پر احسان کرنا ہے - جب یہ سمجھے گا تو ظاہر ہے کہ 'من' کے معنی سے جو باتیں متفرع[1] ہوئی تھیں ، ان کو چھوڑے گا -

خیرات و صدقہ کا ذکر کرنا ، ظاہر کرنا ، فقیر سے اس کا

۱- متفرع ہونا : پھوٹنا - مرتب

بدلہ چاہنا کہ شکر گزار اور دعا گو ہو ، اور خدمت و تعظیم کرے ، اور حقوق بجا لائے ، اور مجلسوں میں آگے بٹھائے ، اور کاموں میں پیروی کرے کہ یہ سب امور منت کے ثمرے ہیں ۔ اذیٰ کے معنی ظاہر میں تو جھڑکی اور عیب لگانے اور درشت کلامی اور ترش روئی اور ظاہر دینے سے پردہ دری کے ہیں ، مگر تم اُس کا منشا دو باتیں جانو؛ اول مال پر سے ہاتھ اٹھانے سے نفس کو اذیت مت دو ، دوم اپنے آپ کو یہ نہ سمجھو کہ میں فقیر سے بہتر ہوں ۔ یہ شخص اپنی حاجت کے سبب سے مجھ سے رتبے میں کم ہے ۔ یہ دونوں باتیں جہالت سے پیدا ہوتی ہیں ۔ اور من اور اذیٰ کے ساتھ خیرات نہ کرے بلکہ خوش دلی سے سائل کو دے اور اُس کو اپنا محسن سمجھے کہ وہ اُس کے دینے کو قبول کرتا ہے ۔

آدمی جو کچھ خیرات کرے اُسے تھوڑا جانے ، اس لیے کہ اگر بہت جانے گا تو تکبر و غرور کرے گا ۔ اُس سے یہ نیک عمل باطل ہو جائے گا ۔

بعض اکابر کا قول ہے کہ خیرات تین چیزوں کے بغیر پوری نہیں ہوتی : اول اُس کو چھوٹا جاننا ، دوم جلد ادا کرنا ، سوم چھپا کر دینا ۔ آدمی کو چاہیے کہ جو خیرات کرے ، اُس سے حیا و شرم کرنے اور جانے میں نے بڑی خست کی ہے ۔

اب یہ سنو کہ جو خیرات لیں ، وہ کیوں کر لیں اور اُس کے عوض میں کیا کریں ؟ فقرا ، مساکین ، علما ، عزیز اقربا جو خیرات لیں ، اُن کو چاہیے کہ وہ خدا کا اول شکر بھیجیں کہ اُس نے اُن آدمیوں کو واسطہ اُن کے رزق کا بنایا ۔ ان آدمیوں کے احسان مند ہوں ، اُن کے لیے دعائے خیر کریں ۔ ان کو چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے اس طرح خیرات لیں کہ خود ان کی پردہ دری نہ ہو ۔ پوشیدہ خیرات لینے میں بے خبر ان کو غنی جانتے ہیں ۔

سوال نہ کرنے کی صورت محبوب ہوتی ہے۔ دوسرے دینے والے کی، عمل نیک و خفیہ کرنے میں اعانت ہوتی ہے۔ اگر عطا میں کچھ عیب ہو تو اُس کو چھپا دے اور اس کی تحقیر و مذمت نہ کرے، اور دینے والا اگر کوئی نہ دیوے تو اُس کو نہ دینے کا ننگ نہ لگائے۔ اگر وہ دیوے تو اُس کے فعل کو اپنے نزدیک اور لوگوں کے سامنے بڑا جانے کیوں کہ دینے والے کا ادب اپنے دہش کو چھوٹا جانتا ہے۔ اور لینے والے کا ادب یہ ہے کہ جو کوئی دے اُس کی دہش کو بڑا جانے۔

بڑی بات خیرات لینے والے میں یہ چاہیے کہ وہ خیرات جب لے کہ اُس کو تحقیق ہو جائے کہ مجھ میں اس کے لینے کا استحقاق پیدا ہو گیا ہے۔ جب اپنا گزارہ کسی طرح سے نہیں کر سکتا ہو، تب خیرات کو ہاتھ لگائے۔ دو باتوں کا لحاظ خیرات لینے میں رکھے کہ یا تو اُس سے اپنی حاجت رفع ہو جو کسی اور طرح سے نہ ہو سکتی ہو، یا دین، مذہب تعلیم کی ترقی اُس سے کر سکے۔

اب تک ہم نے یہ مضمون ''احیاء العلوم'' سے اس طرح انتخاب کیا ہے کہ وہ ہر قوم و ملت کے موافق ہو سکتا ہے۔ ہم کمی[1] و بیشی کے ساتھ اُس کو اور پیرائے سے ادا کرتے ہیں۔

۱۸ - خیرات

خیرات کے مختلف طریقے یہ ہیں؛ اُن سب میں انسان کی یہ نیت ہونی چاہیے کہ کوئی اپنی غرض شامل نہ ہو۔ ریا و شہرت منظور نہ ہو، احسان ماننے اور دعا لینے کی تمنا نہ ہو۔ خیرات کے یہ طریقے ہیں:

۱۔ اصل میں 'کم' ہے۔ مرتب

اول زبردستی خیرات دینا ؛ یہ خیرات اس قسم کی ہوتی ہے جیسے لوگ چند دن میں سو روپے دیتے ہیں کہ کوئی ذی وجاہت کسی کار خیر کے لیے روپیہ طلب کرتا ہے ۔ کچھ اس کے رعب سے ، کچھ مآل اندیشی کے سبب سے روپیہ دیتے ہیں ۔ یا بعض درگاہ کے خادم اور مندروں کے پجاری ایسی زبردستی کرکے ستاتے ہیں کہ روپیہ دینا پڑتا ہے ، یا حاکم کوئی ٹیکس کسی کار خیر کے لیے لگا دیتا ہے جیسے کہ قحط کی ٹیکس لگی ہوئی ہے ۔ اگر ان دونوں کاموں میں نیت خیر نہیں ہے تو یہ کار خیر نہیں ، نہ روپے کا دینا خیرات ہے ۔

دوم محتاج کے مانگنے پر دینا ؛ ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں بھیک مانگنے والے بدن پر چیتھڑے لگائے ہوئے ، لیتڑے پہنے ہوئے ہماری صورت دیکھتے ہی ہماری خوشامد کی باتیں بناتے ہیں ؛ دعائیں دیتے ہیں ، اپنی مصیبت کی باتیں سناتے ہیں ، کچھ لینے کے لیے گڑگڑاتے ہیں ، ہاتھ جوڑتے ہیں ، پاؤں پڑتے ہیں ۔ یا ہمارے[1] گھر پر آتے ہیں اور اپنی آمات کی کہانی سناتے ہیں ۔ اُن کو ہم کچھ دے دیتے ہیں ۔ اس دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ہزاروں آدمیوں کو جو اپنی محنت مزدوری سے گزارا کر سکتے ہیں ، سست و کاہل بنا دیتے ہیں ۔ ان کو میلے پھٹے پرانے کپڑے پہنواتے ہیں اور جھوٹی افسانہ سازی سکھاتے ہیں ۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ قصہ گویوں اور بھیک مانگنے والوں کے برابر کوئی دنیا میں جھوٹا نہیں ہوتا ۔ یہ دینا اس سبب سے نہیں ہوتا کہ ہم لوگوں کی حالت زار دیکھتے ہیں کہ وہ جاڑے میں ننگے ہیں یا گرمی میں گودڑ اوڑھے ہوئے ہیں بلکہ وہ ان کی دعائیں و خوشامد کی باتیں

---

۱ ۔ اصل میں 'تمہارے' ہے ۔ مرتب

اچھی لگتی ہیں اس لیے دے دیتے ہیں ۔ اُن کے ہم حال بہت سے آدمی ہم دیکھتے ہیں جو ہم سے سوال نہیں کرتے ، اُن کو کچھ نہیں دیتے ۔

سوم جو محتاج کہ ہم سے کچھ مانگتے نہیں ، اُن کو دے دیتے ہیں ۔ یہ عمدہ خیرات ہے کہ جب ہم کو کسی شخص کی احتیاج ایسی معلوم ہو کہ وہ اس کے رفع کرنے پر خود قادر نہ ہو ، تو ہم اُس کو کچھ دے دیں ۔

چہارم محتاج کو احتیاج کے موافق دیں ۔ یہ بھی ایک خیرات میں خوبی ہے کہ محتاج کو اس قدر دے دیں کہ اُس کی احتیاج رفع ہو جائے اور اس کو کسی دوسرے (کے) پاس احتیاج لے کر نہ جانا پڑے ، جس سے اُس کو سوال کی ذلت اُٹھانی پڑے ۔ اظہار افلاس سے پردہ دری ہوتی ہے ۔

پنجم محتاج کی احتیاج کے موافق نہ دیں ۔ اگر آدمی کسی کی پوری احتیاج رفع کر سکتا ہو اور نہ کرے تو خیرات میں خست کرتا ہے ۔

چھٹا ، لینے والا دینے والے کے نام سے آگاہ ہو مگر دینے والا لینے والے کو نہیں جانتا ہو ۔ یہ اکثر مسلمانوں میں خیرات کے لنگرخانوں میں اور ہندوؤں کے ہاں سداورت[1] میں ہوتا ہے کہ بھوکوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے ۔ کھانے والے جانتے ہیں کہ کون کھلاتا ہے مگر کھلانے والا نہیں جانتا کہ کون کھا گئے ۔ یہ خیرات ایسی ہے کہ جس میں اذیٰ و من کو دخل نہیں ۔

ساتواں ، لینے والے اور دینے والے دونوں ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوں ، نہ پہچانتے ۔ یہ خیرات ایسی ہے جیسے کہ اسپتالوں

---

۱ ۔ سداورت : لنگر ۔

اور مکتبوں میں اور لاوارث بچوں کی تعلیم و تربیت میں ہوتا ہے، کہ بیمار آتے ہیں اور علاج کراتے ہیں - وہ نہیں جانتے کہ کون اس شفاخانے کا خرچ چلاتا ہے - خرچ چلانے والا یہ نہیں جانتا کہ کون بیمار اچھا ہو گیا - سب سے زیادہ عمدہ خیرات یہ ہے جو بچوں کی تعلیم و تربیت میں روپے کے خرچ کرنے سے ہوتی ہے؛ اس واسطے کہ بچے یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ کون ہماری تعلیم کا بار اپنے سر پر اٹھا رہا ہے - وہ اس احسان کا شکریہ ادا کرنا بھی نہیں جانتے - اگر لاوارث بچوں کی تربیت میں روپیہ صرف کرو تو بچے یہ نہیں سمجھتے کہ تم ان پر احسان کرتے ہو، ہم کو اس کا شکریہ بجا لانا چاہیے - یہی خیرات اس قسم کی ہے کہ محتاج پر احسان کیا جاتا ہے جس کو نہ وہ احسان سمجھتا ہے، نہ اس کا شکر ادا کرنا جانتا ہے -

آٹھواں، افلاس اور مصیبت کے انسداد و انتظام کے واسطے پہلے سے خیرات دینا - جیسے بڑے بڑے عمارات میں مزدوروں کا لگانا اور صنعت کے کارخانوں کا کھولنا جس میں ہزاروں آدمی افلاس کی مصیبت سے بچتے ہیں ''التعمیر نصف[1] الخیرات'' مشہور ہے - یہی آٹھ طریقے[2] خیرات کے ساری دنیا میں جاری ہیں -

۱۹ - اپنے عیب پہچاننے

جو شخص اپنے عیبوں کو پہچانتا ہے، اس کو یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ اس کے حال پر نہایت مہربان ہے - جو شخص تیز عقل ہوتا ہے وہ اپنے عیب پہچانتا ہے، کوئی عیب اس کا پوشیدہ نہیں

---

۱ - تعمیر آدھی خیرات ہے - مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اس میں آدمی کو محنت کرنی پڑتی ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ باروزگار ہوجاتا ہے -

۲ - اصل میں تھا 'آٹھ طرح خیرات کی' - مرتب

رہتا ، اور وہ اُس کے علاج کے بھی در پے ہوتا ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ اکثر آدمی اپنے عیبوں سے جاہل ہوتے ہیں ، اَوروں کے عیب ذرا ذرا معلوم کرتے ہیں لیکن اپنے بڑے بڑے عیب نہیں دیکھتے ۔

اے ہنر ہا نہادہ بر کف دست عیب ہا را گرفتہ زیر بغل
تا چہ خواہی خریدن اے مغرور روز درماندگی بہ سیم دغل

اپنے عیب جاننے کے چار طور ہیں :

اول کوئی بزرگ اپنا جو عیوب نفس جانتا ہو اور پوشیدہ آفات روحانی کو پہچانتا ہو ، اُس کے حوالے اپنے تئیں کر دے اور جو عیب وہ بتلائے اُسے تسلیم کرے اور جو علاج کہے وہ کرے ، مگر یہ عمل کہیں ہوتا نہیں ۔ نہ کوئی ایسا کامل شخص ہوتا ہے اور نہ کوئی اپنے تئیں ایسے کامل کے حوالے کرتا ہے ۔

دوم یہ کہ کسی اپنے دوست صادق ، متدین ، عقیل سے کہے کہ میرے احوال اور افعال کو تاکتا رہ اور جو کچھ میرے اخلاق اور افعال ظاہری و باطنی میں برا معلوم ہو، اُس سے مجھ کو اطلاع دے ۔ بزرگان دین نے ہمیشہ ایسا ہی کیا ہے ۔ مگر ایسا دوست ملنا دشوار ہے کہ منہ دیکھے کا لحاظ برطرف کرکے عیب بتلا دے ، یا حسد کے باعث جتنا چاہیے اس سے زیادہ نہ کہے ۔ اکثر دوست حاسد و خود غرض ہوتے ہیں کہ جو عیب نہ ہو ، اس کو عیب جانیں یا خوشامد کے مارے عیب چھپاویں ۔ زمانے کا دستور ہو گیا ہے کہ ہم سے جو کوئی نصیحت کی بات کہے اور ہم کو ہمارے عیب بتلا دے ، ہم اس کو سب سے بڑھ کر دشمن سمجھتے ہیں ۔ افسوس ہے کہ لوگ نہیں سمجھتے کہ اخلاقِ بد مثل سانپ اور بچھو کے ہیں ۔ پس اگر کوئی ہم سے یہ کہے کہ تمھارے کپڑوں میں بچھو ہے تو اس کا ممنون ہونا چاہیے اور خوش ہو کر

اُس (بچھو) کو علیحدہ کرنا چاہیے اور اس کو مارنا چاہیے ۔ بچھو کا زہر تو ایک روز یا اس سے بھی کم تکلیف پہنچاتا ہے اور اخلاق بد کا وبال تو زندگی تک پیچھا نہیں چھوڑتا ۔ اہل مذہب کے نزدیک تو وہ ابد الاباد تک پیچھا نہیں چھوڑے گا ۔

تیسرا طور یہ ہے کہ اپنے عیب دشمنوں کی زبانی معلوم کرے کہ دشمن عیوب ہی کے درپے رہتے ہیں ۔ اور غالب یہ ہے کہ آدمی اس باب میں بہ نسبت دوستوں کے دشمنانِ عیب جُو سے زیادہ نفع حاصل کر سکتا ہے ۔ اس لیے کہ دوست خوشامد کی جہت سے عیب نہیں ظاہر کرتے مگر آدمی کی فطرت میں یہ بات ہے کہ دشمن کے قول کو جھوٹا اور مبنی بہ حسد جانتے ہیں ، لیکن اہل بصیرت دشمنوں کے قول سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں ، اس لیے کہ برائیاں ضرور ان کی زبانوں پر مذکور ہوتی ہیں ۔

چوتھا طور یہ ہے کہ آدمیوں سے مل کر جو بات اُن میں بری دیکھے، اپنے نفس کو اُس پر متنبہ کرے ، اس لیے کہ ایمان دار ایک دوسرے کا آئینہ ہوتا ہے ۔ دوسرے کے عیب دیکھ کر اپنے عیب کو معلوم کر لے اور جان لے کہ طبیعتیں سب کی قریب قریب ہوتی ہیں ۔ جو بات ایک میں ہوگی اُس کی اصل دوسرے میں بھی ہوگی یا اس سے بڑھ کر ہوگی ۔ اس طرح جو بات دوسرے میں بری معلوم ہو، اُس بات کو اپنے نفس سے دور کردے اور یہ تادیب بہت عمدہ ہے ۔ اگر آدمی اُس پر عمل کرے تو مرشد و مؤدب کی کچھ حاجت نہیں ۔

۲۰ ۔ اپنا عیب اوروں کو لگانا

راہ میں ایک زنگی[1] کو آئینہ پڑا ہوا ملا ۔ اس نے اپنی

---

۱ ۔ زنگی : حبشی ۔ مراد بد صورت ہے ۔ مرتب

صورتِ زشت کو اس میں دیکھا کہ آنکھیں مثل آتش اور رخ مثلِ انگشت ہے ۔ جب آئینے نے یہ عیب اُس کو بتائے تو اُس نے اُس کو زمین پر دے مارا اور کہا کہ یہ جو راہ مین ایسا خوار پڑا ہے ، اس کا سبب یہی ہے کہ وہ ایسا زشت ہے ۔ اگر میری طرح رعنا ہوتا تو کیوں اس کی یہ بری گت ہوتی ۔ یہ ذلت اس کی زشت خوئی اور سیاہ روئی کی وجہ سے ہے ۔ بس یہی حال جاہل کا دانا کے ساتھ ہے کہ وہ اپنے عیب کو اُس کے ساتھ لگاتا ہے ۔ آدمی جب کشتی میں بیٹھتا ہے تو نظر اس کی کج ہو جاتی ہے ۔ اپنے تئیں ساکن اور ساحل کو متحرک جانتا ہے ۔ یہ نہیں جانتا کہ میں چلتا ہوں اور ساحل ساکن ہے ۔

مردِ دینار پرست کا بھی یہی حال ہے کہ وہ لڑکے کی طرح ضعیف و نادان ہے کہ اپنی نخوت و کبر و عُجب و خشم کو خوشنودی و عزت و علم جانتا ہے ۔ اگر تجھے علم ہو، اُس کے ساتھ عمل نہ ہو تو اپنے تئیں گدھا سمجھ کہ بار کو اٹھاتا ہے اور گھاس کھاتا ہے ۔ دانش کے معنی عمل کرنا ہے ، جیسے خنجر کا کام صف توڑنا ہے ۔ علمِ باکار سود مند ہوتا ہے ، علمِ بے کار پابند ہوتا ہے ۔ تجھے اس کوچے کی خبر نہیں ، تونے خوب یہ زبان پر رواں کر رکھا ہے کہ فلاں ملحد ہے ، فلاں کافر ہے ۔ تو اپنے گریبان میں منہ ڈال کہ ایمان تیرا سلامت رہے ۔ تو اپنی غم خواری کر ، دوسرے کا اندیشہ نہ کر، اپنی گفتار کو کردار کے موافق کر ۔ علم مخلص جان کے اندر ہوتا ہے ، علم دو رُو زبان پر ۔ ماہ کو روشنی جیسے آفتاب سے ملتی ہے ، ایسے ہی دانش کو تازگی صواب سے ملتی ہے ۔

باب سوم

علم و عمل و عقل

۱ - علم

علم کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح کوئی چیز ہے ، اس کو اسی طرح جانے ۔ علم مال سے بہتر ہے ، علم تیری حفاظت کرتا ہے اور تو مال کی ۔ علم حاکم ہے اور مال محکوم ۔ مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے ، علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے ۔ کوئی چیز علم سے بڑھ کر عزت والی نہیں کہ بادشاہ لوگوں پر حاکم ہوتے اور علما بادشاہوں پر حاکم ہوتے ہیں ۔ علم کے ماتحت مال اور حکومت ہیں ۔ جس خاصے سے کہ انسان کی تمیز چوپایوں سے ہوتی ہے ، وہ علم ہے ۔ انسان جب ہی انسان کہلائے گا کہ جس بات سے اس کو شرف ہو ، وہ اس میں موجود ہو ۔ انسان کی شرافت نہ تو جسم کے زور کے باعث ہے ، اس لیے کہ زور میں اس سے اونٹ زیادہ ہے ، نہ بڑا جثہ ہونے کی جہت سے ہے کہ ہاتھی اس سے بڑا ہے ، نہ شجاعت کے سبب سے کہ درندے اس سے بھی زیادہ شجاع ہیں ، نہ کھانے کی وجہ سے کہ بیل کا پیٹ اس سے کہیں زیادہ ہے ۔ غرض انسان کو جو شرافت ہے ، وہ فقط علم کے سبب سے ۔ علم کے لیے وہ پیدا ہوا ہے ۔ جس کو علم نہ ملا ، اس کو اور کیا ملا اور جس کو علم ملا اس سے اور کیا باقی رہا ۔ دل کی غذا علم اور حکمت ہے ۔ انھی دونوں سے اس کی زندگی ہے، جس طرح بدن کی غذا کھانا ہے جس سے وہ جیتا ہے ۔ جس شخص

کو علم میسر نہیں تو اس کا دل بیمار ہے اور موت اس پر سوار ۔ مگر اُس شخص کو اپنے دل کی بیماری اور موت کی خبر نہیں ہوتی اس لیے کہ دنیا کی محبت اور اس کے کاروبار میں لگے رہنے سے اُس کی حس باقی نہیں رہتی ؛ جیسے کہ خوف اور نشے کے غلبے میں زخم کا درد اُس وقت نہیں معلوم ہوتا ، اگرچہ واقعے میں درد ہوتا ہے ۔

بعض حکما سے کسی نے سوال کیا کہ کون سی چیز ذخیرہ کی جائے ؟ تو جواب دیا کہ وہ چیز ذخیرہ کرنی چاہیے کہ جب تیری کشتی ڈوب جائے تو وہ تیرے ساتھ تیرنے لگے ، یعنی علم ذخیرہ کرنے کے قابل ہے کہ جب کشتیِ بدن غرقابِ موت ہو تو بھی ساتھ رہے ۔

بعض حکما کا قول ہے کہ جو شخص حکمت کو اپنی لگام بناتا ہے ، لوگ اُس کو امام بناتے ہیں ۔ جو شخص حکمت میں معروف ہوتا ہے ، لوگ اُس کی عزت اور وقار کرتے ہیں ۔ اگر آدمی مفلس بھی ہو جائے مگر علم پاس ہو تو وہ بڑی دولت ہے ۔ دل نورِ حکمت سے ایسا زندہ ہوتا ہے جیسے کہ زمین بہاری مینہ سے سرسبز ہوتی ہے ۔ علما ہدایتوں کے چراغ ہوتے ہیں ۔ ہر ایک اپنے وقت میں شمع ہوتا ہے کہ اس سے اس کے عہد کے لوگ روشنی حاصل کرتے ہیں ۔ انھی کے علم کی بدولت انسان حالت بہیمی سے نکل کر انسانیت کی سرحد پر پہنچتا ہے ۔ یہی علم ہے کہ صبح سے لے کر شام تک ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتا ۔ تنہائی میں انیس ، سفر میں جلیس ، خلوت میں گفتگو کرنے والا اور ذہن کا راہ نما ، حالت تونگری میں اور افلاس میں چراغ اور دوستوں کے سامنے نائب ، اور اجنبی شخص کو اقرب بنانے والا ، دشمنوں کے حق میں ہتھیار اور راہِ جنت کا مینار ۔ اُسی کے باعث خدا تعالیٰ

کی طاعت اور توحید اور عبادت و تمجید ہوتی ہے ، اسی سے ورع اور تقویٰ اور صلۂ ارحام اور معرفت حلال و حرام حاصل ہوتی ہے - علم امام ہے ، عمل اُس کا تابع ہے - علم مہلک عادتوں ، بری خصلتوں سے بچاتا ہے ، عمدہ اخلاق اور سعادت کی طرف راہ بتاتا ہے اور عقل کو جلا دے کر پاک کرتا ہے - علم کی ترقی امیروں کی قدر شناسی پر موقوف ہے - جس علم کی وہ عزت کرتے ہیں ، عزیز ہوتا ہے ، جس کی وہ ذلت کرتے ہیں ، ذلیل ہوتا ہے -

۲ - فضیلتِ علم

علم کی فضیلت کے معنی سمجھنے سے پہلے فضیلت کے معنی سمجھنے چاہئیں ؛ فضیلت کا مادہ فضل ہے جس کے معنی زیادتی کے ہیں- جب دو چیزیں کسی بات میں شریک ہوں اور ایک میں کوئی بات زیادہ ہو تو اُس کو کہیں گے کہ یہ دوسری سے افضل ہے - لیکن زیادتی ایسی چیز میں ہونی چاہیے جو اُس کا کمال ہو - اب علم کو بالذات فضیلت ہے ، کچھ اضافی فضیلت نہیں ہے - نفیس چیز کی رغبت جو ہوتی ہے، اُس کی تین قسمیں ہیں : ایک وہ کہ غیر کے لیے مطلوب ہو اور ایک وہ جو بالذات مطلوب ہو ، اور ایک وہ کہ بالذات اور غیر کے لیے مطلوب ہو - ان تینوں قسموں میں سے جو بالذات مطلوب ہوتی ہے ، وہ اول کی بہ نسبت اشرف اور افضل ہے - اور اول قسم کی جو چیزیں غیر کے لیے مطلوب ہوتی ہیں ، وہ روپیہ اشرفی ہیں کہ ان سے خود کسی طرح کا فائدہ نہیں ؛ آدمیوں کی حاجتیں ان سے روا نہ ہوں تو اُن کا حال کنکروں کا سا ہو - جو چیز بالذات بھی اور غیر کے لیے بھی مطلوب ہوتی ہے ، اس کی مثال بدن کی سلامتی ہے ؛ مثلاً پاؤں کی سلامتی اس جہت سے بھی مطلوب ہے کہ بدن درد سے سلامت رہے اور اس لیے بھی مطلوب ہے کہ اُس سے چل کر اپنے مطالب اور مقاصد

پورے کریں -

اب علم میں یہ تینوں اوصاف موجود ہیں ؛ وہ خود بالذات بھی لذیذ ہے ، اس سے بالطبع انسان کو بے غرض مسرت حاصل ہوتی ہے اور وسیلۂ معاش و معاد ہے ، جس سے آخرت میں نجات اور دنیا میں عزت و وقار اور سلاطین پر حکم کرنا حاصل ہوتا ہے - عالم کی قدر و منزلت طبیعتوں میں ضرور ہوتی ہے؛ جیسے علوم مختلف ہیں، اُن کے فضائل میں بھی تفاوت ہے- غرض علم کے افضل ہونے میں کچھ شبہ نہیں اس لیے اس کا سیکھنا افضل بات کا حاصل کرنا ہے اور سکھانا افضل امر کی تعلیم ہے -

انسان کے تمام مقاصد دین یا دنیا سے متعلق ہوتے ہیں اور دین کا انتظام بہ دون دنیا کے انتظام کے نہیں ہو سکتا کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے - پس جو علوم دنیا کے کام کے ہیں ان کا سیکھنا مقدم ہے اور ایسا ضرور ہے جیسا دین کے علوم کا ، کیوں کہ جب تک معاش درست نہ ہو ، معاد درست نہیں ہو سکتی - دنیا کے معاش کے کاروبار کے اصول چار ہیں جن کے بغیر عالم کا قیام نہیں :

اول زراعت جس پر کھانا موقوف ہے -

دوم نوربافی لباس کے لیے -

سوم تعمیر رہنے کے واسطے -

چہارم سیاست آپس میں مانوس رہنے اور اجتماع کے لیے اور اور اسباب معیشت میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے-

اب تمام علوم دنیاوی انھی چار اصول کے خادم ہیں -

اب علوم دینی جن پر اہل مذہب کی نجات آخروی موقوف ہے ، ان میں علم معاملہ ہے ؛ وہ دل کے حالات کا معلوم کرنا ہے ، خواہ وہ اچھے حالات ہوں جیسے صبر و شکر اور خوف و رجا ،

رضا ، زہد و تقویٰ ، قناعت ، سخاوت ، سب حالات میں خدا تعالیٰ کے احسان کو پہچاننا، لوگوں سے سلوک پیش آنا ، خدا تعالیٰ پر گمان اچھا رکھنا ، حسنِ خلق اور حسنِ معاسرت اور صدق و اخلاص اور اُن کے مثل ہیں - اور برے حالات دل کے ، جیسے کہ کینہ رکھنا ، حسد کرنی ، نفاق ، برتری کی طلب اور خواہشِ ثنا ، دنیا میں مزے اُڑانے کی محبت ، کبر ، نمود ، غصہ ، شیخی، عداوت ، بغض ، طمع ، بخل ، حرص ، نکبر ، اِترانا ، تونگروں کی تعظیم کرنی ، فقیروں کی اہانت کا خواہاں ہونا ، آپس میں ایک دوسرے کی برائی کرنی ، ہر بات میں تکبر کرنا ، بے فائدہ امر میں خوض کرنا ، زیادہ گفتگو کرنے کی محبت ، دوسرے کی کٹتی بات کہنی، لوگوں میں بن‌سنور کر رہنا ، دین میں سستی کرنا ، اپنے نفس کو بڑا[1] جاننا ، اپنی برائیوں سے غافل ہو کر لوگوں کی عیب چینی کرنی ، خوف الٰہی کا جاتا رہنا ، جب نفس کو ذلت پہنچے تو اس کا بدلہ سختی سے لینا ، حق بات کے انتقام میں ضعیف ہونا ؛ مکر ، خباثت ، فریب ، سخت دلی ، سخت کلامی ، ظلم کرنا ، ہلکا پن ، حیا و رحم کا کم ہونا ، چوری اور جو ایسی چیزیں ہوں ، سب بری ہیں -

یہ برائیاں تمام اعمال کی ہیں - غرض ان بری بھلی صفات کی تعریفوں اور حقیقتوں اور سببوں اور ثمروں اور علاجوں کا معلوم کرنا علمِ تہذیب اخلاق ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں کام آتا ہے - جو ظاہری اعمالِ بد کرتے ہیں وہ دنیا کے بادشاہوں کے ہاتھوں سزا پاتے ہیں - جو باطنی اعمالِ بد کریں گے ، وہ بادشاہِ حقیقی کے ہاتھ سے سزا پائیں گے - کوئی آدمی ایسا نہیں جو بری

---

۱ - اصل میں 'برا جاننا' ہے - مرتب

صفتوں سے مبرا ہو اور حرص و حسد و ریا، کبر، عُجب وغیرہ سے
خالی ہو - یہ سب صفات اُس کو ہلاک کرنے والی ہیں - اُن کو
دل سے چھوڑ دینا اور اپنے اعمالِ ظاہری میں مشغول رہنا ایسا ہے
کہ آدمی خارش یا پھوڑوں کی تکلیف میں ظاہرِ بدن پر لیپ کرے
اور اندر کا مواد فصد و سینگی سے نکالنے میں سستی کرے -

جب تک باطن کو بری باتوں سے خالی نہ کروگے، اچھی
باتوں سے وہ پُر نہیں ہوگا - زمین سے جب تک گھاس نولائی[1] نہیں
جائے گی، کھیتی اور چمن کی بہار اُس میں نہیں ہوگی - علم دنیاوی
ہو یا دینی، ہر ایک وہ دریا ہے کہ جس کی تھاہ نہیں معلوم ہوتی -
تیرنے والے اُس کے کناروں ہی پر پھرتے ہیں - جتنا جس سے ہو سکتا
ہے اتنی وہ گردش کرتا ہے - کبھی کوئی اُس کی انتہا پر نہیں پہنچا -
جو بڑے غواص ہیں، وہ بھی کبھی اُس کے پار نہیں گئے - ہاتھ
پاؤں بہت مارے مگر پانی کے تھپیڑوں نے اُن کو اُلٹا ہی پھیر
دیا - جاہ و مال کی زینت ایسی ہے جیسے کہ اُبٹنے کا رنگِ مستعار -
علم و کمال کی شرافت ایسی ہے جیسے کہ عارض پر زلف و خال
کہ وہ قائم ہوتے ہیں - علم و کمال وہ حسنِ خدا داد ہے کہ
رنجوری و پیری سے باطل نہیں ہوتا - نوشتۂ دانش وہ نہیں ہے
کہ کزلکِ مرگ سے صفحۂ روزگار سے وہ زائل ہو جائے - اہل علم
گو خود چلے جاتے ہیں مگر اُن کے نقوش و آثار باقی رہتے ہیں -

۳ - علم کی تمثیل

حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کے کلام سے منقول ہے کہ علم کو ایسے
شخص سے تمثیل دی ہے کہ جس کا سر تواضع ہو، آنکھیں اُس کی حسد
سے بری ہوں، گوش اُس کے فہم ہوں، زبان اُس کی راست گوئی،

---

۲ - نولائی : دور نہیں کی جائے گی - مرتب

لہ اُس کا تفحص و تجسس اور دل اُس کا نیک نیتی ، عقل اُس کی
نت اشیا ، ہاتھ اُس کے رحمت (ضعیفوں و درویشوں پر عطا
دست‌گیری کرتے ہوں) پاؤں اُس کے زیارت علما ہوں ، ہمت و
. اُس کا سلامت ہو (یعنی نفس کو دوسرے کی اذیت پہنچانے سے
یا دین و دنیا کے خطروں سے بچتا ہو) حکمت اُس کی امور معاش
ماد کا منتظم کرنا ، پرہیزگاری اس کی منع حرام ہو ، قصر اور
گہ اُس کی رستگاری ہو ، پیس رو اُس کی عاقبت ہو ، سواری
کی وفاداری و اصلاح ہو ، آلۂ جنگ اُس کی نرم گفتاری ،
یر اُس کی رضا ہو ، کمال اُس کی مدارا و ہمواری ، لشکر اُس
محاورہ (آپس میں باتیں کرنی) ، مال اُس کا ادب ہو ، ذخیرہ
کا گناہوں کا اجتناب ہو ، توشہ اُس کا خلق کے ساتھ نکوئی ،
کا پانی مصالحہ ہو ، دلیل یعنی رہ‌نما اُس کا ہدیٰ و ارشاد ہو ،
، اُس کا نیکوں کی محبت ہو ۔

۴ ۔ عقل

عقل کا شرف بداہۃً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے
کرنے میں تکلف کی حاجت نہیں ؛ خصوصاً ایسی صورت میں
علم کی فضیلت کو ہم نے بیان کر دیا ہو اور یہ جانتے ہوں
وہ عقل کا منبع اور مطلع اور اصل ہے ۔ علم کو عقل سے وہ
ت ہے جو اصل کو پھل سے ، آفتاب کو نور سے ، آنکھ کو
سے ۔ عقل کی بدولت دنیا کی فضیلت اور آخرت کی سعادت
ل ہوتی ہے ۔ چوپائے خواہ کیسے ہی شہ‌زور ہوں ، وہ عقل کے
سے دب جاتے ہیں ۔ مخلوقات میں کوئی چیز اکرم عقل سے
• خدا تعالیٰ نے نہیں پیدا کی ۔ سارے کام عذاب ثواب کے
سے ہوتے ہیں ۔ عقل کی زیادتی کمائی میں معاون ، نیک کاموں
طرف رہ‌نما ۔ کوئی کام دین دنیا کا اُس کے بغیر پورا نہیں ہوتا ۔

اُسی کے موافق انسان سارے برے بھلے اعمال کرتا ہے۔ عقل انسان کی نگہبان ہے ، اس کے ایمان کا سامان ہے ؛ وہی اچھی قوم کی محافظ ہے ، اچھے گھروں کی منتظم ہے ، اچھے سوداگروں کی بضاعت ہے۔ مسافروں کے لیے ایک بڑا خیمہ ہے ، ویرانیوں کی آبادی ہے۔ وہی انسان کے بعد اُس کی یادگار ہو سکتی ہے ، جس کا ذکر مدتوں چلا جائے۔ جس سخص کی عقل پوری ہے وہ اپنے نفس کو نصیحت کرتا رہتا ہے اور بہ موجب عقل کے زندگی بھر عمل کرکے فلاح و نجات کو پہنچتا ہے۔ وہ خدا سے ڈرتا ہے اور اُس کے حکموں کو بجا لاتا ہے۔

۵ ۔ عقل کے معانی

عقل کے معانی مختلف چار لیے جاتے ہیں :

اول عقل سے مراد وہ وصف ہے جس کے باعث انسان سب چوپایوں سے ممتاز ہے ؛ یعنی جس کے باعث علوم نظری قبول کرنے اور حصہ صناعات فکری کے سوچنے کی اُس کو استعداد ہوتی ہے۔ غرض وہ ایک نور انسان کے دل میں ہوتا ہے جس سے وہ ادراک کے قابل ہوتا ہے اور علوم نظری کا ادراک کرنے کے لیے مستعد ہوتا ہے۔ جیسے زندگی ایک قوت ہے کہ جس سے جسم حرکات اختیاری اور ارادی پر مستعد ہوتا ہے اور حس کی چیزیں ادراک کرتا ہے ، اسی طرح کی قوت عقل بھی ہے کہ جس سے انسان علوم نظری کے قابل ہو جاتا ہے۔

دوم عقل سے مراد وہ علوم ہیں جو تمیزدار لڑکے کی ذات میں ہوا کرتے ہیں ؛ یعنی جائز چیزوں کے جائز ہونے اور محال چیزوں کے محال ہونے کا علم ، مثلاً اس بات کا علم کہ ایک سے دو زیادہ ہیں اور ایک شخص کا ایک ہی وقت میں دو جگہ رہنا ممکن نہیں۔

سوم عقل اُن علوم کو کہتے ہیں جو روزمرہ کے حالات دیکھنے سے اور اُن کے تجربوں سے حاصل ہوتے ہیں کیوں کہ جو شخص تجربوں سے مشاق اور طریقوں سے واقف ہو جاتا ہے ، اُس کو رسم کے بہ موجب عاقل کہا کرتے ہیں ، اور جو تجربے وغیرہ سے متصف نہیں ہوتا اُس کو جاہل ، غبی و ناتجربہ‌کار کہتے ہیں ۔ غرض علوم تجربہ کی بھی ایک جداگانہ قسم علوم ہے جس کو عقل کہا کرتے ہیں ۔

چہارم عقل اُس کو کہتے ہیں کہ قوت طبیعی کی قوت ایسی ہو جائے کہ امور کے انجاموں کو جاننے لگے ، اور جو خواہش کہ سردست کی لذت کی خواہاں ہو ، اُس کو اُکھاڑ دے اور دبائے رکھے ۔ جب یہ قوت آدمی میں آ جاتی ہے تو اُس قوت والے کو عاقل کہتے ہیں ؛ اس اعتبار سے کہ وہ امور پر اقدام اور جرأت اس طرح کرتا ہے جس طرح کہ انجاموں میں فکر مقتضی ہے ۔ یہ نہیں کہ بہ موجب سردست کے، خواہشِ لذت کا[1] مرتکب ہو جائے ۔

غرض اول معنی تو سب کی جڑ اور بنیاد اور منبع ہے اور دوسرے اول کی فرع اور اُس سے قریب ۔ تیسرے اول اور دوم کی فرع ، اس لیے کہ قوت طبیعی اور علوم بدیہی سے تجربوں کا علم حاصل ہوتا ہے ۔ اور چوتھے معنی ثمرۂ آخری اور علت غائی ہے ۔ پس اول کی دونوں عقلیں سرشتی ہیں اور آخر کی دونوں کسب سے حاصل ہوتی ہیں اس لیے حضرت علیؓ نے فرمایا ہے :

دو ہیں عقلیں میرے نزدیک اے پسر
اک طبیعی ایک سمعی یاد کر

---

۱ ۔ اصل میں ’کے‘ ہے ۔ مرتب

فائدہ سمعی سے کچھ ہوتا نہیں
جب نہ ہو طبعی کا دل میں کچھ اثر
جیسے سورج سے نہیں کچھ منفعت
گر نہ ہووے آنکھ میں نور نظر

غرض حقیقی معنی عقل کے تو اس قوت جبلی کے ہیں اور مجازاً اور علوم پر اس سبب سے اطلاق ہوتا ہے کہ اس قوت کے ثمرات ہیں ۔ یہ علوم اس قوت جبلی میں چھپے رہتے ہیں اور پھر کسی وجہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں ، وہ اس قوت سے باہر سے نہیں آتے ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ پانی کہ کنواں کھودنے سے نکل آتا ہے اور جمع ہو کر محسوس ہو جاتا ہے ، یہ نہیں کہ باہر سے کوئی چیز اس میں ڈالی جاتی ہے ۔ اسی طرح بادام میں تیل اور گل میں گلاب رہتا ہے ۔

۹ ۔ عقل کا کم اور زیادہ ہونا

عقل کی کمی و زیادتی سب قسموں میں سوائے قسم دوم کے ہو سکتی ہے ؛ یعنی علم بدیہی میں کچھ تفاوت نہیں ہو سکتا ۔ سب انسانوں کی عقل اس باب میں یکساں ہے کہ ایک سے زیادہ دو ہوتے ہیں اور ایک جسم دو جگہ نہیں رہ سکتا ۔ باقی تین قسموں میں کمی و بیشی ہوتی ہے ۔

اول قسم کی عقل کا کم و بیش ہونا : ظاہر ہے کہ لوگ علوم کے سمجھنے میں متفاوت ہوتے[1] ہیں ۔ کوئی تو کم ذہن ایسا ہوتا ہے کہ بہت سا سمجھانے اور استاد کے مارنے سے سمجھتا ہے ۔ کوئی تیز ذہن ہوتا ہے، ادنیٰ رمز و اشارے میں سمجھ جاتا ہے ۔ کوئی ایسا کامل ہوتا ہے کہ خود اس کے نفس سے امور حقائق

---

۱ ۔ اصل میں 'ہوتی' ہے ۔ مرتب

جوش مارتے ہیں ، سیکھنے کی نوبت نہیں آتی - تیسری قسم کی عقل ، جو تجربوں کا عالم ہے ، اُس میں بڑی لوگ کم و بیش ہوتے ہیں - بعض جلد بات کو پا جاتے ہیں اور اُن کی رائے اکثر ٹھیک ہوتی ہے اور بعض ایسے نہیں ہوتے - چوتھی قسم میں یعنی قوتِ عقل کا اس درجے پر زیادہ ہونا کہ وہ شہوات کو اُکھاڑ دے ، اُس میں ظاہر ہے کہ لوگ متفاوت ہوتے ہیں ، بلکہ اس بات میں صرف ایک شخص کی حالت میں بھی وہ کم و بیش ہوتی رہتی ہے - یہ تفاوت کبھی شہوت کے تفاوت کی جہت سے ہوتا ہے ، کبھی اُس کے ضرر کے علموں کے تفاوت کے سبب سے - ایک عالم گناہ کے ضرر جانتا ہے ، جاہل نہیں جانتا - بعض آدمیوں کے نفس میں عقل ایسی ہوتی ہے کہ خود متنبہ ہو کر بات سمجھ جاتے ہیں ، بعض بدون تنبیہ اور تعلیم کے نہیں سمجھتے اور بعض کو تنبیہ و تعلیم بھی کارگر نہیں ہوتی - اُس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ زمین کی کہ اُس کی تین قسمیں ہوتی ہیں ؛ ایک تو وہ جس میں پانی جمع ہوتا ہے اور زور پکڑتا ہے اور خود اُس میں سے چشمہ بہنے لگتا ہے - دوسری قسم وہ جس میں حاجت کنواں کھودنے کی ہوتی ہے اور پانی بغیر کنویں کے نہیں نکلتا - تیسری قسم وہ ہے کہ جس میں کنویں سے بھی پانی نہیں نکلتا ، خشکہ ہی رہتی ہے - اس منقسم ہونے کا سبب یہ ہے کہ زمین کے جواہر اپنی صفات میں مختلف ہوتے ہیں - اسی طرح کا حال انسان کی عقل کا ہے -

۷ - عقل

جو کچھ زیرِ چرخ نیک و بد ہے ، وہ خرمنِ خرد کا خوشہ چین ہے - علم و عمل سب اُسی سے درست ہوتے ہیں - سارے کاموں کی کنجی اسی کے ہاتھ میں ہے ، تمام امورِ بستہ کو وہی

کشادہ کرتی ہے ، مایۂ نیک و مایۂ بد میں وہی تمیز کراتی ہے - دولت و دین و صلاح میں اُسی کی آنکھ آخر بین ہوتی ہے - عقل سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہوا ہے ، کیا ہو رہا ہے ، کیا ہوگا - عقل کے سخن میں صوت و حرف نہیں ہوتے - اُس کا نطق جہاں دم مارتا ہے ، وہاں حرف و آواز عدم میں چلے جاتے ہیں - وہ خود ہی گوہر ہے ، خود ہی کان ہے ، خود ہی رسول ہے ، خود ہی نگہبان ہے - جسم و جان کو بردباری اور نفس کو علم و یاری دیتی ہے - یہ فسون و افسانہ نہیں بلکہ حکیمانہ بات ہے کہ آفتابِ عقل کے مشرق و مغرب میں دوں و تحت و چپ و راست نہیں ہے بلکہ اُس کا مشرق ازل ہے اور مغرب اُس کا خدائے عز و جل ہے ؛ اُسی کی رو سے بہشتیِ دین ہوتی ہے ، اسی سے دنیا کی بارگاہ قائم ہے ، وہی بنی آدم کی شادی ہے - فہم ، وہم ، ہوش اُسی سے قائم ہوتے ہیں - وہی دونوں جہان کے عیبوں کو کبھی چھپاتی ہے ، کبھی صریح دکھاتی ہے - عقل ہی راہ حق کی دلیل ہے - عقل کا دامن پکڑ کہ تیری رہائی ہو - جو اُس کا فرمان کرنے اور نہ کرنے کا ہو، وہ دل و جان سے مان - اہل عرب اُس کو مدبر الاقرب کہتے ہیں - عقل کا نام فعال ہے - پانچوں حواس اُس کے غلام ہیں - حس و طبیعت اُس کو اپنا امیر کہتے ہیں ، نفسِ ناطقہ اُس کا وزیر ہے ، مصلحت کی وجہ سے نہ کسی ہوس کی جہت سے - اس کا میل خسروِ عادل اور عالمِ عامل کی طرف ہوتا ہے - اس جوہر کے یہی دو عرض ہیں - ان دونوں (کے) بغیر ملک و دین برباد ہوتے ہیں - جہاں یہ دو نہیں وہاں عقل نہیں ہوتی - یہ عقل ہی کا جوہر ہے جو نفس کو ہوائے نفسانی و مقتضیات شہواتی سے روکتا ہے - وہی شرع و دین کی وارث ہے - وہی زیر کوں کی غم خوار اس دنیا میں ہے - انسان کی جان کی حکمت فزا عقل ہی ہے - جہالت سے عقل ہی تجھے رہائی

دیتی ہے ، تیری دست گیری کے واسطے عقل ہی کافی ہے ، یہی
زاد راہ بس ہے۔ جس شخص میں عقل کی بو آتی ہے ، اس کی باتوں
میں نکتے نکلتے ہیں۔

۸ - عقل

عقل ایک سلطانِ خوش خو ، صاحبِ قدرت ہے ، اسے سایۂ
خدا کہتے ہیں۔ ذات کے ساتھ سایہ آشنا ہوتا ہے ، اس سے کبھی
جدا نہیں ہوتا۔ سایہ بندہ وار ہوتا ہے ، اس کو خود اختیار نہیں
ہوتا ہے ، مگر ذات کے نیچے ہوتا ہے۔ پس عقل بھی خدا کے ماتحت
ہے۔ جو وہ حکم کرتا ہے اس کو کہہ دیتی ہے۔ وہ پیش کارِ[۱]
فرمان ہے ، اس کی بات ہم قرینِ قرآن ہے ، اس کا فیض صفا میں
سکینۂ روح ہے ، اس کا فضل وفا میں سفینۂ نوح۔ جو بات اس کی
بارگاہِ فرمان سے نہیں ، وہ تیرے درد کی درمان نہیں۔ عقل برتر
وہم و حس و قیاس اور فلکِ ستارہ شناس سے ہے۔ مصالح
میں مدبرِ جان ، ممالک پر دبیرِ یزدان۔ اگر شیطان اور
آگ و دخان (کے) پاس تم ہو تو عقل تم کو جلد چھڑا دے
گی۔ جو کوئی اس کا مخالف ہوا ، وہ خراب خستہ ہوا ، جو
اس کا تابع ہوا وہ بلاؤں سے چھٹ گیا۔ عقلِ انسانی ہر چیز کو
جانتی ہے۔ وہ بہتر و بدتر و پاک و مردار میں تمیز کرتی ہے۔
تنِ بشر کی وہ کد خدا ہے ، سب حال سے باخبر ہے۔ جو اس سے
آشنا ہوا ، سب عیبوں سے جدا ہوا۔ سرائے فساد میں غافل کی
فوز و فلاح کے واسطے وہی صلاح ہے۔ مردِ ہنر گو بیابانی ہو
مگر اس کی روح سر لوحِ ربانی ہوتی ہے۔ ہنر مرد کے لیے ایسا ہے
جیسا تن کے لیے جان۔ بے ہنر کے بدن زندہ ہو مگر جان مردہ

---

۱ - اصل (صفحہ ۵۷) میں 'پیشکالہ' غلط ہے۔ مرتب

ہوتی ہے - جو بردبار ہے، وہ شربتِ عقل چکھتا ہے - خرِ بے خرد بار کھینچتا ہے - عقل کو ابجدِ حق ازبر ہوتی ہے ، جامۂ باطل اُس کے سر سے الگ ہوتا ہے - جو شخص عقل میں نا اہل ہے ، اُس کا حلم و علم جہل ہے - مردِ بے عقل سوائے خیال کے کچھ نہیں ہوتا - عاقل قادر و مقدور و آمر و مامور ہے - عقل بادشاہ ہے اور سب اس کے لشکر ہیں ، کیوں کہ مرتبے میں اُس سے کم تر ہیں - عقل کو یہ عزت خدا ہی نے دی ہے ورنہ یہ شرف اس میں ہرگز نہ ہوتا - جو عقل حیلے کی رہنما ہے وہ عقل نہیں ہے ، تیرے لیے عقیلہ[1] ہے - جو شخص عقل کو بدی کے ساتھ ملاتا ہے، اُس سے عقل بھاگ جاتی ہے اور وہ خود بھک جاتا ہے - جو عقل راہ دکھلائے اُس پر چل - جس کو عقل نہیں دیوانہ ہے ، وہ کسی کا آشنا نہیں، بیگانہ ہے- جس گھر میں عقل ہے وہاں غرور و مے انگور نہیں - جس گھر میں وہ نہیں وہاں مے و شطرنج و نرد و بربط و نے ہے- عقل امن و امر کے لیے ہے ، نہ قمار و خمر کے لیے- جو سلاطین عقل سے قرین نہیں وہ شیاطین ہیں - عقل طرار و حیلہ گر نہیں ہوتی، عقل میں دو روئی و کینہ وری نہیں ہوتی - عقل کو اشعار سے عار ہوتا ہے ، اُس کو دروغ و ہرزہ کاری سے کیا کار ہوتا ہے - عقل طمع سے کسی کی مدح و ذم نہیں کرتی ، کسی دل پر ستم نہیں کرتی - عقل برے کام نہیں کرتی ، جس کام کو وہ خود نہیں پسند کرتی ، نہیں کرتی - عقل خواجۂ محقق ہے ، صوفی بق بق کرنے والا نہیں - عقل کبھی کذب سے راضی نہیں ہوتی - عقل سوائے راست گوئی کے کارساز نہیں ، گلو بُر[2] و حیلہ ساز

---

۱ - عقیلہ : بندھن ، بیڑی -
۲ - گلو بُر : گلا کاٹنے والا - (؟)

نہیں ۔ عقل ہرگز خطا نہیں کرتی ، کسی کے لیے بلا کا منصوبہ نہیں سوچتی ۔ عقل کو سوائے صلاح کے اور کام نہیں ۔ اپنی صلاح میں عقل کو معطل نہ کر ۔ خود را کے ہاتھ میں خرد ایسی ہے۔ جیسے کہ کسی ناپاک جا میں چراغ ۔ عقل زور و بہتان کی دم ساز نہیں ۔ فلان و بہمان[1] کی پردہ پوش نہیں ۔ جو مال و جاہ و بدنیتی کے واسطے عقل رکھتا ہے ، وہ عقل عاریتی ہے ، عقل ایسے کاموں سے کنارہ کرتی ہے ، دام و دانہ کا قصد نہیں کرتی ۔ جو عقل سے خالی ہیں وہ اپنے جہل سے اپنے گرد کرم کی طرح جالا تنتے ہیں ۔ اگر وہ تیز رائے حکیم بھی ہوں تو وہ ظاہر میں مار اور باطن میں کزدم ہیں ۔ سخا میں کند ، جفا میں نیز ہیں۔ ایسے آدمیوں کی عقل کو استراق[2] اہرمن کہنا چاہیے ۔ قلاب[3] و کاہن و ساحر کے ذہن کو ذرو (؟) و شعبد و شاعر کی رائے کو طراری و مکاری جاننا چاہیے۔ جو خرد بدی کی طرف رہنا ہو اس پر لعنت بھیج ۔ عقل ہی خوے بخل کو جود سے اور بوے بید کو عود سے تمیز کرتی ہے ۔ کیاست[4] اوباس سے درگذر ، عقلِ دین تلاش کر اور روا رو نہ[5] چلا جا ۔ عقلِ دین نیری نیک یار ہے ، اگر وہ ٹل جائے تو اس کو سرسری کار نہ جان ۔ عقلِ دین سوائے ہدایت کے کچھ اور نہیں عطا کرتی ۔ جب تک وہ حق (کے) پاس تجھ کو نہیں لے جاتی، وہ تجھے نہیں چھوڑتی ۔ عقل دین تجھ کو مخلوق پر امیر بنا دیتی ہے۔

---

۱ ۔ بہمان : شخص مجہول کے لیے جیسے زید ، بکر ۔ (غیاث)
۲ ۔ استراق : چھپ کر باتیں سننا ۔ (غیاث)
۳ ۔ قلاب : دغاباز ۔ (غیاث)
۴ ۔ اصل میں 'گیاست' غلط ہے ۔
۵ ۔ اصل میں 'چلا جا نہ' ہے ۔ مرتب

اس دیر کہن میں عقلِ مادر زاد سے زیادہ کوئی دایہ آدمی کے لیے نہیں ہے - عقل بتلاتی ہے فلاں خوب ہے، فلاں زشت ہے، وہ زمین شور ہے، وہ قابل کشت ہے - اس خار کا گل اچھا ہے، یہ آب سرد ہے، اس بد مست کی عقل فتنہ ہے، یہ بلند ہے، وہ کوتاہ ہے، وہ سرخ و سفید، یہ سیاہ ہے - اس بیہودگی سے درگذر، شاہ بن کر فرزیں کی چال نہ چل (ٹیڑھی چال نہ چل) - کسبِ معاد کے واسطے کاسہ و کیسہ کو عقل سے پُر کر - در غیب پر عقل ہی ترجمان ہے - تن کی جان اور جان کی بادشاہ خرد ہے - جو کوئی ہوا و ہوس کے لیے خرد کو کام میں لاتا ہے وہ دو گڑھوں کے درمیان پیادہ چلتا ہے - بے خرد کو فضل و ہنر ایسا برا معلوم ہوتا ہے جیسے چیونٹی کو پر - خدا ہر شخص کو بقدر عمل ثواب دے گا - تجھ پر افسوس ہے اگر تو عقل کو ایک جھوٹی عورت سمجھے - تجھے چاہیے کہ جب عقل تیرے پاس آئے تو اس کو جان کے برابر عزیز رکھ، وہ تجھ کو خوب رو بنائے گی - اگر تو اس کی تسبیح توڑے گا، تو تیری صورت مسخ ہو جائے گی - خرد ہی تیری جان کی مشاطہ ہے - خرد تیرے ایمان کا چراغ ہے - اس جان میں حقۂ حق خرد ہے جو سر بہ مہر و پائدار ہے - راستی عقل عاقبت کا اور کری کینہ و حسد کا نام ہے - کفر جاہلی ہے، دین عاقلی ہے - جہل عیب جوئی کرتی ہے، عقل غیب گوئی - عاقل تجھ پر خفا ہو، اس سے بہتر ہے کہ جاہل تجھے آنکھوں پر بٹھائے - خدا عاقلوں سے کام ڈالے، جاہلوں کی صحبت سے دور رکھے - مایۂ عقل سے آدمی بادشاہ ہوتا ہے، اسی کے سائے سے آفتاب بنتا ہے -

۹ - عقل و شرع

عقل و شرع دونوں ایسے پاس پاس ہیں جیسے چشم و نور -

نور بے چشم ، شاخ بے بر ، چشم بے نور ، جسم بے سر ہیں ۔ جو شہوت و خشم کے ہاتھ میں پھنسے ہوئے ہیں وہ چشم بے نور اور نور بے چشم ہیں ۔ ایک تواضع تلبیس کے ساتھ کرتا ہے ، دوسرا ابلیس کی طرح تکبر کرتا ہے ۔ دین و دنیا کے چشم و چراغ عقل و شرع ہیں ۔ اگر تیرے دل میں خرد کی ہوا ہے تو سب چیزوں سے سوائے جدل کے تو خوش ہوتا ہے ۔ خرد ہر دل کی طرف دوڑتی ہے ، ہر دل سے باتیں کرتی ہے ۔ عقل کا کام سوائے کرم و داد کے نہیں ۔ جب عقل پر کھولتی ہے تو نزاع و ہوس تدرو کی طرح سر کو خس میں چھپاتا ہے ۔ جس سوار کے ہاتھ میں عقل کی باگ ہے ، نیک انجامی کا گھوڑا اس کی ران کے نیچے ہے ۔ جس چہرے کی مشاطہ خرد ہے ، اس کو روزِ بد کبھی نہیں پیش آتا ۔ جو بد گوہر ہیں وہ خرد سے قرب نہیں حاصل کرتے ۔ سنگِ بد گوہر ، گوہر نہیں ہوتا ۔ باخرد ہوائے نفسانی کو ایک علتِ زہر آمیز سمجھ کر اس سے بھاگتا ہے ۔ اہل عاطفت کی عمر خرد ہی پر ختم ہوتی ہے ۔ زبان پر حرفِ بد زبوں ہوتا ہے ۔ اہل دین کبھی دوں نہیں ہوتا ۔ عقل کا مالک ہونا زر و جواہر کے مالک ہونے سے بہتر ہے ۔ بادشاہی ، پاسبانی سے اچھی ہوتی ہے ۔ عقل کی تعریف نہیں ہوسکتی ۔ جو ملکِ عقل میں پہنچ گیا ، اس نے دونوں عالم کو جیسے وہ ہیں ، دیکھ لیے ۔

اے خداوند خالق سبحاں　　تن رہی را بملکِ عقل رساں

۱۰ ۔ علما

عالم جو لوگ بنتے ہیں ، وہ دو طرح کے ہوتے ہیں :

ایک وہ جو دنیاوی علوم سیکھتے ہیں اور جن کی غرض علم سے اپنی کسب معاش ہوتی ہے ، جس سے دنیا کے چین حاصل ہوں اور اہل دنیا کے نزدیک جاہ و منزلت کا ذریعہ ہو ۔ انسان کی

عادت ہے کہ وہ ایسی چیز کو اختیار کرتا ہے جو اُس کو سہل اور اپنی طبیعت کے موافق معلوم ہوتی ہے ، اس لیے آدمی زیادہ تر دنیا کے حاصل کرنے کے لیے علم سیکھتے ہیں ۔ کسبِ کمال سے غرض حب جاہ و ریاست و مرجعِ خلائق اور انتظامِ ملکی میں شریک ہونا ہوتا ہے۔ وہ مدرسے کے چراغ کے دھوئیں کو دماغ میں اس لیے بھرتے میں کہ مشعلیں اُن کے آگے جایں۔ وہ اوراق پر متوجہ ہو کر کتابوں کی سطور کو ایوان دولت کی نردبان بناتے ہیں اور منصوبوں پر عروج کرتے ہیں ۔ کتابوں کی طرف رجوع اُن کو اسی سبب سے ہوتی ہے کہ مرجع خلائق اور پیشوائےعوام بنیں ۔ دوسرے وہ جو دین کا علم سیکھتے ہیں ۔ آخرت کے کاموں کا خیال دنیا میں کرنا مشکل ہے ۔ حق تلخ اور گراں ہوتا ہے ، اُس پر آگاہ ہونا مشکل ہوتا ہے اور اُس کا دریافت کرنا نہایت سخت ہے ۔ اُس کا طریق دقیق ہے ، خصوصاً دل کی صفات کو معلوم کرنا اور اُس کو برے اخلاق سے پاک کرنا ، جو ایک ہمیشہ کی جان کندنی ہے ، اور جو شخص اُس کے درپے ہوتا ہے وہ ایسا ہے جیسے دوا پینے والا کہ دوا کی تلخی پر بہ اُمید شفائے آئندہ صبر کرتا ہے ۔ پس ایسے طریق کی رغبت کس طرح بہت ہو سکتی ہے۔ صفت باطنی پیدا کرنے کے اہل خواص ہوتے ہیں اور جو چیز عوام کو دی جاتی ہے ، وہ سہل ہوتی ہے ۔ اُس کے خواست گار بہت ہوتے ہیں ۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ سارا علم دنیا ہے مگر عمل اُس کا آخرت ہے ۔ پس جو علم حاصل کرتے ہیں اور اُس پر عمل نہیں کرتے ہیں ، اُن کا علم بے کار ہے ۔ علم عمل کو پکارتا ہے ، اگر عمل نے ہاں کہا تو خیر ورنہ علم رخصت ہوتا ہے ۔

بزرگوں کا قول ہے کہ تین شخصوں کا حال قابلِ افسوس

ہوتا ہے ؛ ایک شخص وہ جو اپنی قوم میں عزت رکھتا تھا ، وہ ذلیل ہو گیا ہو ۔ دوم وہ جو قوم میں تونگر تھا ، مفلس ہو گیا ہو ۔ سوم وہ عالمِ آخرت جو دنیا میں مشغول ہو گیا ہو ۔ حقیقت میں آخرتؔ کے عمل کو چھوڑ کر دنیا کی طلب میں مشغول ہونا عالم کے دل کی موت ہے ۔ ایسے عالموں کا حال ایسا ہے جیسا کہ کوئی پتھر نہر کے منہ پر رکھ دے کہ وہ نہ خود پانی پیے ، نہ پانی کو پینے دے ، نہ کھیتی میں جانے دے ۔ یا وہ باغوں کے تختوں کی پختہ نالیاں ہیں کہ باہر گچ ہے اور اندر بدبو ، یا قبر کہ اوپر سے آباد اور اندر مردوں کی ہڈیاں ۔ دنیا اور آخرت ایک دوسرے کی ضد اور مثل دو سوکنوں کے ہیں کہ جب ایک کو راضی کرو تو دوسری ناخوش ہو ۔ یا ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں کہ جتنا ایک جھکے ، اُتنا دوسرا اُٹھے ، یا مشرق و مغرب جیسے ہیں کہ جتنا ایک سے پاس ہو ، اُتنا دوسرے سے دور ہو ، یا دو پیالوں کی طرح ، جن میں سے ایک بھرا ہے اور ایک خالی ، جس قدر بھرے ہوئے میں سے خالی میں بھرنے کے لیے ڈالو گے ، اُسا ہی بھرا ہوا خالی ہوگا ۔

ایک شخص نے اپنے بھائی کو لکھا تھا کہ تجھ کو خدا نے علم عنایت کیا ، اپنے علم کے نور کو گناہوں کے اندھیرے سے مت بجھانا ورنہ جس روز اہلِ علم اپنے علم کے اُجالے میں چلیں گے تو تُو تاریکی میں رہے گا ۔ جب کسی قوم کے عالم دنیا میں نہایت مصروف ہو جاتے ہیں تو اُن کی اصلاح مشکل ہو جاتی ہے ۔ جب خود نمک ہی میں فساد آ جائے تو وہ اَور کھانوں کا مصلح کیسے ہو سکتا ہے ۔ علمائے آخرت ، جو مذہبی لباس میں دنیا کو طلب کرتے ہیں ، تو وہ بکریوں کی کھال پہنتے ہیں اور اُن کے دل بھیڑیوں کے ہیں ۔ اور زبان اُن کی شہد سے میٹھی اور دل

ایلوے سے زیادہ کڑوا ہے ۔ ایک وہ عالم ہیں جو اپنے علم کو جمع کر رکھتے ہیں اور ایسا بخل ہوتا ہے کہ یہ نہیں چاہتے کہ وہ دوسروں کے پاس بھی موجود ہو ۔ بعض عالم اپنے علم کی حکومت شاہانہ چاہتے ہیں کہ اگر اُن پر ذرا اعتراض ہوتا ہے یا اُن کے حق میں سستی کی جاتی ہے ، تو وہ غصے کے مارے آگ بگولا ہو جاتے ہیں ۔ ایک وہ عالم ہیں ، جب وعظ کہیں گے تو بڑی درستی سے مگر جب کوئی اُن کو نصیحت کرتا ہے تو ناک بھوں چڑھاتے ہیں ۔ ایک وہ عالم ہیں کہ عُجب و کبر کرتے ہیں ، فروتنی اور تواضع اُن میں نہیں ہوتی ۔

غرض علمائے آخرت وہ ہیں جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں ۔ اُن کا فعل قول کے خلاف نہیں ہوتا ۔ وہ پہلے اپنے نفس کو نصیحت پزیر بناتے ہیں ، پھر اَوروں کو نصیحت کرتے ہیں ۔ یہ نہیں کہ اَوروں کو کہیں[1] کہ خیر کرو اور آپ نہ کریں ۔ جو ناصح ایسا ہے کہ وہ جو عیب اَوروں کو بتاتا ہے وہ خود کرتا ہے ، جو اَوروں کو کہتا ہے کہ دنیا کی طرف نہ مائل ہو اور آپ خود اُس پر مرتا ہے ، اُس کی نصیحت دلوں پر سے ایسی رپٹ جاتی ہے جیسے کہ پتھر پر سے قطرہ ڈھل جاتا ہے ۔ وہ اَوروں کو خدا یاد دلاتے ہیں اور خود بھولے ہوئے ہیں ۔ اَوروں کو خدا سے ڈراتے ہیں اور آپ اُس پر دلیر ہیں ۔ خدا کے نزدیک اَوروں کو بلاتے ہیں ، آپ اُس سے دور بھاگتے ہیں ۔

پس ایسے عالموں کا حال ایسا ہے کہ جیسے کوئی عورت خفیہ زنا کرے اور حمل رہ جائے ، اور جب حمل ظاہر ہو تو رسوا ہو ۔ جب علمائے آخرت لغزش کرتے ہیں تو اُس کا بہت بڑا اثر

---

۱ ۔ اصل میں 'کہیے' ہے ۔ مرتب

لوگوں پر ہوتا ہے ۔ وہ اُن کے دلوں کو زمینِ شور بنا دیتے ہیں کہ اُن پر میٹھے پانی کے قطرے گرتے ہیں مگر اُن کو ذرا شیرینی نہیں معلوم ہوتی ۔ ایسے عالم بے عمل بہت جھگڑے کھڑے کر دیتے ہیں اور اعمال سے رو گرداں ہوتے ہیں ۔ اُن کا حال ایسا ہے جیسے کسی بیمار کو بہت روگ ہوں اور وہ کسی حاذق طبیب سے ملے اور وقت بڑی تنگ ہو کہ وہ چلا جاوے ۔ ایسے وقت میں وہ طبیب سے دواؤں کی خاصیت اور علم کی عجیب باتیں پوچھے اور جس ضرورت میں خود گرفتار ہے ، اُس کو دریافت نہ کرے ، تو اُس کی حماقت میں کیا شک ۔

جو علماے آخرت ہوتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ ہر شخص جو دنیا میں[1] کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے وہ اس سے پہلے چھوٹ جاتی ہے ۔ مگر نیکیاں ایسی وفادار محبوب ہیں کہ وہ قبر میں ساتھ جاتی ہیں ۔ جن شخصوں کے پاس کوئی چیز قدر و قیمت کی ہوتی ہے ، اُس کو اُٹھا کر احتیاط سے رکھتے ہیں اور حفاظت کرتے ہیں ۔ نیک علما کے ہاتھ میں جو چیز قدر و قیمت کی ہوتی ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف پھیر دیتے ہیں ۔ لوگوں کا میل ، مال اور حسب نسب ، شرافت کی طرف ہوتا ہے ۔ علماے آخرت کے نزدیک یہ سب امور ہیچ ہوتے ہیں ۔ وہ تقویٰ و ورع ہی کو بزرگی و شرافت جانتے ہیں ۔ حسد کے سبب سے لوگ اوروں پر بدگمانی کرتے ہیں اور برا کہتے ہیں مگر وہ خلق سے عداوت نہیں رکھتے ، رفق و مدارا کرتے ہیں ۔

غرض وہ سب طرح سے خدا کی اطاعت پر جمے رہتے ہیں ۔ دنیا کی خواہشوں سے اپنے نفس کو ذلیل نہیں کرتے ۔ خدا پر

---

۱ ۔ اصل (صفحہ ۸۱) میں 'میں' نہیں ہے ۔ مرتب

توکل رکھتے ہیں ۔ وہ اور لوگوں کی طرح تجارت ، حرفے نہیں کرتے ، بدن کی تندرستی پر ، اپنی قسم کی مخلوق پر بھروسا نہیں رکھتے ۔ وہ زیب و زینت میں پھنسے نہیں رہتے ، نہ اس سے انس رکھتے ہیں ۔ وہ حکام سے دور رہتے ہیں کیونکہ جو شخص حکام سے ملتا ہے اس کو کچھ نہ کچھ تکلف ان کی رضاجوئی اور دل داری میں کرنا پڑتا ہے ۔ وہ جانتے ہیں کہ امیروں کے دروازے فتنے سے خالی نہیں ہوتے ، اس لیے وہ اس سے گریز کرتے ہیں ۔ وہ علما بدتر ہیں جو بادشاہوں کے پاس جائیں ، اور وہ بادشاہ بہتر ہیں جو عالموں کے پاس آئیں ۔ ظالم بادشاہوں (کے) پاس ہدایت کے لیے عالم کا جانا اچھا ہے مگر ان (کے) پاس جا کر مشکل پڑتی ہے کہ کلام میں نرمی[1] اور مداہنت نہ کرے اور ان کی تعریف اور خوشامد نہ کرے ۔

غرض نہ دنیا کی طرف مائل ہوتے ہیں ، نہ سلاطین سے ملتے ہیں ۔ وہ تو علم باطن کے سیکھنے کا اور دل کی نگرانی اور طریقِ آخرت کے پہچاننے اور اس کے چلنے کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں ۔ خدا کے یقین کو لوگوں کے دلوں میں قوی کرتے ہیں اور ان کو شبہے سے نکالتے ہیں (فصل اول میں پڑھو) ۔ ایسے علما اکثر گفتگو علم و اعمال کی[2] کرتے ہیں ، اور جو چیزیں کہ عمل کو فاسد کرتی ہیں اور دلوں کو پریشان کرتی ہیں اور وسواس کو ابھارتی ہیں اور شر کو اٹھا کر کھڑا کرتی ہیں ، ان کے حال سے بحث کرتے ہیں کیونکہ دین کی اصل شر سے بچنا ہے ۔ اشعار :

---

۱ ۔ اصل (صفحہ ۸۱) میں 'زمی' ہے ۔
۲ ۔ اصل (صفحہ ۸۱) میں 'کے' ہے ۔ مرتب

بدی کے علم سے ہم کو بدی نہیں منظور
ولے بچے رہیں اُس سے ، یہی ہے اپنی مراد
کہ شر کے حال سے جو آدمی نہیں آگاہ
بعید کیا ہے کہ وہ شر میں پڑ کے ہو برباد

ایسے لوگ اپنی عمر کو زیادہ نہیں سمجھتے - جانتے ہیں کہ جو چیز آنے والی ہے وہ نزدیک ہے - دور وہی ہے جو آتی نہیں - اس لیے وہ امور خیر میں جلدی کرتے ہیں - نفس کی تہذیب اور باطن کی درستی کی طرف خیال رکھتے ہیں - اپنے علم کے موافق عمل کرتے ہیں ، کسی کو ایذا پہنچانے سے حذر کرتے ہیں - جو مال اُن (کے) پاس پہنچتا ہے ، وہ نیک راہ میں خرچ کرتے ہیں ، جو بات کہ زائد از حاجت ہوتی ہے ، اُس کو زبان سے نہیں نکالتے -

۱۱ - علم و عقل

علم بہرِ کمال باید خواند　　　　نہ بسودائے مال باید خواند

ہم عقل کا بیان لکھ چکے ، اب علم کا بیان لکھتے ہیں ؛ علم ہی انسان کو درگاہ الٰہی تک پہنچاتا ہے - ہوائے نفسانی و مال و جاہ سے بے پروا کرتا ہے - جتنا علم آتا ہو اُس کو کام میں لاؤ اور کام کے واسطے اُس کو پڑھو - علم کے ساتھ حلم ضرور ہے - بے حلم کے آدمی علم سے متمتع نہیں ہوتا - علم بے حلم خاک کُو ہے اور علم با حلم آبرو ہے - جان بے علم شاخ بے بار ہے ، علم بغیر آدمی گمراہ ہے اور سرائے الٰہی کی رسائی میں دست کوتاہ ہے - جس کا دم‌ساز علم ہوا ، وہ نعمت و ناز میں سرافراز ہوا - اہل علم و ہنر کا سینہ آسان ہوتا ہے اور اس میں دقائق و نکات اختر ہوتے ہیں - سنگ بے سنگ کے لعل نہیں ہوتا - ایسا ہی آدمی کا علم بغیر حلم کے نیک پے نہیں ہوتا - سب باتوں کی طرف کان لگانے چاہئیں - جو اُن میں بہتر معلوم ہو ، وہ دل پر گلشن

کرنی چاہیے۔ ''خذ ما صفا و دع ما کدر'' ۔ (جو چیز صاف ہے ، اس کو لے ، جو کدورت رکھتی ہے ، اُسے چھوڑ) ۔

علم داں کہ خدائے جہاں اور خاصگان خدا میں سے ہوتے ہیں ، جیسے کاہ کاہربا سے زیادہ قیمتی نہیں ہو جاتی ، ایسے ہی بدوں کو نیکوں کے ذریعے سے سلامتی نہیں، حاصل ہوتی ۔ اگر علم پڑھنے سے اہل ہنر نہ ہو تو تمھارے علم سے جہل بہتر ہے ۔ جو شخص علم کے واسطے آمادہ نہیں ہے ، وہ مثل کاہ و کاہربا کے ہے کہ کاہربا کو کاہ کے جذب سے کچھ نہیں حاصل ہوتا ۔ علم کا عالم بڑا فراخ و عجیب ہے ، اُس کی اطراف و حدود نہیں ہیں ۔ اگر آدمی ہے تو اُس عالم کی سیر کر ۔ علم گلشن جان کا بام ہے ، عقل و حواس اُس کی نردبان ہے ۔ جو عالم عمل سے دور رہا اس کا حال مہندس و مزدور کا سا ہے ۔ مہندس جو ایک دم میں سوچ لیتا ہے ، وہ مزدور سے پانچ مہینے میں نہیں سوچا جاتا ۔ دو مہینے میں جو مہندس کام بنا لیتا ہے ، وہ اُس کے شاگرد سے برسوں میں نہیں ہوتا اور جو یہ شاگرد کام کرتا ہے وہ مزدور سے عمر بھر نہیں ہوتا ۔ اسی سبب سے مہندس سے مزدور کی مزدوری کم ہوتی ہے ۔ یہ جسم سے کام کرتا ہے اور وہ علم سے ۔ دیدۂ عالم مآل میں ہوتا ہے ، دیدۂ جاہل حال میں ہوتا ہے ۔ جو نادان نیک ہوتا ہے ، وہ اصل میں نیک نہیں ہوتا ۔ بد دانا اُس سے زیادہ نیک ہوتا ہے ۔ عالم کے ایک لحظے کی بہا ایک عالم ہوتا ہے ، جاہل کے ایک سال کے کام کی بہا چند درم ہوتے ہیں ۔ علم سوار ہے ، عمل سواری ہے ، اس لیے عمل بار بردار علم کا ہے ۔ علم نر ہے عمل مادہ ہے ۔ دین و دولت انھی سے پیدا ہوتے ہیں ۔ اول عالم اس عالم میں کم ہیں اور پھر عامل ان میں کمتر ۔

علم بغیر کوئی کام بارور نہیں ہوتا ۔ تخم کے مغز کی طرح

ثمرعلم جو دین و داد کے واسطے ہے ، وہ آتش و آب و خاک و باد ہے - جو علم باغ و راغ کے واسطے ہو ، وہ دزد کے ہاتھ میں چراغ ہے - علم داں علم خواں نہیں ہوتا - جو عالم اپنی گفتار پر مست ہوتا ہے ، وہ کبھی ہشیار نہیں ہوتا - علم سخن فروشی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ خموشی کے واسطے - جو علم میں دعویٰ ہوس کے لیے کرتا ہے ، وہ بانگ جرس ہے ، جس کے کچھ معنی نہیں - جو اہلِ معنی ہیں وہ بکواس نہیں کرتے ہیں - جس نے علم سے صدق و حق کو ڈھونڈھا ، وہ سبقت لے گیا ، جس نے اُس سے دغا کا قصد کیا ، وہ ہلاک ہوا - علم مخلص جان میں ہوتا ہے - علام دوروے زبان پر - جو علم باکار ہے وہ برومند ہے ، جو علم بےکار ہے وہ پائے بند ہے -

اہل صواب کے دل میں علمِ حق جوئے خرد میں آبِ روشن ہے - علم مغز ہے ، عمل پوست ہے - ایک نور چراغ ، دوسرا روغن ہے - افسوس ہے کہ عمل میں ایک مرد صادق نہیں لیکن مدعی بہت سے ہیں -

ایک حکیم حاذق نہیں جو پیر کے فالج کا اور جوان کی دق کا معالج ہو - وہ اپنی دانش کا رخ خلق کو دکھاتے ہیں اور اُس کی مزد پا لیتے ہیں - مال و جاہ کے واسطے علم کی ہوس نہیں چاہیے - خدا کے واسطے علم چاہیے ، آسمانِ ازل کے واسطے علم و عمل سے بہتر کوئی نردبان نہیں ہے - یہی وزیر ہیں جو اوج قربِ الٰہی میں پہنچاتے ہیں ، یہی دو بازو ہیں جو دل کے باغ کو ہوس ہائے نفسانی کے خار و خس سے پاک و صاف کرتے ہیں - اہل علم با عمل کے برابر کسی فرقے کو عیبوں سے پاک صاف رہنا[1]

---

۱ - اصل میں 'زیبا' صحیح نہیں ہے - مرتب

ضرور نہیں ہے ، کیونکہ اُن سے اوروں کے حال کی اصلاح و تہذیب اخلاق ہوتی ہے ۔ عوام انھی کی پیروی کرتے ہیں ، اُن کے محاسن دیکھنے سے ایک خلق نکوکار ہو جاتی ہے ۔ اگر اُن کے اوضاع زشت و ناصواب ہوں تو اُس سے خلق کے اخلاق میں فساد ہوتا ہے ۔ عوام کی زشتیِ اعمال تو نجاست خشک ہے کہ اُن سے اثر دوسرے کو نہیں پہنچتا اور اہل علم کی بداطواری نجاست تر ہے[۱] کہ ایک خلق اُن سے پلید و ناپاک ہوتی ہے ۔ انسان کے گوہر کی آب علم ہے اس لیے علوِ شان کے آسمان پر آفتاب ہی علم ہے ۔ جمال علم کے کمال کے سبب سے انسان بہائم و دواب سے جدا و ممتاز ہے ۔ اسی ہنر کی آبرو سے وہ محفل ہستی میں سب پر مقدم نشیں ہے ۔ علم ہی سے حرام و حلال معلوم ہوتا ہے ۔ وہی راہ بہشت کا منارہ ہے ۔ وحشت میں مونس و غربت و تنہائی میں مصاحب ، خلوت میں سخن گو ، سستی و سختی روزگار میں دلیل ، دشمنوں پر سلاح اور دوستوں کی فلاح ، ضعف میں قوت بدن ۔ علم دل کی زندگی اور دیدوں کی روشنی ہے ، جہل موت و ظلمت ہے ۔ وہی اخیار[۲] کی منازل اور ابرار کی مجالس میں پہنچاتی ہے ۔ دنیا و آخرت میں اُسی سے درجے بلند ہوتے ہیں ۔ علم کوئی مال نہیں ہے کہ صندوق میں جدا رکھا ہوا ہو ۔ وہ دل میں ہوتا ہے ، ہر وقت ساتھ رہتا ہے ، گھر اور بازار میں جدا نہیں ہوتا ۔ کیا خوش وقت وہ صاحبِ توفیق ہے کہ شمع جہل سوز سے اپنا دل روشن کرتا ہے ۔ چراغ مدرسہ سے اپنی ظلمتِ نادانی کو دور کرتا ہے ۔ فرخ فال وہ صاحب اقبال ہے کہ ممالک علم و دانش کی تسخیر کے لیے علم بلند کرتا ہے ۔

---

۱ ۔ اصل میں 'ہی' ہے ۔
۲ ۔ اصل میں 'اخیسار' ہے ۔ مرتب

زندہ دل وہ عاقل ہے کہ کتب معتبرہ کی سوادِ ظلمات میں آب حیات تحقیق سے اپنے تئیں زندہ کرتا ہے ۔ وہ کیا شیریں کام ہے کہ چار باغ کتب مستند میں شاخسار سطور سے معارف کے اثمار خوش گوار کے مزے لیتا ہے ۔ علم کے لیے عمل اور عمل کے لیے علم درکار ہے ، کیونکہ ہر کام کے کرنے کے لیے اس کا جاننا ضرور ہے اور ہر مقصد کے طلب میں اُس کے حاصل کرنے کا طریقہ جاننا مقدم ہے ۔

غرض علم کو عمل پر تقدم ہے ۔ نساجی و حلاجی و نجاری و حدادی میں شاگردی و اُستادی ضرور چاہیے ۔ اُستاد بتلائے تو شاگرد عمل کرے گا ۔ جو لوگ بے علم کے عمل کرتے ہیں ، وہ جہل و نادانی کی باریک و تاریک راہ میں قدم رکھتے ہیں ۔ عمل بے علم ہمیشہ اصلاح کی نسبت فساد زیادہ کرتا ہے ۔ عامل بے علم ایسا راہ رو ہوتا ہے کہ راہ مقصد پر نہیں چلتا ۔ جتنا جلد چلتا ہے اُتنا ہی منزل مقصود سے دور ہوتا ہے ۔ جو لوگ خدا کی راہ میں چلنا چاہتے ہیں اُن کے لیے ہادی و مرشد کی ضرورت ہے ۔ جو شخص بے ہادیِ علم کے عمل کی وادی میں قدم رکھتا ہے ، وہ ضلالت میں پڑتا ہے ۔ جیسے عمل کے لیے علم درکار ہے ، ایسا ہی علم کے لیے عمل کی ضرورت ہے ۔ اہل علم و کہال عوام و جہان میں ایسے ہوتے ہیں جیسے اندھوں میں دیکھنے والے ۔ اندھوں کی نسبت دیکھنے والوں کا کنویں میں گرنا یا راہ سے ، جو مدعا کی طرف جاتی ہے ، اُس سے بھٹک جانا زیادہ قبیح و برا ہے ۔ اس طرح اگر اہل علم طریق بندگی میں بے پروائی کرکے گھاٹیوں کے اندھے کنویں میں گر پڑیں تو بہ نسبت جاہلوں کے زیادہ برا ہے ۔ جاہل تو اپنے جہل کے سبب سے عمل نہ کریں تو اتنا برا نہیں ہے جیسا کہ اہل علم کا باوجود علم کے عمل نہ کرنا برا ہے ۔

نہ ازاں لعنت است بر ابلیس   کہ نداند ہمیں ز یسار
زاں برو لعنت است کاندر دیں   علم دارد بعلم نہ کند کار

تو دزد حرص سے ڈر ، نہیں رات کو وہ چراغ لے کر آئے گا اور تیرے گھر میں سے عمدہ اسباب لے جائے گا ۔ عالم فاسق ، جاہل فاسق سے زیادہ بدبخت ہوتا ہے اور اس سے مواخذہ سخت ہوتا ہے ۔ سچ ہے علم کے ساتھ رنج عمل ضرور ہے ۔ ان ہی دو مقدموں کی ترتیب سے نتیجۂ رستگاریِ دین و دنیا پیدا ہوتا ہے ۔

۱۲ ۔ جہالت اور عالم بے عمل کی مذمت

تو نے عقل سے بہت دور اپنا خیمہ لگایا ہے اور جہالت کے پاس جا کر پڑا ہے ، جس نے تیرے منہ پر مہر لگا دی ہے ۔ تو اس راہ پر چلا نہیں جس میں آدمیوں کو چلنا چاہیے بلکہ جنگل میں گم راہ ہو رہا ہے ۔ علم کی مدد سے مجھے فراغ نہیں ہے ، شبِ تاریک میں میرے پاس چراغ نہیں ہے ۔ جس کی راہ میں چراغ نہ ہو وہ چاہ میں گرتا ہے اور پھر راہ بھی وہ ہو جس میں سو چاہ ہوں اور تو اُن سے بے خبر ہو تو تیرا چلنا اُس میں ایسا ہے جیسا کہ چھلنی میں چیونٹی[۱] کا چلنا ۔ جو شخص دانش کے سبب عزیز نہیں ہوتا ، وہ گائے بیل ہوتا ہے ۔ جاہل پاس زر خواہ کتنا ہی ہو ، وہ گدا ہے ۔ جو مرد علم سے تونگر ہوتا ہے اُس کی نظر گھر و زر پر نہیں ہوتی ۔ علم و درم دونوں کسی شخص کے پاس نہیں ہوتے ۔ عالم ، تونگر جاہل سے بہتر ہوتا ہے ۔ اگر جاہل اپنے زر پر خروش کرے تو اربابِ ہوش اُس کو عیب سمجھتے ہیں ۔ گائے پر اگر موتیوں کی جھول ہو تو اُس پر بوجھ زیادہ ہوگا ، کوئی ہنر اُس میں نہیں پیدا ہوگا ۔ سفیہ سر پر عمامہ رکھنے سے فقیہ نہیں بن جائے گا ۔ خر

---

۱ ۔ اصل میں 'چینوٹی' ہے ۔ مرتب

جل دیبا سے اہل نہیں ہوگا ۔ جب سرمایۂ علم نہیں تو اُس پر دستار کے پیچ میں کیوں اپنے تئیں ڈالتا ہے ۔ سب لباسوں میں جہل کا لباس زشت ہے ۔ اگر کوئی اہل علم کا ، جاہل لباس پہن لے تو اُس سے جہل پوشیدہ نہیں ہوتی ۔ یہ ایسا ہے کہ جبہ سفید ہے ، استر اندو سے رنگین ۔ اوپر لطیف ہے نیچے خارا ہے ۔ اگر آدمی فقط لباس ہی پہن کر صدر جوئی کرے تو جس وقت کوئی اُس سے مسئلہ پوچھے گا تو کیا کہے گا ۔ منصب بےمایہ کو سزاوار ہی نہیں ، خواہ وہ پیغمبر زادہ ہی کیوں نہ ہو ۔ جس کی جگہ صف نعال[1] میں ہونی چاہیے ، اُس کے واسطے گاؤ تکیہ لگانا وبال ہے ۔ جو جاہل مایۂ اعلیٰ طلب کرتا ہے ، وہ اجہل ہے ۔ جانگاہ کی کمی و بیشی کو ذلت و جاہ بےبصر جانتے ہیں ۔ مگر جو بینا ہیں وہ اُس کی کمی و بیشی پر کچھ خیال نہیں کرتے ۔ دیدہ فربہ ہو نہ لاغر ۔

فائدۂ خاص یہ ہے کہ جاہ و[2] تکبر سے خلاص ہو ۔ جہالت بے دینی کے دیباچے کا مطالع ہے اور خود بینی کا سبق ہے ۔ جو شخص دانس کو آبرو کے لیے تلاش کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اہل تکلف میری تعظیم کے لیے کھڑے ہوں ، صدر بلند پر بٹھائیں وہ اپنی آبرو سے ہاتھ دھوتا ہے ۔ دانش مند اُس کو اپنا شرف نہیں سمجھتا کہ صدر بلند پر اُسے بٹھائیں ۔ محراب اُسی کو سزاوار ہے جو دین و دیانت کی باتیں بہت جانتا ہے ۔ اگر وہ ہم سروں کی صفوں میں بیٹھ کر نمائش کے لیے ہرزہ درائی کرے تو وہ گدھا ہے ۔ اُس کو چاہیے کہ وہ نیشکر کی طرح پُری سے خموش ہو ، خالی نے کی طرح خروش نہ کرے ۔ جو عالم سوال و جواب سے

---

۱ ۔ صف نعال : جوتے اُتارنے کی جگہ ۔
۲ ۔ اصل (صفحہ ۸۶) میں واؤ نہیں ہے ۔ مرتب

غافل ہو ، اُس کا بیان ایسا ہوتا ہے جیسا کہ بڑانا ۔ جو علم کہ
خواب کی طرح بیان ہو ، وہ علم نہیں ہے بلکہ افسانہ ہے ۔ علم وہ
زندہ دلی سے پڑھ کہ تیرا خواب بھی عبادت ہو ۔ جب تو ہی
شاہد و مے کے لیے بہانے علم سے بنائے گا تو اُس کو علم نہ کہو ،
خواب پریشان کہو ۔ لوزات میں زہر کا ہونا زہر ہے ، ایسے ہی
بادہ و قرآن کا ایک سینے میں ہونا قہر ہے ۔ جو حافظ قرآن ہو
کر شراب پیے تو وہ قرآن کو شراب سے دھوتا ہے جو کفر ہے ۔
علم وہی ہے کہ سلامتی کی راہ بتائے اور راہ قیامت کا بدرقہ ہو ۔
جو بدرقۂ راہ کو رہزنی سکھاتا ہے وہ اپنے وطن میں آگ لگاتا ہے ۔
تعلیم وہی ہے جو دل افروزی کرے ، نہ یہ کہ دوزخ کے واسطے
سبق آموزی کرے ۔ جو تیشہ زن ہنر سکھاتا ہے ، وہ تختہ جلانے
کے واسطے نہیں بناتا ہے ۔ شمع گھر کی شب افروزی کے واسطے
ہوتی ہے ، نہ گھر میں آگ لگانے کے واسطے ۔ سوئی اس لیے ہوتی
ہے کہ جو پاؤں میں کانٹا چبھ جائے ، اُس سے نکالے ، نہ یہ کہ وہ
خود اپنی نوک پاؤں میں اور چبھوئے ۔

تو جو مسائل مذہب کو مکر و فریب سے بیان کرتا ہے ،
تو فرشتے کے نیچے بیضۂ شیطان رکھتا ہے ۔ ہُما کے نیچے خواہ کسی
مرغ کا بیضہ رکھو وہ اپنے نسب پر پیدا ہوگا ۔ تجھے شرم نہیں
آتی کہ فرمان دہی کے وقت تو تیغ نبی کو شیطان کے ہاتھ میں
دیتا ہے ۔ جو عالم یزدانی ہوتے ہیں وہ حیلہ و مکر سے ایسے دور
رہتے ہیں جیسے سایے سے نور ۔ جاہل اگر نیک و بد میں فرق نہ
کریں تو مضائقہ نہیں کیوں کہ ورق بے نگار میں کوئی شک
نہیں ہوتا ، مگر عالم ہو کر ایسا کرے تو غضب ہے ۔ علم وہی
ہے جو راہ تحقیق میں نفس زنی کرے ، خشم خدا سے ترس ناک
ہو کر صواب اور پاک باتیں کہے ۔ اگر تجھے اپنی خطا کی بیم نہ

ہو تو تیرے لیے عالم خلل عظیم ہے ۔ تو اپنے عمل سُست سے نتنوں کے واسطے کمر چست کرتا ہے ۔ جو علم کہ عمل کا نشان نہیں رکھتا ، وہ ایک کالبدِ بے جان ہے ۔

۱۳ ۔ صوفی

اگر تجھ کو صوفی ہونے کا شوق ہو تو تُو خود بینی سے آنکھ بند کرلے ۔ گنج عرفان کو اپنا حاصل و کسب بنا ، فقط خدا کی ذات کو اپنا قبلہ بنا ۔ جلوۂ وحدت تو ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رکھ ، لطف و قہر کو ، نوش و زہر کو یکساں جان ۔ صوفیِ صافی صفت تو یہی خوبیاں رکھتے ہیں ۔ جو صوفی اپنا آوازہ بلند کرتے ہیں اور اسی شغل کو پسند کرتے ہیں ، وہ مثل خمِ تہی کے ہیں کہ جس سے آواز نکلتی ہے ۔ وہ صوفی نہیں ، اُن کو اس دعوے سے کچھ سود نہیں ۔ خام جو پختگی کا دعویٰ کرے ، اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ زنگی کا نام کافور رکھو تو اس سے سیاہی اُس کی دور نہیں ہوتی ۔ طوطیِ قدسی ہونے کا دعویٰ اور ہوا میں مگس کی طرح ہوس کے سبب سے لوگوں کے خوان پر پر زنی ۔ خرقۂ صدپارہ کیا کام آئے گا جب تیرا دین ہی صد پارہ ہوگیا ۔ یہ صوفی ہونا نہیں ہے بلکہ اپنے تئیں بدی میں مشہور کرنا ہے اور درد و بلا کو جمع کرنا ۔ ریا سازی کی عادت کو طاعت بازی بنا رکھا ہے ۔ سجادے کو کندھے پر سجادہ فروشوں کی طرح ڈال رکھا ہے ۔ اہل بازار دیدہ ور ہیں ، وہ تیری ایسی جنس کو پھوٹی کوڑی کو بھی نہیں خریدیں گے ۔

اہل دل کی راہ میں ہمت پست کے سبب سے سوائے عصا کے کچھ اور تیرے پاس نہیں ہے ۔ اگر لغزش پا سے کنوئیں میں گرے گا تو یہ عصا کچھ تیری مدد نہیں کرے گا ۔ مسواک کو تونے دندانِ طمع کے تیز کرنے کے لیے سوہان بنا رکھا ہے ۔ وہ تیرے

دانتوں کو آرے کی طرح کاٹ ڈالے گی ۔ تو تسبیح کو انگلیوں
پر پیچ دے رہا ہے ، تیرے اس پیچ میں کوئی نہیں آئے گا ۔ چند
مہرۂ بے سروپا کی بست و کشاد سے نقش مراد حاصل نہیں ہوتا
ہے ۔ اگر تجھ کو حساب حسنات مطلوب ہے تو انگلیوں کی پوریں
ہی کافی ہیں ۔ تو اپنی ڈاڑھی کے بالوں کو کنگھی سے ایسا آراستہ
کرتا ہے جیسے کہ عورتیں اپنے بالوں کو بناتی ہیں ۔ اگر مرد
ہے تو شانے کو پھینک دے ۔ جو اوروں کو ساتھ لے کر
دانتوں کی طرح صف باندھ کے غیروں کی روٹیوں پر بیٹھا ہے ، تو
اس سے تجھ کو کچھ بہرہ نہیں حاصل ہوگا ۔ حرص و شرہ سے
دست کوتاہ کر ، اہل قناعت کی صف میں آ ۔ اس دیر مجاز میں
دست درازی سے کوتاہ دستی کرنی سب باتوں سے زیادہ اچھی ہے ۔

۱۴ ۔ صوفی

اگر تو راہ تصوف میں چلنا چاہتا ہے تو اس راہ میں خدا کی
رضا کا توشہ لے اور اپنے سب آرام کو ایک کونے میں رکھ دے ۔
اسباب دنیا کی محبت کو اس راہ میں لے کر نہ چل ، ہزاروں راہ زن
اس میں موجود ہیں ۔ اگر اس بار کو سر سے نہ اتارے گا تو
تیرا حال دنبے کا سا ہوگا جس کے پیچھے بھیڑیا دوڑے تو اس
کی دُم کی چکتی کا بوجھ ہی اس کے پاؤں کے لیے سنگ راہ ہوگا ۔
جب تک تو اپنے تئیں خاک و گھاس کی طرح پاکوب[1] نہیں
بنائے گا ، درگاہ کبریائی میں قدم نہیں رکھنے پائے گا ۔ جب تک
سو جگہ سے دل کو خستہ نہیں کرے گا ، نور حقائق تجھ کو
نہیں حاصل ہوگا ۔ بہت سی خلائق پشمینہ پوش ہیں جن کے گوش

---

۱ ۔ پاکوب : رقاص ۔ یہاں پائمال کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ اصل
میں 'پاکوب سے' ہے ۔ مرتب

میں آواز اذان نہیں جاتی - بہت سے زاہد خشک ایسے ہیں کہ اپنی ظاہری طہارت دکھانے کے واسطے بدن کو بار بار دھوتے ہیں جس سے کہ آبرو لوگوں میں حاصل ہو، ایسی آبرو روغن دوزخ ہے - جو آلودگی میں اپنے تئیں پاک دکھاتا ہے، وہ اہل نظر کی نظر میں تاب ناک نہیں ہوگا - جو حقیقت میں پاک ہیں جیسے آفتاب، گو اس کی تابش کی نگاہ کو تاب نہیں مگر اس کو آب میں دیکھ لیتے ہیں -

غرض کسی ذریعے سے پاک دلوں کو لوگ جان جاتے ہیں - بہت سے زاہد زر دوست ہیں کہ وہ زر کی خوب مضبوط گرہیں باندھتے ہیں - مگر زر فقیر لے اور وہ کسی کو نہ دے، تو وہ خس ہے - صوفی کو دولت سے پرہیز چاہیے - یہ کیا کہ سر پر بالوں کا بوجھ نہ اٹھائیں، اس کو منڈائیں، مگر یہ بار زر سر پر لیں - اگر فقر[1] سے غرض زرطلبی ہو تو فقر اور تجارت میں کیا فرق ہے - جواری جو پاک‌باز (سب مال ہارنے والا) ہے، وہ اس عابد سے اچھا ہے جس کی عبادت کا سبب حرص و آز ہے - صوفی کو یہ سمجھنا چاہیے، جیسا برہمنوں کے واسطے بت زریں بد ہے، ایسے ہی میرے لیے اس زر کا بت بنانا برا ہے - سچ یہ ہے کہ آدمی دین دنیا دونوں کے ساتھ موافقت نہیں کر سکتا - زہر و تریاق ایک جگہ نہیں اکٹھے ہوتے - ایک پلڑے میں شیر کی مونچھیں اور گوزن کی پلکیں نہیں تل سکتیں -

۱۵ - استاد کے آداب

علم کے باب میں آدمی کے چار حال ہیں، جیسے مال کے حاصل کرنے میں ہوتے ہیں ؛ مثلاً مال والا اول تو مال پیدا کرتا ہے،

---

۱ - اصل میں دونوں جگہ 'فقیر' ہے - مرتب

اُس وقت کمانے والا کہلاتا ہے ۔ دوم اپنی کمائی کو جمع کرتا ہے تو تونگر ہو جاتا کہ حاجت دوسرے کے مانگنے کی نہیں رکھتا ۔ سوم اپنے مال کو خود اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے تو اُس سے منتفع و متمتع ہوتا ہے ۔ چہارم وہ دوسروں کو دیتا ہے تو اس صورت میں سخی اور اہل فضل گنا جاتا ہے اور یہ پچھلی حالت سب حالتوں سے اشرف ہے ۔

پس یہی حال علم کا ہے ؛ وہ بھی مال کی طرح تحصیل کیا جاتا ہے اور چار حالتیں اُس کی بھی ہیں : اول طلب کا زمانہ ، دوم حاصل کیے ہوئے علم پر ایسا عبور ہونا کہ حاجت سوال کی نہ رہے ۔ سوم جس بات کو حاصل کیا ہے ، اُس کو فکر کر کے اس سے مستفید ہونا ۔ چہارم اُس سے فائدہ پہنچانا ۔ اور یہ حال سب میں اشرف ہے ۔

پس جو شخص اَور لوگوں کو علم سکھاتا ہے ، اس کا حال آفتاب کی طرح ہے کہ دوسروں کو روشنی دیتا ہے اور آپ بھی روشن ہے ، یا مشک جیسا ہے کہ دوسروں کو معطر کرتا ہے اور خود بھی خوش بو دار ہے ۔ جو شخص معلمی کا کام اپنے ذمے لیتا ہے ، وہ ایک امر خطیر کو اختیار کرتا ہے ۔ اُس کو ان آداب اور قواعد پر عمل کرنا چاہیے ۔

'ادب اول[۱۰] : شاگردوں پر شفقت کرے اور اُن کو اپنے بیٹوں کے برابر جانے اور اپنے شاگردوں میں باہم وہ محبت پیدا کرے جو بھائیوں میں ہوتی ہے ۔ جیسے کہ ایک باپ کے بیٹے آپس میں محبت و سلوک رکھتے ہیں ، ایسے ہی اُس کے سب شاگرد

---

۱۰ ۔ اصل (صفحہ ۹۰) میں 'اداب' صحیح نہیں ہے ۔ مرتب

آپس میں پیار اخلاق سے رہیں ۔

[1]ادب دوم : علم سکھانے پر نہ مزدوری طلب کرے اور نہ کسی اور طرح کے بدلے کی نیت ہو کہ شکر کا خواہاں ہو ، نہ اُن پر اپنا احسان جتائے ۔ غرض پڑھانے سے صرف علم پھیلانے سے ہو تاکہ تہذیب و شائستگی بڑھے ۔ نیک کمائیوں کی طرف لوگ متوجہ ہوں ۔

[2]ادب سوم : شاگرد کی نصیحت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے ۔ اُستاد اپنے طلبا کے اخلاق اور تہذیب نفس کو دیکھتا رہے اور جب وہ تہذیب کے خلاف کام کریں تو اُن کا مزاحم ہو ، اور جہاں تک ہو سکے کنایۃً اور پیار کی راہ سے اخلاقِ بد سے منع کرے ۔ تصریح و توبیخ کے ساتھ نہ جھڑکے ، اس لیے کہ تصریح ، ہیبت کا حجاب دور کردیتی ہے، اور خلاف کرنے پر جرأت کا باعث ، اور اصرار پر حریص ہونے کا موجب ہوتی ہے ۔ کنایۃً سمجھانے میں یہ خوبی ہے کہ جن طلبا کے نفوس اچھے اور ذہن تیز ہوتے ہیں ، وہ اُس کے معانی نکال لیتے اور مقصود کے سمجھ جانے کی خوشی کے سبب اُس پر عمل کرنے کی رغبت کرتے ہیں جس سے اُن کی دانائی کا اظہار اَوروں پر ہو ۔

[3]ادب چہارم : اُستاد جس علم کو سکھاتا ہو، شاگرد کے دل میں اُس علم کے سوا اَور علوم کی برائی نہ ڈالے ، اَور علوم کے سیکھنے کی بھی راہ بتلائے کہ وہ اُن کو اورعالموں سے سیکھے ۔ یہ نہیں کہ وہ جو منطق و فلسفہ پڑھاتا ہے تو وہ علم لغت کو کہے کہ

---

۱ ، ۲ ۔ اصل (صفحہ ۹۰) میں 'ادب' ہے ۔
۳ ۔ اصل (صفحہ ۹۰) میں لفظ 'ادب' نہیں ہے ۔ مرتب

وہ کسی کام کا نہیں ، اُس کا سیکھنا ضرور نہیں -

پانچواں ادب : شاگرد کے سامنے بیان کرنے میں صرف اُس کی سمجھ پر کفایت کرے - ایسی بات اُس سے نہ کہے جس تک اُس کی عقل نہ پہنچے ، نہ سمجھنے کے سبب سے وہ اس سے نفرت کرنے لگے ، یا اُس کی عقل میں خبط نہ ہو - غرض اُن کے فہم کے موافق باتیں کرے - وہی باتیں شاگرد کے آگے بیان کرے جس کو جانے کہ وہ اچھی طرح سمجھے گا اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے کا اہل ہے - جس صورت میں کہ شاگرد ایک بات کو سمجھتا ہی نہیں ہو ، بہتر ہے کہ اُس کے آگے ذکر نہ کرو - بقول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہ سوروں کی گردن میں جواہر مت ڈالو کہ حکمت جوہروں سے بہتر ہے - اور جو شخص اُس کو برا جانتا ہے ، وہ سوروں سے بدتر ہے -

ایک بزرگ کا قول ہے کہ ہر شخص کو اُس کی عقل کے پیمانے کے بہ موجب ناپو اور اُس کی سمجھ کی ترازو کے بہ موجب اس کے لیے سخن سنج ہو ، تاکہ وہ تم سے نفع پاوے - علم تو جہل نہیں ہوتا مگر اُس کی تاثیر ضرر پہنچانے میں نااہلوں پر جہل کی طرح ہوتی ہے -

چھٹا ادب : جب شاگرد کا حال معلوم ہو جاوے کہ کم فہم ہے تو اُستاد کو چاہیے کہ اُس کو موٹی بات ، جو اُس کے لائق ہو ، بتاوے اور اُس سے یہ نہ کہے کہ اُس میں کوئی دقیق بات بھی ہے جو میں نے تم کو نہیں بتائی ، کیونکہ اس کہنے سے شاگرد کی رغبت اُس موٹی بات میں پھیکی پڑ جائے گی اور اُس کے دل کو پراگندگی ہو جائے گی اور یہ وہم کرے گا کہ مجھے بتانے میں دریغ کرتے ہیں - کیونکہ اپنے گمان میں ہر کوئی سمجھتا ہے کہ میں ہر ایک علمِ دقیق کے قابل ہوں ، اور ہر شخص یہ جانتا ہے کہ میری

عقل کامل بنانی ہے - اور حقیقت میں وہ شخص بڑا احمق اور کم عقل ہے جو اپنی عقل کے کامل جاننے سے زیادہ خوش ہو۔

ساتواں ادب : اُستاد اپنے علم کے بہ موجب عمل کرتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کہے کچھ اور کرے کچھ اس لیے کہ علم تو دل کی آنکھ سے معلوم ہوتا ہے اور عمل ظاہر کی آنکھ سے - ظاہر کے دیکھنے والے لوگ بہت ہیں - اس لیے جو شخص ایک کام خود کرے اور دوسروں کو کہے کہ اُس کام کو نہ کرو کہ زہر قاتل ہے ، تو اس سے لوگ تمسخر کریں گے اور تہمت لگائیں گے کہ اُستاد جی خود ایک کام کو کرتے ہیں ، تو ضرور وہ اچھا اور مزےدار ہوگا ، آؤ ہم بھی کریں - اُستاد کو شاگرد کے لحاظ سے دیکھو تو ایسا ہی جیسے کہ مُہر اور نقش یا لکڑی و سایہ - جس مُہر پر خود نقش اچھے نہ ہوں گے ، وہ موم پر کیسے اچھے نقش کرے گی ؟ جو لکڑی خود سیدھی نہیں ، وہ اپنا سایہ کیسا سیدھا ڈال سکتی ہے ؟ پس جو اُستاد کسی خطا میں خود مشغول ہے اور وہ اس سے شاگردوں کو منع کرتا ہے ، وہ بڑا نامعقول ہے - جو ایک اچھی بات کا حکم[1] دوسرے شاگردوں پر کرے پہلے اسے[2] آپ مانے۔ پس جن برائیوں سے اَوروں کو منع کرے ، پہلے آپ اُس سے باز رہے -

۱۶ - آدابِ طالب علم

پہلا ادب : طالب علم اَور شغلوں کے تعلقات کو کم کرے - ہو سکے تو سب اپنے عزیز و اقارب اور وطن سے دوری اختیار کرے ، اس لیے کہ ایسے سب علاقے تحصیل علم کے حارج اور مانع ہیں - اور کسی انسان کے دو دل نہیں ہوتے ؛ پس جب دل بٹا رہے

---

۱ - اصل میں 'حکم' نہیں ہے -

۲ - اصل میں ہے : 'پہلے اس سے کہ' - مرتب

تو تحصیل علم کے اندر قصور رہے گا - کسی بزرگ کا قول ہے کہ علم مجھ کو اپنا تھوڑا حصہ دے گا ، جب تک تو اس کو اپنا سب دل و جان حوالے نہ کرے گا - غرض جب آدمی کا ذہن بہت کاموں میں بٹا رہتا ہے ، اس کا حال نالے کا ہوتا ہے جس کا پانی پھیل گیا ہو کہ کچھ تو زمین پی جاتی ہے اور کچھ ہوا سکھا دیتی ہے ، تو اس میں اتنا پانی نہیں رہتا کہ اکٹھا ہو کر کھیتی میں پہنچے -

دوسرا ادب : کہ علم پر تکبر نہ کرے اور نہ استاد پر حکومت ، بلکہ اپنے معاملے کو ہر حال میں بالکل استادِ کے اختیار میں چھوڑ دے اور اس کی نصیحت کو ایسا مانے جیسے جاہل بیمار ، طبیبِ شفیق و حاذق کو[1] مانتا ہے - استاد سے چاہیے کہ انکسار کے ساتھ پیش آئے اور اس کی خدمت کو اپنا شرف جانے - طالب علم کو تکبر کرنا زہر ہے - کبھی تکبر یوں بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی مشہور عالم سے پڑھیں اور دوسرے عالموں کے پڑھنے سے کنیائیں[2] - یہ امر عین حماقت ہے - علم ہر عالم سے حاصل ہو سکتا ہے - غرض علم کو تکبر سے نفرت ہے - علم بغیر انکسار اور کان لگانے کے نہیں آتا - جو کان میں ڈالا جائے ، اس کو اچھی طرح سن کر خوشی کے ساتھ قبول کرے - استاد کے سامنے شاگرد کو چپ رہنا چاہیے ، جیسے کہ نرم زمین ، جس پر بہت سا مینہ برسے اور وہ سب پی جائے ، ایسے ہی جو استاد بتائے اس کو قبول کرے اور اس میں اپنی رائے کو دخل نہ دے - جو شاگرد اپنے استاد کی رائے کے سامنے اپنے آپ رائے اور اختیار باقی رکھے گا ، تو وہ اپنی حاجت سے محروم رہے گا - بے شک استاد سے پوچھنا چاہیے اور جو اپنی سمجھ میں آئے وہ کہنا چاہیے ، مگر استاد جہاں تک

---

۱ - اصل میں 'تو' ہے - ۲ - اصل : کنہائیں - مرتب

پوچھنے کی اور اپنی اظہار رائے کی اجازت دے ۔ اور جن چیزوں کے استفسار کو کبھی وہاں تک تو یہ کام جائز ہے ؛ ایسی بات پوچھنی کہ جس کے سمجھنے کا رتبہ ہم کو حاصل نہیں ہوا ہے ، برا ہے ۔ جس چیز کے بتانے کا وقت ہوتا ہے ، وہی وقت اُس کے پوچھنے کا ۔ اُستاد سے بہت سوال نہ کرو ۔ جواب میں اُس کو طعنہ مت دو ۔

تیسرا ادب : طالب علم ابتدا میں ایسے امور کے سننے سے احتراز کرے کہ جس میں اختلاف آراء ہو ؛ اس لیے کہ اختلافوں کے سننے سے مبتدی کی عقل متحیر اور ذہن پریشان اور رائے سست ہو جاتی ہے اور ادراک اور اطلاع سے یاس ہو جاتا ہے ۔ بلکہ اُس کو چاہیے کہ اول ایک عمدہ طریقے اسی باب میں ، جو اُستاد کے نزدیک پسندیدہ ہے ، اُس کو یقین کر لے اور پھر اُس کے بعد جو اختلافات ہوں اُن کو سنے ۔ اگر اُستاد کی رائے اچھی نہ ہو تو یہ مجبوری ہے ۔ ع

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

غرض مبتدی کو منتہیوں کی رایوں میں دخل دے کر اپنے دل میں شبہات نہ پیدا کرنے چاہئیں جس سے خاطر پریشان ہو ۔

چوتھا ادب : طالب علم عمدہ علوم میں سے کوئی فن بدون دیکھے نہ چھوڑے ، اور اس طرح پر دیکھے کہ اُس کے مقصود اور علت غائی سے مطلع ہو جاوے ۔ پھر اگر زندگی وفا کرے تو اُس میں کمال پیدا کرنے کا طالب ہو ۔ اور جو اُن میں اہم معلوم ہو اُس کو اول سیکھ کر اُس میں کمال پیدا کرے ۔ غرض کسی ایک علم میں کامل ہو اور باقی علوم میں سے تھوڑا تھوڑا حاصل کر لے کیوں کہ علوم ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور آپس میں وابستہ ہیں ۔

قاعدہ ہے کہ جو چیز آدمی کو نہیں آتی ، اُس کا دشمن ہوتا ہے ، اس لیے آدمی جانے کہ کوئی علم مجھے جو اچھا معلوم نہیں ہوتا وہ میرے جہل کے سبب سے ہے - جیسے مریض کا منہ کڑوا ہو تو میٹھا پانی بھی کڑوا معلوم ہوتا ہے - ایسے ہی میرا مذاق اس علم کے لیے درست نہیں ، مجھے وہ برا معلوم ہوتا ہے -

پانچواں ادب : علوم و فنون کو بالترتیب سیکھے - جو ضروری وجہ معاش کے لیے زمانے کے موافق ہوں ، اُن کو اہم سمجھ کر اول سیکھے - یہ کچھ ضرور نہیں کہ اُس میں کمال ہی حاصل کرے - غرض جو کچھ حاصل کرے ، وہ عمدہ علم ہو اور تھوڑے ہی پر قانع ہو اور اس سے جو قوت حاصل ہوئی ہو وہ سب اس علم کے پورا کر دینے میں صرف کر دے - علوم کو وہ یہ دیکھ لے کہ اس کا ثمرہ کیا ہے اور اس کا شرف کیا ہے -

چھٹا ادب : علم کا مقصد سردست یہ ہو کہ میں اس سے اپنے باطن کو آراستہ اور فضیلت سے مزین کروں ، تحصیل معاد و معاش میں عقل بڑھاؤں - شاگرد میں تین باتیں ہونی ضرور چاہئیں جن سے کہ وہ اُستاد سے پوری تعلیم پا سکتا ہے : اول عمل ، دوم ادب ، سوم اچھی سمجھ -

۱۷ - عالم بےعمل

جو عالم ایسا ہے کہ اپنے علم کے بہ موجب عمل نہیں کرتا ، اُس کا حال دفتر کا سا ہے کہ دوسرے کو اس سے فائدہ ہوتا ہے اور وہ خود علم سے خالی ہوتا ہے ، یا سان کا سا ہے کہ لوہے کو تیز کرتا ہے اور خود نہیں کاٹتا ، یا سوئی کا سا ہے کہ اَوروں کے لیے لباس سیتی ہے اور آپ ننگی ہے - عالمِ بے عمل فتیلۂ شمع ہے کہ اُس سے ایک مجمع روشن ہوتا ہے اور وہ خود جلتا ہے -

ایک بزرگ کا قول ہے کہ آدمی چار طرح کے ہوتے ہیں :

ایک وہ جو جانتا ہے اور واقعے میں جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں ، تو وہ شخص عالم ہے - اس کا اتباع کرو - اور ایک وہ ہے کہ جانتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ جانتا ہوں تو وہ سونے والا ہے ، اُس کو ہوشیار کرو - اور ایک وہ کہ نہیں جانتا اور جانتا ہے کہ نہیں جانتا ؛ ایسا شخص ہدایت کے قابل ہے ، اس کو ہدایت کرو - اور ایک وہ کہ[1] نہیں جانتا اور یہ بھی نہیں جانتا کہ میں نہیں جانتا ، تو وہ جاہل ہے ، اُس کو ترک کرو کہ علم عمل کو پکارتا ہے - اگر عمل نے ہاں کہا تو خیر ، نہیں تو علم رخصت ہوتا ہے -

ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب تک آدمی طلب علم میں رہتا ہے ، تب تک عالم ہوتا ہے اور جب یہ گمان کرتا ہے کہ میں جان چکا ، تب جاہل ہو جاتا ہے -

۱۸ - انبیا و جہلا کا بیان

انبیاء دین میں سچے تھے - اُنھوں نے خلق کو راہِ راست دکھائی - جب مغرب فنا میں چلے گئے تو پھر جہالت کا زور ہوا - ظلمت نے شب شرک کے پردے لگا دیے - کفر اب شرک پر بوسے دینے لگا - کسی نے چلیپا کو شاخِ گل کی طرح ہاتھ میں لیا ، کسی نے نیلوفر کی طرح آفتاب پرستی شروع کی ، کسی نے صنم کو معبود بنایا ، کسی نے بت کو اپنا خدا بنایا - جہل سے بدی کو دیو سے اور نیکی کو یزداں سے شمار کیا - کسی مذہب نے شراب کی طرح مغز سے عقل زدائی کی ، کسی نے آندھی کی طرح سر سے عمامہ اُتارا - کوئی سحر و تنجیم کی امید و بیم میں لگا - غرض بہت خوب سیرت اور اعملی بصیرت ہو گئے - دین میں عوام منکر کرنے لگے ، خواص گھر میں ہو بیٹھے - دینِ حق نے منہ اپنا نہاں کیا ،

---

[1] - اصل میں 'کہ' نہیں ہے - مرتب

دینِ باطل نے منہ اپنا عیاں ۔ بیہودگی کی تلقین اور تخییل شروع ہوئی ۔ عوام و خواص غیبت و فضولی کے پابند ہوئے ۔ خواص لذات شہوات میں ڈوبے ، عوام ہزل و ترہات[1] میں ۔

غرض عالم سباع و دیو و ستور[2] سے پُر ہو گیا ۔ ہزاروں راہیں اور ان میں چاہ و غول و نہنگ ۔ رہبر اندھے ، ہمراہی لنگ ۔ غرض راہ دین پر چلنا دشوار ہو گیا ۔ لوگ جہالت کی نیند میں خوب سوتے تھے ۔ اگر اٹھتے تھے تو جب کہ حمق کا بچھو اُن کو کاٹتا تھا ۔ جو نیک نہاد سنتِ انبیا پر چلتے تھے وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے ، اُن کا نام باقی نہ[3] رہا ۔ جو نئے لوگ اُن کے قائم مقام ہوئے وہ اپنے دل و جان کے عشووں میں مصروف ہوئے ۔ اب اُنھوں نے باغ و زمین پر دل لگایا ، عقل و دین و شرع کو بھلایا ، راہ صدق سے بے خبر ہوئے ، آدمی سے خر بنے ۔ اُنھوں نے مکتب شرع کی صورت تک نہ دیکھی ، عقل کے دروازے پر قدم تک نہ رکھا ، ماہ رو، تیرہ ہوش اور جاہ جُو دین فروش ہوئے ۔ رعنا مگر عقل سے دماغ خالی ۔ اندھے خر، آواز بنے ۔ اپنے ہم آواز سے پرہیز کریں ، اپنی آواز سے آپ بھاگیں ۔ اصل کو چھوڑ دیا ، فرع کو لے لیا ۔ ہر کام میں ایک شرع کا بہانہ بنا ۔ باز آشیاں ، شاہین خشم ، طوطی زباں ، کرگس چشم ہوئے ، مگر عاقبت کے کاموں میں کور ۔ اپنے خواب و خور کی بندگی میں مثل ستور ، بلکہ مگس و فرس سے بدتر ، علم میں ابتر ۔ باتوں میں فربہ ، دین میں لاغر ۔ بے فراغ و بے فروغ ، بالکل دروغ ۔ عیش و آرام میں مشغول ، اُن کی زندگی

---

۱ ۔ ترہات : سخن ہائے باطل ، لہوآمیز ۔ (غیاث)

۲ ۔ ستور : چوپائے ۔

۳ ۔ اصل (صفحہ ۹۵) میں 'نہ' نہیں ہے ۔ مرتب

مرگ سے بدتر - معلوم نہیں اُن کے مرگ کا کیا برگ ہوا - امام اجل بنے ہوئے ہیں ، روپیوں کی تھیلیاں بغل میں ، کبر و تمکین کی جستجو ہے ، شریعت و دین سے کچھ غرض نہیں - یہ چاہتے ہیں کہ لوگ اپنا سر ہمارے پاؤں میں رکھیں جس سے ہمارا جاہ بڑھے - حقد ، کین و حیل سے فتوے دیتے ہیں - بغض سے کسی کو کافر ، کسی کو ملحد بناتے ہیں - جیسے شمع نابینا کے آگے ، ایسا ہی علم اُس گروہ رعنا کے روبرو - بسیار گو ، کم علم ، شیطان جو اُن کو 'تو' کہے ، تو اس سے زیادہ شیطنت کر کے تجھے دکھا دیں - نفاق و خباثت و تلبیس میں ابلیس سے سو درجہ زیادہ - باتوں میں شتر بے مہار ، یتیموں اور بیواؤں کے مال کو حلال سمجھتے ہیں - تقویٰ کی بو نہیں ، سبو کی طرح پانی سے خالی ، کوئی خوبی نہیں -

---

باب چہارم ۔

کہنا سننا[1]

۱ ۔ زبان

ان اللسان صغیر جرمہ و لہ
جُرم کبیر کما قد قیل فی المثل

"حقیقت میں زبان کا جرم (یعنی جسم) چھوٹا ہے اور اُس کا جُرم (یعنی گناہ) بڑا ، جیسا کہ عرب کی مثل میں کہا گیا ہے ۔"

زبان یوں تو گوشت کا ہی ٹکڑا ہے مگر اُس میں خدا کی عجب حکمت بالغہ پائی جاتی ہے ۔ زبان ہی انسان کے تمام خیالات کی ترجمان ہے ۔ وہی دل کی تمام باتوں کو ظاہر کرتی ہے ۔ اسی سے ہمارا کفر اور ایمان ظاہر ہوتا ہے ۔ جو کچھ ہماری عقل ، وہم و خیال میں آتا ہے ، زبان اُس کی[2] تعبیر اور تقریر کرتی ہے ۔ جو زبان کا میدان وسیع ہے ، وہ کسی عضو کا نہیں ۔ شکل اور رنگت کے سوا آنکھ کسی اور چیز کو نہیں دیکھ سکتی ، کان آواز کے سوا کسی اور شے کو سن نہیں سکتے ، ہاتھ اجسام کے سوا نہیں پہنچ سکتے ۔ مگر زبان کے لیے کوئی حد و انتہا نہیں ۔ جو دل میں آئے ، خواہ وہ معدوم ہو یا موجود ، خالق ہو یا مخلوق ، معلوم ہو یا موہوم ، وہ خیالی ہو یا عینی ، سب کے سب زبان پر آتے ہیں ۔ اس کو اختیار ہے کہ خیر کی باتیں کرے یا شر کی ۔ غرض جو بات زبان پر آتی ہے وہ دل میں ایک صفت پیدا کرتی ہے ۔ اگر خوشی کی

---

۱ ۔ نسخۂ اول میں 'سنتا' ہے ۔
۲ ۔ اصل میں 'کو' ہے ۔ مرتب

باتیں کرتی ہے تو دل میں خوشی پیدا ہوتی ہے۔ اگر رنج کی باتیں کرتی ہے تو رنج۔ اگر بری باتیں کہتی ہے تو دل تاریک ہو جاتا ہے اور اگر نیک باتیں کرتی ہے تو دل روشن ہو جاتا ہے۔ اور جب جھوٹی اور ٹیڑھی بات کہتی ہے تو دل کا حال ایسا ہو جاتا ہے جیسا کہ آئینہ ٹیڑھا ہو جائے کہ اس میں کوئی صورت سیدھی نہیں دکھائی دیتی۔

غرض زبان پر انسان کے سب کاموں کا مدار ہے۔ اگر اُس کو اختیار میں نہ رکھے تو معلوم نہیں کیا کیا آفتیں وہ سر پر لائے۔ وہی شخص زبان کی شرارت سے بچ سکتا ہے جو اُس کو ابتدا ہی سے لگام دے گا۔ منہ سے وہی بات نکالے گا کہ جس میں نفع دنیا و آخرت کا ہو اور جس بات کی ابتدا و انتہا میں کچھ شک پاوے گا، اُس کو زبان تک نہ لائے گا۔ مگر یہ دریافت کرنا کہ کس بات کا کہنا اچھا ہے اور کس کا برا، بہت مشکل اور دقیق ہے اور اُس پر عمل کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ زبان انسان کے تمام اعضا میں زیادہ نافرمان ہے۔ کیوں کہ اُس کے ہلانے میں ذرا سی مشقت نہیں پڑتی۔ اور انسان اُس کی آفات سے بچنے میں اور مضرات سے خوف کرنے میں سہل انگاری کرتا ہے، اس لیے ہم زبان کی سب آفات مع اُن کی تعریف اور اسباب اور علاج کے آگے بیان کر دیں گے، پہلے خاموشی کا ذکر کرتے ہیں۔

۲ ـ خاموشی

"من صمت نجا" (جو چپ رہا، نجات پائی)۔

اگرچہ پیش خرد مند خامشی ادب است
بوقت مصلحت آں بہ کہ در سخن کوشی
دو چیز طیرۂ عقل است: دم فروبستن
بوقتِ گفتن و گفتن بوقتِ خاموشی

خموشی معنیِ دارد کہ در گفتن نمے آید۔

حضرت سلیمان علیہ اسلام کا قول ہے کہ اگر کلام بالفرض چاندی ہو، تو چپ رہنا سونا ہے۔

حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میری زبان درندہ ہے۔ اگر چھوڑ دوں تو مجھے چٹ کر جائے۔ غرض عاقل پر واجب ہے کہ عارفِ زبان اور حافظِ زبان ہو۔

مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ آدمی کو زبان کا روکنا روپے پیسے کی حفاظت سے زیادہ دشوار ہے۔

یونس بن سعد فرماتے ہیں کہ جس کی زبان ایک ٹھکانے پر رہتی ہے، اُس کے سب کام ٹھیک رہتے ہیں۔

ایک بار چار بادشاہ جمع ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ جو میں کہتا ہوں اُس سے پچتاتا ہوں اور جو کچھ نہیں کہتا اُس پر کچھ ندامت نہیں ہوتی۔ دوسرے نے کہا کہ جب میں کلمہ بولتا ہوں، میں اُس کے اختیار میں ہو جاتا ہوں، وہ میرے قابو میں نہیں رہتا۔ اور جب تک نہیں بولتا تو میرے اختیار میں رہتا ہے، میں اُس کے قابو سے باہر رہتا ہوں۔ تیسرے نے کہا کہ مجھے اُس بولنے والے ہی سے تعجب ہے کہ اگر وہی بات اُس پر واپس آوے تو ضرر دے اور اگر واپس نہ آوے تو کچھ فائدہ نہ دے۔ چوتھے نے کہا کہ میں بِن کہی بات کے ہٹا لینے پر زیادہ قادر ہوں، کہی ہوئی کو نہیں ہٹا سکتا۔

غرض خاموشی کے یہ فوائد بیان کیے جاتے ہیں۔ بولنے میں زیادہ آفات یہ ہیں: جھوٹ، خطا، غیبت، چغلی، ریا، نفاق، فحش، تکرار، اپنے آپ کو بتلانا، دوسرے کی بات کاٹنی، زیادہ گوئی، بات بدلنی، گھٹانی بڑھانی، خلق کو ایذا دینا، پردہ دری، یہ ساری باتیں زبان ہی کے سبب سے ہوتی ہیں۔ زبانہ

ہلانے کے وقت وہ کچھ نہیں معلوم ہوتیں ، دل میں مزہ معلوم ہوتا ہے - جہاں بولنے والے کی عادت ہوئی ، پھر یہ مشکل ہوتا ہے کہ زبان قابو میں رہے کہ جہاں بولنا چاہے وہاں بولے ، جس بات کو نہ کہنا چاہے اُس سے باز رہے ، کیوں کہ یہ تمیز نہایت مشکل ہے کہ کون سی بات کہنی چاہیے ، کون سی نہیں - اس لیے لوگ کہتے ہیں کہ بولنے میں خطرہ ہے اور خاموشی میں سلامتی ہے ، اس لیے خاموشی کو فضیلت بولنے پر لوگ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سکوت سے ہمت اٹھتی رہتی ہے اور ہیبت بنی رہتی ہے - فکر ، ذکر ، عبادت کی فراغت میسر ہوتی ہے مگر[1] انسان سے یہ نہیں ہو سکتا کہ :

زبان بریدہ بکنجے نشستہ صم بکم

انسان کو چاہیے کہ اشعارِ سعدی پر عمل کرے جو اول ہم نے لکھے ہیں - زبان کو ان آفات سے بچائے جو ہم نے نیچے لکھے ہیں :

انسانوں کی صحبت میں ہم زبانی ، خوشی و پیوندی پیدا کرتی ہے اور غیر زبانی تندی - بہت سے ہندو مسلمان ہم زبان ہیں اور دو مسلمان غیر زبان - مگر زبان کی[2] محرمی اَور چیز ہے اور ہم دلی اَور چیز ہے - نطق ، ایما ، رمز نوشتہ کے سوائے دل سے ہزاروں ترجمان پیدا ہوتے ہیں - ہم زبانی سے ہم دلی بہتر ہے - زبان مثل سنگ و آہن ہے ، اس سے آگ نکلتی ہے ، تُو فضل و لاف میں بیہودہ طور پر آگ نہ نکال ، اس لیے کہ چاروں طرف ایک پنبہ زار ہے ، اُس میں آگ لگ جائے گی - ایک سخن سے عالم ویران ہو جاتا ہے ، زبان ہی سے آدمی کا زیان ہوتا ہے - جب وہی کچھ کہے تو

---

۱ - اصل میں 'مگر' کے بعد ایک 'یہ' زائد ہے -
۲ - اصل میں 'کی' نہیں ہے - مرتب

اُسے آدمی کیا کہہ سکتا ہے ۔ وہی آتش ہے ، وہی خرمن ہے ۔ جو کچھ کہتی ہے وہ کرتی ہے ۔ اے زبان! تو ہی گنج بے پایاں ہے اور تو ہی رنجِ بے درماں ہے ۔ تو ہی ہم صفیر بن کر مرغوں کو فریب دیتی ہے ، تو ہی مرغوں کی رہ بر ہوتی ہے ۔ اے زبان! تیرے ہی نیچے آدمی مخفی ہے ۔

تا مرد سخن نگفتہ باشد   عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اے زبان! تو ہی درگاہِ جان پر پردہ ہے ۔ جب ہوا اُس کو اٹھاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ صحن درگہ میں کیا رکھا ہے ۔ موتی ہیں ، گندم ہیں یا مار، کژدم یا گنج ہے جس کے کنارے پر سانپ بیٹھا ہے کیوں کہ گنج زر بے پاسبان نہیں ہوتا ۔ اے زبان! تو ہی بعضوں کے منہ سے موتیوں کا دریا برساتی ہے ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بولنے والے کے باطن میں دریائے سخن جوش مار رہا ہے ، جس سے باہر موتی نکلے پڑے ہیں ، جو حق و باطل میں فرق بتلاتا ہے ۔

۳ - کلامِ بے فائدہ کرنا اور زیادہ گوئی

زيادة القول تحكى النقص فى العمل   و منطق المرء قد يهديه للزلل

"آدمی کی زیادہ گوئی نقصان کو ظاہر کرتی ہے اور اُس کی گفتگو کبھی اُس کو لغزش کا رستہ دکھاتی ہے ۔"

زیادہ گوئی اُسے کہتے ہیں کہ آدمی ایسی باتیں کرے کہ جن کی کچھ حاجت نہیں اور اگر نہ کہے تو اُس کو کسی[1] طرح کی دینی اور دنیوی مضرت نہ پہنچے ۔ ایسی باتوں کا ترک کر دینا حسن اسلام میں داخل ہے ۔ جیسا کہ کلام بے فائدہ کو[2] ترک

---

۱ - اصل میں 'کس' ہے ۔

۲ - اصل میں 'کا' ہے ۔ مرتب

کرنا چاہیے[1] ، ایسا ہی کلامِ مفید کا بے موقع نہ کہنا چاہیے ۔ اس لیے کہ اکثر کلامِ مفید بے موقع کہا جاتا ہے تو اُس سے خرابی ہوتی ہے ۔ ایسے ہی حلیم اور احمق سے بحث کرنی بھی زیادہ گوئی میں داخل ہے ، کیوں کہ بحث کرنے سے حلیم کو غصہ دلانا ہے اور بے وقوف سے ایذا اُٹھانی ہے ۔

کلامِ بے فائدہ کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص اپنی محفل میں اپنے سفروں کا ذکر کرے اور اُس میں کچھ کم و بیش اس نظر سے کرے کہ بیان دلچسپ ہو جائے اور اُس سے فخر اُس کی سیاحت کا ظاہر ہو ۔ اکثر آدمی اپنی تضییع اوقات زیادہ گوئی میں کرتے ہیں اور بے فائدہ کلام کرتے ہیں کہ نہ جن سے کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوتا ہے ، نہ دینی ۔ اکثر وہ دوسرے آدمی سے بے فائدہ سوالات کیا کرتے ہیں کہ جواب دینے میں دوسرے کو دقت و زحمت پیش آتی ہیں ۔ اگر جواب نہیں دیتا تو پوچھنے والے کی تحقیر ہوتی ہے ۔ اگر سچ کہتا ہے تو اپنا راز کھلتا ہے ، اگر بات کو بدل کر کہتا ہے تو جھوٹ ہو جاتا ہے ۔ مثلاً رمضان میں پوچھیں گے کہ تم آج روزہ سے ہو یا نہیں ؟ اب جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہاں میں روزے سے ہوں ، تو عبادت کا اظہار ہوتا ہے ۔ اور کہیں کہ نہیں ، تو ترک فرض کے اظہار سے اپنی خفت ہوتی ہے ، اور اگر کچھ جواب نہ دیں تو سائل کی تحقیر ہوتی ہے ۔ یا کسی مولوی صاحب سے ایک مسئلہ مجلس میں ۔ ضرورت پوچھ رہے ہیں کہ چھپکلی کے پتّے کو سرمے میں پیس کر آنکھ میں لگانا کیسا ہے ؟ اگر مولوی صاحب کو معلوم نہیں تو وہ بغلیں جھانکتے ہیں اور شرمندہ ہوتے ہیں ، یا کچھ گھڑ دیتے

---

۱ ۔ اصل میں 'چاہے' ہے ۔ مرتب

ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں ، یا جواب دینے کو جی نہیں چاہتا تو پوچھنے والا ذلیل ہوتا ہے ۔

غرض کلام بے فائدہ کرنے میں وقت ، جو انسان کا بڑا راس المال ہے ، ضائع کرنا نہیں چاہیے ۔

عوام الناس بعض اوقات ایسے سوال کرتے ہیں کہ جس کا جواب سمجھنا اُن کی عقل سے پرے ہونا ہے ۔ اُن کو خوشی دخل در معقولات دینے سے ہوتی ہے ۔ مثلاً وہ بعض اوقات خدا تعالیٰ کی ذات اور صفات کی نسبت ایسے سوالات کرتے ہیں جو اُن کو کرنے نہیں چاہئیں ۔ وہ راز کی باتیں خاص بندگان خدا پر کھلتی ہیں ۔ عوام کو اُن کا دریافت کرنا ایسا ہے جیسے کوئی سائیس معاملات ملکی کو دریافت کرنے لگے ۔

زغن را بہرطاؤسی نزادند مگس را فرّ عنقائی ندادند

ایک زیادہ گوئی یہ ہے کہ ضروری کلام میں مقدار ضرورت سے زیادہ باتیں ہوں ۔ ایک بات چار لفظوں میں بیان ہو سکتی ہے ، وہ دس لفظوں میں بیان کرتے ہیں ۔ آدمی کو چاہیے کہ زبان کو زائد بات سے روکے اور زائد مال کو خرچ کرے ۔ مگر آدمی زائد مال کو جوڑتا ہے اور زبان کو مطلق العنان چھوڑتا ہے ۔

اور سوائے ان امورِ مذکورہ کے زیادہ گوئی میں یہ بھی لوگ کرتے ہیں کہ امورِ باطلہ کا ذکر داخل کر دیتے ہیں ؛ یعنی سوائے زائد از مطلب ہونے کے ایسی باتیں داخل کر دیں کہ جن میں حرمت ہو ۔ مثلاً گناہوں کی باتوں کا ذکر ، عورتوں اور شراب کا ذکر ، بدکاروں کی مفلسی کا بیان ، دولت مندوں اور بادشاہوں کی عیاشی کا بیان ، لوگوں کی گالیوں کی نقل ۔ یہ عادت یوں ہی پڑتی ہے کہ پہلے کلامِ بے فائدہ اور زائد از مطلب کہنے

کی عادت ہوئی ، پھر رفتہ رفتہ اُس میں اُن حرام کاریوں کی داستانیں شروع ہوتی ہیں -

ایک اور آفت زیادہ گوئی میں مراء ، یعنی دوسرے کی بات کاٹنی ہے - مراء کی تعریف یہ ہے کہ دوسرے شخص کی بات میں براہِ اعتراض ، خواہ لفظوں میں یا معنوں میں یا ارادے میں خلل ظاہر کرنا - دوسرے کی بات میں لفظوں میں عیب بتلانا ، اس طرح کہ علم نحو یا لغت یا محاورہ کے برخلاف کہتے ہو یا اُس کلام کی بندش اچھی نہیں ، اس کے الفاظ میں تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے - اور ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جو شخص کم علم ہوتا ہے ، وہ صحیح عبارت نہیں بول سکتا یا زبان بہک جاتی ہے ، کچھ منہ سے نکل جاتا ہے - تو جس میں عادت اعتراض کی ہوتی ہے وہ فوراً عیب جوئی پر آمادہ ہوتا ہے ، حالاں کہ اظہار عیب کی کوئی وجہ نہیں - معنوں پر طعن کرنا یہ ہے کہ جیسا تم کہتے ہو ویسا نہیں ہے ، اس میں یہ غلطیاں ہیں - اور ارادے میں عیب ظاہر کرنا یہ ہے کہ اس طرح کہے کہ تمھارا کلام تو درست ہے مگر تم نے اثبات حق کے لیے نہیں کہا بلکہ اُس میں تمھارا کچھ مطلب ہے -

غرض بعض آدمیوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب کوئی بات کہتا ہے تو وہ اُس کی بات کو کاٹتا ہے یا رد کرتا ہے اور ایسی باتیں کہتا ہے کہ جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کہنے والا احمق ، نادان ، جھوٹا ہے اور میں زیرک اور عاقل اور سچا ہوں - دنیا میں دیکھو کہ ایسی عادت سے کیا کیا جھگڑے اور اختلاف امور دنیا اور دین میں پیدا ہوتے ہیں - آدمی اپنا فضل اور برتری دوسروں پر اُن کے نقصان کے اظہار سے چاہتا ہے - اپنا اظہار فضل ، قبیلِ خود ستائی سے ہے جو بڑائی اور بزرگی ، یعنی صفاتِ ربوبیت

سے جوش میں پیدا ہوتی ہے، اور دوسرے کو ناقص جاننا صفات سبعی کے مقتضا سے بر روے کار آتا ہے، کیوں کہ درندہ بھی یہی چاہتا ہے کہ دوسرے کو چیر پھاڑ کر برابر کرے یا صدمہ و ایذا پہنچائے۔ انسان کو اس سے پرہیز چاہیے کہ ان دونوں برائیوں سے بچے۔

ایک اور آفت زبان کی یہ ہے کہ کلام کو خوب بنا بنا کر کہنا اور سجع اور قافیہ اور فصاحت کے لیے تکلف کرنا اور تمہید اور مقدمات گھڑنے، جیسا کہ اکثر مدعیان تقریر کی عادت ہے۔ اس طرح کا تکلف و تصنع گفتگو اور بول چال میں مذموم ہے۔ آدمی کلام اس طرح کرے کہ مقصود حاصل ہو اور مطلب دوسرے کی سمجھ میں آ جائے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ تکلف میں داخل ہے۔ مگر یہ یاد رکھو کہ اس میں وہ قافیہ بندی اور فصاحت داخل نہیں جو خطبہ یا وعظ میں بے افراط اور مبالغہ کے کرتے ہیں، کیوں کہ وعظ سے دلوں کا شوق دلانا ہے۔ اور اس میں الفاظ کی خوبی کو بڑی تاثیر ہے، مگر جو محاورے کہ روزمرہ کی حاجات میں بولے جاتے ہیں اُن میں وزن و قافیے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اس میں ایک تصنع اپنی فصاحت و بلاغت کے اظہار کا ہوتا ہے۔

ایک اور آفت زبان کی فحش بکنا ہے۔ گالی دینا، پھکڑ لڑنا، مسخراپن کرنا، خبث باطنی یا کمینہ پن کے سبب سے ہوتا ہے۔ فحش اس کا نام ہے کہ امور قبیحہ کو صریح الفاظ سے ذکر کرنا، مثلاً شرم گاہ کا نام لینا وغیرہ، جیسا کہ اکثر مسخرے دن رات بکا کرتے ہیں۔ نیک بخت لوگ ایسی چیزوں کا نام کنایۃً لینے سے بھی بچتے ہیں۔ ضرورت کے وقت رمز کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔

فحش کا سبب یا ایذا دہی ہوتی ہے یا بُروں کی صحبت سے عادت پڑ جاتی ہے کہ یوں ہی زبان پر گالیاں آتی ہیں - سب سے زیادہ بڑی گالی یہ ہے کہ آدمی کسی پر لعنت بھیجے - لعنت کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے ہاں سے دور نکال دینا - پس یہ لفظ اُسی شخص پر بولنا درست ہوگا کہ جس میں ایسی صفت پائی جائے جس سے خدا تعالیٰ سے بُعد ہو اور وہ صفت کفر اور ظلم کی ہے - تو یہ کہنا جائز ہے کہ ظالموں پر خدا کی لعنت اور کافروں پر خدا کی لعنت - کسی خاص معین شخص کو ملعون نہیں کہہ سکتے اس لیے اُس کو کہنا گویا غیب دانی کا دعویٰ ہے - سوائے خدا کے کون جان سکتا ہے کہ کوئی خاص آدمی اُس سے بُعد رکھتا ہے -

ایک اور آفت زبان کی ہنسی ٹھٹھا ہے جسے مزاح اور خوش طبعی بھی کہتے ہیں - ہر وقت مزاح کرنا معیوب ہے ، مگر کبھی کبھی تھوڑی سی خوش طبعی کرنی مباح ہے -

ایک اور آفت استہزا اور تمسخر ہے - تمسخر اور استہزا کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کی حقارت اور اہانت کرنی اور اُس کے عیب و نقصان اس طرح بیان کرنے جس سے ہنسی آئے - اور یہ اس کئی طور سے ہو سکتا ہے کہ کسی فعل کی نقل کرنے سے یا قول کی نقل سے یا اشارے اور ایما سے - اگر یہ اس پیٹھ پیچھے ہو تو غیبت ہے ، ورنہ تمسخر اور استہزا نام ہے - استہزا میں ہمیشہ دوسرے کو ایذا پہنچتی ہے ، مثلاً اگر کوئی بات میں بھک جائے تو اُس پر ہنسنے لگنا ، یا افعال پر استہزا کرنا کہ خط کیا خوب لکھتے ہیں ، یا فلانا کام کیا اچھا کرتے ہیں - یا قد و قامت و صورت پر ہنسنا جیسے بونے یا لمبے آدمی پر ہنسا کرتے ہیں - یا کوئی عیب اور نقصان دیکھ کر ہنسنا سب داخلِ تمسخر

ہے ، اُن سے اجتناب چاہیے ۔ ایک لوگ وہ ہوتے ہیں کہ استہزا اور مسخرگی کی صحبتوں کا نام خوش صحبتی اور دانائی رکھتے ہیں ۔ ستم ظریفی ایسی کرتے ہیں کہ ہر دم ایک دل کو جلاتے ہیں اور ایسی باتیں پہلودار کہتے ہیں کہ دوسرے شخص کی شگفتگی پژمردہ ہو جاتی ہے ۔ اخلاق ذمیمہ سوخ طبعی کو دانائی و ذہانت جانتے ہیں ۔ خود کاہوں میں وہ گراں بار ہوتے ہیں اس لیے بزرگوں اور درویشوں و زاہدوں کی خفت و سبکی کا اعلان کرتے ہیں ۔ قربِ حق سے خود محروم ہیں ، نزدیکانِ درگاہ الٰہی پر نام رکھتے ہیں ۔ متحمل بردباروں کے تحمل کو گدھا بن بتاتے ہیں ۔ خاکساروں کے انکسار اور خاموشی پر کہتے ہیں ''ایک خاموشی اور سو شراوب ۔''

جن اُمرا کی مجالس میں مسخرے ندیم جمع ہوتے ہیں ، اُن کا حال ایسا ہے جیسا کہ ایک شاہزادے کا تھا کہ جس نے اپنی خبثِ طینت اور شوخی طبیعت سے ملازموں کو حکم دے رکھا تھا کہ بچھو پکڑ پکڑ کلھڑوں میں بند کرکے جمع کریں ۔ جب وہ بہت سے جمع ہو جاتے تو کسی دن مجلس جمع کرتا اور اُن میں کلھڑوں کو پھوڑ کر بچھوؤں کو چھوڑ کر اہل مجلس کا تماشا دیکھتا ۔ جب کسی کو بچھو کاٹتا اور وہ تڑپتا تو یہ خوش ہوتا ۔ پس ان اُمرا کی مجلس میں بچھو مسخروں کی زبانیں ہوتی ہیں جو اپنی جاں گزا اور کلفت افزا باتوں سے لوگوں کے دلوں کو تکلیف دیتے ہیں ۔ اُن کی زبان درازیاں سانپ کی سی نیش زنی دلوں پر کرتی ہیں ۔ وہ انبیا ، اولیا کی اہانت کرتے ہیں ۔ سچے مسلمانوں کی باتوں پر قہقہے اُڑاتے ہیں ۔ اُن کی طینت میں وہ خباثت بھری

ہوئی ہوتی ہے کہ ''می تراود آنچہ در آوند من است[1]۔''

ایک آفت راز کا ظاہر کر دینا (ہے)۔ یہ بھی ممنوع ہے اس لیے کہ اس میں بھی دوسرے کو اذیت ہوتی ہے اور حق معرفت برباد جاتا ہے۔ کسی دوست یا عزیز کا راز کہہ دینا بھی خباثت میں داخل ہے۔

ایک آفت جھوٹا وعدہ کرنا ہے ؛ زبان وعدہ کرنے میں پیش قدمی کیا کرتی ہے مگر نفس پر پورا کرنا ناگوار ہوتا ہے، تو وعدہ جھوٹا ہو جاتا ہے۔ وعدہ ایک طرح کا قرض ہی ہوتا ہے، اس کا ادا کرنا فرض ہوتا ہے۔ وہ منافق کامل ہے کہ بات کہے تو جھوٹی کہے، دوسرے وعدے کے خلاف کرے، سوم عہد کرکے فریب اور دغا کرے، چہارم خصومت کے وقت گالیاں سناوے۔ اور یہی حال اس شخص کا ہے کہ وعدہ کرنے کے وقت نیت وفا کی نہ ہو، عہد وفا نہ کرے۔ مگر جو شخص وعدے کے وقت اس کے پورا کرنے کا ارادہ پورا رکھتا ہے اور کسی عذر کے سبب سے پورا نہ کر سکے تو وہ منافق نہیں ہے۔ مگر بے ضرورت شدید اپنے نفس کو معذور کرنا نہ چاہیے۔ سب سے بڑی آفت جھوٹ بولنا ہے۔

۴ ۔ جھوٹ بولنا

جھوٹ بولنا اور قسم کھانی عیب فاحش اور گناہ عظیم ہے۔ ظاہر و باطن اور قول و فعل اور مدخل اور مخرج کا اختلاف نفاق کہلاتا ہے، اور جس اصل پر یہ مبنی ہے وہ دروغ ہے۔ جھوٹی باتیں وہی بناتے ہیں جن کو خدا کا یقین نہیں ہوتا۔ جھوٹ کو شیطان کی چٹنی کہتے ہیں۔

---

۱ ۔ جو کچھ میرے برتن میں ہوتا ہے، وہی ٹپکتا ہے۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو فرمایا کہ جھوٹ مت بولنا - گو وہ چڑیا کے گوشت کی طرح مزہ دار ہوتا ہے ، الاّ تھوڑی سی بات میں متکلم کو اس کی برائی معلوم ہو جاتی ہے -

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب تک تم سے ملاقات نہیں ہوتی تب تک تو تم میں سے زیادہ اچھا[1] وہ معلوم ہوتا ہے جس کا نام اچھا ہو ، اور جب ملاقات ہو جاتی ہے تو وہ اچھا معلوم ہوتا ہے جو عادت اچھی رکھتا ہو ، اور معاملہ کرنے کے بعد وہ اچھا معلوم ہوتا ہے جو بات کا سچا اور امانت کا پکا ہو -

قاعدہ ہے کہ آدمی کے دل میں جھوٹ اور سچ لڑتے رہتے ہیں ، یہاں تک کہ ایک غالب ہو کر دوسرے کو نکال دیتا ہے -

بعض اکابر کا قول ہے کہ جھوٹ اپنی ذات سے حرام نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے حرام ہے کہ اس سے دوسرے شخص کو ضرر پہنچتا ہے - ادنیٰ سی بات جھوٹ کی یہ ہے کہ ایک بے اصل بات کو اعتقاد کرے اور حقیقت سے جاہل رہے ، اور اس سے کبھی نقصان بھی ہو جاتا ہے - پس اگر حقیقت اس کے جاہل رہنے میں نفع اور مصلحت معلوم ہو تو جھوٹ کچھ برا نہیں - بلکہ بعض کا تو یہ قول ہے کہ ''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز'' - گو بعض قومیں اس کے برخلاف رائے رکھتی ہیں مگر دنیا میں عمل اسی پر ہوتا ہے - مثلاً کوئی شخص بھاگ کر ایک گھر میں تمھارے سامنے چھپ جائے اور دوسرا شخص ناحق مار ڈالنے کے لیے تلوار لے کر پیچھے سے آئے اور تم سے پوچھے کہ فلانا شخص کہاں ہے ؟ تو ایسی صورت میں جھوٹ بولنا

---

۱ - اصل میں 'اچھا' نہیں ہے - مرتب

واجب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں جھوٹ اور سچ دونوں سے عمدہ مقصود حاصل ہو سکتا ہے تو وہاں جھوٹ بولنا حرام ہے۔ اور اگر صرف جھوٹ ہی سے وہ مطلب حاصل ہو سکتا ہے تو جھوٹ مباح ہے، بسرطیکہ وہ مطلب بھی مباح ہو۔ اور اگر مطلب واجب ہے تو جھوٹ بھی واجب ہے۔ جیسا کہ اوپر کی مثال میں خون ناحق سے بچانا واجب تھا تو جھوٹ بولنا بھی واجب تھا۔

صلح و جنگ کے مقاصد بغیر جھوٹ کے راست نہیں ہوتے، تو ایسے مقامات میں جھوٹ بولنا ساری قوموں نے جائز رکھا ہے۔ مگر حتی الوسع اس سے پرہیز کرنا چاہیے، کیوں کہ جھوٹ کی عادت ہونے میں اس بات کا خوف ہے کہ جس جھوٹ کی حاجت نہ ہو، وہ بھی زبان سے نکل جائے، یا ضرورت سے زیادہ کہہ دے۔

حقیقت میں جھوٹ حرام ہے مگر ضرورت کے لیے بعض اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ مگر اکثر لوگ جو جھوٹ بولتے ہیں وہ حظ نفسانی کے لیے اور زیادتی جاہ و مال کے لیے، اور یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ اگر فوت ہو جائیں تو کچھ خرابی لازم نہیں آتی۔

دکان دار قسمیں کھا کھا کے اپنی چیزوں کی قیمتیں بڑھاتے ہیں، تو وہ بہت برا کام کرتے ہیں۔ عالم بلا تحقیق فتویٰ دے دیتے ہیں جس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنا فضل ظاہر ہو۔ اسی واسطے یہ منہ سے نہیں نکلتا کہ میں نہیں جانتا۔ لڑکوں کو مکتب میں بھیجنے کے لیے جھوٹے ڈراوے سے ڈرانا یا جھوٹے وعدوں سے ترغیب دینی بری ہے؛ اس سے لڑکپن ہی میں عادت خود جھوٹ بولنے کی اور دوسرے کے وعدے پر یقین نہ[1] کرنے کی پڑتی ہے۔

۱۔ اصل میں 'نہیں' ہے۔ مرتب

آدمی کو چاہیے کہ کنایۃً بھی جھوٹ نہ بولے ؛ مثال کنایۃً کی یہ ہے کہ کوئی دوست کسی اپنے دوست (کے) پاس مدت بعد جائے اور جب وہ سبب اس دیر کی ملاقات کا پوچھے تو کہے کہ میں بیمار تھا اس لیے حاضری سے مقصر رہا -

غرض لوگ سینکڑوں طرح سے جھوٹ بولتے ہیں - کوئی کنایتہ، کوئی مزاحاً ، کوئی صریحاً ، جھوٹ کا بڑا رواج انسانوں میں ہے - بعض اوقات مبالغے سے ایسی جھوٹی باتیں بنا کر کہتے ہیں کہ اُس پر لوگوں کو ہنسی آئے - بہت سی باتوں کی عادت ایسی پڑ جاتی ہے کہ اگرچہ وہ اصل میں جھوٹی ہوتی ہیں مگر وہ جھوٹ سمجھی نہیں جاتیں ؛ مثلاً کوئی شخص کہے کہ ہم نے تم کو ہزار دفعہ منع کیا مگر تم کہا نہیں مانتے، تو یہاں غرض شمارِ عدد منظور نہیں ، فقط کثرت بطور مبالغہ منظور ہے -

ایک جھوٹ جس کی عادت اور سہل انگاری لوگوں میں شایع ہے ، یہ ہے کہ جب دوسرے آدمی سے کہیں کہ کھانا کھاؤ تو وہ کہے کہ میں کھانا کھا کر آیا ہوں یا بھوک نہیں - یہ بھی عیب کی بات ہے -

بعض آدمی جھوٹے خواب بنایا کرتے ہیں - بعض آدمیوں کی عادت ہی ہوا کرتی ہے کہ جو بات اپنے تئیں نہیں معلوم ، اُس کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ آگے خدا جانے - یوں کہنا بھی برا ہے -

جھوٹ آدمی کو اور آدمیوں کی نظر میں خوار کرتا ہے اور وہ اُس کی قدر و قیمت گھٹاتا ہے ، اُس کی بے اعتباری اور خواری کی بنیاد ڈالتا ہے ، اندوہ و ملال کا سرمایہ جمع کرتا ہے ، عرق انفعال کا سرچشمہ بہاتا ہے ، آبرو ریزی کرتا ہے ، اُس کی گفتگو کی قدر کھوتا ہے ، عزت کو غارت کرتا ہے ، خجلت پیدا کرتا ہے ، نکوئی کو باطل کرتا ہے ، سیاہ روئی کو ظاہر کرتا ہے ،

بے زاری کی جڑ جاتا ہے - کیا وہ شخص اچھا ہے کہ اس جھوٹ کی سموم ِ جاں سوز اور عافیت گداز سے بچ کر بحر صدق میں غوطہ لگاتا ہے اور راستی کے سفینے میں بیٹھ کر کجی اور فساد کے گرداب سے بچتا ہے۔ اور راستی کو جانتا ہے کہ وہ حصار امن و امان ہے ، چراغ ایمان کی فانوس ہے ، گلشن حیات کا پانی ، نجات کی راہ ، اقتدار و اعتبار کا تعویذ ، علم نصرت کا پرچم ، گوہر آبرو کا خازن ، طریق معاش کا عصا ، راہ انتعاش[1] کا رہبر ، شعلۂ بیان کا نور ، دل ہائے ریش کا مرہم ، چراغ عزت کا روغن ، دروغ گوئی کا سراب آوارہ کرتا ہے ، صدق و صفا کا آب صافی گل و ریحان کا تختہ لگاتا ہے - سب سے اول آدمی کو سچ بولنا سیکھنا چاہیے -

۵ - غیبت کا بیان

غیبت اسے کہتے ہیں کہ دوسرے آدمی کا ذکر اس طرح کریں کہ اگر وہ سنے تو بُرا مانے - اب یہ ذکر خواہ کسی قسم کا ہو ؛ اُس کے ناقص الاعضا ہونے کا ہو یا نسب کا یا خُلق کا یا قول و فعل کا یا دین و دنیا کا یا کپڑے اور گھر اور سواری وغیرہ کا -

بدن کا عیب تو یہ ہے کہ اُس شخص کی آنکھیں چندھی ہیں ، یا وہ بھینگا ، کانڑا ، گنجا ، بونا ، لنبا ، غرض کوئی عیب بدن کا ظاہر کیا جائے -

نسب کا عیب یہ ہے کہ وہ کنیزک زادہ ہے ، باپ اُس کا موچی ہے یا کمھار ہے ، یا کوئی اور مکروہ پیشہ رکھنے والا -

خُلق کا عیب یہ کہ فلاں شخص بد مزاج یا بخیل و متکبر یا ریا کار یا غصیلا یا نامرد بزدل ہے -

مذہب کے عیبوں کو یوں بیان کرنا کہ وہ شخص شراب

---

۱ - انتعاش : بلندی ، نیکی ، عیش و نشاط -

خوار ، خائن ، ظالم ، بے نماز ، بے روزہ ، والدین سے سلوک نہیں کرتا ۔

دنیا کے عیبوں کو یوں بیان کریں کہ وہ شخص ادب سے لوگوں کی تعظیم نہیں کرتا ، اپنا حق سب پر چاہتا ہے اور اپنے اوپر کسی کا حق نہیں سمجھتا ، یا بڑا کنی ہے یا بسیار خور اور بہت سونے والا ہے ۔

کپڑے کے عیب کہ فلانے شخص کے کپڑے جھاڑجھلو ہوتے ہیں ، یا ہمیشہ میلے کپڑے پہنتا ہے ۔

بعض آدمیوں کا قول ہے کہ دین کے باب میں جو کسی کو کچھ کہے تو داخل غیبت نہیں اس لیے کہ جس چیز کو خدا نے برا کہا ہے ، اسی کی مذمت کرتے ہیں ، تو ایسے شخص کے برا کہنے میں کیا گناہ ہے جو خلاف احکام مذہبی کام کر رہا ہو ۔ مگر غیبت تو اس کا نام ہے کہ دوسرے آدمی کو ایسا کہنا کہ وہ سنے تو برا مانے ۔ پس ایسا کہنا اس میں داخل ہے ۔ اگر آدمی کی کسی بری بات کا ذکر کیا جائے جو اس میں ہو ، وہ غیبت ہے ، اور اگر نہ ہو تو وہ بہتان ہے ۔

بعض اوقات غیبت نقل اتارنے سے ہوتی ہے ؛ جیسے کوئی لنگڑے آدمی کی نقل اتارے اور خود اس کی چال چلنے لگے ۔ بلکہ نقل کرنا غیبت سے بھی بڑھ کر ہے اس لیے کہ اس سے زیادہ تر صورت دوسرے شخص کی ذہن میں آتی ہے ، گویا تصویر پیش ہو جاتی ہے ۔

اور یہی حال لکھنے کا ہے کہ قلم بھی نصف زبان ہے ۔ پس اگر کوئی معین شخص کی نسبت برا لکھے تو بھی داخل غیبت ہے ۔ یہ معین شخص خواہ صراحۃً ہو یا کنایۃً ہو ۔

بعض ریاکار مکار پڑھے لکھے غیبت ایسے پیرائے میں کرتے

ہیں کہ اُن کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اور اچھے کے اچھے بنے رہتے ہیں ۔ مثلاً کسی شخص کی حکام میں عزت ہو ، اُس کا ذکر اُن کے روبرو ہو ، تو وہ کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم کو حکام سے غرض نہیں پڑی اور نہ ہم دنیا کے واسطے اُن کے سامنے جاکر ذلیل ہوئے ، بے شرمی سے خدا بچائے ۔ غرض ان الفاظ سے یہی ہوتی ہے کہ دوسرا شخص معیوب ہے مگر اُس کو خدا کے شکر اور دعا کے پیرائے میں ادا کرتے ہیں ۔

بعض اوقات کسی شخص کی مدح بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلانا شخص کتنا اچھا ہے ، اُس کے تمام افعال اور اقوال درست ہیں ۔ مگر بے عیب خدا کی ذات ہے ، وہ بھی ایک بلا میں مبتلا ہے جس میں ہم سب گرفتار ہیں ، وہ یہ کہ صبر نہیں کرتا ہے ۔ پس اول اپنے نفس کا ذکر کر لیتے ہیں اور اُس کے ضمن میں دوسرے کی مذمت کرتے ہیں ۔ اپنے تئیں صلحا سے مشابہ کرتے ہیں ۔ تو اس صورت میں تین خطائیں جمع ہو جاتی ہیں : غیبت ، ریا ، اپنے نفس کو صاف و بے عیب جاننا ۔ خود بھی سمجھتے ہیں کہ ہم بے عیب ہیں ، کسی کی غیبت سے سروکار نہیں رکھتے ۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی جلسے میں ایک آدمی کے عیب کا ذکر کرتے ہیں اور بعض شخص اُس پر کان نہیں لگاتے ، تو پھر وہ پیرایہ بدل کر یوں کہتے ہیں کہ سبحان اللہ! عجیب و غریب بات ہے ، تاکہ لوگ خوب متوجہ ہو کر سنیں ۔ اپنے خبث باطن کے اظہار میں خدا کا نام لیا جاتا ہے ۔ خدا کو بھی دھوکا دیتے ہیں ۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ خدا تو دلوں کی بات جانتا ہے کہ اُن کی کیا غرض ہے ۔

بعض اوقات یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دوست پر جو یہ حال گزرا ، ہم کو بھی رنج ہوا کہ اُن کی سبکی و ذلت ہوئی ، خدا تعالیٰ

اُس کے عوض راحت دے - یہ غم کا اظہار اور دعا کا اظہار دونوں جھوٹے ہوتے ہیں - وہ اپنے خبثِ باطن کو ان پیرایوں میں چھپاتے ہیں -

غیبت کا سننا بھی داخلِ غیبت ہے - اگر لوگ غیبت سنیں[1] نہیں ، تو کوئی کہے بھی نہیں - جب غیبت کو سن کر لوگ تعجب کرتے ہیں تو غیبت کنندہ خوش ہوتا ہے اور زیادہ کہنے کو تیار ہوتا ہے - مثلاً جب کسی نے دوسرے کا عیب بیان کیا اور سننے والے نے کہا کہ ہم اُس کو ایسا نہیں جانتے تھے ، ہم تو اُس کو کچھ اور ہی سمجھے بیٹھے تھے ، یہ تو آج تم نے ایک نئی بات کہی ، خدا اُس سے بچائے ؛ اس سے وہ شخص غیبت کنندہ اور ایسی ہی باتیں اُس آدمی کی نسبت کہنے لگتا ہے ، جس سے زیادہ تر تعجب ہو - اور سننے والا بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے - غرض غیبت کا سننا اور اس کا تصدیق کرنا بھی داخلِ غیبت ہے - سننے والا بھی ایک غیبت کرنے والا ہے -

آدمی کو چاہیے کہ جب دوسرا غیبت کرنی شروع کرے تو اُسے زبان سے منع کر دے ، اور اگر زبان سے منع نہ کر سکے تو دل میں برا جانے ، یا مجلس سے اُٹھ کر چلا جائے ، یا کہنے والے کو دوسری بات میں لگا لے - کسی اشارۂ چشم و ابرو و ہاتھ سے منع کرے ، یا ظاہر منع کرے کہ خبردار! ایسا ذکر پھر مت کرنا -

آدمی ان سببوں سے لوگوں کی غیبت کیا کرتا ہے :

اول جب آدمی کو دوسرے آدمی پر غصہ آتا ہے تو اُس کو برا کہنے لگتا ہے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے - یہ امر

---

۱ - اصل میں 'سنے' ہے - مرتب

بہ مقتضائے طبع ہے ۔ کبھی بظاہر کچھ نہیں کہتا مگر دل میں ب
جانتا ہے جس سے دل میں کینہ پیدا ہوتا ہے ، جس سے آئندہ ب
کہنے کی بنیاد پڑتی ہے ۔ پس کینہ اور غضب دونوں غیبت ۔
سبب سے ہوتے ہیں ۔ آدمی یہ سمجھ لے کہ یہ غصہ و کی
دونوں کیسے انسان کی جان کے لیے عذاب ہیں ، اُن سے بچنا چاہیے
جس کے سبب سے اور غضب کی مصیبت نہ زیادہ ہو ۔

دوسرا سبب یہ ہونا ہے کہ اوروں کی دیکھا دیکھی ہ
میں ہاں ملاتا ہے ؛ مثلاً اگر اپنے رفیق اور اہل جلسہ کسی
برائی کریں تو اُس وقت یہ سمجھتا ہے کہ انھی کی طرح ،
نہ کہوں گا تو ناراض ہوں گے یا مجھ کو برا سمجھیں گے ا
کنارہ کشی کریں گے ، تو اُن کی سی یہ بھی کہنے لگتا ہے ا
اس امر کو حسن معاشرت اور ملنساری جانتا ہے ۔ تو جب
کینہ اور غصہ کے سبب سے کسی کو برا کہتے ہیں تو یہ بھ
اُن کو برا کہنے لگتا ہے ۔ یہ انسان کا بڑا کمینہ پن ہے
اپنے تئیں اچھا کہلانے کے لیے برے کام کرنے لگے ۔ اُس
چاہیے کہ وہ خود غیبت سے باز رہے اور اوروں کو منع کرے ۔

تیسرا سبب ، جہاں پیش بندی منظور ہوتی ہے ۔ جب اُس
معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی بڑے آدمی کے سامنے میرے[1] ۔
میں نیش زنی کرے گا یا میرے خلاف گواہی دے گا تو وہ پہلے سے[2]
اس کی برائی کرنے لگتا ہے ۔ اگر پھر وہ اُس کی نسبت کچھ کہے

---

۱ ۔ اصل میں 'سامنے میرے' کے الفاظ نہیں ہیں ، صحت نامے کے مطاب
اضافہ کیا گیا ۔

۲ ۔ اصل میں ہے 'پہلے کی برائی' ۔ صحت نامے کے مطابق تصحیح
کی گئی ۔ مرتب

شنوائی نہ ہو اور دشمنی پر محمول ہو۔ یا اول ہی سے مخاطب کے دل میں جم جائے کہ یہ آدمی لغو اور فضول گو ہے۔ یا اول اول اُس کے سچے حالات بیان کیے، بعد اُس کے کچھ جھوٹے معاملات بھی اُس کی طرف منسوب کرکے کہہ دیے تاکہ پہلے حالات کی طرح مخاطب ان کو بھی صحیح تصور کرے اور اُس کا جھوٹا اور فریبی ہونا مشہور ہو جائے۔ وہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ میری عادت جھوٹ بولنے کی نہیں ہے۔ میں نے تم سے فلاں فلاں حال، جو اُس شخص کے بیان کیے، سب ایسے ہی نکلے جیسے میں نے کہے تھے۔ ان بیانوں کی تصدیق کرا کے وہ اپنی جھوٹی باتوں کو تصدیق کرانا چاہتا ہے۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ کسی عیب سے اپنے تئیں بری کرنا منظور ہوتا ہے، اُس وقت دوسرے شخص کا نام لے کر کہتا ہے کہ اُس نے بھی ایسا کیا، یا وہ بھی میرے ساتھ شریک تھا، میں اس میں معذور ہوں۔ اُس کو چاہیے تھا کہ خود عذر کرتا اور دوسرے کا نام نہ لیتا۔ آدمی خوب سمجھ لے کہ انسان کا نفس یوں برائی سے بری نہیں ہو سکتا بلکہ اور زیادہ لوگوں کو برا معلوم ہونے لگتا ہے۔

پانچواں سبب ارادۂ فخر اور مباہات ہے کہ دوسرے کے ناقص بتلانے سے اپنا افضل ہونا ثابت کرے؛ مثلاً کسی کو یہ کہنا ہو کہ وہ جاہل آدمی ہے، اُس کی سمجھ اچھی نہیں، کلام پوچ کرتا ہے۔ اس سے غرض یہی ہوتی ہے کہ ہم اُس کی نسبت زیادہ جانتے ہیں۔ یا یہ خوف ہو کہ شاید میری سی تعظیم کہیں اُس کی نہ ہونے لگے اس لیے اُس میں عیب نکالنے شروع کیے۔ یہ امر موہومی ہے کہ اس طرح اُس کو عزت حاصل ہو۔ تجربے سے معلوم ہوگا کہ وہ خود لوگوں کی نظروں میں اس سے

ذلیل ہو جاتا ہے۔

چھٹا سبب حسد ؛ یعنی جب لوگوں کو دیکھا کہ کسی کی تعریف اور تعظیم کرتے ہیں اور اس سے بہ محبت پیش آتے ہیں تو آگ حسد کی جوش کرتی ہے اور یہ دل چاہتا ہے کہ یہ نعمت اس کے پاس نہ رہے ؛ تو اور تو کچھ نہیں بن پڑتا ، اس کا عیب ظاہر کرنا شروع کرتا ہے تاکہ لوگوں کے نزدیک اس کی عزت نہ رہے ، تعظیم و اکرام و مدح سے باز آئیں ، اس لیے اس کو تعریف کا سننا اور تعظیم ناگوار گزرتی ہے۔ اس کا نام حسد ہے۔ غصے اور کینے کی صورت میں تو یہ ہوتا ہے کہ دوسرا شخص کچھ اپنا بگاڑ کرتا ہے تو غصہ آتا ہے اور کینہ ہوتا ہے۔ اور حسد بگاڑ پر موقوف نہیں ؛ دوست ، محسن ، رشتہ دار پر بھی ہوا کرتی ہے۔ آدمی سمجھ لے کہ حسد اپنی جان کے لیے ایک عذاب ہے۔ کسی استاد کا شعر ہے کہ :

حاسد کو ایک دم نہیں راحت جہان میں
رنجِ حسد ہے ، جان ہے جب تک کہ جان میں

اپنے بھلے کے لیے اوروں کا برا چاہنا ، پرائے شگون کے واسطے ناک کٹانا ہے۔ قاعدہ ہے کہ حسد اور غیبت کے سبب سے دوسرے کا فضل اور زیادہ ہوجاتا ہے اور اپنی حماقت ، جہالت ظاہر ہوتی ہے جس سے ندامت ہوتی ہے۔

ساتواں سبب کھیل اور دل لگی ہے کہ دوسرے کی برائی بیان کر کر ہنسنا اور ہنسانا اور وقت کا ٹالنا منظور ہوتا ہے۔

آٹھواں سبب کسی کو پیٹھ پیچھے بنا لینا۔ اس سے غرض اپنی بڑائی اور دوسرے کی ذلت منظور ہوتی ہے۔

نواں سبب کسی کا استہزا کرنا اور اس کو بنا لینا ، گو کسی شخص کو رسوا کر دے۔ یہ بنانا صرف چند آدمیوں کے

روبرو ہوتا ہے ، مگر آدمی سوچے کہ اُس کا نتیجہ کیا برا اپنے حق میں ہوتا ہے ۔

[1]دسواں سبب کسی خاص دین دار کا نام لے کر اُس کے عیب و برائی کو تعجباً کہنا یا اُس کے واسطے دعا مانگنی یا اپنا غصہ و غضب جتلانا ۔ انسان کو حب غیبت کا خیال آئے تو اپنے نفس میں فکر کرے کہ کوئی عیب مجھ میں بھی ہے یا نہیں ۔ اگر کوئی عیب پائے تو اُس کے دور کرنے میں مشغول ہو جائے ۔ وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے کہ جو اپنے عیبوں کی درستی سے شغل رکھے اور دوسروں کی عیب جوئی نہ کرے ۔ آدمی کو اس سے شرم آنی چاہیے کہ اپنے تئیں تو عیبوں پر ملامت نہ کرے ، یہ نہ سمجھے کہ جیسا میں اپنے عیب کے دور کرنے میں مجبور تھا ، ویسے ہی دوسرا شخص معذور تھا کہ اپنے عیب نہیں دور کر سکتا تھا ، ورنہ پھر وہی مثل ہوگی : ''خود را فضیحت دیگرے را نصیحت'' ۔ یہ امر اس صورت میں ہے کہ دوسرے شخص میں عیب اس قسم کا ہو جو اُس کے فعل اور اختیار سے ہو ، ورنہ اور کوئی جبلی امر اعضائے ظاہری میں ہو تو اُس پر برا کہنا تو خالق کو برا کہنا ہے ، معاذ اللہ ۔ جیسا کہ منقول ہے کہ ایک شخص نے کسی حکیم سے کہا کہ اے بد صورت! اس نے جواب دیا کہ صورت کا بنانا میرے اختیار میں نہیں تھا کہ میں اُس کو اچھا کر لیتا ۔ بہ نظر انصاف دیکھو تو کوئی آدمی عیب سے خالی نہیں ۔ اگر کوئی شخص اپنے تئیں عیب سے پاک تصور کرے تو یہ محض حماقت اور نادانی ہے ۔ غرض دوسرے شخص کے عیب چھانٹنے سے یہ بہتر ہے کہ اپنے نفس کی اصلاح کرے

---

۱ - اصل میں یہاں 'نواں سبب' غلط ہے ۔ مرتب

اور یہ سوچے کہ اگر کوئی شخص مجھ کو برا کہے تو مجھے
کیسا برا معلوم ہوگا ، ایسا ہی دوسرے شخص کو سمجھے ۔

پس جیسے آدمی یہ پسند نہیں کرتا کہ دوسرا آدمی
میری غیبت کرے ، ایسا ہی یہ امر نہ پسند کرے کہ دوسرے
کی غیبت یہ خود کرے ۔ انسان کو چاہیے کہ جیسے زبان سے
غیبت کرنے کو برا جانے ، ایسے ہی دل میں بھی کسی طرف
سے بدگمانی نہیں کرنی چاہیے ۔ بدگمانی سے غرض یہ ہے کہ کسی کو
قصداً دل سے برا نہ سمجھے ۔ سوء ظن اس سبب سے برا ہے کہ
اسرار قلوب کو سوائے عالم الغیب کے کوئی نہیں جانتا ۔ پس
بندے کا یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے کی طرف بدی کو اپنے دل میں
جمائے ؛ ہاں اس صورت میں کہ بدی کا معائنہ ایسی طرح پر ہو
جائے جس میں محل تاویل نہ رہے ، کیوں کہ پھر اُس کے خلاف
دل میں جمنا دشوار ہے ۔ مگر جب تک کسی کا حال نہ دیکھا
ہو نہ سنا ، خواہ مخواہ دل میں اُس کی طرف سے بدگمان ہونا
شیطان سیرتوں کا کام ہے ۔ جب کسی کی طرف سے دل میں برائی
پیدا ہوتی ہے تو اُس سے کسی قدر نفرت دل میں سما جاتی ہے ۔ اُس
کا پاس بیٹھنا ناگوار ہوتا ہے ، اُس کی تعظیم و اکرام میں بھی
سستی ہونے لگتی ہے ۔

الحاصل غیبت بری ، خوئے زشت ناپسند ہے ۔ دوستوں کو
دشمن بناتی اور دشمنوں کو اَور زیادہ دشمن بناتی ہے ۔ جب تم
لوگوں کو برا کہتے ہو تو لوگ تم کو کہتے ہیں ۔ گویا تم اَوروں
کی غیبت کیا کرتے ہو ، اپنے تئیں رسوا کرتے ہو ۔ اپنی تیغ زباں
کو اَوروں پر کیا چلاتے ہو ، اپنا گلا کاٹتے ہو ۔ جو مرد عاقبت
اندیش ہے ، وہ اپنے حفظ ناموس کے لیے اَوروں پر زبان درازی
نہیں کرتا :

عیب تو خواہی نگوید خصم عیب او مگو
با خموشی می توان خاموش کردن کوہ را

اگر تم میں عیب نہ ہو تو سو عیبوں کا یہ ایک عیب ہے کہ تم اوروں کی عیب پوشی نہیں کرتے اور اس میں اپنی اوقات شریف کو ضائع کرتے ہو :

درگفتن عیب دگراں بستہ زباں باش
از خوبی خود عیب نمائے دگراں باش

اوروں کے افعال اور اقوال کو بدی پر حمل کرنا اور لوگوں کے عیب ہائے نہانی کا ڈھونڈنا عین بد ذاتی اور بد طینتی کی نشانی ہے ، شیطان سیرتی اور شرارت نفس کی دلیل ۔ انسان کو چاہیے کہ ہمیشہ نظر خلق کی خوبیوں اور محاسن پر رکھے ۔

۶ ۔ کہاں کہاں غیبت کرنی درست ہے ؟

اول ظلم کی داد رسی کے لیے غیبت ؛ مثلاً مظلوم آدمی اگر حاکم اعلیٰ سے کہے کہ فلاں حاکم ادنیٰ نے میرے اوپر ظلم کیا یا خیانت کی یا رسوت لی ، تو یہ داخل غیبت نہیں ۔ اس کے بدون داد رسی نہیں ہو سکتی ۔ مگر سوائے مظلوم کے اور کوئی شخص ایسا کہے تو غیبت ہوگی ۔ مظلوم کو ظالم کا کہنا درست ہے ۔

دوسرے یہ کہ بری بات کے دور کرنے کے لیے یا گناہ گار کی راہ راست پر آنے کے لیے استعانت منظور ہو ۔ غرض جہاں شرارت سے بچاؤ غیبت کے سبب سے ہو سکے اور اس کے سبب سے خیر پیدا ہو ۔

۷ ۔ چغلی

چغلی کی تعریف لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے جا کر یہ کہہ دے کہ فلانا شخص تم کو یہ کہتا

تھا ۔ مگر چغلی واقعے میں اُسی پر منحصر نہیں ، بلکہ تعریف اُس کی یہ ہے کہ جس چیز کا ظاہر کرنا برا ہو ، اُسی کو ظاہر کر دے ، خواہ جس کی طرف سے کہا ہے اُس کو برا لگے ، یا جس سے کہا ہے اُس کو برا معلوم ہو ، خواہ کسی تیسرے آدمی کو ناگوار گزرے ۔ یہ ظاہر کرنا بھی خواہ قول سے یا لکھنے سے یا اشارے کنائے سے ہو اور جو چیز ظاہر کی ہے وہ بھی خواہ عمل ہو یا کلام، خواہ عیب و نقصان دوسرے کا ہو یا نہ ہو ، غرض کہ چغلی افشائے راز اور مکروہات کے اظہار کا نام ہے ۔

آدمی کو چاہیے کہ جب اُس کی نظر لوگوں کے حال پر پڑے تو سکوت اختیار کرے ، مگر ہاں ، وہاں بولے جہاں کسی دوسرے کا نقصان ہوتا دیکھے ۔ مثلاً جب کسی شخص کو دیکھے کہ وہ دوسرے کا مال لیے لیتا ہے تو چاہیے کہ اُس کے واسطے گواہی دے ، اُس میں رعایت مال والے کی ہوگی ۔ لیکن اگر کوئی اپنا مال چھپا کر رکھتا ہو ، اُس کو اگر ظاہر کردے گا تو چغلی ہوگی ۔ اگر کسی کے[1] عیب یا نقصان کا ذکر کرے گا تو غیبت اور چغلی دونوں ہوں گے ۔ چغلی کھانے سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس کی بات کہے اُس کو کچھ برائی پہنچے ، یا یہ کہ جس سے بیان کرتا ہے، اس کی دوستی کا اظہار منظور ہو ، یا باتوں میں دل لگی کے طور پر مذکور ہو ، یا فضول اور باطل بکنے کا شوق ہو ۔ بہر صورت جب کسی شخص کے سامنے اُس قسم کی چغلی پیش ہو ، مثلاً یوں کہے کہ فلاں شخص تم کو ایسا ایسا کہتا تھا ، یا تمھارے باب میں یہ تدبیر کی ، یا تمھارے بگاڑ کی فکر میں ہے ، یا دشمن سے ساز رکھتا ہے ، یا کوئی اور

---

۱ ۔ اصل میں 'کے' کے بعد ایک 'کا' زائد تھا ۔ مرتب

ایسی بات کہے ، تو سننے والے کو پانچ باتیں چاہئیں :
اول اس کو سچا نہ جانے ۔ چغل خور اکثر بدکار ہوتے ہیں ، ان کی بات قابل اعتبار نہیں ہوتی ۔
دوم کہنے والے کو منع کرے کہ پھر تم ایسی بات مت کہنا اور نصیحت کر دے کہ یہ حرکت بے جا ہے ۔
سوم غائب شخص پر بدگمانی نہ کرے ۔
چہارم یہ کہ اس کے کہنے سے درپے تجسس اور تحقیق نہ ہو ۔
پنجم یہ کہ جس بات سے کہ چغل خور کو منع کیا ہے ، اس میں خود مبتلا نہ ہو ، مثلاً لوگوں میں ذکر نہ کرے کہ فلاں شخص مجھ سے ایسا کہتا تھا ۔

نقل ہے کہ ایک حکیم کا کوئی بھائی پاس آیا اور اس کے کسی دوست کا کچھ حال کہا ۔ اس نے سن کر جواب دیا کہ تم بہت دن میں تو آئے اور تین کرتوت ساتھ لائے ؛ اول یہ کہ ایک دوست سے بغض پیدا کر دیا ۔ دوم دل میرا فارغ اور چین سے رہتا تھا ، اس میں ایک تردد ڈال دیا ۔ تیسرے میں تم کو امین جانتا تھا ، اب اعتبار جاتا رہا ۔
حضرت حسنؓ کا قول ہے کہ ”من نم الیک نم علیک[۱]“ اسی کا ترجمہ حضرت سعدی نے یہ کیا ہے :

ہر کہ عیب دگراں پیش تو آورد و شمرد
بے گماں عیب تو پیش دگراں خواہد برد

غرض چغل خور لوگوں میں بگاڑ ڈالنے سے خالی نہیں ہوتا ۔ معلوم نہیں اس کا کیا سبب ہے کہ انسان ہر قوم کے لوگوں سے

---

۱ - یعنی ، جو شخص تیرے سامنے کسی کی چغلی کھاتا ہے ، وہ تیری چغلی بھی کسی اور کے سامنے کھائے گا ۔ مرتب

سچ بات پسند کرتے ہیں مگر چغل خور اُن کی جھوٹی بات کو پسند کرتا ہے - ایک بزرگ کا قول ہے کہ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ چغلی کی نسبت چغلی کا مان لینا زیادہ برا ہے ، اس لیے کہ چغلی میں تو صرف بتلانا ہی ہے اور ماننے میں اجازت ہوئی جاتی ہے کہ وہ اور کہا کرے - دونوں میں بڑا فرق ہے - چغل خور اگر سچا ہو تو بھی اُس کا فعل چغلی کا کمینگی سے خالی نہیں ہوتا کہ وہ عیب پوشی کا پابند نہ ہوا -

حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو فرمایا کہ جو شخص تجھ میں اور لوگوں میں بگاڑ ڈالا چاہے اور فریب دینا چاہے ، اُس کی بات کبھی مت مان - اور اپنا بھائی اور دوست اُس کو جان کہ جب علیحدہ ہو جائے تو نہ تو اُس کی برائی کرے اور نہ وہ تیری - اور بعضوں نے کہا ہے کہ چغلی ، جھوٹ اور حسد اور نفاق سے بنتی ہے ، اور یہی تینوں چیزیں ذلت کی بنا اور ارکان ہیں - اور بعض اکابر کا قول ہے کہ چغل خور اگر بالفرض سچ ہی کہتا ہے تو واقعے میں وہ خود گالی دیتا ہے ؛ اس واسطے کہ جس کی طرف سے بیان کرتا ہے ، سچ پوچھو تو قابل رحم ہے کہ اُس کو اتنی ہمت اور جرأت نہ ہوئی کہ سامنے کہتا ، اپنی زبان سے تم کو رنج دیتا - یہ رنج تو چغل خور نے اپنی زبان سے کہہ کر دیا : اشعار

یکے تیرے افگند و در رہ فتاد وجودم نیازرد و رنجم نہ داد
تو برداشتی وآمدی سوے من ہمی در سپوزی بہ پہلوے من

حاصل یہ کہ چغلی کی بدی قابل بچنے کے ہے ، وہ بری بلا ہے ، اُس سے بڑے بکھیڑے پیدا ہو جاتے ہیں -

۸ - دو رُخی باتیں کرنی

آدمی دو رخی باتیں جب کیا کرتا ہے کہ وہ دو ایسے آدمیوں

سے ملتا ہے جن میں عداوت ہوتی ہے۔ جس کے پاس جاتا ہے، اُس کی سی کہتا ہے۔ اسی کو نفاق کہتے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ اگر وہ دو دشمنوں کے پاس ہو تو وہ باتیں کرے جو سچی سچی ہوں۔ اس طرح وہ دورخا نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ دو عداوت والوں سے سچی ملاقات کی جائے اور دوستی بنی رہے، مگر[۱] اس قسم کی دوستی ضعیف ہوتی ہے، بھائی چارے کے درجے کو نہیں پہنچتی، کیوں کہ پکی دوستی میں تو دوست کے دشمن کے ساتھ عداوت کرنی پڑتی ہے۔ آدمی دو رخا جب ہوتا ہے کہ وہ عداوت والوں میں سے ہر ایک کی بات دوسرے سے جا کہے اور یہ امر چغلی سے زیادہ برا ہے؛ اس واسطے کہ چغل خور تو ایک ہی طرف کی نقل کرتا ہے، جہاں دونوں طرف کی بات ایک دوسرے سے کہتا ہے۔ اور اگر کلام ایک دوسرے کے نقل نہ کرے بلکہ ہر ایک سے یہی کہے کہ تم فلاں شخص سے عداوت رکھتے ہو، یہ بہت اچھی بات ہے۔ یا ہر ایک سے وعدہ کرے کہ میں تمھارے ساتھ ہوں، یا دشمنی کے سبب ہر ایک کی تعریف کرے، تو اُن سب باتوں سے دو رخا کہلائے گا۔ یہی حال اُس صورت میں ہوگا کہ منہ پر اچھا کہے اور پیٹھ پیچھے برا کہے۔ آدمی کو سزاوار یہ ہے کہ کچھ نہ کہے، اور اگر کہے تو حق کہے، خواہ وہ کسی کے سامنے ہو یا پیچھے۔ ایک دشمن کے سامنے بھی دوسرے دشمن کی سچی تعریف کرے۔

۹ - مدح و ہجو

ہجو کا حال تو بعینہٖ غیبت کا سا ہے جس کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ مدح کی بعض آفتیں تو اُس شخص سے متعلق ہیں جو مدح کرتا ہے اور بعض ممدوح سے۔ مدح میں اکثر افراط ایسی ہوتی ہے

۱ - اصل میں "گو" غلط ہے۔ مرتب

کہ وہ جھوٹ بن جاتی ہے - کبھی اس میں ریاکاری ہوتی ہے کہ تعریف میں اظہار محبت ممدوح کے ساتھ ہے مگر دل میں محبت کچھ بھی نہیں - کبھی ممدوح میں وہ اوصاف بیان کرتا ہے جس سے یہ خود واقف نہیں ہوتا کہ ممدوح میں ہیں یا نہیں اور نہ اُن پر آگاہ ہونے کی کوئی سبیل ہوتی ہے -

انسان دوسرے انسان کے اعمالِ ظاہری کو دیکھ کر تعریف کر سکتا ہے مگر اوصافِ باطنی پر یقین نہیں کر سکتا - ایک شخص نماز پڑھتا ہے ، روزہ رکھتا ہے ، زکٰوۃ دیتا ہے ، حج کرتا ہے ، تو وہ ان باتوں کی نسبت یقینی کہہ سکتا ہے کہ وہ یہ نیک کام کرتا ہے ، کیوں کہ اُن کا یقین صرف دیکھنے سے ہو جاتا ہے - اوصافِ باطنی مخفی ہوتے ہیں ، وہ کچھ دیکھنے میں نہیں آتے ، اس لیے جب تک آدمی کے باطن کا امتحان نہ کر لے تب تک یقیناً ان اوصاف کا حال نہیں کہنا چاہیے - ممدوح باوجودیکہ بدکار اور ظالم ہوتا ہے ، پھر بھی اُس کے دل خوش کرنے کے لیے اُس کے عدل و انصاف کی تعریف کرتے ہیں - چاہیے تھا کہ اُس کی مذمت کرکے اُس کے دل کو ناخوش کرتے ، برخلاف اس کے مدح کرنے والا خوش کرتا ہے - اب ممدوح میں یہ برائیاں پیدا ہوتی ہیں کہ جب اُس کی تعریف ہوتی ہے اور اوصاف اُس کے بیان کیے جاتے ہیں تو وہ اپنے تئیں کامل سمجھنے لگتا ہے اور شیخی و غرور اُس میں پیدا ہو جاتا ہے اور اپنے منہ میاں مٹھو بن جاتا ہے -

مداح تعریف کرنے کی بھی کوئی حد نہیں چھوڑتے - امرد[1] کو خدا کہہ دیتے ہیں - معشوق کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ اگر وہ دن کو اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دے تو دو آفتاب نظر آنے لگیں -

---

۱ - اصل میں 'امرو' غلط ہے - مرتب

اگر رات کو زلفیں شانوں پر چھوڑ دے[1] تو تین لیلۃ القدر ہو جائیں ۔ اُس کے شادی افزا بال اور مجلس افروز چہرہ شب و روز سے اچھے ہیں ۔ وہ مُردوں کو زندہ کرتے ہیں ، وہ آنکھوں کے لیے یوسف و گل ہیں مگر دل کے لیے گرگ و خار ۔ چہرہ اُن کا گو عالم افروز ہو مگر دل گزا ۔ اُن کی چشم جانوں کے چرانے کے واسطے دل میں رخنہ کرتی ہیں ۔ اُن کی زلفیں ایسی سانپ ہیں کہ جن کے دانتوں تلے زہر ہے مگر سر میں مہرہ نہیں ۔ یہ زلف سیہ غول دلوں کے لیے غول ہیں ۔

غرض مدح و ہجو میں کسی کو آسمان پر چڑھاتے ہیں ، کسی کو تحت الثریٰ کو پہنچاتے ہیں ۔ ایک کہتا ہے کہ کمال و فضل و جود و سخا میں کوئی تیری برابر نہیں ۔ دوسرا کہتا ہے کہ تو دونوں عالم کا مالک ہے ، تیرے طفیل سے یہ ساری جانیں پیدا ہوئی ہیں ، تو ہی عیش و خرمی ہے ، تو ہی نوش و مرہم ہے ۔ جب ممدوح دیکھتا ہے کہ مداح اس کی ستائش میں بد مست ہو رہے ہیں ، تو پھر تکبر کے مارے وہ اپنے آپے میں نہیں رہتا ۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ مجھ جیسے ہزاروں کو شیطان نے ڈبویا ہے ۔ یہ لطف و مکر کا لقمہ اچھا معلوم ہوتا ہے مگر اُس کے اندر آگ چھپی ہوئی ہے ۔ آخر کو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے ، مادح پھر تیری برملا ہجو کرتا ہے تو رات دن تیرا دل جلتا ہے ۔ اگر تو کہتا ہے کہ اُس کی طمع میں نے پوری نہیں کی اس لیے اُس نے میری ہجو دی ہے ، مگر اُس کا اثر دل میں باقی رہتا ہے ۔ وہ سرمایۂ فکر بنتا ہے ۔ مدح شیریں اور ہجو تلخ[2] ہوتی ہیں اس لیے

---

۱ ۔ اصل میں 'چھوڑ دیں' ہے ۔
۲ ۔ اصل میں 'ملیح' غلط ہے ۔ مرتب

وہ بھلی اور بری معلوم ہوتی ہیں۔

ہجو کا حال تلخ گولیوں اور دوا کا سا ہے کہ وہ دیر تک رنج و سوزش میں رکھتی ہیں، اور تعریف کا حال حلوے کا سا ہے کہ اُس کا مزا دم بھر کا ہوتا ہے، اُس کا اثر دیرپا دوا کا سا نہیں ہوتا۔ مگر ایک اثر اُس کا چھپا ہوا یہ ہوتا ہے کہ کچھ مدت کے بعد بدن پر پھوڑے پھنسیاں نکلتی ہیں۔ اور اُن گولیوں کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بدن اخلاطِ کثیف سے صاف ہوتا ہے۔

نفس مدح سے فرعون ہو جاتا ہے اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ بندہ ہو کر سیطان نہ بنے، گیند بن کر چوٹیں کھائے مگر چوگان نہ بنے۔ جب تجھ میں لطف و جمال نہیں رہے گا تو حریفوں کو تجھ سے ملال ہوگا۔ پھر جو تعریف کرتے تھے، وہ ہجو کریں گے۔ تجھ کو اس طرح دیکھیں گے جیسے کہ کسی بھوت نے گور سے سر باہر نکالا۔

جو لوگ اپنی تعریف و خوشامد کو بہت پسند کرتے ہیں اُن کو یوں سمجھو کہ وہ ایک زخم رکھتے ہیں جس کی برائی اس سبب سے نہیں معلوم ہوتی کہ مکھیاں اُس کو گھیرے بیٹھی ہیں۔

۱۰ - زبانِ حال کو زبانِ قال سے تعبیر کرنا

ایک طریقہ بیان کا یہ بھی ہے کہ زبانِ حال کو زبانِ قال سے تعبیر کرتے ہیں تاکہ دل پر زیادہ اثر ہو، جیسے کہتے ہیں کوئی چیز نہیں ہے جو خدا کی خوبیاں نہیں پڑھتی اور سبحان اللہ نہیں کہتی۔ اب کوئی بڑا احمق و غبی و نادان ہو جو یہ سمجھے کہ درحقیقت یہ نباتات و جمادات میں عقل اور جان آ گئی ہے جس سے کہ وہ لغات و حروف میں بولتے ہیں۔ اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود سے زبانِ حال سے گویا ہو کر خدا کی تسبیح و تقدیس و وحدانیت کی شہادت دیتی ہیں۔ شعر:

ہر گیاہے کہ از زمیں روید ’وحدہ لا شریک‌لہ‘ گوید

اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر گھاس کا پٹھا اپنی صورت حال سے خدا کی توحید کی شہادت دیتا ہے - غرض جو صنائع اپنے صانع کی قدرت اور حسن تدبیر و کمال پر شہادت دیتے ہیں ، اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ اپنی زبان سے کہتے ہیں کہ ہم گواہ ہیں بلکہ اُن کی ذات اور حال سے شہادت مراد ہوتی ہے -

۱۱ - استعارہ

بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کا ذکر صریح کیا جاوے تو سمجھ میں وہ آتی ہیں ، مگر اُن کو استعارے اور اشارے کے طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ اُن کا اثر سننے والے کے دل پر زیادہ ہو - مثلاً کوئی شخص نااہلوں کو حکمت اور علم کی باتیں سکھا رہا ہو تو کہیں کہ وہ سؤروں کو آم چسا رہا ہے - اب نہ وہاں سؤر ہیں نہ آم ہیں - اس سے مطلب یہ ہے کہ جیسے کہ سؤر میں آم چوسنے کی قابلیت نہیں ہے ، ایسی ہی سننے والوں میں مسائلِ حکمت سمجھنے کی قابلیت نہیں ہے - مثال ، مسجد ریٹھ سے ایسی سکڑتی ہے جیسے آگ سے کھال ؛ یعنی جیسے آگ کھال سے مخالف ہے، ایسے ریٹھ مسجد کی پاکیزگی سے خلاف ہے - جو شخص نماز میں امام سے پہلے سر اُٹھاتا ہے ، اُس کو ڈرنا چاہیے کہ خدا اُس کے سر کو گدھے کا سر بنا دے - یہاں یہ مراد ہے کہ جیسا گدھے کے سر میں بے وقوفی اور کم ذہنی ہوتی ہے، ایسے ہی اُس شخص کے سر میں بے وقوفی ہوگی جو امام کا اقتدا بھی کرتا ہے اور اُس سے آگے بھی بڑھتا ہے - وہ نہایت حماقت کرتا ہے - یا جیسے حدیث ہے کہ خدا تعالیٰ کی دو اُنگلیوں میں مومن کا دل ہے ، تو اس میں انگلیوں سے اشارہ قدرت کی طرف ہے - اس سے اقتدار کے سمجھانے میں بڑا اثر ہوتا ہے ؛ جیسے کہتے ہیں یہ

کام ہاری چٹکی میں ہے۔

۱۲ - شاعر و شعر و شاعری کی برائیاں

قول سہ کس نیست بدہر استوار   شاعر و قرعہ زن و اختر شمار

ایک گروہ اپنے تئیں شعر تراش کہتا ہے مگر وہ شعر خراش ہوتا ہے۔ قلب ان کا سلیم (زہر آلود)، قالب ان کا لئیم، خاطر اُن کی عقیم، نظم اُن کی سقیم؛ چہرہ ان کا پیاز کی طرح لال و نیک معلوم ہوتا ہے مگر اندر سے بالکل پوست ہوتا ہے۔ سخن میں وہ زبان کو جری کرتے ہیں مگر عقل کو پہلے بھرا کر دیتے ہیں۔ اُن کی جان جیسے مغز پر بادہ[1]، دل اُن کا مثل اُن کی نظم کے سادہ۔ اُن کے افعال ایسے زشت جیسی اُن کی عبارت۔ جان اُن کی ایسی گراں جیسے اُن کے استعارے۔ صورت بھلے آدمیوں کی سی مگر کام بن‌مانسوں کے سے۔ ایسے شاعروں سے اُمرا بڑے خوش ہوتے ہیں کہ وہ اُن کے فتنے کا نام بھی عافیت رکھتے ہیں۔ شکل اُن کی گربۂ مسکین کی سی۔ وہ ایک لقمے کے لیے محتاج ہوتے ہیں۔ دسترخوان پر ایک ایک ٹکڑے کے لیے مار کھاتے ہیں۔ چوہوں کی طرح لوگوں کے گھروں میں پڑے پھرتے ہیں اور دسترخوان کو کترتے ہیں۔ طوطے کی طرح اپنے بولنے کی لاف مارتے ہیں اور معانی سے دل اُن کا خالی ہوتا ہے۔ کمینوں کے سامنے شعر اپنے لے جاتے ہیں اور اپنے تئیں اُن کا ندیم بناتے ہیں، اُن کی مجلس کے حکیم بن جاتے ہیں، اور شعرا کے سخن کے ریزے ریزے جمع کرکے اپنا ذخیرہ جمع کرتے ہیں۔

غرض روز و شب دربدر خاک بسر روٹیوں کے لیے پھرتے ہیں اور شاعروں کے نیک نام کو بد کرتے ہیں۔ شعر جو حسبِ طبع

---

۱ - مغز پر بادہ: غرور بھرا دماغ (؟)۔

ہو وہ جان سرہ[1] ہوتا ہے ، جب وہ معمولی طریقوں سے کہا جاتا ہے تو مسخرہ ہوتا ہے ۔ شاعری جس میں دروغ ہو ، وہ فروغ نہیں رکھتی ۔ (ایسی) شاعری سے دل میں گدائی کا نقش جم جاتا ہے ۔ عقل جو بادشاہ سخن ہے ، وہ دروغ زن ہو کر غلط موذن ہو جاتی ہے ۔ شاعروں کی باتیں سارے غمزے ہوتے ہیں اُن غمزوں سے وہ خواجہ بننا چاہتے ہیں ۔ وہ بہت بے حمیت و بے خرد ہوتے ہیں ۔ سخن اُن کا معنی سے ایسا برہنہ ہوتا ہے جیسا اُن کا سر ۔ جب وہ کسی گروہ میں سخن پڑھتے ہیں تو اپنی فر و شکوہ ظاہر کرتے ہیں ۔ مگر اُن کی آواز کانوں کو ایسی بری معلوم ہوتی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ وہ خاموش ہوں جس سے درد سر موقوف ہو ۔ جو اُن میں ہزل گو ہیں ، اُن کا کلام عاقل کب سنتے ہیں ۔ وہ اُن کے سامنے پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں تو وہ اپنے کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں ۔ اگرچہ وہ ظاہر میں سنتے ہیں مگر دل میں غصے ہوتے ہیں ۔ اور اُن کے کلام سننے کو عاقل گناہ اور جاہل موعظت جانتے ہیں ۔ وہ ایک قصیدے کو دو سو جگہ سفلوں کے روبرو ڈاڑھی کو ہلاہلا کر پڑھتے ہیں ۔ کچھ اشعار ازبر کر کے شہر کو گدائی سے زیر و زبر کرتے پھرتے ہیں ۔ موچی ، درزی ، نداف کی دکانوں میں بیٹھے اپنی شاعری کی لاف مارتے ہیں ۔ اوروں کے موتی چرا کے اپنے خر مہرہ کے ساتھ ملا کے بیچتے پھرتے ہیں ۔ ہمیشہ احمقوں کی طرح غرور کرتے ہیں اور خلق کو رنجور ۔

کوئی شخص ایک دو بیت کے پڑھنے سے شاعر نہیں ہوتا بلکہ وہ سخن‌ور شاعر کہلاتا ہے جو معانی سے ماہر ہو ۔ یہ شاعر بالکل بے مایہ ہوتے ہیں ۔ رزق اور تذویر کے طلب گار ، دس جو پر

---

۱ ۔ سرہ : خالص ، بے عیب ۔

مدح سرائی کرنے والے ، ڈھونڈ ڈھونڈ کی ستائش میں شعر اس سبب سے پڑھنے والے کہ کپڑے دھووے اور جوتی پہناوے ۔ روٹیوں پر شعر بیچتے ہیں ، کتے کی طرح در بدر پڑے پھرتے ہیں اور کوکل کو چلغوزہ کہتے ہیں ۔ جو بادشاہ کی تعریف میں کہتے ہیں وہ عوام کی تعریف میں اُن کو کبھی خدا بھی کہتے ہیں ۔ خلخال کی جگہ تاج پہنتے ہیں ۔ مدح و ذم اُن کے نزدیک یکساں ہے ۔ بے زباں مگر اپنے تئیں زباں داں جانتے ہیں ، اندھے مگر اپنے تئیں بینا سمجھتے ہیں ۔

بادشاہ کا بڑا برگزیدہ کام یہ ہے کہ اُن کی نسل کو جہان سے برکندہ کرے کہ اس قوم نابکار کے عذاب سے خلق چھوٹ جائے ؛ اس لیے کہ اکثر شاعروں کے پوچ اور[1] خیالات واہی قضائے الٰہی کے عدم رضا پر مبنی ہوتے ہیں ۔ اُن کے مضامین کفر آمیز نظم میں یا نثر میں ہوتے ہیں ۔ کبھی آسمان سے لڑائی ہے کہ کیوں اُس نے ایسا کیا ، کبھی دورِ فلک پر عتاب ہے کہ کیوں اس نے ان کو سب کا سرتاج نہ بنایا ۔ قضا و قدر کے ساتھ بھی گستاخی سے نہیں چوکتے ۔ جو مضمون اُن کے ذہن میں آئے اور اُس میں کچھ لطائف شعری پائے جائیں ، پھر اُس کے کہنے سے باز نہیں رہتے ، خواہ اُس میں سراسر کفر ہی کیوں نہ بھرا ہو ۔ عرش و کرسی کو اپنے ممدوح کے پائے سے کمتر کہہ دیتے ہیں ۔ حضرت عیسیٰؑ و موسیٰؑ کو تو موردِ اعتراض بناتے ہیں اور خضرؑ و الیاسؑ پر ملامت کرتے ہیں ۔ یہ ہرگز نہیں سمجھتے کہ برگزیدگانِ خدا کا رتبہ ایسا برتر ہے کہ بے نام و نشانوں کے واسطے اُن کے ساتھ یہ گستاخی اور بے ادبی کرنی نہایت حماقت و نادانی ہے ۔

---

۱ ۔ اصل میں 'اور' نہیں ہے ۔ مرتب

۱۴ - شاعر و شعر و شاعری کی خوبیاں

لطفِ سخن کا لباس انسان کو خاص خدا تعالیٰ نے عنایت کیا ہے - جس وقت وہ وزن کا خلعت ناز سے پہنتا ہے اور قافیے کو دامن کا طرار بناتا ہے اور ردیف کی خلخال ڈالتا ہے ، خیال کا خال ماتھے پر لگاتا ہے ، تشبیہ سے رخ پر جلوۂ ماہ دکھاتا ہے ، تجنیس کی مانگ بناتا ہے ، ایہام سے چشمک زنی کرتا ہے ، مجاز کی زلف کو چھوڑ کر حقیقت سے پردہ اُٹھاتا ہے ؛ جب وہ اس شکل سے شبستانِ خیال سے جلوہ افروز ہوتا ہے ، تو کوئی شاہدِ موزوں اُس کی برابر دل ربا نہیں ہوتا - اُس کے عشق میں صبر صعب اور تسلی مشکل ہے - وہ کانوں کو موتیوں سے پُر کرتا ہے - کبھی تحمید میں نغمہ سرائی ، کبھی توحید میں عقدہ کشائی ، کبھی خوش حالوں کے صومعہ میں ہے ، کبھی صوفیوں کے سماع میں وہ نکتہ سنجی قوالوں کے لب سے کرتا ہے کہ وہ دل و جان کو اُس پر فدا کرتے ہیں - کبھی عاشق کا غم نامہ پڑھتا ہے ، کبھی معشوقوں کی پردہ ساری اور عاشقوں کی پردہ دری کرتا ہے - غرض اُس سے کبھی دل کو قوت ہوتی ہے ، کبھی جان کو راحت - کبھی اس سے دولت ملتی ہے ، کبھی عزت - غرض وہ سر تا سر ہنر ہے اور بےعیب ہے - مگر جب بے ہنروں سے اُس کو پالا پڑتا ہے تو اُس کا وہ حال ہوتا ہے جو اُوپر بیان ہوا کہ پھر وہی زبان سے بیہودہ باتیں کراتا ہے - شعر دل کے سرچشمے کا پانی ہوتا ہے - اگر چشمہ مٹی سے اٹا ہوا ہے تو اُس کا پانی کیوں نہ گلِ آلودہ ہوگا - پہلے دل تمام آلودگی سے پاک ہو تو شعر پاک ہو - جب وہ خباثت سے معمور ہے تو شعر بھی خبث سے خالی نہیں ہو سکتا - جو شاعر پاک نہاد نہیں ، اُس کا کلام بھی نجاست سے خالی نہیں - نظم سخن کا بھی کیا وزن ہے کہ وہ اس ترازو

اور ہاتھ سے نہیں ہوتا بلکہ طبیعت کے دست اور ترازو سے ہوتا ہے - پس یہ طبیعت ہی اُس کی قوت بازو ہے ، وہی اس کو حکمت اور بیان میں سحر بناتی ہے ، وہی اُس کو آسمان پر چڑھاتی ہے ، وہی تحت الثریٰ میں لے جاتی ہے - غرض جیسی طبیعت شاعر کی ہوتی ہے ، ویسا شعر ہوتا ہے -

۱۴ - فکر اشعار

شاعر دن بھر شعروں کی اُدھیڑ بن میں رہتے ہیں - راتوں کو قافیہ جوئی کے خیال میں آنکھیں نہیں بند کرتے - اپنے مقاصد کے واسطے قصائد ارباب مناصب کی مدح میں کہتے ہیں اور مطالب حاصل کرتے ہیں - سادہ دلوں کی ہجو میں بھی کبھی کبھی کاغذ کو سیاہ کرتے ہیں - غزل پردازی میں غزالوں کے ساتھ عشق بازی کی باتیں کرتے ہیں - کبھی مثنوی میں ایک وزن کے ہزاروں شعر کہتے ہیں اور اپنے خیال میں ہزاروں موتی پروتے ہیں - ان کی ترصیع میں ایسے محو ہوتے ہیں کہ عقل و دین دونوں کھوتے ہیں - کبھی رباعی دل کی غم خواری کے واسطے فرماتے ہیں - کبھی قطعے میں طبع بلند دکھاتے ہیں ، کبھی کوئی ایک بیت فرد ایسی کہہ دیتے ہیں کہ وہ سینۂ پر درد کے واسطے مرہم ہوتی ہے - کبھی کسی کے نام کو معمے میں گم کرتے ہیں - کبھی ماتم داری کے واسطے مرثیہ ارشاد کرتے ہیں جس کے سننے سے آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برستا ہے - اُس میں بیان کرتے ہیں کہ فلانا امیر ، فلانا بادشاہ مر گیا ، اپنا ملک و میراث بدخواہ کے حوالے کر گیا - غرض اوروں کے مرنے سے اپنے مرنے کا ماتم خیال کراتے ہیں - کبھی کسی واقعۂ عظیم کی تاریخ کہہ کر اُس کو یادگار روزگار بناتے ہیں - غرض اسی طرح اُن کی عمر کٹتی ہے ، یہاں تک کہ اُن کے نظم احوال کی تقطیع ہوتی ہے - عمرشریف

کا قافیہ تنگ ہوتا ہے ، دم بہ دم مرگ اس کی ردیف بنتی ہے -

۱۵ - اشعار کا مطالعہ اور ان پر ستم

دفتر اشعار جو[1] خرد کے موافق لکھے گئے ہوں ، ہر ورق ان کا رنج و الم کی صحت کے واسطے نسخہ ہو تو ان کے ساتھ جلیس ہونا چاہیے - ان سے بہتر کوئی جلیس و انیس نہیں ہے - وہ روح کے واسطے باغ سے کم نہیں - جو ورق اس کا الٹیے ، ایک نیا شگوفہ شگفتہ نظر آتا ہے - اگر تم یہ چاہو کہ اس کی نکہت تمہارے دماغ کو معطر کرے تو غرض کی آلائش سے خاطر کو دھو ڈالو ، صدق کی طلب میں ہمت عالی رکھو ، تعصب کا زنگ دل سے دور کرو اور تأمل عقل کے موافق کرو - قلم کی طرح قطرہ زنی نہ کرو بلکہ پرکار کی طرح قدم قائم کرو - معنی کو جمع کرو اور ہر نقطے اور نکتے پر غور کرو - ہر حرف سے حق معنی طلب کرو ، معنی ژرف کی تہہ پر پہنچو - جب تک دریا میں غواص غوطہ نہیں لگاتا ، کف میں صدف گوہر نہیں لا سکتا - اگر دس شعروں میں ایک کے معانی بھی پسند ہوں تو اس سے دل کو خرسند کرو - اشعار کی بحر بھی کان گوہر ہوتی ہے اور اس کے گوہر بھی صدف کے موتیوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں - معانی کو اصل جانو ، گو عبارت میں کچھ عیب بھی ہو تو اس کو معاف کرو - حاسد کی طرح بیہودہ خروش نہ کرو - عیب جوئی کو اپنا ہنر نہ بناؤ - ایک عیب کے سو عیب نہ بتلاؤ - کبھی ان کے وزن پر طعن نہ کرو ، کبھی ان کے زحاف پر عیب نہ لگاؤ - کبھی الفاظ کو نامعقول اور قافیے کو نامقبول نہ کہو - اگر ایسا کرو گے تو خود نظم ، معانی سے دور معلوم ہوگی[2] اور

---

۱ - اصل میں 'جو' کی بجائے 'خو' غلط ہے -
۲ - اصل میں 'ہوں گے' ہے - مرتب

تمھاری خردہ گیری کو لوگ تعصب بتلائیں گے ، اور یہ کہیں گے کہ تمھاری خاطر کا قافیہ تنگ ہے ۔ تم نے غور و تامل میں ایک شب آنکھوں کو نہیں جگایا ۔ کوئی گوہر مخزنِ غیب سے نہیں نکالا جس سے تم میں معنیِ باریک کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ۔ تم اس کام کی دقت سے واقف نہیں اس لیے اس کی فہم سے عاری ہو ۔

تین آدمی بڑا ستم اشعار پر کرتے ہیں :

ایک غزل خوانِ خام کہ وہ روشِ نظم سے واقف نہیں ہوتا ۔ تیغِ زباں سے کبھی نظم کا سر کاٹتا ہے ، کبھی پاؤں ۔ وہ جن فرزندوں کے بند بند کاٹتے ہیں ، اُن کے باپ بڑی واویلا کرتے ہیں ۔

دوم ان برے پڑھنے والوں سے بدتر غلط لکھنے والے ہوتے ہیں کہ نظمِ رواں کے سروپا کو چوبِ قلم سے شکستہ کرتے ہیں ۔ اپنا قلم تیر کی طرح چلاتے ہیں اور چشمِ معانی میں لگا کے اس کو اندھا کرتے ہیں ۔ وہ اپنی غلط نویسی سے ہر سخن کے دست و پا گم کرتے ہیں ۔ اپنی قلم کی طرح اس کو رو سیاہ بناتے ہیں ۔

ان دو مخالفوں کے سوا تیسرا وہ ستم کیش ہے جو چشمِ انصاف سے نہیں دیکھتا ۔ وہ اپنے کینے کی کزلک کو زہرآب کرکے نقشِ صواب کو حک کرتا ہے ۔ اگرچہ اس میں دقایق بے نظیر دیکھتا ہے مگر سب میں عیب نکالتا ہے ۔ جو مرغ کانٹے کھاتا ہے ، وہ خرما کے درخت پر بیٹھ کر (بھی) کانٹے ہی کھاتا ہے ۔ جیسے آبِ رواں خس و خاشاک سے خالی نہیں ہوتا ، ایسے ہی کسی کی نظم عیب و غلطی سے پاک نہیں ہوتی ۔ دریا میں موتی بہت ہوتے ہیں مگر بے صدف کے وہ باہر نہیں نکلتے ۔ کوہ میں پتھر

بہت ہوتے ہیں ، زر تھوڑا ہوتا ہے - چشم ہنر ہیں ، عیب سے پاک ہوتی ہے ، بے ہنر عیب نکالیں تو آسے دیاً باک ہے - جو کمینے ہنرمندوں کے عیب دیکھتے ہیں انہیں کون دیکھتا ہے - آئینے کی پشت کو کوئی نہیں دیکھتا - بزرگوں کی نظر انصاف پر ہوتی ہے - وہ جانتے ہیں کہ سخن دانی کسے کہتے ہیں اور یہ گوہر کس کاں سے پیدا ہوا ہے ، یہ سخن نادر کس ذہن سے نکلا ہے - وہ ترتیب کے اندر حوبیاں دیکھتے ہیں - غرض موتی اندھوں کے دیکھنے کے واسطے نہیں ہوتے - گدھے کی گردن تعویذ کے لایق نہیں ہوتی - پس جو اشعار حکمت شعار ہوتے ہیں ، آن کا سمجھنا سخن دانوں ہی کا حق ہوتا ہے -

۱۶ - سخن

اس چرخ کہن کے نیچے سخن بھی کیا تعجب خیز ہے - اُس کے واسطے قالب انسان بنا ہے - خدا نے عقل و سخن انسان کے ساتھ مخصوص کیے ہیں ، وہی اس کی ہمشیرۂ جان ہیں - کوئی نہیں جانتا کہ حد گفتار کہاں تک ہے اور وہ جاں کا کار پنہاں کہاں تک کرتی ہے - وہی وحی خدا ، پیغمبروں کے لیے ہے - تمام باریک نکتے انسان کے اسی میں ہیں - ورع اور رزق اسی میں ہے - آدمی اور گدھے میں فرق اسی میں ہے ، شمشیر زبان کا وہی جوہر ہے ، آب دہاں کا وہی گوہر ، نغمہ ساز وہی ہے - اس گنج کی حفاظت سے تو رنج سے بچ سکتا ہے - صرفۂ گفتار صرفۂ زر سے بہتر ہے - جو مرد تجربہ کار ہوتے ہیں وہ ہر چیز کو بہ مقدار مناسب خرچ کرتے ہیں - جو سمندر میں زیادہ سفر کرتے ہیں وہ اُس میں پانی کا زیادہ صرفہ کرتے ہیں -

پس جو سخن شناس ہیں ، وہ سخن میں اسراف نہیں کرتے - سخن کا نرخ مال سے نہیں کرتے - سخن کو جان ، مال کو سفال

جانتے ہیں - سخن فہمی کے واسطے دل باریک جو چاہیے کہ وہ سخن میں فرق مو بہ مو کرے - جب بلبل نغمۂ دل افزا کر رہی ہو تو آلو کا ہو ہو کرنا بیہودہ ہے - جو شخص بر محل اور با[1] موقع سخن نہ کہہ سکے تو بے موقع کہنے سے خموشی بہتر ہے - بڈھے قوال کو گانے کے وقت کھانسی کا گلوگیر ہونا خاموشی کے لیے مناسب ہے - جو غضب سے فحش سخن کرتا ہے ، وہ اس کو ارۂ دل اور سوہان جان بناتا ہے - اگر مینڈک کی آواز دل پزیر ہوتی تو اس کی نفیر سے کیوں لوگ نفرت کرتے - جیسے سکۂ قلب[2] کو خوش خطی سے کچھ سود نہیں ، ایسے ہی آدمی کو تکبر کی چکنی چپڑی باتوں سے کچھ حاصل نہیں - جھوٹے لعل کو کبھی دروغ کے سبب سے فروغ نہیں ہوتا - در فتح اسی پر کھلتا ہے جو راستی کی کنجی ہاتھ میں رکھتا ہے - جو شخص راست سخنی کے پاؤں پر سر رکھتا ہے ، اس پر باد حوادث چل کر اس کو ٹیڑھا نہیں کر سکتی - جو شخص راستی علامت ہے وہ توفیق سلامت کا قالب ہے - صدق سوائے راستی کے پیدا نہیں ہوتا - تیر سیدھا کالبد ہی سے ہوتا ہے - جب مسطر ٹیڑھا ہوتا ہے تو اس پر ہر خط کج ہوتا ہے - پس جب دل ہی ناراست ہوتا ہے تو اس کی ہر بات ٹیڑھی ہوتی ہے - زبان ہی آدمی کو چھپاتی ہے ، وہی اس کو برہنہ کرتی ہے -

اہل درم کا حال مال سے معلوم ہوتا ہے ، اہل مقال کا مقال سے - جیسے قلم بے شگاف نہیں لکھ سکتی ، ایسے بغیر دو زبانی کے صواب و گزاف نہیں نکل سکتے - افسوس ہے کہ اگر آدمی کو

---

۱ - اصل میں 'با' نہیں ہے -

۲ - سکۂ قلب : کھوٹا سکہ - مرتب

میل دو زبانی کی طرف ہو ، اس دو زبانی سے زبان ، قصاب کی دو چھریاں بن جاتی ہیں جو ایک دوسرے کو خون ریزی کے لیے تیز کرتی ہیں ۔ اگر تو کسی نکتے کے دست و پا لگا کر بڑھا دے گا تو وہ کان میں ہزارپا و بچھو بن جائے گا ۔ درج دہان کو قفل لگانا اور اس کی کنجی کو گم کرنا بہتر ہے ۔ تو کان سے پنبہ نکال کر دہن میں لگا ۔ سن بہت ، بول کم ۔ باز کی طرح خاموش ہو ، چڑیا کی طرح زبان نہ باز کر ۔ جو شخص دہن کو کھول دیتا ہے ، وہ غافل ہوتا ہے اور اس سے ملال دل ہوتا ہے ۔ دل خموشی پسند ہو ، دہن خواہ کشادہ ہو یا بند ۔ مرد کم سخن تازہ رو ہوتا ہے ۔ جو آزاد ہیں اُن کے لب سے کوئی بات ایسی نہیں نکلتی کہ اس سے کوئی بیم ہو ۔ کوئی شخص سخن نرم سے خوف نہیں کرتا ، سخن سخت سے آدمی ڈر جاتا ہے ۔ جو شخص سخن تشدد سے کرتا ہے ، اُس کے حرف دل میں چبھ جاتے ہیں ۔ جو تلواریں کہ گوشت کاٹتی ہیں ، وہ تو بے حد ہوتی ہیں اور جو تلواریں کہ گوشت کی ہوتی ہیں ، وہ بہت بد ہوتی ہیں ۔ تو اپنی تیغ زبان کو تیز نہ کر ، وہ تیرے حلق کو کاٹ ڈالے گی ۔

کوئی شخص زخم زبان نہیں لگاتا جو اس سے شکستگی اور زیان نہیں پاتا ؛ جیسے خار جس کی زبان میں نشتر ہوتا ہے ، اکثر چبھنے سے خود شکستہ ہو جاتا ہے ۔ ربان اور جراحت لگانے کے وقت کسی سے خوف نہیں کرتے ۔ چیرہ زبانی سے ایسا زخم جان پر لگتا ہے جیسا کہ نشتر کے بوسے سے خون نکلتا ہے ۔ جیسے خنجر سنگ خارہ سے تیز ہوتا ہے ، ایسے ہی سخت دلی سے زبان کو حوصلۂ جنگ ہوتا ہے ۔ کوئی خاموش (آدمی) کو گزند نہیں پہنچاتا ۔ مرد سخن گو ہی زخم کھاتے ہیں ۔ آدھی رات کو چوروں کی آواز ہی پر تیر لگاتے ہیں ۔ تو یہ جان لے کہ جو کچھ کہتا

ہے اُس کو خدا ذرا ذرا سنتا ہے ۔ قد سمع[1] اللہ تیری ہر بات کے لیے موجود ہے ۔ اچھی بولو کو ادب آموز ہو اور سامع کو بھی جو لوگ تیرے سامنے عیب کریں تو اُس کو نہ سن ۔ ہمیشہ نیک باتیں سن ۔ قطرہ صدف پاک میں موتی ہوتا ہے اور ناپاک میں کیڑا ۔ پس اسی طرح جو خرد مندوں کے کان میں بات آتی ہے ، اُس کو وہ چشم و ہوش سے دیکھتے ہیں ۔ جیسے کہ ہاتھی کی آنکھوں کا پنکھا کان ہیں ، ایسے ہی بزرگوں کے واسطے بصر کی دلیل سمع ہے ۔ جو عیب پوش کی بات نہیں سنتا ، وہ اپنے حق میں خود عیب کوش ہے ۔ آدمی کو چاہیے کہ یا تو نیک باتیں کہے اور اچھی باتیں سنے ، نہیں تو گونگا و بہرا ہو جائے ۔ اگر تیری زبان سے لوگوں کی برائی ہونے لگے تو تُو اُس کو تالو سے نکال ڈال ۔ جب زبان نجاست آلود ہو جاتی ہے تو آب دہن سے اور زیادہ پلید ہو جاتی ہے جیسے کہ غلاظت تر ہونے سے اور زیادہ غلیظ ہو جاتی ہے ۔ آدمی اتنا ہی بولے جو پسندیدہ اور خوش ہو ۔ اگر تجھ کو ایسا بولنا نہیں آتا ہو تو مشک کی طرح دہن کھولنے سے کیا فائدہ ہے ۔

۱۷ ۔ وعظ اور اُس کی ضرورت ، اُس کے فائدے ، اُس کے آداب

۱ ۔ وعظ کی ضرورت :

انسان کی طینت کے خزانے میں دل یا عقل کا قیمتی گوہر ایسا خدا نے امانت رکھا ہے کہ وہ اُس کا آئینۂ گیتی نما ہے ، اُس کے اعمال کے دائرے کا مرکز ۔ جیسا کہ آئینہ بخارات سے مکدر ہوتا ہے اسی طرح یہ دل کا جوہر معاصی و ہوائے نفسانی اور لہو و لعب کی کثرت استعمال سے زنگ آلودہ ہوتا ہے اور اس

---

۱ ۔ یعنی بہ تحقیق خدا سن رہا ہے ۔

میں صور حقائق اور انوار حق نہیں دکھائی دیتے اور آدمی اپنی صلاح حال کو فساد سے نہیں تمیز کر سکتا ۔ کار دنیا کو عظیم و بزرگ جانتا ہے اور کار عقبیٰ کو سہل و چھوٹا ۔ اب اس حالت کے دو مرتبے ہیں کہ یا تو گناہ کا زنگ اس آئینے پر ایسا لگا ہو کہ اس میں قابلیت یہ ہو کہ توبہ و ندامت کی صیقل سے وہ اتر جائے ۔ دوم یہ کہ اس پر ایسا زنگار لگا ہو کہ پھر آئینۂ دل مجلا ہونا دشوار ہو ۔ انسان کا دل پہلے گناہ سے لڑتا ہے اور جب اس کے غلبے سے مغلوب ہو جاتا ہے تو پھر انسان کا باطن زیر و زبر ہو جاتا ہے ۔ اب وہ چیز جو انسان کے دل سے اس کدورت کو دور کرتی ہے ، وعظ و نصیحت ہے کہ ناصح مہربان سے سنے یا کسی معتبر کتاب میں پڑھے ۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ عامہ خلائق کو وعظ کی ضرورت ہے ۔ ہر عقل مند جانتا ہے کہ اگر ایک جماعت کسی راہ پر چلتی ہو اور بعض ان میں سے راہ بھول جائیں تو باقی کو ضرور ہے کہ وہ ان کو راہ بتائیں ۔

اگر بینی کہ نابینا و چاہ است — وگر خاموش بنشینی گناہ است

کوئی ہدیہ انسان کے واسطے اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ کوئی کلمۂ حکمت ایسا اس سے کہے کہ اس کو ہدایت ہو اور طریق ناشائستہ سے پھیر لائے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ کوئی تحفہ و ہدیہ مواعظ سے زیادہ نہیں ہو سکتا ۔

۲ ۔ آداب وعظ :

(۱) واعظ کو اول چاہیے کہ جن باتوں کی نصیحت اوروں کی کرنی چاہتا ہے ان پر خود عمل کرے ، جب سننے والوں کے دلوں پر اس کی گفتگو کا اثر ہوگا ۔ اس کو چاہیے کہ اول اپنے تئیں خواب غفلت سے بیدار کرے تاکہ اور سوئے والوں کو جگا سکے : ع

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

پہلے اپنے دلِ مردہ[1] کو زندہ کرے تا کہ اس کا نمکِ سخن دلوں پر اثر کرے ۔ جو عالم اپنے علم پر خود عمل نہیں کرتا اور عمل صالح نہیں کرتا ، اس کی پند و نصیحت دلوں پر سے ایسی اتر جاتی ہے جیسے کہ بارش سے پتھروں پر سے مٹی ۔ اس کی بات دل نشین نہیں ہوتی ۔ جب تک سوزِ سینہ سے بات منہ سے نہیں نکلتی وہ دل پر اثر نہیں کرتی ۔

(۲) دوم وعظ میں واعظ کو چاہیے کہ اغراض کی لوث سے طبیعت کو پاک کرے ، دل کو توقعات خسیسہ سے بالکل خالی کرے اور وحیٔ الٰہی کی تفسیر کو قصیدۂ طمع کی شاہ بیت نہ بنائے ۔ طول سخن کو اظہار کمال کا واسطہ نہ بنائے ۔ عصا و ردا سے علم افتخار نہ بلند کرے ، منبر کو آلۂ خودنمائی نہ بنائے ۔ ریش دراز اور سبحۂ صد دانہ کو جذب قلوب کا سر رشتہ نہ کرے ۔ استغنا و بے طمعی کا اظہار اس طرح نہ کرے کہ لوگ بے طلب دینے کی فکر کریں ۔ غرض اعلان کلمۂ حق میں سوائے خیر خواہی خلائق اور رضائے خالق کوئی اور مدعا اور مطلب نہ رکھے اور یہ سمجھے کہ آدمیوں کی نصیحت کرنے کی اجرت سوائے کرم الٰہی کے خزانے سے کہیں اور سے نہیں ملے گی ؛ جس سے کہ اس کی باتوں کی وقعت اور تاثیر کامل دلوں پر ہو ۔

(۳) سوم گفتگو میں طریقۂ نرم گفتاری کو ہاتھ سے نہ دے ۔ مطلب کو بلاغت سے ادا کرے ۔ نصیحت کی تاثیر کو درشت گوئی پر منحصر رکھ کر زبان کو تلخ گفتاری سے زہر آلود نہ کرے ، کیونکہ سننے والوں کو اس سے نفرت ہوگی ۔ اول نصیحت و پند

---

[1] ۔ اصل میں 'اپنے دل مردگی' ہے ۔ مرتب

اکثر طبائع کو ناملائم معلوم ہوتی ہیں اور جب ان کی ادا کا طریقہ ناملائم ہو تو پھر وہ کب مستمع کے دل نشین ہوں گی - ہر واعظ و پند گو کو لازم ہے کہ سخن حق کو اس طرح دل خلائق میں پہنچائے جیسے کہ ہلکے ہلکے مینہ کا پانی درختوں کے رگ و ریشہ میں پہنچتا ہے - یہ نہیں کہ[1] سخن ناہموار کے ارے سے لوگوں کی دل خراشی کرے جس سے سننے والوں کا شوق جاتا رہے - اور درشت گوئی سے سامعین کی جماعت پر کلوخ اندازی نہ کرے جس سے وہ پریشان ہو جائیں - جن لوگوں کا دل پند سے تنگ نہیں ہوتا اُن کو داروے تلخ و سود مند دینی چاہیے - بعضے خوشامد طلب ہوتے ہیں لیکن شکر سے تو تپ نہیں جاتی - اگرچہ داروے تلخ ہر کوئی نہیں کھاتا لیکن اس کے کھانے والے بھی بہت ہوتے ہیں - تپ زدوں کے واسطے حلوا اچھا نہیں ہوتا ، اُن کے لیے دھنئے کا کھانا خرما سے بہتر ہوتا ہے - ان کو تلخ اگر ہنر کے ساتھ دیا جائے تو شیریں سے بہتر ہوتا ہے - چرایتا[2] شکر سے زیادہ فائدہ دیتا ہے - پس جب نصیحت تلخ کہو تو شیرینی کے ساتھ - جس جوان و پیر کو پند تلخ معلوم ہوتی ہے وہ شیریں کرنے سے دل پزیر ہو جاتی ہے - ہڑ کو دیکھو کہ وہ شہد میں پرورده کرنے سے داروے خوش گوار بن جاتی ہے -

(۴) چہارم ”تکلموا الناس علی قدر عقولهم“[3] - واعظ کو چاہیے کہ ہمیشہ مخاطب کے مرتبۂ فہم کو ملحوظ رکھے اور ادائے کلام اُس کے موافق کرے - بازاریوں اور گنواروں کی مخاطبت میں ایسے

---

۱ - اصل میں ’کہ‘ ندارد -

۲ - چرایتا : بطور دوا کام آنے والی ایک تلخ بوٹی -

۳ - یعنی لوگوں کے ساتھ ان کی سمجھ کے مطابق گفتگو کرو - مرتب

الفاظ کو استعمال نہ کرے کہ جن کے معنی جاننے میں "صراح[1]" و "قاموس" کی احتیاج ہو ۔ بلکہ مطلب کو ایسی واضح عبارت میں بیان کرے کہ خواص و عوام سب آسانی سے سمجھ لیں ۔ چوں کہ سننے والوں کا حال مختلف ہوتا ہے اور ہر ایک جدا جدا مرض قلبی میں گرفتار ہوتا ہے ، اس لیے واعظ کو چاہیے کہ ہر طرح کے سخن کی نمریب کرے اور ہر قسم کا شربت اور دوا مفید و[2] مختصر خلائق کے کام جان میں ڈالے تاکہ جو شخص مرضِ حبِ دنیا و حرصِ مال و طلبِ مرتبہ جاہ و جلال میں مبتلا ہے ، وہ اس کی بے وفائی اور انقلاب اوضاع کے بیان سے منتفع ہو ۔ اشغال لہو و لعب و ہرزہ گوئی میں جو شخص گرفتار ہے وہ عمر و زندگانی کی بے اعتباری سے واقف ہو جائے ۔ جو غرور و نخوت میں مست ہے وہ کبر و خودبینی کی مذمت اور تواضع و مروتی کے اوصاف کی تعریف سن لے ۔ خشم و غضب کی تپ جن کو چڑھتی ہے وہ حسن خلق و حلم کی مدح سے صاحب وقار ہونے کا فائدہ حاصل کریں ۔ جن کو سستی و کاہلی کا فالج ہو رہا ہے وہ چستی و چالاکی کے فائدے جان جائیں ۔ جس شخص کو اپنے مرض کا علاج کرنا منظور ہو ، وہ سخنان حق کی ادویۂ مجرب سے کر لے ۔ "خیرالکلام[3] ماقل و دل" کی رعایت کا پاس کرے کہ طول کلام سے سامعین کے دل تنگ نہ کرے ۔ نہ تو ایک مطلب کی تکرار ہو ، نہ نطویل ہو ۔ ہر طرح بات اتنی ہی کہے کہ کافی ہو ۔

---

۱ ۔ صراح و قاموس : لغات کی دو معروف کتابیں ۔ اصل میں 'صراح' کی بجائے 'صحاح' درست نہیں ہے ۔

۲ ۔ اصل میں واؤ نہیں ہے ۔

۳ ۔ بہترین گفتگو وہ ہے جو مختصر مگر مدلل ہو ۔ مرتب

۱۸ - وعظ سننے والوں کے آداب

جو لوگ مجلس وعظ میں جائیں وہ یہ دل میں خوب جانیں کہ ہماری غرض استماع مواعظ و انتفاع سخنان حق ہے - واعظ کی نیکی و بدی سے کوئی ہم کو سود و زیان نہیں - گفتار کو کردار کے مواخذے میں نہیں پکڑنا چاہیے - سخن بے عیب کو سخن گو کے عیب کے سبب سے ملامت نہیں کرنی چاہیے - جمال عروس کو زشتیِ مشاطہ سے کیا نقصان ہوتا ہے اور صدف کی بے قدری سے در شاہوار کی بہا میں کیا نقصان آتا ہے -

واعظ کو بہ منزلہ لوح یا صحیفہ کے فرض کریں اور اس کے سخنانِ دل پزیر کو یہ سمجھیں کہ اس پر تحریر ہے جس کو ہم پڑھ رہے ہیں - اس وقت سخن کی نیکی و بدی کو اپنی میزان عقل میں تولنا چاہیے ، لوح کی زشتی و زیبائی سے قطع نظر چاہیے -

وعظ کے سننے میں حرکات لغو ، قہقہہ ، بیہودہ باتیں کرنی یا آپس میں گفتگو کرنی نہیں چاہیے - کوئی حرکت ایسی نہ کرو کہ جس سے واعظ کو یہ معلوم ہو کہ تم وعظ سننے پر متوجہ نہیں ہو ، جس سے وہ وعظ کہنے میں بے شوق اور دل سرد ہو جائے - اگر کوئی مشکل مسئلے میں سوال کی ضرورت ہو تو جب تک صبر کرو کہ واعظ موعظت سے فارغ ہو -

۱۹ - پند و وعظ میں قصہ گوئی و اشعار و شطح[1] و طامات

پند و وعظ کا کام یہ ہے کہ نفس کے عیوب اور آفات کو

---

۱ - شطح :— شوخی ، بے حیائی - رنگین کا شعر ہے :

کہا میں نے کہ ملتی جا ادھر آ

تو اس شطاح نے ہاں کی نہ ہوں کی (فرہنگ آصفیہ)

طامات : لاف و گزاف ، خصوصاً وہ جو ریاکار صوفی اپنی کرامتوں کے متعلق کرتے ہیں (جامع اللغات) مرتب -

بیان کرے اور اُن سے بچنے کی تدبیریں بتائے۔ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا اور اُن کی شکر گزاری سے بندے کے قاصر ہونے کا ذکر کرے۔ دنیا کے عیب و صواب پر مطلع کرے جن سے لوگوں کے نفسوں میں صفائی و پاکیزگی پیدا ہو۔

بعض واعظ و ناصح یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ کام قصہ گوئی و شعرخوانی شطح و طامات سے خوب حاصل ہو سکتا ہے۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ قصہ گو اور بھیک مانگنے والوں کی برابر کوئی جھوٹا نہیں ہوتا۔ بعض قصوں کا سننا مفید ہوتا ہے[1]، بعض کا مضر، اگرچہ وہ سچے ہی کیوں نہ ہوں۔ اکثر قصوں میں کمی و بیشی و اختلاف کو دخل ہوتا ہے۔ غرض جو لوگ قصہ گوئی کو پند و وعظ میں ملاتے ہیں وہ سچ و جھوٹ کو ضرور ملاتے ہیں اور اس لیے وعظوں[2] کے مفید و مضر ہونے میں اختلاط ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات سچے قصوں میں بھی بڑے بڑے اکابر کی لغزشیں ایسی بیان ہوتی ہیں کہ عوام میں سے کوئی ان خواص کی نیکیوں سے قطع نظر کرکے ان لغزشوں کو اور خطاؤں پر تمسک کرکے اپنی لغزشوں کے عذرات کی تمہید قرار دے لیتا ہے کہ فلاں عالی مرتبت نے، جو مجھ سے بزرگ اور افضل تھا، یہ کام کیا تھا تو میں کیوں نہ کروں۔

بعض لوگ ایسے ہیں کہ طاعتوں کے باب میں رغبت کی حکایتیں گھڑ لینے کو صواب جانتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارا قصد ان سے خلق کو حق کی طرف (راستہ) بتلانے کا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے

---

۱ - اصل میں 'ہے' ندارد۔

۲ - اصل میں 'واعظوں' ہے۔ مرتب

کہ سچ میں بہت گنجائش ہے ، وہ کیا تھوڑا ہے کہ جھوٹ کی اختراع کی حاجت ہو -

بعض واعظ[1] مسجع و مقفیٰ عبارتیں اور اشعار پڑھتے ہیں - اور شعر بھی ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں عشق کا وصف ، معشوق کی خوب صورتی ، وصال کی راحت ، جدائی کا درد مذکور ہوتا ہے - مجلس وعظ میں زیادہ تر عوام اور اجلاف[2] ہی بھرے رہتے ہیں اور ان کے باطن شہوات سے بر ہوتے ہیں اور اُن کے دل خوب صورتی کی طرف التفات کرنے سے خالی نہیں ہوتے - بس یہ اشعار اُن کے دلوں میں اُس چیز کو اُبھارتے ہیں جو اُن میں چھپی رہتی ہے ، اس لیے شہوات کی آگ اُن میں بھڑک اُٹھتی ہے ؛ چیختے ہیں ، حال کرتے ہیں -

خلاصہ یہ ہے کہ ایسے افسانے خرابی سے خالی نہیں ہوتے - اس نظر سے بجز اُن اشعار کے جن میں نصیحت و حکمت ہو اور وہ بھی دلیل و اُنس دلانے کے طور پر مذکور ہو ، اور کسی قسم کا شعر استعمال نہیں کرنا چاہیے - ایسے اشعار کا سمجھنا خواص ہی کا کام ہے - عوام پہلی قسم کے اشعار کو سمجھتے ہیں -

قاعدہ ہے کہ سننے والا جو کچھ سنتا ہے ، اُس کو اُس چیز کی طرف ڈھال لیتا ہے جو اُس کے دل پر غالب ہوتی ہے - شطح کو اکثر صوفی مشرب واعظ گھڑا کرتے ہیں - شطح وہ کلام ہے کہ جس میں عشق الٰہی اور وصل خدا میں بڑے لمبے چوڑے ایسے دعوے ہوتے ہیں جس کے بعد اعمال ظاہری کی ضرورت نہیں رہتی - اکثر اس کے سبب سے کم فہم ، خبط و مہمل کلمات کہنے

---

۱ - اصل میں 'وعظ' ہے -

۲ - اجلاف : مردمان سفلہ و فرومایہ (غیاث) - مرتب

لگتے ہیں - کوئی اُن سے حجت کرے تو کہتے ہیں کہ یہ علم مکاشفہ ہے ، جب نورحق باطن میں ہو تو یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں -

ایک شطح تو یہ ہے ، دوسری قسم کا شطح یہ ہے کہ وہ کلمات ایسے ہوں کہ ظاہر میں تو اچھے ہوں مگر اُن کے معانی خوف ناک ہوں اور کوئی فائدہ اُن سے نہ حاصل ہو - یہ کلمات یا تو خود کہنے والے کی سمجھ میں آتے ہوں[1] ، اپنی عقل کے خبط و خیال کی پریشانی کے سبب سے کہتا ہو ، یا خود سمجھتا ہو مگر دوسرے کو نہ سمجھا سکتا ہو ، اور ایسی عبارت نہ بنا سکتا ہو جس سے اُس کا مافی‌الضمیر معلوم ہو - اس قسم کے کلام سے کچھ فائدہ نہیں ، بہ جز اس کے کہ دلوں کو پریشان اور عقلوں اور ذہنوں کو حیران کرے - یا اُس سے وہ معنی سمجھ میں آئیں جو اُس سے مقصود نہیں - اس صورت میں ہر شخص اس کو اپنی خواہش اور طبیعت کے موافق سمجھے گا - بھلا یہ امر عقل کے نزدیک کب جائز ہے کہ آدمی وہ باتیں کرے کہ جن کو خود تو سمجھتا ہو مگر سننے والے کی عقل اُس کو نہ پہنچتی ہو ، کیونکہ جو شخص حکمت نااہلوں میں بیان کرے وہ جاہل ہے اور جو حکمت کے اہل سے اُس کو روکے وہ ظالم ہے -

طامات میں وہ امور داخل ہیں جو شطح میں بیان ہوئے ، مگر ایک اور بات اس میں یہ زائد ہوتی ہے کہ ظاہری الفاظ سے جو معنی نکلتے ہوں ، وہ نہ لیں اور اُن سے امور باطنی کے معنی نکالیں کہ ذہن میں اُس کا فائدہ نہ ہوتا ہو ؛ اس سے بڑا نقصان ہوتا ہے کہ ناحق کی تاویلیں کرکے الفاظ کے ظاہری معنی بغیر ضرورت

---

۱ - اصل میں 'ہوں' ندارد -

عقلی کے چھوڑ دیں اور ایک باطنی معانی لگائیں جس سے الفاظ پر
اعتماد جاتا رہے ، جس سے کلام الٰہی کا نفع ساقط ہو جائے۔
کیوں کہ جو لفظوں سے سمجھا جاتا ہے اُس پر تو اعتماد نہ رہا ،
اور باطن سب کا ایک ہوتا نہیں ، اس لیے مختلف طور پر الفاظ کو
ڈھال سکتے ہیں ۔ اسی سبب سے بدعتیں پیدا ہوتی ہیں اور لوگوں
کو خراب کرتی ہیں ۔

۲۰ ۔ قرآن

ہر سورت اس کی دلبر و جاں فزا صورت ، ہر حرف اُس کا مغز
و نغز ، دل مجروح کی شفا ، درد دل سوز کی دوا ، دل و جان کی
راحت ، اصل ایمان ، رکن تقویٰ ، گنج معانی ، حکما کی حکمت کا
قانون ، علما کی عبادت کا معیار ، کیسا[1] جلیل جس کا سخن واضح و
واثق ، جس کی حجت لائح و لائق ، جس کی برہان میں کمال جلالت و
سطوت ، در جان کے واسطے اُس کے حروف دُرج ، چرخ دین کے
واسطے اُس کی ہر آیت برج ، جان کے لیے جنت الاعلیٰ ، عارفوں
کے لیے روضۂ اُنس ؛ اُس کے حرفوں سے زبان پر ذوق ، طریقۂ اسلام
کی شمع ، عقیدۂ عام کی خازن ، عاقلوں کی جان کی حلاوت اور
غافلوں کی زبان کی تلاوت ۔ چشم جسم اُس کے حروف کو دیکھتی
ہے اور کانوں سے اُس کی نعمت جسم کو پہنچاتی ہے ۔ چشم جان
اُس کے معنی کو دیکھتی ہے اور ہوش سے روح کو اُس کی نعمت
کھلاتی ہے ۔ نا محرموں کے واسطے اُس کے جمال پر پردہ ہائے
جلال مشک کے لگے ہوئے ہیں ۔ پردہ اور پردہ دار کب بادشاہ
سے آگاہ ہوتا ہے ، وہی بادشاہ کو جانتا ہے جو بصر رکھتا ہے ،
پردہ کیا خبر رکھتا ہے ۔ جس کو وہ اہل دیکھتا ہے ، اپنے اوپر

---

۱ ۔ غالباً 'کہ ایسا' کو 'کیسا' لکھا گیا ہے ۔ متن مطابق اصل ہے ۔ مرتب

سے نقاب اٹھا کے آسے اپنا جمال دکھا دیتا ہے ۔ حس تو صورتِ نغز ہی دیکھ سکتی ہے ، مغز جانتا ہے کہ مغز کے اندر کیا ہے ۔ حس اُس کی سورت کی صورت پڑھتی ہے مگر اس کی سیرت کی صفت کو نہیں جانتی ۔ قرآن خواں کے رو برو قرآن ایک مہمان سرائے عدن ہوتا ہے ۔ حرفوں کا نقاب اُس پر پڑا ہوتا ہے ، نا محرموں سے یوں پردے میں رہتا ہے ۔ جو خفتہ ہیں وہ اُس کی صورت کو دیکھتے ہیں ، عین روح سے بے خبر رہتے ہیں ۔ جو بیدار ہیں وہ روح کو دیکھتے ہیں ۔ قرآن کے حرف پیا دیدۂ جان سے قرآن کے اسرار کو دیکھ سکتے ہیں ۔

دنیا ایک تابستان ہے ، خلق اُس میں سرمستوں کی طرح پھرتی ہے ۔ سب بیابان غفلت میں پڑے ہیں ۔ مرگ شبان[1] ہے، خلق رمہ[2] ہے ۔ جنگل میں رنگ گرم پانی کی طرح رواں ہے ۔ اس میں قرآن قرأت کا آب سرد ہے ۔ وہ عاصیوں کو پانی پلاتا ہے ۔ حروف و قرآن کو ظرف اور آب خیال کرو ۔ تم پانی پیو، برتن کو نہ دیکھو ۔ پاک دل ہی قرآن کے اسرار پاک کو جان سکتے ہیں ۔ جیسے تمھاری جان پر لباس ہے ، ایسے ہی معنیِ قرآن پر حروف قرآن ہیں ۔ اس کے حروف زبان سے پڑھے جاتے ہیں ۔ اس کے معنی جو جان قرآن ہیں ، جان سے پڑھے جاتے ہیں ۔ حرف صدف ہے ، قرآن دُر ہے ۔ جو حُر ہیں وہ صدف کی طرف دل نہیں لگاتے ۔ زبان سے اُس کے حرف پڑھو ، دل سے معنی سمجھو ۔ آنکھ سے بید دیکھو ، دل سے طوبیٰ ۔ جب حرفوں کے پردے اٹھاؤ گے تو سرِ قرآن پاؤ گے ۔ پوست کو اتارو گے تو مغز دیکھو گے ۔ دُر اس سبب سے ہاتھ نہیں لگتا کہ صدف کے گرد پھرتے ہیں ، کف کو

---

۱ ۔ شبان : صحرا میں چوپایوں کی نگرانی کرنے والا ۔
۲ ۔ رمہ : گلۂ گوسپند ، بھیڑوں کا ریوڑ ۔ مرتب

کف میں لاتے ہیں ۔ کفوں اور نیرہ صدفوں کو چھوڑو ، دُرِ صافی قعرِ بحر میں سے نکالو ۔ گُہر بے صدف دل بنے ۔ صدف بے گوہر گِل ہے ۔ در کی قیمت صدف سے نہیں ہوتی ، تیر کی قیمت ہدف سے ہوتی ہے ۔ جو شخص دریا کے کنارے پر بیٹھا ہے ، اُس کے ہاتھ لولوء لالا کب آتا ہے ۔ قرآن کی سطر تو شطر[1] ایمان ہے ۔ اس سے دل و جان کو راحت ہوتی ہے ۔ اُس کے قعر میں دُر و گہر ہیں ، اُس کے ساحل پر عود و عنبر ہیں ۔ ظاہر و باطن دونوں کے لیے نعمتیں موجود ہیں ۔ پاک ہو تو پنجرۂ حروف سے معانی تمھارے لیے باہر آئیں گے ۔ جب تک تم دنیا کی ناپاک آلایشوں سے دل پاک نہ کرو گے ، حروف قرآن سے معانی تمھارے پاس نہیں آئیں گے ۔ حروف قرآن سے دل بہتر نہیں ہوتا ۔ مکری میں میں کرنے سے فربہ نہیں ہوتی ۔ پیاسا خواب میں آب دیکھنے سے سیر نہیں ہوتا ۔ جب تک آدمی قلم و سیاہی کو دیکھتا ہے ، وہ چہرے اور نقاب میں تمیز نہیں کرتا ۔ رنگ و بوے سخن کبھی جان سخن نہیں ہو سکتا ۔ اس میں نکتے سخت باریک ہیں ، ان کو دل و جان سے پڑھ تاکہ دُر و گوہرِ یقین اور کیمیاے دین حاصل ہو ۔ سِرّ ربانی اور امر روحانی پر تجھے علم ہو ۔ وہ نقاب سیاہ سے اپنا رو ، مہر و ماہ کی طرح تجھے دکھلائیں ۔ تو کبھی قرآن کو سرود بناتا ہے ، کبھی اُس کو سلاح جدل بناتا ہے ۔ اس کے واسطے اپنے قیاس سے تاویل کرتا ہے ، کبھی اُس کے حکم کی تحویل ۔ کبھی اپنے لیے اُس کی تفسیر کرتا ہے ، اپنے عام کے موافق تقریر کرتا ہے ۔ سپاروں کے صندوق کے گرد لوگوں کی سرزنش کے لیے تو پھرتا ہے ۔ کبھی رفیق جاہل اور کاہل کو کہتا ہے

---

۱ - شطر : بمعنی نصفے ہر شے و بمعنی جانب و طرف ۔ (غیاث)

کہ تجھے قرآن کا تعویذ لکھ دیتا ہوں ، تو اس کو پلید نہ کیجیو ، پاک رکھیو ، اس کے واسطے کچھ میرے لیے ہدیہ لا ؛ مرغ سیاہ کا خون چاہیے - یہ سب حیلے ایک دو درم کے واسطے کیے جاتے ہیں کہ جس سے شکم صبح دا شام کو طعام سے پر ہو - تجھے اس کام سے شرم آئے یا عقل یا اجل تیرے پاس آئے -

شب و روز فریاد کے ساتھ پڑھتے ہو لیکن اس کے ایک حرف کے صدق کی داد نہیں دیتے ہو - عقل و جان کو اس کے حوالے نہیں کرتے - کبھی اسے ہوا و حرص کی تیغ سے خستہ کرتے ہو ، کبھی ہوائے نفسانی کے دام میں پھنساتے ہو - کبھی گھر میں بصد ناز ، کبھی بازار میں بھرنماز قوال کی طرح اسے گاتے ہو اور اس کو اپنا اعجاز جانتے ہو - مگر قرآن کی لذت اور حلاوت زبان سے فقط نہیں حاصل ہو سکتی ، جب تک اس کے ساتھ دل و جان نہ شریک ہوں -

وہ تجھ کو تمام جہان کا اندر اور باہر اور خشک و تر بتلاتا ہے ؛ جو حکم محکوم خدا ہیں ، وہ تجھے اس سے معلوم ہوتے ہیں - تمام صفات خدا وہ تجھے سنواتا ہے ، صدق کی قصہ سرائی کرتا ہے - جس وقت مستمع اس کے کلام کو سنتا ہے تو سارے بال بدن پر کھڑے ہوتے ہیں - مگر اس کی سورۂ اخلاص پڑھنے کے واسطے دیدۂ اخلاص چاہیے - قول باری باری سے سن ، صنعت قاریؑ کو اس کا حجاب نہ بنا - تو اس کے حرفوں کو نہیں بلکہ معنی کو دل سے طلب کر - راہ دین کوئی صنعت و عبارت اور نحو و تصریف و استعارت کا نام نہیں ہے - تو اس کے احکام پر خیال کر ، نام پر نہیں - جو مرد دانا ہے جان سے اس کا سماع کرتا ہے ، حرف و صوت کو وداع کرتا ہے - جان اپنا حظ اس سے اٹھاتی ہے ، اپنے سب کام نکالتی ہے - جو مجلسوں میں اس کی

بانگ لگاتے ہیں وہ دو دانگ کے لیے - وہ ایک آئینۂ روشن سامنے رکھا ہے مگر افسوس ہے کہ رعنائی جو انسان کی طبیعت ہے ، وہ اس آئینے کی پردہ بنتی ہے - روغن میں نور صفائی ہے مگر جب اس میں پانی مل جاتا ہے تو اس نم بیگانہ سے چراغ میں چک چک کی بانگ نکلتی ہے - بس ایسے ہی جن صاف دلوں میں کدورت ہوتی ہے ، وہی اس میں خچ خچ کرتے ہیں ؛ ورنہ اس کا کاغذ جو حرفوں سے سیاہ ہے ، دلِ تیرہ کو ماہ بناتا ہے -

۲۱ - آدابِ مناظرہ

کسی امر میں اس نظر سے مباحثہ کرنا کہ امرِ حق کھل جائے ، مناظرہ کہلاتا ہے - امرِ حق کا مطلوب ہونا اور اس پر فکر کرنے میں ایک شخص کا دوسرے کی تائید کرنا اور بہت سی رایوں کا متفق ہونا نہایت مفید ہوتا ہے - اس طور کے مناظرے سے بہت فائدے ہوتے ہیں[1] ، جس کے آداب یہ ہیں :

اول مناظرہ کرنے والوں کا امرِ حق میں ایسا حال ہو جیسے کوئی کھوئی چیز کو ڈھونڈھے کہ اس بات کی تمیز نہ کرے کہ وہ میرے ہاتھ سے ملے یا دوسرے کے ہاتھ سے - بحث کرنے میں طرفِ ثانی کو اپنا مددگار جانے ، مقابل و خصم نہ سمجھے - اگر وہ اس کی غلطی پر آگاہ کر دے یا حق بات بتا دے تو اس کا شکر گزار اور ممنون ہووے ، جس طرح کہ گم شدہ چیز کی تلاش میں اگر ایک رستہ چلتا ہو اور دوسرا شخص اس کو وہ چیز دوسری سڑک پر بتا دے تو یہ شخص دوسرے شخص کا شکریہ ادا کرتا ہے ، اس کی وہ برائی نہیں کرتا ؛ اس سے وہ خوش ہوتا ہے ، اس کو برا نہیں جانتا -

---

۱ - اصل میں 'ہیں' ندارد - مرتب

دوم خلوت اور تنہائی میں مناظرہ کرنا اچھا ہوتا ہے
بہ نسبت محفلوں اور امراء و[1] حکام کے سامنے ہونے کے ، اس لیے کہ[2]
خلوت میں ہمت مجتمع اور ذہن و فکر صاف رہتے ہیں اور حق کو
جلد سمجھتے ہیں۔ اور لوگوں کے سامنے نمود کے لوازم ابھر کھڑے
ہوتے ہیں اور ہر کسی کو فریقین میں سے یہی حرص ہوتی ہے کہ
میں ہی ور رہوں ؛ اس کی پروا نہیں ہوتی کہ حق پر ہوں یا باطل
پر ۔ اکثر مناظرہ کرنے والے محفلوں اور مجمعوں میں بحث کرنے
پر زیادہ حریص ہوتے ہیں اور وہ تنہائی میں کچھ تقریر نہیں
کرتے ۔ مگر کوئی رئیس ہو یا مجمع ہو تو پھر کوئی دقیقہ باقی
نہیں رکھتا تاکہ گفتگو میں بڑا مقرر معلوم ہو ۔

تیسرا حق کے لیے تعصب میں مبالغہ نہ کرے اور مخالفین
کو بہ چشم حقارت نہ دیکھے ، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ مخالفین
بھی مکافات اور مقابلے پر آمادہ ہوتے ہیں اور باطل کی مدد زیادہ
کرتے ہیں۔ اور جس چیز کا الزام ان پر لگایا جاتا ہے اس کو خوب
مضبوطی سے تمسک کرتے ہیں ۔ اگر یہ حضرات اعلیٰ برائے محبت اور خیر خواہی سے[3] ان کو خلوت میں نصیحت کرتے
اور تعصب اور حقارت کے موقع سے قطع نظر کرتے تو غالباً
کامیاب ہوتے ۔

چوتھا جو امور پہلے مناظروں میں طے ہو چکے ہیں ان میں
مناظرہ کرنا [illegible] ہے ، بلکہ جو نئی باتیں پیش آئیں ان میں
مباحثہ کرنا چاہیے اور اس حق میں کلام مختصر کر کے جلد مطلوب
پر پہنچ جانا چاہیے ۔ یہ نہیں کہ تقریر کو طول دیا جائے

---

۱ - اصل میں واؤ ندارد ۔
۲ - اصل میں 'کہنے' [illegible]
۳ - اصل میں 'کے' ہے ۔ مرتب

پانچواں مناظرے کا شریک اگر ایک دلیل سے[1] دوسرے کی طرف آئے یا ایک اعتراض سے دوسرے پر بدلنا چاہے تو اُس کو روکنا نہیں چاہیے ۔ مثلاً اِس کہنے سے کیا حاصل کہ اس بات کا ذکر مجھ پر لازم نہیں اور یہ امر تمھاری پہلی تقریر کے خلاف ہے اس لیے نہیں مانا جائے گا ۔ ایک کو دوسرے کی بات کاٹنی نہیں چاہیے ، لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہیے ۔ سوال جوابوں میں شور و غل نہ مچانا چاہیے ۔ آپس میں سوائے مقابل شخص کے عاجز کرنے کے[2] کوئی بات پیش نظر نہیں ہوتی ۔ مناظرے میں امر حق کی طرف رجوع کرنی چاہیے اور باطل کے برخلاف ہو کر امرِحق کو قبول کرنا چاہیے ۔

چھٹا ، مناظرے میں ان باتوں کو آفت جانے کہ وہ اس غرض کے لیے ہو کہ اپنا غالب ہونا اور دوسرے کا ساکت کرنا ، اپنے فضل و شرف کا اظہار اور لوگوں میں اپنی فصاحت اور خوش تقریری اور فخر کو دکھلانا اور لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنا اس سے منظور ہو ۔ ایسی صورت میں جتنی عادتیں مذموم ہیں ، ان سب کا منبع مناظرہ بن جاتا ہے ۔ جیسے آدمی شراب پی کر نشے میں ساری برائیوں کو کرنے لگتا ہے ، ایسے ہی جس شخص کو دوسرے کے ساکت کرنے اور اپنے غلبے اور فخر کی طلب غالب ہوتی ہے ، سارے خباثت کے کاموں کے کرنے سے پرہیز نہیں کرتا ۔ ساری مخفی خباثتوں کا ہیجان اس کے دل میں ہو جاتا ہے ۔ ایسے مناظرے میں جو بد عادتیں اُبھرتی[3] ہیں اُن میں اول حسد ہے جس کی نسبت حدیث ہے کہ ”حسد نیکیوں کو ایسا

---

۱ ۔ اصل میں ’سے‘ ندارد ۔
۲ ۔ اصل میں ’کی‘ ہے ۔
۳ ۔ اصل میں ’ابھرنے‘ ہے ۔ مرتب

کھاتی ہے جیسے آگ لکڑی کو چاٹ جاتی ہے۔" ایسا مناظرہ کرنے والا حسد سے خالی نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ کبھی غالب ہوتا ہے اور کبھی مغلوب، اور بعض اوقات اس کے کلام کی تعریف ہوتی ہے اور بعض اوقات غیر کے کلام کی۔ تو جب تک دنیا میں ایک بھی ایسا شخص ہوگا جو قوت علمی اور مناظرے میں معروف ہو، یا مناظرہ کرنے والے کے گمان میں مناظرے اور کلام میں اس سے[1] بہتر اور قوی ہو تو بالضرور اس سے[2] حسد کرے گا اور اس کی اس نعمت خدا داد کا زوال چاہے گا۔ اور یہ پسند کرے گا کہ لوگوں کے دل اس سے پھر کر میری طرف ہو جاویں۔

حسد ایک جلتی آگ ہے۔ جو اس میں مبتلا ہوتا ہے وہ دنیا میں عذاب الیم میں رہتا ہے۔ ایسے مناظرہ کرنے والے کو یہ سمجھو کہ وہ ریوڑوں کے بکرے ہیں جو آپس میں لڑتے ہیں۔ یہ مناظرہ کرنے والے اپنے اقران اور ہم سروں پر تکبر کرتے ہیں اور بڑائی ڈھونڈتے اور اپنی لیاقت سے بڑھ کر جگہ پانے کے خیال سے خالی نہیں رہتے۔ جب ان کو مقام صدر میں جگہ نہ ملے تو وہ اس پر بحث و تکرار کو موجود ہو جاتے ہیں۔ اور جو ان میں مکار فریبی ہوتے ہیں وہ اس بات کے لیے یہ بہانہ بناتے ہیں کہ ہم کو علم کی عزت کی حفاظت منظور ہے۔ پس اس بہانے سے وہ تواضع کی صفت کو ذلت بنا دیتا ہے۔

کینہ بھی اس کے دل میں ہوتا ہے۔ جو اس کی تحریر و تقریر کو ناپسند کرتا ہے تو اس کی کم توجہی کے سبب سے

۱۔ اصل میں 'اسے' ہے۔
۲۔ اصل میں 'کے' ہے۔ مرتب

اُس کی طرف سے کینہ عمر بھر سینے میں جم جاتا ہے ۔ پھر وہ غیبت بھی کرنے لگتا ہے ۔ اپنی طرفِ مقابل کے کلام کی نقل کرکے اُس کی برائی کیا کرتا ہے ۔ اُس کے سچے بیانوں کو اُلٹ پھیر کرکے جھوٹ بنا دیتا ہے ، بہتان لگاتا ہے ۔ غرض جو شخص اُس کی طرفِ مقابل کے کلام سنے اور اُس کی طرف متوجہ ہو تو یہ اُس کی ہتک کے درپے ہوتا ہے ۔ اُس کو جاہل ، احمق ، کم فہم کہتا ہے اور سب سے بڑا عیب جو اپنے نفس کی تعریف کرنے کا ہے وہ پیدا ہوتا ہے ۔ ایسا مناظرہ کرے والا اپنے نفس کی تعریف کے جوش میں بھرتا ہے کہ مناظرے میں کہہ بیٹھتا ہے کہ میں اس علم میں طاق ہوں ۔ اس کے اسرار مجھ سے مخفی نہیں ۔ جن باتوں کو تم نہیں جانتے وہ میرے ناخنوں میں بھری پڑی ہیں ۔ غرض ایسی باتیں کبھی شیخی کے طور پر اور کبھی اپنے کلام کے رواج دینے کی ضرورت سے کہا کرتا ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ شیخی و لاف زنی عقلاً و شرعاً ممنوع ہے ۔ اپنے ہمسروں کی لغزشیں اور طرفِ مقابل کے عیب ڈھونڈتا رہتا ہے ، بر سر مجلس ان کا اعلان کرتا رہتا ہے ۔ اگر کوئی طرفِ مقابل کی صورت میں عیب ہوتا ہے تو ظاہر کرتا ہے ۔ اگر پھکڑباز ہے تو کھلا کھلی اور علانیہ اُس کے عیب کے جتانے سے باز نہیں رہتا ۔ وہ اپنے ہمسروں اور فضل کے شریکوں سے ایسی عداوت رکھتا ہے جیسے دو سوکنوں میں ہوتی ہے ؛ جیسے ایک سوکن دوسری کو دیکھ کر کانپ اُٹھتی ہے اور زرد پڑ جاتی ، اسی طرح مناظرہ کرنے والا جب دوسروں کو دیکھتا ہے ، اُس کا رنگ بدل جاتا ہے اور فکر میں پریشانی آ جاتی ہے ؛ گویا بھوت سامنے آ گیا یا کوئی درندہ مقابل ہوگیا ۔

غرض ان قوموں میں وہ محبتِ قلبی کہاں جو اپنے ہم سر

علاؤں میں ہونی چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں اور رنج و راحت میں شریک ہوں ۔ اہل فضل و عقل میں علم ایک قرابت قریبہ ہوتی ہے ۔ وہ ان میں نہیں ہوتی ، بلکہ علم ان کا عداوتِ قطعی کا سبب ہوتا ہے ۔

بعض مناظرہ کرنے والے منافقانہ طرفِ ثانی یا ان کے دوستوں اور پیروؤں سے ملتے ہیں ۔ ناچار زبان سے ان کی دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور شوق جتاتے ہیں اور اُن کے رتبے کے قائل ہوتے ہیں ، حالاں کہ کہنے والا اور مخاطب اور جو کوئی غیر اُن کی باتیں سنتا ہے ، وہ جانتے ہیں کہ یہ سب جھوٹ اور مکر اور نفاق اور بدکاری ہے کہ ظاہر میں زبان سے دوست ہیں اور دل سے دشمن ۔ سب سے بری بات اُس کو یہ معلوم ہوتی ہے کہ طرفِ ثانی کی زبان سے امر حق ظاہر ہو ۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو جتنا اس سے ہو سکتا ہے اُس کی دفع کے لیے بک بک اور مکر و فریب و حیلہ کرتا ہے ۔ پھر امر حق میں جھگڑا کرنا اُس کی جبلی عادت ہو جاتی ہے ۔ جس وقت کوئی کلام اُس کے کان میں پڑتا ہے ، اس وقت سے طبیعت کو اعتراض کرنے پر متوجہ کرتا ہے ۔

بعض دفعہ تو سب برائیوں کا مجموعہ اس مناظرے میں ظہور میں آتا ہے کہ ہشت مُشت ، دھول دھپے ، لات مکے ، کپڑے پھاڑنے ، ڈاڑھی پکڑنے ، ماں باپ ، اُستادوں کو برا کہنے اور مغلظہ گالیاں دینے کی نوبت پہنچتی ہے ۔ اس طرح کے لوگ زمرۂ انسانیت سے خارج ہیں ۔ جو لوگ عاقل اور بزرگ ہیں اُن میں یہ عیب نہیں ہوتے ۔

علاوہ ان بد عادتوں کے جو اصل ہوتی ہیں ، اُن کی یہ فروع اور نکلتی ہیں کہ ناک بھوں چڑھانی ، گردن کی رگیں پھلانی ، منہ سے جھاگ اُڑنے ، غصے ہونا ، دشمنی و طمع ، جاہ و مال کی

طلب کی محبت ، اپنے غلبے اور مباہات سے خوش ہونا ، اترانا ، تونگروں اور حکام کی تعظیم ، اُن کے پاس آنا جانا ، ظاہری آرایش کا ساز و سامان بہم پہنچانا اور فخر و تکبر سے لوگوں کو حقیر جاننا ، بے فائدہ امور میں خوض کرنا ، کلام بہت کرنا ، عبارت مقفیٰ و مسجع بولنا ، نادر باتوں کا یاد کرنا ۔ غرض وہ باتیں کرنی جو امر حق کے لیے کچھ بکار آمد نہ ہوں ، فقط ان کی نمود کی تائید کریں ۔

جو اہل دین و یقین ہیں ، وہ مناظرات و مباحثاتِ علمی میں تحقیقِ حق اور حلِ مشکلات کے سوائے کسی اور بات کو منظور نہیں رکھتے تاکہ اس سے ان کو ثواب و فضیلت حاصل ہو ۔ اور یہ بات بغیر اس صورت کے نہیں حاصل ہو سکتی کہ یارانے کے طور پر آپس میں بیٹھیں ، دوستانہ آپس میں ایک دوسرے کی گلستان دانش سے افادات کے پھول چنیں ، شور شر کو اپنی مجلس سے دور کریں ، سینہ صاف ہو کر آپس میں اتفاق کریں ، خاطرِ پاک کو طرفین شگفتگی اور خوش مزاجی سے خوش کریں ۔ تحقیق کے بادۂ بے دُرد کو شیشۂ اندیشہ سے حسنِ بیان کے قدح میں ڈال کر ہوش مندانہ پئیں ۔ جن سوالات سے غرض ہو ، اُن کے جواب دیں اور جو اغراض فتنہ انگیز ہوں اُن کو برطرف کریں ۔ دونوں مل کر رشتہاے فکر کا فتیلہ بنائیں ۔ توفیق کے روغن سے اور نورِ بصیرت کے شعلے سے چراغ پُر ضیاء اس ظلمت میں روشن کریں جس میں وہ گم ہو رہے ہیں ۔ مگر یہ کام آزاد نژادوں کا ہے کہ اپنی خودی اور انانیت سے ہاتھ اُٹھائیں ، دین کے پانے کے واسطے چراغ یقین روشن کریں ۔ متاع نجات کے خریدنے کے لیے سرمایۂ دانش جمع کریں ۔ اپنے تئیں سوختہ بنا کر سخن حق کی جو آتش بطلان سوز ہے ، اُس تک پہنچیں ۔ ایسے

آدمی کم یاب ہیں جن میں یہ صفتِ خداپسند پائی جائے۔

اکثر آدمی ایسے ہیں کہ کتب علم سے "علَم مباہات بلند کرنا اور کوسِ فضیلت بجانا ان کا مقصد اعظم ہوتا ہے۔ علم و فضل کی تحصیل سے یہ منظور ہوتا ہے کہ شہروں میں شہرہ ہو اور زمانے میں یکتا و یگانہ مشہور ہوں۔ ایسے مبتدی اپنے تئیں منتہی سمجھتے ہیں، اوروں کو اپنے آگے ہیچ جانتے ہیں، سوائے خود بینی کے اُن کی آنکھیں کچھ اور دیکھتی[1] نہیں۔ تیغ زبان ان کی سوائے اپنے ہم چشموں پر غلبہ حاصل کرنے کے اور کچھ نہیں کرتی۔ جب کوئی ان کے قول کو رد کرتا ہے تو اپنی جگہ سے اچھل پڑتے ہیں۔ پہلے دونوں میں کچھ باتیں ہوتی ہیں، پھر دونوں آپس میں جب جاتے ہیں۔ امر متنازعہ فیہ کو چھوڑ۔ کر نرم نرم باتوں سے درشت کلامی ہوتی ہے، پھر رفتہ رفتہ مجلسِ علم جوتی پیزار کے کار زار کا میدان ہو جاتا ہے اور طعن و تشنع کے تیر چلنے لگتے ہیں اور لعنت ملامت کے نیزے ایک دوسرے کو خاک ذلت پر گراتے ہیں۔ کبھی تلواروں سے چہرے بھی سرخ ہو جاتے ہیں۔ متعصب[2] و حماقت کیش، طرفین کی طرف داری کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دست بازی و زبان درازی ان میں ہونے لگتی ہے۔ خاص و عام دور سے اُن کا تماشا دیکھتے ہیں۔ اُن کے اطوارِ ناہنجار پر تعجب کرتے ہیں اور ہنستے ہیں۔ پس جہاں یہ نفسانیت کا تلاطم ہو، وہاں گوہرِ حق کب مل سکتا ہے۔

۱۔ اصل میں 'دیکھتے' ہے۔

۲۔ اصل میں 'تعصب' ہے۔ مرتب

در مبحث علم تند خوئی چه کنی
جنگ و جدل و درشت گوئی چه کنی
این مجلس درس است نه میدان قتال
این حق جوئی است جنگ جوئی چه کنی

۲۲ - راگ و رقص و سماع و وجد

به از روے زیباست آواز خوش
که این حظ نفس است آن قوت روح

انسان کے پانچ حواس ہیں اور ایک عقل ہے - ہر حاسے کا ایک ادراک ہے اور جو چیزیں اس سے مدرک ہوتی ہیں اُن میں سے بعض تو اس کو اچھی معلوم ہوتی ہیں ، بعض بری ؛ مثلاً قوت باصرہ کے حاسے کو سبزہ اور آب رواں اور خوبصورت صورتوں اور رنگوں کے دیکھنے سے لذت خاص ہوتی ہے ، بری صورتوں اور رنگوں کے دیکھنے سے نفرت - قوت شامہ کے حاسے کو خوشبوؤں سے لذت اور بدبوؤں سے نفرت ہوتی ہے - قوت ذائقہ کو لذیذ ، روغنی ، شیریں ، کھٹی ، چٹپٹی چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں تلخ ، بدمزہ ، کسیلی[1] بری معلوم ہوتی ہیں - حاسۂ لمس کو نرمی ، چکناہٹ ، ہم واری اچھی لگتی ہے ؛ ناہمواری ، درشتی بری معلوم ہوتی ہیں - عقل کو علم و معرفت سے لذت ہے اور جہالت و بلادت سے نفرت -

پس یہی حال حاسۂ سمع کا ہے کہ بعض آوازیں اُس کو لذیذ معلوم ہوتی ہیں جیسے بلبلوں کے چہچہے ، عمدہ باجوں کی آوازیں - آواز کریہہ بری معلوم ہوتی ہیں جیسے گدھے کی آواز -

اب خوش آوازی کے ساتھ موزونی بھی ہو - اس موزونیِ آواز

---

۱ - 'کسیلی' کے بعد 'میٹھی' بے موقع تھا جسے حذف کر دیا گیا - مرتب

کے تین مخارج ہیں ؛ ایک وہ جو جماد سے نکلیں ؛ جیسے تاروں کی آواز ، بانسری کی آوازیں ، لکڑی کی گتیں ، ڈھولکی کی آواز ۔ دوسرے وہ کہ انسان کے گلے سے نکلیں ۔ تیسرے وہ کہ حیوان کے گلے سے نکلیں ، جیسے بلبل جو سبزہ و گل پر نغمہ سرائی کرتے ہیں اور قمری سروِ سہی پر زمزمہ سازی ، فاختہ چنبروف[1] گلے میں ڈالے ہوئے نوا سنجی کرتی ہے۔ اور ایسی ہی خوش الحان و نغمہ خوان جانوروں کی آوازیں کہ اچھی بھی ہوتی ہیں اور موزوں بھی ۔ اُن کا آغاز و انجام متناسب ہوتا ہے اور اسی سبب سے ان کا سننا اچھا معلوم ہوتا ہے ۔

آوازوں میں اصلی حیوانات کے گلے ہیں کہ مزامیر کو اُنھیں کے مشابہ بنا لیا ہے تا کہ خلقت کے مطابق صنعت ہوجائے ۔ جتنی چیزیں کہ کاری گروں نے ایجاد کی ہیں ، کوئی ایسی نہیں جس کی مثال خدا تعالیٰ کی مخلوق میں نہ ہو ۔ اول مبدء فیاض نے اس کو اختراع فرمایا ، پھر اس سے کاری‌گروں نے سیکھ کر خالق کا اقتدا کیا ۔

اس آوازِ موزوں کا نام راگ ہے جس کو غذائے روح کہتے ہیں ۔ جیسے لوہے اور پتھر میں آگ مخفی رہتی ہے یا جیسے کہ پانی کے نیچے زمین چھپی رہتی ہے ، اسی طرح دلوں کے اور باطن کے جواہر اور اسرار ان میں پوشیدہ ہیں اور ان کے اظہار کی تدبیر راگ سے بہتر کوئی نہیں ۔ دلوں کی طرف راستہ بجز کان کے معدوم ہے ۔ لذیذ و موزوں نغمات کوئی چیز دل میں نہیں پیدا کرتے بلکہ جو دل میں پہلے سے بھرا ہوتا ہے اُس کو اُبھارتے ہیں ۔ دل کا حال برتن کا سا ہے ۔ جب چھلکاؤ گے تو وہی نکلے گا جو اُس

---

۱ ۔ چنبروف : ایک قسم کا ساز ۔

میں بھرا ہے ۔ اسی طرح راگ بھی دلوں کے حق میں سچی کسوٹی ہے ۔ جب اس سے دلوں کو حرکت ہوگی تو اُن سے وہی باتیں ظاہر ہوں گی جو اُن پر غالب ہیں ۔

خدا تعالیٰ نے موزوں نغموں اور روحوں کے درمیان مناسبت رکھی ہے ۔ وہ ارواح میں عجب تاثیر کرتی ہیں ۔ بعض نغمات سے سر درد ہوتا ہے ، بعض سے غم ، کسی سے نیند آتی ہے ، کسی سے ہنسی ؛ کسی میں یہ اثر ہے کہ اپنی موزونیت سے حرکتیں ہاتھ اور پاؤں اور سر وغیرہ میں پیدا کر دیتا ہے ۔ یہ بات اس پر موقوف نہیں کہ جو چیز گائی جائے وہ سمجھ میں آ جائے ۔ بچوں کو دیکھ لو کہ خوش آوازی سے لوری سن کر رونا چھوڑ دیتے ہیں اور چپکے سے سو رہتے ہیں ۔ اونٹ باوجود غبی ہونے کے حُدی[1] سے ایسا اثر پاتا ہے کہ بھاری بھاری بوجھ اس کے سبب سے ہلکے ہو جاتے ہیں اور شدتِ نشاط میں بڑی مسافت کو تھوڑا سمجھتا ہے اور حُدی کا نشہ اس کو ایسا مست کرتا ہے کہ بڑے بیابانوں میں جب بوجھ اور محمل سے تھکتا ہے تو جہاں آوازِ حُدی سنتا ہے ، اس کی طرف گردن بڑھاتا ہے اور اس کی طرف کان لگاتا ہے اور جلد چلتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ راگ کی تاثیر دلوں میں محسوس ہوتی ہے ۔ اور جس شخص کے دل کو اس راگ سے حرکت نہ ہو تو وہ ناقص ہے اور اعتدال سے ہٹا ہوا ہے اور روحانیت سے دور ، اور اونٹوں اور پرندوں و بہائم سے کثیف تر ہے ، اس لیے کہ موزوں نغموں سے سب کو اثر ہوتا ہے ۔

---

۱ ۔ حُدی : اونٹوں کو ہنکانے کے لیے شتربانوں کی مخصوص آواز ۔ عرب میں اس کا زیادہ رواج تھا ۔ مرتب

شیخ سعدی یہ فرماتے ہیں ۔ شعر

اشتر بشعر عرب در حالت است و طرب
گر ذوق نیست ترا کژ طبع جانوری

غرض کلمات مقفیٰ اور موزوں کا گانا پانچ موقعوں پر خاص غرضوں کے لیے دستور پڑ گیا ہے جن سے دل میں اثر ہوا کرتا ہے۔

اول عبادت میں جیسا کہ مندروں اور گرجاؤں میں دیکھتے ہو ، اکثر بھجن اور ایسے مضامین گائے جاتے ہیں کہ جس سے خدا کی محبت کا شوق دل میں زیادہ ہوتا ہے ۔ باجوں کی آواز دل پر ان الفاظ کی تاثیر کو اور زیادہ کر دیتی ہے ۔ غرض یہ راگ ہی بعض آدمیوں کو شوق عبادت دلاتا ہے اور مندروں اور گرجاؤں میں لے جاتا ہے ۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر وہ لوگ بھی نہ جائیں ۔

دوم میدان جنگ میں سپاہیوں کو شجاعت پر آمادہ کرتا ہے ، دلیری پر اقدام ۔ خوش آوازی دل میں جوش جوانی بھی پیدا کرتی اور لڑنے میں سرور پیدا کرتی ہے ۔

سوم غم کرنے کے لیے نوحے کی آواز ، جیسے محرم میں مرثیے سنتے ہو کہ مرثیہ خوانوں کی خوش آوازی اور مرثیوں کے مضامین کی غم انگیزی کیسا مجالس عزا میں آدمیوں کو رلاتے اور تڑپاتے ہیں ۔

چہارم خوشی کے اوقات میں سرور کی تاکید کے لیے ؛ جیسے تم شادی بیاہوں میں دیکھتے ہو کہ ناچ گانے سے بہت سرور و نشاط زیادہ ہو جاتا ہے ۔ یاران جلسہ جب جمع ہوتے ہیں اور اس میں گانا ہوتا ہے تو دل کو بہت سرور ہوتا ہے اور صحبت کا لطف زیادہ ہو جاتا ہے ۔

پنجم عرسوں اور صوفیوں کی مجلسوں میں جس سے عاشقان الٰہی کا شوق دوبالا ہوتا ہے اور ان کا نفس تسکین پاتا ہے ۔ آں کے

عشق و طبیعت کو پختہ کرتا ہے اور اُن کے دل پر کام چقماق کا
کرتا ہے کہ اُن کی آتش شوق مشتعل ہوتی ہے اور اس سے ایک
حالت ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے جس سے وہ بے خود ہو کر
وجد کرنے لگتے ہیں ۔

غرض روحیں نغمات کی مسخر ہیں اور اُن کے اثر سے شوق ،
خوشی ، غم ، انبساط ، انقباض کی کیفیتیں دلوں میں پیدا ہوتی ہیں ۔

راگ میں فی نفسہ کوئی برائی نہیں مگر بعض عوارض ایسے
ہیں کہ جن سے دل پر اس رقص و سرود کے سبب برے اثر پیدا
ہوتے ہیں ۔ اُس کے گانے والی عورتیں بدکار ہوتی ہیں کہ اُن کی
خوش آوازی اور خوبصورتی ، پھر اُس کے ساتھ ادا و انداز عشق
بہیمی کا متحرک ہوتا ہے ۔ اُس عشق سے طلب وصال مراد ہوتی
ہے جس کے معنی اجسام ظاہری کے ملنے کے ہیں ۔ پس ایسے راگ
سے اجتناب چاہیے ۔

دوم جو چیزیں گائی جاتی ہیں ، ان میں فحش و بیہودگی و ہجو
اور جھوٹ ہوتا ہے ؛ جیسے کہ ہزاروں غزلیں اور گیت ہوتے ہیں ۔
اشعار میں عورتوں کے اعضا و خط و خال و چشم و گوش و رخسار
و قد و سراپا کی تعریفیں ہوتی ہیں ۔ سننے والے ان اوصاف کو طرح
طرح سے اپنے خیال کے موافق ڈھال لیتے ہیں ۔ کوئی لفظ ایسا
نہیں جس کو استعارے کے طور پر بہت سے معانی پر نہ ڈھال سکیں ؛
مثلاً دل جس پر عشق الٰہی غالب ہوگا وہ تو زلفوں کی سیاہی سے
کفر کی تاریکی خیال کرتا ہے ، سفیدی و تازگیِ رخسار سے
نورِ ایمانی ، اور وصال کے ذکر سے دیدار الٰہی ، اور فراق کے مضمون
سے اُس کی جناب سے مردود ہونا ۔ وصال میں رقیب کے مخل ہونے
سے دنیا کے طرائق و آفات ، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وصال دائمی میں
خلل انداز ہوتے ہیں ، سمجھتے ہیں ۔ ایسے معانی ڈھالنے میں ان کو فکر

و تامل کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ جو باتیں کہ ان کے دل پر غالب ہوتی ہیں ، وہ جھٹ پٹ سمجھ میں آ جاتی ہیں ۔

سوم یہ کہ سننے والے میں خرابی ہو ، یعنی شہوت غالب ہو اور جوانی کی عین بہار ۔ راگ کے سننے سے اس کے دل میں ایک شخص معین کی محبت غالب ہو جائے گی ۔ جب وہ وصف زلف و رخسار کا اور فراق و وصال کا بیان سنے گا تو اس کی شہوت جنبش کرے گی اور ان الفاظ کو کسی معین صورت پر ڈھالے گا ، جس سے ایک آگ اس کے اندر سلگ جائے گی جو اس کو شر میں ڈالے گی ۔ ایسے راگوں سے آدمی کو چاہیے کہ وہ اجتناب کرے جو اس کو انسان سے حیوان بنا دے اور ان کی ہوائے نفسانی کے ہتھیاروں کو تیز کردے ۔

جب راگ سے لذت اور یہ لہو و لعب مقصود نہ ہو، جس سے دل کو آرام ملتا ہے اور رنج کا علاج کرکے راحت پہنچاتا ہے ، تو اس میں تھوڑا سا مصروف رہنا چاہیے ، باقی اوقات میں دین دنیا کے کاموں میں جد و جہد کرنی چاہیے ۔ بہت سی محنت میں تھوڑا سا کھیل ایسا ہوگا جیسا کہ رخسار پر تل ، ہرچند کہ کالا ہوتا ہے مگر اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ مگر گالوں پر بالکل تل ہوں کہ تل رکھنے کی جگہ نہ ملے تو گال نہایت بدصورت ہو جائیں گے ، اور جو چیز کہ حسانت کی تھی وہی کثرت کے سبب سے کراہیت کی ہو جائے گی ۔ تھوڑی چیز جو اچھی ہو ، یہ ضرور نہیں کہ وہ بہت ہو کر بھی اچھی ہو ، بلکہ وہ کثرت کے باعث کراہیت اور حرمت کو پہنچ جاتی ہے ۔ روٹی اچھی ہے ؛ اگر بہت کھاؤ ، دیکھو کیا نوبت پہنچتی ہے ۔ غرض راگ تھوڑا سا سننا انسان کو راحت اور آرام پہنچاتا ہے مگر اس میں عادت کی کثرت قباحت لاتی ہے ۔

جو ہم نے راگ کا بیان کیا وہی ناچ کا حال ہے ۔ راگ آواز

موزوں کا نام ہے ، ناچ اعضا کی حرکاتِ موزوں کا نام ہے - اب
اس ناچ اور راگ کے سمجھنے والوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں ؛
ایک سننے والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بہ جز نغمات اور الحان
کی لذت کے اور کچھ سماع کی کیفیت نہیں جانتے - یہ سمجھنا تو
ایسا ہے جیسے اونٹ سمجھتا ہے جس کا ذکر پہلے کر آئے ہیں -
دوسرے سننے والے ایسے ہوتے ہیں کہ سمجھ کے ساتھ سنتے ہیں
مگر مضمون کو کسی مخلوق معین یا غیر معین پر ڈھالتے جاتے
ہیں - یہ سننا جوانوں اور شہوت پرستوں کا ہے کہ جو کچھ سنتے
ہیں اُس کے موافق اپنی شہوتوں اور مقتضاے احوال کو ڈھال لیتے
ہیں - تیسرے ایسے ہیں کہ جو کچھ سنیں اس کو اپنے حال پر
ڈالیں ، یعنی خدا تعالیٰ کے معاملات میں - جب وہ عتاب و خطاب کا
ذکر سنیں ، یا قبول اور رد کا ، یا وصل و ہجر کا ، یا قرب و بعد کا
یا فوت شدہ چیز کا افسوس ، یا متوفیٰ کا اشتیاق ، یا کسی آنے
والے کا شوق ، یا طمع و خوف ، یا دل کے گھبرا کے دیکھنے کا ،
یا ایفاے وعدہ کا ، یا[1] عہد شکنی کا ، یا خوف فراق و سرور وصال کا ،
یا زیارت حبیب اور فرقت رقیب کا ، یا اشک فشانی و تواتر سرگرانی
کا ، یا طول فراق و وعدۂ وصال یا کسی اور بات کا ذکر سنتا
ہے جو اکثر گانے کے مضامین میں ہوتے ہیں تو ان کا سننا ایسا
ہوتا ہے جیسا کہ چقماق سے آگ کا پیدا ہونا کہ فوراً دل کی آگ
بھڑک اٹھتی ہے اور شوق کا غلبہ ہوتا ہے - الفاظ کے معنی وہ
نہیں لگاتے ہیں جو مصنف کی مراد ہوتے ہیں بلکہ وہ موافق اپنے
فہم کے لگا لیتے ہیں - اور قاعدہ ہے کہ ہر کلام کئی صورتوں پر

---

۱ - اصل متن میں 'کا یا' کے الفاظ نہیں ہیں لیکن سیاق و سباق کے تقاضے
سے یہ الفاظ شامل کیے گئے - مرتب

محمول ہو سکتا ہے ۔ اس سے ایک حالت ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے جس سے وہ وجد میں آ جاتے ہیں اور حرکات بے خودانہ دیوانہ وار کرنے لگتے ہیں ۔ سماع کے ثمرے کا نام وجد ہے ، یعنی ایک نئی حالت ۔ راگ سننے کے بعد سننے والا اپنے نفس کے اندر شوق ، خوف ، حزن ، قلق ، سرور ، افسوس ، ندامت ، بسط ، قبض میں سے کوئی پاتا ہے ۔ اہل احوال کو سماع جوش میں لاتا ہے یا قوی کر دیتا ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر راگ اچھی طرح سنا جائے تو اس سے تنبیہ ہوگی ، حالت بدلے گی ، دل کی صفائی ہوگی ، اس میں تقویت آئے گی ؛ نیکی کی حالت میں چستی آئے گی ، کند فہم میں کندی ہوگی تو تیزی آئے گی ، طبیعت میں جو کدورت ہوگی وہ صاف ہو جائے گی ، نفس میں ایک جولانی آ جائے گی ۔ غرض سماع دل کو عالم روحانی کی طرف رہنما ہے ، مگر بشرطیکہ سماع کے آداب ملحوظ خاطر رہیں کہ وقت ، یاران جلسہ ، مقام ، سماع کی طرف توجہِ تمام ، سماع کا ذوق ہو ۔ غرض جن لوگوں پر دنیا کی شہوت غالب نہ ہو، جن کی بری صفات کا اُبھار سماع سے نہ ہو ، اُن کے واسطے سماع ایک نہایت لذت کی چیز ہے ۔ جیسے قوت متفکرہ علم کی رہنما ہے ، ایسے ہی سماع روح کا رہنما ہے ۔ جو خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں ، سماع سے ان کے دل میں شوق الٰہی کی[1] سلسلہ جنبانی ہوتی ہے اور تمام صفات محمود کی تحریک ۔

۲ ۔ بیاہ اور شادی کی رسموں میں رواج ہے کہ ناچ رنگ ہوتا ہے ۔ جو مسلمان شرع کے پابند ہیں وہ اس رقص و سرود سے احتراز کرتے ہیں اور اپنے ہاں شادیوں میں وہ ناچ نہیں کراتے ۔

---

۱ ۔ اصل میں 'کے' ہے ۔ مرتب

نوجوان رنگین طبع جب ان میں شریک ہوتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ اگر یہاں چنے ہوتے تو ان پر کلمہ پڑھ کر دل بہلاتے اور اس کو پھولوں کی مجلس کہتے ۔ اگر ناچ رنگ ہوتا ہے تو شادی کی محفل کہتے ہیں ۔ اب حیران ہیں کہ اس مجلس کو کیا کہیں ۔ ان شادیوں میں فاحشہ عورتیں ناچنے کے لیے بلائی جاتی ہیں جن کی وجہ معاش بھی ناچ رنگ ہوتا ہے ۔ وہ زیور و لباس سے آراستہ ہوتی ہیں ، طرح طرح کے ناز کرشمے اور دل ربایانہ حرکتیں اس لیے کرتی ہیں کہ مرد ان پر فریفتہ ہوں اور صبر و شکیب ان کا غارت ہو ۔ نوجوان ناچ دیکھ کر ، گانا سن کر فرحت و مسرت کے نشے میں مخمور اور چُور ایسے ہوتے ہیں کہ پھر وہ از خود رفتہ ہوتے ہیں ۔ اگر کوئی شخص تمام عشق بازوں کا رجسٹر بنائے اور خانۂ کیفیت میں سبب عشق بازی کا تحریر کرے تو سو میں نوے ایسے ہوں گے کہ جن کو یہ مرضِ عشق شادیوں کے رقص و سرود سے لگا ہوگا ۔ جب ایک عورتِ نو عمر کسی جوان مرد کے روبرو آوازِ نرم و دل کش سے عاشقانہ شعر گائے اور اپنی صورت کو زیور اور لباس سے زینت دے اور حرکات دل کش کرے ، تو مشکل ہے کہ مرد کا دل از خود رفتہ نہ ہو۔ اور جب نوجوان یہ جانتا ہو کہ اس عورت کا پیشہ فحش و زنا ہے تو طبیعت کا تھامنا مشکل ہے ۔ یہاں ایسے رقص و سرود سے ہزاروں آدمیوں کو نقصان پہنچتا ہے ۔ امرا اور سلاطین نے تو اس شغل میں اپنی ریاستیں اور سلطنتیں برباد کردیں ۔ واجد علی شاہ کو دیکھو کہ کیا سلطنت کو ایسے کاموں میں نام پیدا کرکے کھویا ہے ۔ غرض ایسا ناچ دیکھنا مرد کے لیے بڑی بے شرمی اور بے حیائی ہے ۔ [illegible]

[illegible]

باب پنجم

محبت و عشق

۱ - محبت و شوق

افراد انسان کا اجتماع و تالیف بے محنت و الفت کے صورت پزیر نہیں ہوتا۔ تمدن انسانی کا قوام محبت سے ہے۔ کوئی انسان محبت سے خالی نہیں ہوتا ۔ اب یہ محبت کئی نوع کی ہے؛ ایک طبیعی جیسے کہ اولاد اور ماباپوں کی ۔ دوم اتفاق جیسے کہ ہمسایے میں رہنے سے ، مدرسے مکتب میں ساتھ پڑھنے سے، یا بازار میں یک جا ہونے سے، یا ایک جگہ نوکر ہونے سے یا سفر میں رفیق ہونے سے ۔ سوم ارادی کہ وہ بہ قصد واختیار پیدا کی جائے ۔ محبت ، صحبت و معرفت سے پیدا ہوتی ہے ۔ صحبت کے معنی ہیں پاس بیٹھنا اور ملنا جلنا ، معرفت کے معنی جاننا پہچاننا ۔ محبت الفت انسان دوسرے سے جب ہی کرتا ہے کہ اس کو محبوب جانتا ہے کیوں کہ غیر محبوب سے تو انسان اجتناب اور دوری کیا کرتا ہے اور اس سے اختلاط نہیں چاہتا ہے ۔ جس چیز کے ادراک سے کسی قسم کی لذت حاصل ہو وہ چیز دل کو محبوب ہوگی اور جس سے کچھ ایذا ہو وہ دل کو مبغوض ہوگی ۔ پس محبوب کے معنی یہ ہیں کہ طبیعت کو اس کی جانب رغبت ہو اور مبغوض کے معنی یہ کہ طبیعت کو اس سے نفرت ہو ۔ اگر طبیعت کی رغبت بڑھ جائے تو اس کو عشق کہیں گے اور اگر نفرت بڑھ جائے تو اس کو عداوت کہیں گے ۔

اب محبت کے اسباب کا حال سنو ؛ آدمی جس سے محبت رکھتا ہے

تو دو حال سے خالی نہیں ہوتی ؛ یا صرف اُس کی ذات سے محبت ہے کوئی اور مقصود اور محبوب چیز نہیں جس کا ذریعہ اُس کی محبت کو کہا جائے۔ یا اس لیے محبت کرتا ہے کہ اُس کے ذریعے سے دوسرا مقصود حاصل ہو۔ پھر یہ مقصود تین صورت سے خالی نہیں : اول صرف متعلقِ منافعِ دنیوی ، دوم متعلقِ منافعِ آخرت ، سُوم متعلقِ باللہ تعالیٰ۔

۲ - اسباب محبت[1]

پہلا سبب : حواس خمسہ سے بعض چیزوں کے ادراک سے ایک قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے اور بہ سبب اس لذت کے طبیعت کو اس طرف رغبت ہوتی ہے ، اور یہی رغبت طبع سلیم میں محبت پیدا کر دیتی ہے ؛ مثلاً آنکھ کو اچھی صورتوں اور پاکیزہ شکلوں کے دیکھنے سے ایک قسم کی لذت ملتی ہے ، کانوں کو اچھی آوازوں ، راگوں کے سننے سے فرحت ہوتی ہے۔ قوت شامہ کو اچھی خوشبوؤں کے سونگھنے سے ایک کیفیت حاصل ہوتی ہے ، قوت ذائقہ کو اچھے کھانوں سے التذاذ اور قوت لامسہ کو نرم اور نازک چیزوں کے چھونے سے احتظاظ ہوتا ہے۔ پس جب ان حواس کو ان چیزوں کے ادراک سے لذت ملتی ہے تو طبیعت کو لامحالہ ان کی جانب میل اور رغبت ہوتی ہے۔ اور ایک چھٹا حواس جو دل کا مرکب ہے ، وہ محظوظ ہوتا ہے اور اس میں محبت پیدا ہوتی ہے۔

دوسرا سبب : انسان اپنی ذات کا بالطبع عاشق ہے ؛ وہ اپنی بقا چاہتا ہے ، موت سے ڈرتا ہے ، اس لیے اول وہ اپنی صحت سے

---

۱ - اس عنوان کے بعد ایک اور ضمنی عنوان تھا : ”محبت جن سببوں سے پیدا ہوتی ہے“ اسے غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیا گیا - مرتب

محبت رکھتا ہے ، پھر اپنے مال اور اولاد اور دوست آشناؤں کو چاہتا ہے اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ ان کی بقا میں میری ذات کی بقا ہے - ان سے اس کا نام باقی رہے گا اور جس قدر مال اور دولت کنبہ قبیلہ زیادہ ہوگا اتنی ہی اس کی ذات کی شوکت و عزت ہوگی - درحقیقت ان چیزوں کی محبت اپنی ذات کی محبت ہے -

تیسرا سبب : آدمی اس کو چاہتا ہے جس نے اس کے ساتھ احسان کیا ہو اور اس کو فائدہ پہنچایا ہو - ظاہر ہے کہ جو شخص کسی کو دولت عطا کرے ، اس کی حاجت برلاوے ، اس کی اعانت کرے ، اس سے شیریں کلامی سے پیش آئے ، اس کا معین و مددگار رہے ، اس کو اعداء کے شر سے بچائے ، اس کے مقاصد کے لیے اسباب فراہم کر دے ، اس کی خواہشیں پوری کر دے ، اس کے عزیز و اقارب کو خوش و خرم کرے ، تو ایسا شخص محبوب ہو جائے گا اور آدمی ایسے محسن کو دل سے چاہنے لگے گا - مگر یہ محبت بھی حقیقت میں اپنی ذات سے محبت کرنی[1] ہے - مثلاً کوئی طبیب اس کا علاج کرکے تندرست کر دے تو اس صحت کے سبب سے جو محبت طبیب سے ہوگی ، وہ اپنی ذات کے ساتھ محبت ہے -

چوتھا سبب : آدمی کسی سے محبت رکھے ، نہ بہ‌سبب اس کی ذات کے ، نہ بہ‌نظر کسی فائدے کے - انسان کی طبیعت و جبلت میں داخل ہے کہ جس کسی کو نیک اور اچھا جانتا ہے خواہ مخواہ اس کی محبت دل میں ہو جاتی ہے ، گو اس سے خاص اس آدمی کو فائدہ نہ پہنچے - مثلاً کسی آدمی کو معلوم ہو کہ فلاں بادشاہ بڑا عادل اور غریب پرور اور رعیت نواز یا عابدِ شب زندہ دار

---

۱ - اصل میں 'کرتی' ہے - مرتب

ہو کہ سخی، کریم، حلیم، متواضع ہے؛ گو وہ ایسی جگہ رہتا جہاں سننے والا کبھی پہنچ نہ سکے، تو بھی اس سے دل میں محبت ہو جائے گی۔ یہی سبب ہے کہ انسان بزرگان دین سے ایسی محبت رکھتا ہے کہ مال و متاع ان پر قربان کر دیتا ہے اور اُن کے نام پر اپنی جان فدا کرتا ہے۔

پانچواں سبب: حسن و جمال کے سبب سے محبت ہوتی ہے۔ حسن و جمال کے یہ معنی ہیں کہ جس چیز کا جو کمال ہے وہ اس میں کامل ہو۔ جو چیز کمال میں کامل ہوگی وہی جمال میں کامل کہلاوے گی۔ مثلاً انسان اچھا وہی ہے جس کے اعضا میں تناسب ہو، جس کا رنگ سرخ سفید ہو، جس کا قد و قامت معتدل ہو؛ خط اچھا وہی ہے جس کے حروف باقاعدہ درست ہوں۔ غرض ہر چیز کا حسن و جمال علیحدہ علیحدہ ہے۔ وہ شکل و صورت ہی پر منحصر نہیں بلکہ اُن چیزوں پر بھی اطلاق حسن کا ہوتا ہے جو حواسِ خمسہ کے ادراک سے خارج ہیں، مثلاً اخلاق نیک؛ وہ جس انسان میں ہوں گے وہ صاحب حسن خلق کہلائے گا۔ اسی واسطے جس طرح کہ حسن صورت کا صورت کے کمال پر اطلاق ہوتا ہے، حسن سیرت کا سیرت کے کمال پر اطلاق ہوتا ہے، بلکہ حسن صورت باعث اس قدر محبت کا نہیں ہوتا جس قدر کہ حسن سیرت باعثِ محبت ہوتا ہے۔ انسان کی جبلت میں حسن و جمال کی محبت داخل ہے۔ جمال ظاہری کو وہ آنکھ سے دیکھتا ہے، باطنی جمال دل کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس جمال باطنی کے[1] دیکھنے کے لیے اہل دل ہونا ضرور ہے۔ جس آنکھ سے جو جمال نظر آتا ہے، وہ آنکھ کو مرغوب ہوتا ہے۔ جمال باطنی دل کی آنکھ سے دکھلائی دیتا ہے اس لیے دل

۱۔ مطبوعہ نسخے میں 'کے' نہیں تھا۔ اضافۂ مرتب ہے۔ مرتب

کو محبوب ہے ۔ مثلاً انبیا ، اولیا ، علما سے جو محبت ہوتی ہے وہ
اُن کی صورت شکل کے باعث نہیں ہوتی بلکہ ان کے جمال باطنی کے
سبب سے ہوتی ہے ۔ جو تنگنائے محسوسات میں گھرے ہوئے ہیں
وہ حسن و جمال کے معنی یہی جانتے ہیں کہ صورت شکل پاکیزہ
ہو ، وہ حسن باطنی کے دیکھنے میں اندھے ہیں ۔

غرض حسن کی طرف انسان کو میلان طبعی ہے ، گو اس
میں شہوت رانی مقصود نہ ہو ۔ اچھی صورتیں بذات خود لذت
بخش ہوتی ہیں جیسے کہ سبزہ زار ، گلزار ، دریا ، نہر ، عمارات
لطیفہ ، آنکھ کو ان کے دیکھنے سے لذت ہوتی ہے اور کوئی
غرض بد ان کے درمیان نہیں ۔

چھٹا سبب محبت کا مناسبت و مشاکلت ہے ۔ مناسبت اور
مشابہت کو باہم میل ہونے میں بڑا دخل ہے ۔ لڑکا لڑکے سے ،
بڈھا بڈھے سے ، جانور اپنی نوع کے جانوروں سے اسی سبب سے
الفت کرتے ہیں ۔ کیا خوب یہ شعر مشہور ہے :

کند ہم جنس باہم جنس پرواز   کبوتر با کبوتر باز با باز

کبھی یہ مناسبت و مشابہت ظاہری ہوتی ہے جیسے کہ لڑکا
لڑکے سے لڑکائی اور ہم‌عمری کے باعث سے محبت کرتا ہے ۔
کبھی غیر ظاہری جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ دو شخصوں میں
باہم خود بخود محبت ہو جاتی ہے ۔ بلا ملاحظۂ جمال اور بغیر
مطالبۂ مال یا کسی اور فائدے کے ان میں مناسبت باطنی اور مشابہت
معنوی ہوتی ہے جو ان دونوں میں الفت اور موافقت کا سبب ہوتی
ہے ۔ مگر یہ باطنی مشابہتیں پوشیدہ ہوتی ہیں ۔ پس آدمیوں میں دو
کا اتفاق جب ہی ہوگا کہ ایک میں دوسرے کا وصف پایا جائے ۔
جیسے کے دو قسم کے پرندے کبھی متفق نہیں ہوتے اور بدون
مناسبت ان کی پرواز ایک ساتھ نہیں ہوتی ، ایسے ہی آدمیوں

کو سمجھو -

۳ - محبت الٰہی

ہم نے جو سبب اوپر بیان کیے ہیں وہ سب صرف ذات پاک الٰہی کی محبت میں پائے جاتے ہیں - مثلاً انسان اپنی ذات سے محبت رکھتا ہے - یہی سبب بڑا سبب ہے کہ اللہ جل شانہ کی محبت رکھنے کا ہو سکتا ہے، اس لیے جو شخص اپنی ذات کو پہچانے گا وہ اپنے پروردگار کو جانے گا - سمجھے گا کہ خدا تعالٰی نے مجھے پیدا کیا ہے، اسی نے زندگی دی ہے، عدم سے وجود میں لایا ہے، اسی نے کمال پر پہنچایا ہے، اسی نے زندگی بسر کرنے کے سارے اسباب فراہم کیے ہیں - پس جو شخص اپنی ہستی اور وجود کو دوست رکھے گا تو کیوں کر خدا کو دوست نہ رکھے گا جس کے سبب سے اس کی ہستی ہے - سب سے زیادہ دوستی اپنی ذات کے ساتھ یہی ہے کہ خدا کے ساتھ محبت رکھے -

دوسرا یہ سبب کہ انسان اپنے محسن کو چاہتا ہے کہ اگر آدمی سوچے تو وہ سمجھے گا کہ محسن حقیقی سوائے خدا کے دوسرا نہیں ہو سکتا - اس کے احسانات کا کچھ ٹھکانا نہیں - کوئی محاسب ان کو شمار نہیں کر سکتا - جو ظاہر میں احسان کرتے ہیں وہ محسن مجازی ہیں ؛ درحقیقت وہ احسان بھی خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے - جب خدا نے دینے والے پاس خزانہ جمع کیا تو اس کو دینے کی توفیق ہوئی - پس اگر احسان کرنے والے سے محبت رکھنا طبعی ہے تو کوئی سوائے خدا تعالٰی مستحق محبت نہیں ہے - جو اس سے محبت نہ رکھیں[۱] وہ جاہل ہیں کہ حقیقی احسان کو محسن مجازی پر ختم کرتے ہیں -

---

۱ - اصل میں 'رکھے' ہے - مرتب

تیسرا یہ سبب کہ انسان کی طینت میں یہ داخل ہے کہ جس کسی کو نیک اور اچھا جانے تو خواہ اس سے دل میں محبت رکھے ۔ تو یہ ایسا ہے کہ سوائے اللہ جل شانہ کے ، جو تمام عالم پر احسان کرنے والا ہی نہیں ہے بلکہ اسی نے تمام مخلوقات اپنے فضل عمیم سے پیدا کی اور ان کو جمیع مایحتاج عنایت کیا ؛ کیسی ان کی شکل بنائی ، ان کو ضروریات سے فارغ البال کیا ، پھر نعمتیں گوناگوں عطا کرکے مرفہ[1] الحال کیا ۔ ان کی زیب و زینت اور عیش و آرام کی چیزیں دے کر ان کو صاحب شان و شوکت بنایا ۔ اس سے بڑھ کر دینے والا اور حاجتیں پوری کرنے والا کون ہوگا کہ بے غرض سب کو دیتا ہے ۔ فرش سے عرش تک جس کو دیکھیے وہ سب نمونہ اسی کے احسان[2] کا ہے ۔ تو جو ایسا محسن ہو کہ تمام عالم اس کے احسان کے ایک ذرے کی برابر نہ ہو اور محسن ، [3]محسن و احسان کا اور احسان کے اسباب کا خالق ہو ، تو پھر اس سے محبت نہ رکھنا بڑی جہالت ہے ۔ ایسے بڑے محسن کا احسان نہ ماننا بڑی کفران نعمت ہے جس کے احسان و سخاوت کی حد نہیں ۔ جس قدر آسمان و زمین و چاند و سورج ، ستارے ، آب ، خاک ، باد ، آتش ہیں سب اس کی جود و سخا کے نمونے ہیں ۔

---

۱ ۔ اصل : مرفحہ ۔
۲ ۔ 'احسان' کے بعد 'کے' زائد تھا جسے حذف کر دیا گیا ۔
۳ ۔ محسن اسم فاعل اور محسن اسم مفعول ہے ۔ مولف کا مطلب غالباً یہ ہے کہ خداوند تعالی احسان کرنے والا ہے ۔ اس نے انسان کو جو احسان مند ہے ، نیز احسان کو اور اسباب احسان کو خلق کیا ہے لہذا ایسی ذات سے محبت نہ کرنا جہالت ہے ۔ مرتب

چوتھا یہ سبب کہ حسن و جمالِ باطنی کے کمال کے سبب سے محبت ہوتی ہے ۔ کمال کا انحصار تین باتوں میں ہے ؛ اول علم ، دوم قدرت ، سوم تنزہ و تقدس ۔ یہ تینوں صفتیں بدرجۂ کمال خدا کی ذات کے سوائے کسی اور میں نہیں پائی جاتیں ۔

سب جانتے ہیں کہ کسی کا علم اللہ جل شانہ کے علم تک نہیں پہنچ سکتا ۔ اگر تمام اولین اور آخرین کے علوم جمع کیے جائیں تو اُس کے علم کے ذرے کی برابر بھی نہیں ۔ کوئی چیز زمین اور آسمان کے درمیان نہیں جو اُس کی نظر سے پوشیدہ ہو ۔ اگر تمام زمین آسمان اور اہل زمین جمع ہوں اور ایک چیونٹی یا مچھر کی خلقت کی حکمت کو دریافت کرنا چاہیں تو سویں حصے کی برابر بھی اُس کی حکمت سے مطلع نہ ہوں ۔ پس اگر صفت علم کے سبب سے محبت ہو تو چاہیے کہ سوائے اللہ جل شانہ اور کسی سے محبت نہ کی جائے ، اس لیے کہ سب کا علم بہ نسبت اُس کے علم کے جہل ہے ۔

قدرت بھی ایک کمال ہے اور ہر ایک کمال و عزت و جلال ماتحتِ محبت ہے ، یہاں تک کہ اگر انسان کسی دوسرے کے کمال کا حال سنتا ہے تو اُس کو ایک قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے اور اس صاحب کمال سے محبت ہوتی ہے ۔ اب اللہ تعالیٰ کی قدرت ، غلبہ ، جلال ، عزت و کمال پر غور کیا جائے کہ جس کے قبضۂ قدرت میں تمام زمین اور آسمان ، کواکب ، پہاڑ ، دریا ، ہوا ، معدنیات ، نباتات ، حیوانات ، انسان سب ہیں ۔ کسی کو ان میں سے کچھ قدرت اپنے اوپر نہیں کہ کچھ کر سکیں ، بلکہ سب کچھ خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ اُسی نے سب کو بنایا اور ان کے اسباب پیدا کیے ۔ ان کو اُسی نے قدرت اور طاقت دی ، سب کی باگ اُسی کے ہاتھ میں ہے ۔ جس سے جو چاہتا ہے وہ کام لیتا ہے ۔

اگر سب کو تباہ کر دے ، اُس کی مملکت و سلطنت میں ایک ذرہ کم نہ ہو ، اور اگر مثل ان کے لاکھ ہا[1] خلقت پیدا کر دے تو ذرا بھی نہ تھکے ۔

تیسری صفت تقدس ؛ عیبوں اور نقصان سے مبرا ہونا اور برائیوں اور خرابیوں سے منزہ ہونا ایسی صفت ہے کہ جو باعثِ محبت ہے ۔ پس خدا سے زیادہ کسی میں تقدس و تنزہ نہیں ۔ کوئی مخلوق نقص سے خالی نہیں اس لیے کہ وہ عاجز و محلوق ہیں ۔ پس دنیا کا محلوق ہونا اور دوسرے کا ان پر مختار ہونا ان کی صفت تقدس کا عیب ہے ۔ کمال تقدس صرف ذات باری کو حاصل ہے ۔ پس اس صفت کے سبب سے بھی سوائے اللہ تعالیٰ کوئی لائق محبت نہیں ۔

پانچواں محبت کا سبب مشابہت اور مشاکات ہے ۔ سو بندے کو اپنے پروردگار سے قربت و نزدیکی اُن صفات میں حاصل ہے جن میں حکم ہے کہ عادتیں اللہ کی سیکھو ۔ آدم کو اللہ نے اپنی صورت پر بنایا ۔ غرض یہ سبب بڑی ایسا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنی فرض ہے ۔ غرض خدا تعالیٰ جس محبت کا مستحق ہے اُس کا کوئی اور مستحق نہیں ۔ سب سے زیادہ اُسی کی ذات سے محبت رکھنی چاہیے ۔

۴ ۔ انسان کا دل اور محبت الٰہی کی لذت

انسان کو بہت سی قوتیں دی گئی ہیں اور جو قوتیں اُس کو دی گئی ہیں اُن کا مقتضائے طبع علیحدہ علیحدہ ہے ۔ اور اُس کو لذت اسی میں ملتی ہے کہ اس قوت کا مقتضائے طبع حاصل ہو ۔

---

۱ ۔ نسخۂ اول میں 'لاکھا' چھپا ہے لیکن موجودہ املا 'لاکھ ہا' ہے جیسے 'ہزار ہا ، کروڑ ہا' وغیرہ ۔ مرتب

مثلاً غضب ، غصہ ، ایک قوت ہے کہ اس کی بالطبع خواہش غلبہ اور انتقام ہے - پس غلبہ اور انتقام ہی اس کی لذت ہے - جب کوئی شخص دشمن سے انتقام لیتا ہے اور اس پر غلبہ پاتا ہے تو کیا خوشی حاصل ہوتی ہے - یا خواہش طعام کی قوت ہے جو غذا حاصل کرنے کے واسطے بنائی گئی ہے ، پس اس میں اس کی لذت ہے - یہی حال سامعہ ، باصرہ ، شامہ کا ہے - پس سب قوتوں کی لذت اس کے مقتضائے طبع کے ملنے میں ہے اور رنج اور دکھ اس کے نہ ملنے میں -

اسی طرح پر دل میں ایک قوت ہے جس کا نام ہے عقل ؛ اسی کو نور الٰہی کہتے ہیں - یہ قوت اس لیے دی گئی ہے کہ اس کے ذریعے سے حقائق اشیا دریافت کی جائیں - اس قوت کا اقتضائے طبع معرفت اور علم ہے اور یہی اس کی لذت ہے - اور علم خاص ترین صفات ربوبیہ سے ہے - جب کسی انسان کی تعریف اس کے علم کے سبب سے کی جاتی ہے ، کیا لذت اس کو حاصل ہوتی ہے اور کس قدر وہ خوش ہوتا ہے - اور قوت علم بہ قدر شرف معلوم کے ہے - پس کوئی سے اجل و اعلیٰ و اشرف موجودات میں اس سے زیادہ نہیں ہے کہ جو سب کا پیدا کرنے والا ، سب کا سنوارنے والا ، سب کے لیے تدبیر کرنے والا ، سب کا تربیت دینے والا ہے ، پس اس کی ربوبیت کے اسرار پر مطلع ہونا اور اس کی ترتیب امورات کا ، جو کہ تمام موجودات کو محیط ہیں ، علم حاصل ہونا سب انواع علوم سے بڑھ کر ہے ، اور سب سے زیادہ اس میں لذت اور لطف ہے - بلکہ جب کوئی شخص اس علم کے مزے سے واقف ہو جاتا ہے تو اور علموں کو چھل چھچھتا ہے -

اس عالم ظاہری میں کوئی لذت ، حکومت اور ریاست سے بڑھ

کچھ نہیں ہے ، جس کے واسطے اہل ہمت تمام مزے کھانے پینے کے ، عیش و آرام کے چھوڑ دیتے ہیں ۔ اور جو کم ہمت ہوتے ہیں وہ عیش و آرام کے لطف میں رہ کر اُس مزے کو کھو دیتے ہیں ۔ اسی طرح جو بڑے عالی ہمت ہیں وہ اس عالم ظاہری کی حکومت اور ریاست کو اُس لطف اور شرف کے واسطے چھوڑ دیتے ہیں جو کہ اسرار اُلوہیت کے علم سے اُن کو حاصل ہوتے ہیں ۔ یہ وہ لذت ہے جو ہمیشہ رہے گی اور اس میں کسی طرح کدورت نہیں ، ہر طرح سے پاک صاف ہے ۔ پس جو لذت اللہ جل شانہ کی معرفت میں ہے اور اُس کی صفات و افعال اور نظام مملکت کے غور کرنے میں ہے ، وہ کسی دوسری چیز میں نہیں ہے ۔ پس جو لوگ اُن کے افعال اور انتظام پر ، جو کہ فرش زمین سے آسمان تک ہے ، غور کرتے ہیں اور اُس کی قدرتوں کے میدانوں میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہیں ، اور اُس کی صنعت کے باغوں کو اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ، اور اُس کی معرفت کے طرح طرح کے خوش ذائقہ پھلوں اور میووں کو چکھتے ہیں ، اور اُس کی قدرت کے رنگا رنگ پھولوں کو دیکھتے ہیں ، اور قسم قسم کی خوشبوئیں سونگھتے ہیں ، وہ ہر وقت ایسی جنتوں میں رہتے ہیں کہ جن کا عرض آسمان اور زمین سے زیادہ ہے ۔ وہ اُسی باغ کی گلگشت کرتے ہیں کہ جس کا ہر چمن نئے ڈھنگ کا ، چمن کا ہر تختہ نئے رنگ کا ، ہر قطعے میں نیا ہی شجر نظر آتا ہے ، ہر شجر میں نیا ہی ثمرہ دکھلائی دیتا ہے ۔ اس باغ میں کوئی پھول نہیں جو اپنے رنگ میں البیلا نہ ہو اور کوئی پھل نہیں جو اپنے مزے میں اَدیلا نہ ہو ۔ جس پھول کو دیکھیے وہ اپنے جوبن میں نرالا ہے ، جس پھل پر نظر کیجیے وہ اپنے ذائقے میں دوبالا ۔

الحاصل اللہ اور اُس کی صفات اور افعال اور اسرار اور حکمتوں

کی لذت سب لذتوں سے بڑھ کر ہے - اور یہ لذت اُس کو نہیں حاصل ہو سکتی جو کہ دل نہیں رکھتا ہے ، اس لیے کہ دل ہی معدن اس قوت کا ہے - جو دل رکھتے ہیں وہ معرفت الٰہی میں فکر کرتے ہیں ، اور اس سے اُن کو وہ فرحت ہوتی ہے کہ سادی مرگ ہو جانا کچھ تعجب نہیں - یہ ایک کیفیت وجدانی ہے ، نہ زبانی - دل ہی اس کیفیت کو جانتا ہے ، تقریر کو اس میں دخل نہیں - دل ہی وہ باغ ہے جس میں معرفت کا سجر ہے ، دل ہی وہ شجر ہے جس میں معرفت کا ثمر ہے ، دل ہی وہ چمن ہے جس میں ہزاروں پھول پھولتے ہیں ، دل ہی وہ نہال ہے جس میں ہزاروں پھل لگتے ہیں ، دل ہی وہ دریا ہے جس سے ہزاروں دُر نکلتے ہیں ، دل ہی وہ صدف ہے جس میں ہزاروں گوہر پیدا ہوتے ہیں - محبت کی کان دل ہے ، معرفت کا خزانہ دل ہے ، بوستانِ امن جسے کہتے ہیں وہ دل ہے ، گلشنِ مسرت جسے کہتے ہیں ، وہ دل ہے - دل ہی خدا کے گھر کا نام ہے جو بے نشان ہے - یہ اُسی کی شان ہے کہ دل کو یہ وسعت دی کہ سب کی سمائی اُس میں ہو جاتی ہے - اُسی نے اُس کو یہ فراخی دی کہ سب کی گنجائش اُس میں ہو جاتی ہے - کوئی چیز نہیں جو اُس میں نہ سما سکے ، کوئی سے نہیں جو اُس میں نہ آ سکے - چیزوں کا ذکر چھوڑو ، اسیا کا نام نہ لو ؛ وہ اُس میں سما جاتا ہے جو کہیں نہیں سماتا ، وہ اُس میں رہتا ہے جو کہیں نہیں رہتا ، وہ اُس میں نظر آتا ہے جو کہیں نہیں دکھلائی دیتا ، وہ اس میں ٹھہرتا ہے جو کہیں نہیں ٹھہرتا - جو زمین میں نہیں سماتا ، جو آسمان پر نہیں آتا ، وہ دل میں آ جاتا ہے - نہ زمین میں یہ گنجائش ، نہ آسمان میں جو عارف کے دل میں ہے -

اُس خدا کی معرفت کی لذت صرف اُسے حاصل ہو سکتی ہے جو کہ درجہ بدرجہ ترقی پا کر اس لذت کے مزے سے واقف ہو گیا

ہے - جب تک انسان لڑکا رہتا ہے اُس کو کھیل تماشا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے اور اس کو وہ بڑی لذت جانتا ہے - پھر جب ذرا بڑا ہوتا ہے تب پوشاک اور خوراک اور زیب و زینت کے مزے سے آگاہ ہوتا ہے - اس وقت اس لطف کے آگے کھیل اور تماشے کی حقارت[1] کرتا ہے - جب جوان ہوتا ہے تو حسینوں اور مہ جبینوں کی الفت[2] کے مزے سے آگاہ ہو کر سب کو اس کے سامنے برا جانتا ہے - جب ریاست و حکومت کی لذت سے آگاہ ہوتا ہے تو سب کو چھوڑ کر اسی کو اپنے لیے بہتر لذت سمجھتا ہے کہ اس کا جاہ و جلال اور عزت و کمال اور رعب و داب و شان و شکوہ اور حکومت و ریاست سب سے بڑھ کر ہو ، اور درحقیقت دنیا کی آخری لذت یہی ہے - مگر جب انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت کی لذت سے آگاہ ہوتا ہے تو وہ ریاست اور حکومت کو چھوڑ بیٹھتا ہے اور وہ سب کو حقیر جانتا ہے -

۵ - شوق و اُنس

دل کی رغبت کسی امرِ پوشیدہ کی طرف ، جو اب تک نہ ملا ہو ، اس کو شوق کہتے ہیں - اگر مل گیا ہو اور مشاہدہ اس کا ہو چکا ہو ، اس سے جو فرحت دل کو ہو ، اس کو اُنس کہتے ہیں - شوق کسی چیز کا جب تک نہیں ہوتا کہ اس کا ادراک کچھ ہو اور کچھ نہ ہو - اگر بالکل ادراک نہ ہو تو اشتیاق کیوں کر پیدا ہو ، جس طرح کہ کسی شخص نے دوسرے شخص کو نہ دیکھا ہو ، نہ اس کی صفت سنی ہو ، تو وہ کیوں کر اس کا مشتاق

---

۱ - یہاں 'حقارت' 'تحقیر' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے - مرتب

۲ - اصل متن (صفحہ ۱۵۵) میں 'الف' چھپا ہے جو غلط ہے - صحیح الفت ہے - (مرتب)

ہوگا ۔ اور اگر بالکل ادراک ہو تو بھی اشتیاق نہ ہوگا ۔ اس لیے کہ کمال ادراک رؤیت سے ہے ، اور جو اپنے محبوب کو ہر وقت دیکھتا ہوگا تو وہ اس کا مشتاق کیوں کر ہوگا ۔ پس ثابت ہوا کہ اشتیاق اُسی وقت تک ہے کہ کچھ ادراک ہو ، کچھ نہ ہو ۔ اور وہ کئی وجہوں سے ہوتا ہے کہ جس کو ہم ایک مثال سے سمجھاتے ہیں ؛ مثلاً کسی کا معشوق کسی سے جدا ہو جائے اور اُس کے دل میں اس کا خیال رہ جائے ، تو ضرور وہ عاشق مشتاق ہوگا کہ دیدار اس کا نصیب ہو ۔ لیکن اگر اس کے دل سے اس کا خیال جاتا رہے اور وہ بھول جائے تو اشتیاق باقی نہ رہے گا ، اور اگر دیدار نصیب ہو جائے گا تو بھی اشتیاق کا اطلاق نہ رہے گا ۔

پس شوق کے معنی یہ ہیں جو خیال دل میں ہے ، اس کے کامل ہونے پر نفس مشتاق ہو ۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دیکھنے پر بھی شوق باقی رہتا ہے ، یعنی کمال رؤیت نصیب نہیں ہوتی[۱] ۔ مثلاً اپنے محبوب کو دیکھ تو لیا لیکن روشنی میں نہیں دیکھا کہ جس سے اچھی طرح پر صورت نظر آتی ۔ تو بھی شوق اس کا باقی رہتا ہے کہ جمال اُس کا روشنی میں دیکھا جائے تاکہ اچھی طرح اس کی شکل و صورت دیکھنے میں آئے ۔

دوسری وجہ اشتیاق کی یہ ہے کہ اپنے محبوب کا چہرہ تو دیکھ لیا لیکن خال و خط کے دیکھنے کی تمنا باقی رہ گئی ۔ پس خواہ نخواہ دل کو اُس کے سب اعضا کے حسن و جمال اور ایک ایک خط و خال کے دیکھنے کا شوق ہوتا ہے ۔ شوق وہ چیز ہے کہ راہِ دراز کو کوتاہ کرتا ہے ۔ کوہ کی برابر رنج اس کی راہ میں کاہ برابر معلوم ہوتا ہے ۔ جس وقت کسی چیز کا شوق دلہ

---

۱ ۔ اصل نسخے میں 'ہو' ہے ، لیکن 'ہوتی' صحیح ہے ۔ مرتب

میں شعلہ زنی کرتا ہے تو وہ سو دریاؤں سے بھی نہیں بجھتا ہے۔ اگر شوق کو کسی طرح تسکین ہو جائے تو جان لو کہ وہ شوق نہیں ہے، ہوس ہے۔ ہوس آئین ہوس ناک ہوتے ہیں۔ عاشق مشتاق ہوس سے پاک ہوتے ہیں۔ جب صدق شوق افزا ہوتا ہے تو وہ مقصود تک رہ نما ہوتا ہے۔ جب شوق صادق محمل اٹھائے گا تو منزل وصل پر پہنچا دے گا۔ کوئی چیز شوق کی راہ کی مانع نہیں ہوسکتی۔ ع

شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست

جو شخص دریاے شوق میں اپنے ہاتھ دھوتا ہے وہ ماہیِ مقصود کو ضرور پکڑ لاتا ہے۔

۶ ۔ دوستوں کے حقوق جو ایک دوسرے پر ہیں

دنیا میں دوستی کا دعویٰ تو بہت آسان ہوتا ہے مگر نباہ اس کا مشکل ہے۔ جب تک دوستی کا امتحان نہ ہو تو اس کا دعویٰ سچا نہ جانو۔ محبت وہ درخت ہے جس کے پھل، دل اور زبان و اعضا سے عیاں ہوتے ہیں، جیسے دھوئیں سے آگ۔ پھل سے ہی درخت جانا جاتا ہے۔ پس جب تک دوستی کے حقوق دل اور زبان اور اعضا سے نہ ادا ہوں، دوستی نہ سمجھنی چاہیے، اس لیے ہم اس کے حقوق بیان کرتے ہیں۔

دوستوں کی دوستی کا عقد بھی مثل عقدِ نکاح ہے کہ جس طرح نکاح چند حقوق کا مقتضی ہے، جن کا پورا کرنا حق نکاح کے ادا کرنے کے واسطے واجب ہے، اسی طرح عقد دوستی میں چند حقوق کی بجا آوری واجب ہے۔ جس سے بھائی چارہ کرو تو اس کا حق تم پر مال میں، نفس میں، زبان میں، دل میں ہوگا۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

اول: دو دوستوں کی مثال دو ہاتھوں کی مثل ہے کہ ایکہ

دوسرے کو دھوتا ہے ، یعنی جیسے دونوں ہاتھ ایک ہی غرض کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں ، اسی طرح دو دوستوں میں دوستی کامل جب ہوگی کہ دونوں ایک مقصد میں ایک دوسرے کی رفاقت کریں ۔ تو گویا وہ من وجہ ایک شخص ہیں ۔ اور یہ امر اس کا مقتضی ہے کہ نفع و نقصان میں دونوں ایک دوسرے کے سہیم اور مال اور حال میں باہم شریک ہوں ۔

بڑی بات دوستی میں مال سے دوست کی مدد کرنی ہے کیوں کہ انسان کا بڑا دوست مال ہے ۔ اس سے دوست کی خاطر جدا نہ ہونا اتحاد کی بڑی دلیل ہے ۔ اب مال سے سلوک کرنا کئی طرح ہوتا ہے ؛ جس وقت دوست کو مال کی ضرورت ہو ، ایک تو یہ ہے کہ تم اس کی خبرگیری اپنے پس انداز مال سے اس طرح کرو جیسے کہ خادم کی کرتے ہیں ۔ دوم یہ کہ تم اس کو ایسی حالت میں بہ منزلہ اپنے نفس کے جانو اور اس کی شرکت کو اپنے مال میں بغیر اس کی طلب کے پسند کرو اور نصفا نصف میں شریک کر لو ۔ سب سے بڑھ کر یہ درجہ ہے کہ دوست کو اپنے نفس پر ترجیح دو اور اس کی حاجت کو اپنی حاجت پر مقدم جانو ۔ یہ درجہ دوستانِ صادق کا ہے کہ دوست کو اپنے نفس پر ترجیح دیں اور اپنے مال کو دوست کے لیے وقف کردیں ، کہ جو کچھ چاہے وہ اپنی ضرورت اور حاجت کے لیے لے لے ۔ بعض مثالیں دنیا میں دیکھنے میں آتی ہیں کہ ایک دوست نے دوسرے دوست کا قرض چکا دیا یا جب دونوں بھوکے پیاسے تھے ، کچھ کھانے پینے کو آیا تو ایک نے دوسرے کو اپنے نفس پر ترجیح دی ۔

دوسرا حق یہ ہے کہ دوست کی اعانت اپنے نفس سے کرے ، یعنی اس کی حاجتوں کو قبل از سوال بجا لانے میں اور اپنی خاص حاجتوں پر ان کو مقدم کرنے میں مدد کرے ۔ اور اس اعانت کا

ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ سوال کے وقت اُس کی حاجت پوری کر دے مگر بہ کشادہ پیشانی اور بہ اظہار فرحت کرے ، خود اس کا احسان مانے ۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ دوست کی ضرورت کو اپنی ضرورت جانے بلکہ اس سے بھی اہم ۔ دوست کے حال سے ایسا غافل نہ رہے جیسے کہ اپنے حال سے غافل نہیں رہتا ۔ اس کے سوال اور اظہار حاجت کے بغیر اُس کی مدد کر دے اور اس مدد کا حق اُس پر نہ سمجھے بلکہ اس نے جو تیری سعی منظور کی ، اُس کا ممنون ہو ۔ غرض دوست کو بھی من جملہ اقارب اور اولاد کے جانے ، اس پر اکرام اور ایثار کی ابتدا کرے ۔

تیسرا حق یہ ہے کہ اس کے عیب نہ اُس کے سامنے ذکر کرے ، نہ پیٹھ پیچھے ، بلکہ عیبوں سے تجاہل کرے ۔ دوسرے یہ کہ جب وہ کلام کرے تو نہ اُس کو رد کرے اور نہ اس کی بات کاٹے اور نہ جھگڑا کرے ۔ سوم اس کے احوال کو تجسس نہ کرے ۔ تجسس کرنے میں شاید اس کو سوالوں کے جواب دینے میں دشواری پیش آئے یا بہ تکلف جھوٹ بولنا پڑے ۔

چوتھا حق یہ کہ جو اسرار اپنے کہے ہوں ، اُن کے افشا سے خاموش رہے ۔ اس کے سوا دوسرے سے ہرگز نہ کہے ، یہاں تک کہ اپنے خاص دوستوں سے بھی ذکر نہ کرے ۔ راز کا فاش[1] کرنا خبثِ باطن کا نشان ہے ۔ یہاں تک اس کے چھپانے میں مبالغہ کرے کہ جھوٹ بولنے تک روا رکھے ۔ جس وقت دوست اپنے راز کو ودیعت بنا کے دے تو اس کو دل میں قبر بنا کے دفن کر دے ۔ مردہ کو زندہ نہ کرے بلکہ بالکل بھول جائے ۔

پانچواں حق یہ کہ اُس کے دوستوں اور اقارب و اہل و فرزند

---

۱ ۔ اصل میں 'فاحش' ہے ۔ مرتب

کے طعن سے سکوت اختیار کرے ۔ اگر کسی نے اُس کو برا کہا ہو تو اُس کے سامنے اس کا ذکر نہ کرے، کیوں کہ جو شخص گالی کی نقل کرتا ہے ، گویا وہی گالی دیتا ہے ۔ نقل کرنے والے سے ایذا ہوتی ہے جیسے حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں : ع

یکے تیرے افگند و در رہ فتاد   وجودم نیازرد و رنجم نہ داد

تو برداشتی و آمدی سوے من   ہمے در سپوزی بہ پہلوے من

ہاں جو کوئی تعریف کرے، اُس کا چھپانا نہیں چاہیے کیوں کہ وہ اول نقل کرنے والے سے خوش ہوتا ہے ، پھر اصل کہنے والے سے ۔ اُس کا چھپانا داخلِ حسد ہے ۔ غرض کہ خاموشی اُن باتوں سے چاہیے جو اُس کو بری لگیں ۔ مگر بعض جو برائیاں اُس کی اُس کو تباہ کریں وہ دوستانہ سمجھا دو ۔ مگر ان برائیوں کے سبب سے اُس کی دوستی سے باز نہ آؤ ، اس لیے کہ کوئی شخص دنیا میں بے عیب نہیں ہوتا ۔ تم اپنے تئیں خود ہی دیکھو کہ کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہوگا ۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں کسی بے عیب آدمی کو دوست بنانا چاہتا ہوں تو اُس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں کسی کو دوست بنانا نہیں چاہتا ۔ کسی آدمی میں خوبیاں زیادہ ہوں تو اُسی کو غنیمت جانو ۔ غرض حق دوستی یہ ہے کہ دوست کی خوبیوں کا نقش دل پر رکھے کیوں کہ دشمن ہمیشہ برائیاں اور عیب تاکتا رہتا ہے : شعر

چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد   عیب نمایند در نظرش ہنر

ور ہنرے داری و ہفتاد عیب   دوست نہ بیند بجز آں یک ہنر

غرض جیسے کہ زبان کو اُس کی برائیوں کے بیان کرنے سے تم کو روکنا چاہیے ، ایسا ہی دل کو اُس کے اوپر بدگمانیوں کے کرنے سے روکنا چاہیے ۔ جہاں تک ہو سکے، دوست کے فعل

کو نیکی پر حمل کرنا چاہیے - اور جو بات یقین اور مشاہدے سے منکشف ہو جائے تو تم اُس کو آگاہ کر دو لیکن اُس کا حمل کرنا سہو اور نسیان پر حتی‌الوسع ضروری ہے -

بدگمانی کا ظن دو طرح سے پیدا ہوتا ہے ؛ ایک تو تفرس سے جس کی کوئی علامت ہو کہ علامت کے موجود ہونے سے ظن کو جنبش ضرور ہوتی ہے ، جس کو آدمی دور نہیں کر سکتا - دوسرا وہ جس کی منشا تمھاری بد اعتقادی ہوتی ہے - مثلاً کوئی کام اُس نے کیا جو دو وجہوں پر محتمل ہو سکتا ہے مگر چونکہ تمھارا اعتقاد اُس کی طرف اچھا نہیں تو تم اُس فعل کو خراب ہی وجہ پر محمول کروگے ، حالاں کہ کوئی علامت ایسی نہیں جس سے وہ فعل اسی وجہ سے خاص کیا جائے - تو ایسا ظن باطن کا قصور ہے ، دوست پر منحصر نہیں بلکہ وہ عام بد ظنی ہے -

زیادہ تر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ لوگ عیبوں کی تاک میں بیٹھے رہتے ہیں - اگر اپنے دوست یا بھائی کی کوئی برائی سنتے ہیں تو اُس پر اور حاشیے چڑھا کر لوگوں میں مشتہر کرتے ہیں - اَوروں کے عیبوں کو چھپانا اور اُن سے تجاہل و تغافل کرنا نکوکاروں کی خصلت ہوتی ہے - دوستی کا اقتضا یہ ہے کہ اُس سے ایسا معاملہ کرے جیسا کہ خود چاہتا ہو کہ دوسرا مجھ سے کرے - اس میں کچھ شک نہیں کہ آدمی دوسرے سے یہ توقع کیا کرتا ہے کہ میرے عیبوں سے وہ چشم پوشی کرے - اگر اپنی توقع کے خلاف اُس سے ظاہر ہوتا ہے تو اُس پر نہایت طیش کھاتا ہے ؛ بڑے تعجب کی بات ہے کہ خود توقع چشم پوشی کی رکھے اور خود عیبوں سے چشم پوشی نہ کرے - وہ بڑا نا انصاف ہے کہ وہ اپنے حق میں انصاف اُس مقدار سے زیادہ چاہتا ہے جتنا اُس کا دل دوسرے کے لیے نہیں گوارا کرتا ہے - عیبوں سے چشم پوشی

نہ کرنے اور اُن کے ظاہر کرنے میں سعی کرنے کی علت ایک مرض باطن کے اندر گڑا رہتا ہے۔ اس مرض کا نام حسد و حقد ہے کہ یہ دونوں جس کے اندر ہوتی ہیں، اُس کے باطن کو خباثت سے پُر کر دیتی ہیں۔ مگر یہ دونوں چیزیں دل میں مقید اور دبی رہتی ہیں، جب تک کوئی موقع نہیں ملتا؛ جب اُن کو موقع ملتا ہے تو اُن کی بیڑی ٹوٹ جاتی ہے اور پردۂ حیا اُٹھ جاتا ہے اور خباثت درونی ٹپکنے لگتی ہے۔ پس جن کے دل میں حسد و حقد ہے وہ کسی کے دوست نہیں ہو سکتے۔ بعض حکما کا قول ہے کہ بھائیوں پر ظاہری عتاب بہ نسبت باطنی کینے کے اچھا ہوتا ہے۔

چھٹا حق یہ ہے کہ جو باتیں یار کو پسند ہوں، وہ اُس کے سامنے بیان کرے۔ اُس کے سامنے چپکا بیٹھنا گویا مردہ کا ساتھی اُس کو بنانا ہے (یاروں کی تلاش اس لیے ہوتی ہے کہ اُن سے کچھ فائدہ ہو، نہ یہ کہ اُن کی ایذا سے بچے رہیں۔ اور خاموشی کے معنی یہی ہیں کہ دوسرے کو زبان سے نہ ستائیں) آدمی کو چاہیے کہ اپنے یار سے بولے، باتیں کرے۔ جن باتوں کا پوچھنا واجب ہو اُن کو پوچھے؛ جیسے اُس کا مزاج، اس کے اہل و عیال کی خیر و عافیت۔ اُس کے رنج و خوشی سے اپنے رنج و خوشی کا اظہار کرے کیوں کہ دوستی کے معنی یہی ہیں کہ درد و راحت میں شریک ہو۔

ساتواں: جب تم کو کسی سے محبت ہو تو اس کو اطلاع دو، اس سے محبت بڑھے گی۔ اگر تم کسی سے محبت کرو اور اُس کو معلوم نہ ہو کہ تم کو اس سے محبت ہے تو محبت کی ترقی نہ ہوگی۔ لیکن اگر وہ جان جائے گا کہ تم کو محبت ہے تو بالطبع تم سے محبت کرے گا۔ اور جب تم کو معلوم ہوگا کہ یہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے تو بالضرور تم کو بھی محبت اُس کے ساتھ زیادہ

ہوگی ۔ اس طرح طرفین سے محبت روز بروز زیادہ ہوتی جائے گی ۔

آٹھواں : دوست کا وہ نام لو جو اُس کو پسند ہو ۔ آگے پیچھے ایک نام لیا کرو ۔ اُس کو سلام کیا کرو ، اُس کو اچھی طرح بٹھلایا کرو ۔ دوست کو جس شخص کے سامنے اپنی تعریف کرانی پسند ہو ، اُس کے سامنے جو خوبیاں تم کو معلوم ہوں ، اُن کو بیان کرو کہ یہ افزایش محبت کا بڑا سبب ہے ۔ اسی طرح اُس کی اولاد اور اہل خانہ اور کردار کی تعریف کرو ، بلکہ اُس کی عقل و صورت ، خط ، اشعار ، تصنیف ، خواہ اور چیزوں کی خوبی بیان کرو جس سے وہ خوش ہو ۔ مگر اس تعریف میں جھوٹ و مبالغہ نہ ہو بلکہ جو بات قابل تحسین ہو اُس کی خوبی بیان کی جائے ۔ اس سے زیادہ یہ امر ضروری ہے کہ اگر غیر شخص اُس کی تعریف کرتا ہو تو اظہار فرحت کے ساتھ دوست سے اُس کا قول نقل کرو کہ اُس کا نہ کہنا حسد میں داخل ہے ۔

نواں : اگر دوست نے کوئی سلوک تمھارے ساتھ کیا ہو تو اُس کا شکر ادا کرو ، بلکہ اگر اُس نے سلوک کی نیت کی ہو اور وہ پورا نہ ہوا ہو تو بھی شکر ادا کرنا چاہیے ۔ جو شخص حسن نیت پر مشکور نہیں ہوتا وہ حسن سلوک پر بھی مشکور نہیں ہوگا ۔

دسواں : محبت کی بڑی تاثیر یہ ہے کہ جب کوئی شخص دوست کو پیٹھ پیچھے برا کہے ، یعنی صراحتاً یا کنایتاً اُس کی عزت کے درپے ہو تو خود دوست کی طرف داری اور حمایت کے لیے مستعد ہو اور اُس بد گو کو چپکا کرے اور للکارے ۔ چپکا رہنا ، کینہ و نفرت کرنی ، حق دوستی میں کوتاہی کرنی ہے ۔

گیارھواں : دوست کو اُس کی غیبت[1] میں اسی طرح ذکر کرو

---

۱ ۔ غیبت : عدم موجودگی ۔

جیسا تم چاہتے ہو کہ تمھاری غیبت میں کوئی تمھارا ذکر کرے۔ جو بات تمھارے دوست کو کسی نے کہی ، وہ تم کو کہتا تو اُس وقت تمھارا دل کیا چاہتا کہ تمھارا[1] دوست تمھارے باب میں کیا کہے - جو تقریر دوست کی ایسے وقت میں تم کو پسند ہوتی وہی تم کو اُس پر طعنہ کرنے والے کے ساتھ کرنی چاہیے - جب تمھارے دوست کا ذکر غیبت میں ہو تو تم یہ خیال کر لو کہ وہ بیٹھا ہوا ہے اور پھر وہ باتیں کہو کہ اگر بالفرض وہ ہوتا اور سنتا تو اُس کو اچھی معلوم ہوتیں - کسی بزرگ کا قول ہے کہ میرے کسی دوست کا مذکور ہوتا ہے تو اپنے تئیں اُس کی صورت میں سمجھ لیتا ہوں اور اُس کے باب میں وہ بات کہتا ہوں جس کو اپنے حق میں کہا جانا بہتر سمجھتا ہوں - یہ بڑی ایمان داری کی بات ہے کہ اپنے دوست کے لیے وہی بات مناسب جانے جو اپنے حق میں بہتر جانے - غرض محبت میں اخلاص رکھنا چاہیے ، یعنی آگے پیچھے اور زبان اور دل اور ظاہر و باطن اور تنہائی و جماعت میں یکساں ہووے - جو شخص اپنے نفس پر اس بات پر قادر نہ ہو کہ ہر حال میں یکساں رکھ سکے، تو اُس کو چاہیے کہ دوستی کا نام نہ لے -

بارھواں حق دوستی یہ ہے کہ تعلیم و نصیحت دوست کو کرے کیوں کہ علم کی حاجت دوست کو مال کی ضرورت سے کم نہیں - غرض کہ جو باتیں دین و دنیا کے لیے کارآمد اور مفید ہوں اُس کی تعلیم کرو اور بعد تعلیم وہ کاربند نہ ہو تو نصیحت کرو ؛ اس طرح کہ افعال بد کی برائیاں اور اُن کے ترک کے فوائد اُس کے سامنے ذکر کرو ، اور جو بات کہ اُس کو دنیا اور

---

۱ - اصل میں 'تمھارے' ہے - مرتب

آخرت میں بری معلوم ہوتی ہو اُس سے ڈراؤ کہ وہ اُن حرکات سے باز آئے ۔ اور اُس کے عیوب پر خبردار کر دو اور بری بات کی قباحت اور نیک بات کی خوبی اُس کے دل میں جما دو ۔ مگر یہ امور خفیہ تنہائی میں اُس سے کہو تاکہ کسی کو اس کی اطلاع نہ ہو ؛ اس لیے کہ مجمع میں کہنا توبیخ و فضیحت ہے ۔ نصیحت اور فضیحت میں فرق یہی ہے کہ ایک خلوت میں ہوتی ہے ، دوسری مجمع میں ۔ ایک ایمان دار دوسرے ایمان دار کا آئینہ ہوتا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایمان دار اپنے ایمان دار دوست کی وجہ سے اپنے عیبوں پر مطلع ہو جاتا ہے ۔ اگر تنہا ہوتا تو یہ بات نہیں حاصل ہوتی ۔ جیسے آئینے سے اپنی ظاہری صورت کے عیب پر واقف ہو جاتا ہے اور بدون آئینے کے نہیں معلوم کر سکتا ۔ مجمع میں جو دوست نصیحت کرتا ہے ، وہ فضیحت کرتا ہے ، اس سے محبت نہیں باقی رہتی ۔ عاقل کو جو دوست اُس کے عیوب پر مطلع کرتا ہے تو وہ اُس کو شفقت جانتا ہے کہ میرے کپڑوں میں بچھو اور سانپ گھسا ہوا تھا جو مجھے ہلاک کرتا تھا ، اس سے مجھے مطلع کرکے جان بچا دی ۔ مگر ہاں احمق نصیحت کرنے سے خفا ہوتا ہے اور نفرت کرنے لگتا ہے ، کیوں کہ اُس میں اُس کا عیب ظاہر ہوتا ہے ۔ جھوٹے آدمی ناصحوں سے محبت نہیں کرتے ۔ اگر دوست میں ہماری نصیحت کارگر نہ ہوگی تو وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہے کہ اپنے عیب کو ترک نہیں کر سکتا ، تو سکوت اختیار کرے ۔ دوست کی دوستی سے کام ہے ، اُس کے افعال سے کیا کام ہے ، اُس پر تحمل چاہیے ۔

تیرھواں دوست کا حق یہ ہے کہ دوست کی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کرے ۔ جو قصور تمھارا کرے تو اُس کو معاف کر دو ۔ آدمی کبھی کج ہوتا ہے ، کبھی سیدھا ، مثلاً

ایک حال پر نہیں رہتا ۔ آدمی سمجھ لے کہ کے دن کی زندگی ہے جو دوستوں سے روٹھ کر بیٹھے ۔ چند روز ساتھ ملنا جلنا غنیمت جانے ۔ دوست سے اگر خطا ہو تو دل میں کدورت نہیں رکھنی چاہیے ۔ دوست کا عذر خواہ سچا ہو یا جھوٹا ، قبول کرنا چاہیے ۔

شعر

ترکِ الفت دوستوں سے جرم پر کرتے ہو تم
پھر بتاؤ وہ کہاں ہے جو خطا کرتا نہیں

ایک بزرگ کا قول ہے ''دوست کی خطا کرنے پر صبر کرنا اس پر عتاب کرنے سے اچھا ہے ۔ عتاب کرنا ترک ملاقات سے بہتر ہے ۔ ترک ملاقات غیبت کرنے سے بہتر ہے ، دوستی اعتدال کے ساتھ اچھی ہوتی ہے ۔''

چودھواں حق دوستی کا وفا اور اخلاص ہے ۔ وفا کے معنی یہ ہیں کہ دوست کی زندگی میں اس کی دوستی پر ثابت اور قائم رہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد اور دوستوں اور اقارب سے وہی معاملہ رکھے جو دوست کے ساتھ تھا ۔

بعض اکابر فرماتے ہیں کہ وفات کے بعد تھوڑی سی وفا بھی زندگی کی حالت میں بہت سی وفا سے بہتر ہے ۔ غرض دوست کی دوستی نباہنے میں یہ بھی شرط ہے کہ اس کے تمام دوستوں اور قریبوں اور متعلقوں کی رعایت کرے اور ان کی مراعات کا اثر دوست کے دل میں بہ نسبت اس کی خود کی مراعات کے زیادہ ہوتا ہے ، اس لیے کہ وہ خود اپنے متعلقین کے تفقد سے زیادہ خوش ہوتا ہے ۔ علاوہ اس کے شفقت اور محبت کا زور ایسے ہی وقت معلوم ہوتا ہے کہ محبوب سے تجاوز کرکے متعلقوں تک پہنچے ۔ یہاں تک کہ اس کے دروازے کے کتے کو بھی اور کتوں پر دل میں ترجیح دے ۔ وفائے محبت میں یہ بھی ایک بات ہے کہ دوست

کی خاطر داری میں اپنا حال نہ بدلے ، گو کسی بلند مرتبے پر خود پہنچ جائے ۔ جاہ و حشمت کے زیادہ ہونے سے دوستوں پر برتری کرنا ہاجی پن ہے ۔ کسی شاعر نے کہا ہے :

طالع کی یاوری سے جو خوش وقت ہوں کریم
کرتے ہیں مفلسی کے جلیسوں کو اپنے یاد

کسی حکیم کا قول ہے کہ جب تمھارا دوست کہیں کا حاکم ہو جائے اور اپنی حکومت میں تمھارے ساتھ پہلے کی نسبت آدھی دوستی رکھے تو بہت غنیمت ہے ۔ ایک وفا کی بات یہ بھی ہے کہ دوست کے حق میں لوگوں کی شکایت نہ سنے ؛ خصوصاً ایسے لوگوں کی کہ پہلے تو ظاہر کریں کہ ہم فلاں شخص کے دوست ہیں اور پھر اُس کی طرف سے ایسی باتیں بنائیں جن سے دلوں میں کینہ پیدا ہو ۔ اور یہ دقیق تدبیر آپس میں پھوٹ ڈلوانے کی ہے کہ اول دوستی کا اظہار کریں تاکہ سامع کے گمان میں متہم نہ ٹھہریں اور آخر کو یہ گل کھلاویں ۔ جو شخص دوست کے حق میں چغلی سنتا ہے تو اُس کی دوستی ہمیشہ نہیں رہتی ۔

کسی شخص نے ایک حکیم سے کہا کہ میں آپ سے دوستی کیا چاہتا ہوں ۔ اس نے جواب دیا کہ تین باتیں منظور کرو تو میں دوستی کروں گا ؛ اول یہ کہ میری شکایت نہ سننا ، دوم میرے کہنے کے مخالف نہ کرنا ، سوم ناز و نخرے سے مجھے پامال نہ کرنا ۔ ایک وفا کی بات یہ بھی ہے کہ دوست کے دشمن سے دوستی نہ کرے ۔

پندرھواں دوستی کا حق یہ ہے کہ دوست کو تکلیف نہ دے اور اُس سے تکلف نہ کرائے ۔ اس پر اپنا کوئی بوجھ نہ ڈالے ۔ ایسی فرمایش نہ کرے جس سے اُس کو مشقت اٹھانی پڑے ۔ اُس کے جاہ و مال سے مدد کی درخواست نہ کرے ۔ فقط یہ مطلب

رکھے کہ اس کی ملاقات سے جی خوش ہو ۔ آپس کی مدد سے ایک دوسرے کا بوجھ ہلکا ہو ۔ بعض اکابر کا قول ہے کہ جو کوئی دوستوں سے ایسی چیز کی خواہش کرے جس کی خواہش وہ اس سے نہ کریں تو اُن پر ظلم کرتا ہے ۔ اور جو شخص ویسی ہی چیز کی خواہش کرتا ہے جیسی وہ خواہش کرتے ہیں ، تو ان پر مشقت ڈالتا ہے ۔ اور جو کوئی ان سے درخواست نہیں کرتا ہے ، وہ اُن سے سلوک کرتا ہے ۔

کسی حکیم کا قول ہے کہ جو کوئی اپنے آپ کو دوستوں میں اپنی قدر سے زیادہ رکھے تو خود بھی گنہگار ہوگا اور وہ بھی گنہگار ہوں گے ۔ اور جو کوئی اپنی قدر کے موافق ان سے رہے گا تو خود مشقت اٹھائے گا اور ان کو مشقت میں ڈالے گا ۔ اور جو کوئی اپنی قدر سے کم ہوکر رہے گا تو وہ اپنے آپ اور اَور سب آرام سے رہیں گے ۔ زیادہ تر ہلکا پھلکا رہنے کی صورت یہ ہے کہ تکلف کو تہ کر رکھے ۔ ایسا تکلف دوستوں میں مکروہ ہے کہ اس کے موافق مدارات نہ ہو سکے تو عذر کرنے کی ضرورت ہو ۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ آدمی میں پھوٹ تکلف ہی سے ہوتی ہے ۔ ایک دوسرے کے پاس جاتا ہے اور وہ اُس کے لیے تکلف کرتا ہے اور یہی تکلف باعثِ ترکِ ملاقات ہو جاتا ہے ۔ جن دوستوں کے لیے تکلف کرنا پڑتا ہے وہ گراں خاطر ہو جاتے ہیں اور ان سے شرمانا پڑتا ہے ۔ جو بے تکلف دوست ہو۔ " ہیں اُن کے ساتھ آدمی ایسا ہی رہتا ہے جیسے تنہا ۔ ایسے ہی آدمیوں کے ساتھ دوستی کرنی چاہیے ۔

۷ - اوپر کے بیان کا خلاصہ

ایک دوست کے حقوق دوسرے دوست پر یہ ہوتے ہیں :

اول جو چیز اپنے واسطے دوست رکھتے ہو ، اُس کے واسطے

بھی دوست رکھو ، اور جس چیز کو اپنے واسطے مکروہ جانتے ہو
اُس کے واسطے بھی مکروہ جانو ۔

دوم جو چیز دوست کی آزردگی کا سبب ہو ، اُس سے پرہیز
کرو اور اُس کی رضا جوئی اور فرماں برداری کرو ۔

سوم اپنے نفس سے ، اپنے مال سے ، اپنی زبان سے ، اپنے
دست و پا سے اس کی یاری اور مددگاری کرو ۔

چہارم دوست کی آنکھ بن ۔ اُس کے لیے آئینہ بن جا کہ اگر
کوئی عیب و نقصان اُس میں ہو تو صداقت اور یاری کی وجہ سے،
نہ از روے ستم ظریفی و خاطر داری کے، اس پر مطلع کرے ۔

پنجم جب تک تو سیر نہ ہو کہ وہ گرسنہ رہے ، اور تو
سیراب نہ ہو جب تک وہ تشنہ رہے ، جامہ نہ پہن جب تک کہ
وہ ننگا ہو : یعنی خورس و پوشس میں اُس کو اپنا شریک حال
رکھ اور اُس کی برہنگی اور گرسنگی سے چشم پوسی نہ کر ۔

ششم اگر دوست (کے) پاس خدمت گار نہ ہو تو اپنا نوکر
بھیج کر اُس کے کھانے پسے ، کپڑے دھوے ، فرش بچھانے کا
سرانجام کرا دے ۔

ہفتم اُس کی قسم کو سچ جانے اور جب وہ دعوت میں بلائے
تو جائے ، بیمار ہو تو عیادت کرے ۔ اگر مر جائے تو اُس کے
جنازے پر جائے۔ جب اُس کی کوئی حاجت معلوم ہو تو پہلے طلب
سے اُس کی حاجت روائی کر دے ۔ دوستی ان حقوق کی رعایت پر
موقوف ہے ۔ اگر ان حقوق پر عمل ہو تو دوستی راست اور
دعوی دوستی بجا ہے ورنہ محض لاف ور سراسر کذب وخلاف ہے ۔

۸ ۔ عشق

عشق کو ، جو افراط محبت کا نام ہے ، ایک گروہ امراض
شہوت میں شمار کرتا ہے اور انواع امراض میں تباہ ترین بتاتا

ہے ۔ وہ ایک شخصِ معیّن کی طلب میں استیلا کا نام ہے ، مگر یہ عشق بہیمی ہے ۔ عشق طلب لذت کی یا طلبِ خیر کی افراط کا نام ہے ۔ اول صورت عشق بہیمی کی ہے جو مذموم ہے اور دوسری صورت عشق نفسانی کی ہے جو محمود ہے ۔ اب حوانوں کی صداقتِ محبت لذت پر موقوف ہوتی ہے اور لذت سریع الزوال ہوتی ہے ۔ دانایوں کی صداقت محض خیر ہوتی ہے ۔ خیر ایک ثابت غیر متغیر چیز ہے اس لیے ان کی مودت تغیر و زوال سے مصئون ہوتی ہے ۔ عشق نفسانی کا مبداء تناسب روحانی ہوتا ہے ، وہ رذائل میں داخل نہیں بلکہ فضائل میں ۔ جب عشق کا خورشیدِ جہاں افروز روشن ہوا ، روح انسانی کی افق پر سے تمام ظلماتِ کثائفِ طبیعت غائب ہوئے ۔

حکما کا قول ہے کہ تین چیزیں سبب جودت ذہن و لطافتِ نفس کی ہیں : ایک عشق عفیف ، دوم فکر لطیف ، سوم سماع وعظ ۔ مگر اکثر آدمی عشق کو رغبات جسمانی اور لذائذ شہواتی سے جانتے ہیں اور اس سے وہ ہوائے نفسانی کی قید میں اسیر ہوتے ہیں ، اور اپنی طبیعت کی اطاعت سے نہیں ماہر ہوتے ۔ وہ فسق کا نام عشق رکھتے ہیں ، ہوس کو محبت کہتے ہیں ، صفت بہیمی کا نام کمال انسانی جانتے ہیں ، شہوت کی غلامی کو آزادی ۔ آزادگان الٰہی جانتے ہیں کہ عشق بہیمی میں لذت مبداء حرکت شہوت ہوتی ہے اور میل شہواتی بہیمی ہوتا ہے ۔ اس عشق میں عاشق، معشوق کو بہ نسبت لذت کے دوست رکھتا ہے ؛ معشوق عاسق کو اپنے نفع کے لیے ۔ اور ان میں شکوہ و شکایت کا سبب یہ ہوتا ہے کہ طالب لذت تو استعجال اس کے استیفا میں چاہتا ہے ۔ طالب منفعت اس کو موقوف اپنے حصول مطلوب پر رکھتا ہے ۔ اس واسطے ان میں توافق کمتر ہوتا ہے ۔ اسی سبب سے عشاق مشاکی و متظلم ہوتے ہیں اور

حقیقت میں خود ظالم ہوتے ہیں - کیوں کہ اپنے استیفا ، لذت نظر اور وصال میں تعجیل کرتے ہیں اور اس کی مکافات منفعت سے نہیں کرتے۔ اس قسم کی محبت کو محبت لوّامہ ، یعنی جو ملامت کے قریب ہے ، کہتے ہیں -

پس جو ایسے عاشق ہوتے ہیں وہ صدق سے دور ہوتے ہیں - ہیزم تر کی طرح دھواں اٹھاتے ہیں ، نور نہیں رکھتے - جیسے جام کو خبر نہیں کہ کیسی شراب اس میں ہے ، مینڈک کو یہ اطلاع نہیں کہ کون سا دریا ہے ، ایسے وہ نہیں جانتے کہ عشق صادق کیا ہوتا ہے - وہ عشق روح سے متعلق ہوتا ہے؛ جو اس کی شراب تلخ کو پی لیتا ہے ، وہ شیرینیِ عالم سے منہ پھیر لیتا ہے - وہ اپنی جان عشق ہی کو جانتا ہے - وہ زندہ دل غمِ دل سے ہوتا ہے ، وہ کشتۂ حق ہوتا ہے - جو دوست کی طرف سے تیر آنکھ میں لگتا ہے اس کا وہ منت پزیر ہوتا ہے - وہ شاہد معنوی کی صورت پر عاشق ہوتے ہیں - کوئی شخص رخ خوب سے جفا دیکھتا ہے ، وفا نہیں دیکھتا - زینب زیبا کا جمال اس کے لیے وبال ہوتا ہے -

وہ سیم بر جو چاند کا مکھڑا رکھتے ہیں، ان کی زلف سیاہ جان کے لیے عقرب ہے - وہ ظاہر میں دل کی چشم و چراغ معلوم ہوتے ہیں لیکن در حقیقت داغ دل ہوتے ہیں - وہ مایۂ مہر معلوم ہوتے ہیں مگر کینہ خو ہوتے ہیں- دشمن جان ہوتے ہیں اور دوست رو دکھائی دیتے ہیں - اگر ان کا دیدۂ شہوت گرای نہ ہو تو صنع خدا سے بہتر کوئی چیز ان کے دیکھنے کے واسطے نہیں ہے - معشوق[1] کو شہوت کی نظر سے دیکھنا وبال ہوتا ہے - قند جب شراب ہوتا ہے تو پھر

---

۱ - اصل میں 'معشوق' سے پہلے 'جو' زائد تھا جسے حذف کر دیا گیا - مرتب

حلال نہیں رہتا ۔ رخِ لالہ فام کو پاک نگاہ سے دیکھنا حرام نہیں ہے جیسے گل لالہ کا دیکھنا ۔ جن کو خدا پاک چشمی عطا کرتا ہے ، رخسار بتاں دیکھنا اُن کو منع نہیں ہے ۔ جس آنکھ میں نظر پاک نہیں ، بہتر ہے کہ اس کا سرمہ خاک ہو ۔ دل جب رخ خوب کی تمنا کرتا ہے ، دیدہ ناچار اس کا تماشا دیکھتا ہے ۔ دل عشق سے ایسا آوارہ ہوتا ہے کہ دیدہ نہیں جانتا کہ میں نظارہ کرتا ہوں ۔ جس[1] دم میں نمک زیادہ ہوتا ہے اُسی سے خستہ دلوں کا دل زیادہ زخمی ہوتا ہے ۔

نکوئیِ رنگ و پوست کا نام حسن نہیں ہے بلکہ جو کچھ دل میں جگہ کرے وہی نیک حسن ہے ۔ رنگ و صفائی سے عشق نہیں ہوتا بلکہ ناز و کرشمہ بلائے دل ہوتا ہے ۔ جو عشق رنگ پر ہوتا ہے، وہ آخر کو ننگ ہوتا ہے ۔ مردوں کے ساتھ جو عشق ہوتا ہے وہ دیرپا نہیں ہوتا اس لیے کہ مُردے کی آیندہ آنے کی امید نہیں رہتی ۔ زندہ کا عشق روان و بصر کو ہر دم غنچے سے زیادہ تر و تازہ رکھتا ہے ۔ پس تو اُس زندہ کا عشق قبول کر جو مردہ نہیں ہوتا ۔

جس دل میں یہ آتشِ عشقِ الٰہی خانہ خیز ہوئی تو وہ اپنے تئیں شعلے سے نہیں بچاتا ۔ یہ فیض عشق اُنھی کو پہنچتا ہے جو اس کے اہل و قابل ہوتے ہیں ۔ آئینہ و آب میں عکس پڑتا ہے ، گل و سنگ میں نہیں ۔ دیدہ خود کچھ نزدیک و دور نہیں دیکھتا ، جب اس قابل ہوتا ہے کہ نور اس میں ہوتا ہے ۔ جب معشوقوں سے وصال ہوتا ہے تو اُن کی قدر نہیں رہتی ۔

---

۱ ۔ اصل میں 'جس' کی بجائے 'جسم' تھا ۔ مرتب

اشعار

دوست بہ صحبت چو فراوان بود
خوار بود گر ہمہ سلطان بود
آنکہ لقب خسرو شاہش کنند
زانست کہ از دور نگاہش کنند

خدا اسی سبب سے عزیز ہے ، وہی عشق کے لائق ہے ۔

۹ ۔ مرافقت و موافقت رفقا و معاندت و مباعدت اقربا

جتنے آداب نکوکاری کے ہیں ان سب میں یاری کا ادب اول ہے اس لیے کہ کوئی دنیا میں برنا و پیر ایسا نہیں کہ جس کو یار ناگزیر نہیں ۔ پس انسان یاری کے دامن کو نہیں چھوڑ سکتا ، اس لیے لازم ہے کہ ایسے یاروں کی صحبت تلاش کرے جو ہمیشہ قائم رہے ۔ جس ہم دمی کی آمید دراز نہ ہو تو اس کا حال ایسا ہے جیسے سفید بالوں پر خضاب کہ اس کا رنگ خواہ کیسا ہی آب و تاب رکھتا ہو لیکن وہ بالوں کا خود اصلی رنگ نہیں ہوتا ۔ یہ رنگ تکلف پانی سے دور ہو جاتا ہے ۔ جو صحبت دیرپا ہے ، وہ خلل پزیر نہیں ، جیسے سفید دیدے سرمے سے سیاہی پزیر نہیں ۔ جو صحبت دیرپا نہیں ، اس کا حال ایسا ہے جیسا اس گھر کا جس کی بنیاد خشت خام کی ہوتی ہے ، وہ دو تین برساتوں میں پست ہو جاتا ہے ۔ جو شخص یاروں کی صحبت کا حق پہچانتا ہے ، وہ اپنی زندگی اسی میں صرف کر دیتا ہے ۔ وہ وفادار دوست سر تا مغز مثل پستہ کے بنتا ہے ۔ وہ کھجور کی طرح اوپر مغز ، اندر استخوان نہیں ہوتا ۔ اپنے سے چھوٹوں کی صحبت اختیار کر اور اپنی ہم نشینی سے ان کو خردمند بنا ۔ عطار بن جا کہ جس کے پہلو سے آوروں کا جامہ معطر ہو ، لہار کی بھٹی نہ بن کہ دور

ہی سے دھوئیں[1] سے شرارے اُووں پر پڑیں۔ آدمی نیک خوئی کے سبب سے خوش گوار ہوتا ہے، بدخو خس کی طرح آتش میں پھینکنے کے لائق ہوتا ہے۔

اس عالم میں جو ہم نفس ہوتے ہیں وہ اکثر حقوق صحبت سے محرم نہیں ہوتے۔ تیرے منہ بر شاد ہوتے، پیٹھ پیچھے یاد نہیں کرتے۔

یار وفادار ایسا ہوتا ہے جیسے کہ مٹھی میں تلوار کہ سب طرف سے گوہر رکھتی ہے، جیسے آگے ویسے پیچھے۔ آئینے کی طرح نہیں ہوتا کہ رو کچھ پشت کچھ۔ یوں مشرق مغرب میں سارے ہم دم بھرے ہوئے ہیں مگر جیسا کہ چاہیے کم ہیں۔ سبز شیشہ اگرچہ زمرد کی مانند معلوم ہوتا ہے مگر جو گوہر شناس ہے، وہ اسے پہچانتا ہے: ایسے ہی جو دوست شناس ہیں وہ ہر شخص، جو ان کو سلام کرے، اصل دوست نہیں جانتے۔ ہر صدف میں گوہر شاہوار نہیں سمجھتے۔ اس روزگار میں ایسا یار کہ وہ حقیقت نیکی بار ہو، نہیں مل سکتا۔ جب تک تو کسی نااہل دوست سے فریب نہیں کھاتا، اہل و نااہل میں تمیز نہیں کر سکتا۔

تیرے گھر میں منافق یار کتوں اور بندروں کی طرح بھرے ہوئے ہیں، ان کو نکال تاکہ عالم کی شترگربگی سے تجھے نجات ہو۔ کمینہ دوست دشمن سے بدتر ہوتا ہے۔ وہ منچرا ہوتا ہے جو جلاد سے بھی زیادہ بے شرم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے بدن کو کاٹتا ہے، یہ غیر کے تن کو۔ اس کے دل میں کچھ ہوتا ہے، زبان پر کچھ۔ اگر تیرا دوست تیرہ دروں اور بظاہر دوستی کی شیخیاں مارتا ہو، گو وہ مثل گل لالہ ہی کے کیوں نہ ہو، تو اس کو

۱۔ اصل میں 'دھوے' تھا۔ موجودہ املا 'دھوئیں' ہے۔ مرتب۔

ہوا میں اڑا دے ۔ منافق دوست جو زاغ دل ہیں ، ان کو قفس میں بند کر دے ۔ چیل کا مغز اور اُلو کا سر ان کو کھلا دے ۔ جو یار کج اندیشہ ہوتا ہے ، خواہ اس کو اپنی آنکھوں پر ابرو کی طرح بھی بٹھائے ، تو بھی وہ کج ہی رہے گا ۔ تو کسی سے مروت کا خواہاں نہ ہو ، خواہ تیرا قرۃ العین (بیٹا) ہی کیوں نہ ہو ۔

آدمی آدمیت اور مردمی کے سبب سے آدمی ہوتا ہے ، کچھ سر و گوش سے نہیں ہوتا ۔ درخت میں گو بالقوہ تخت و کرسی بنانے کی قابلیت ہوتی ہے مگر جب تک وہ درخت تخت و کرسی نہ بنائے کندۂ ناتراشیدہ ہے ۔ ایسے ہی آدمی جب تک مردمی نہ کرے وہ آدمی نہیں ۔ جو عود خوشبو نہ دے ، وہ ہیزم ہے ، عود نہیں ۔ یاروں کو یار کا لطف ترش روئی کے ساتھ خوش‌گوار نہیں ہوتا ۔ اگر میزبان تلخی کرے تو مہمان کو فاقہ اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ اگر اندھا پاسبان ہو تو خفتہ نگہبان سے بہتر لگتا ہے ۔ انسان جس کی طبیعت دوست‌خو ہوتی ہے ، وہی دوست ہوتا ہے ۔ تکلف سے دوست رو نہیں ہوتا ۔ آئینے میں تیرا عکس گو تجھ ہی جیسا ہوتا ہے مگر وہ تیری صورت ہوتی ہے ، تو نہیں ہوتا ۔ ایسے ہی دوست منافق گو صورت میں یار موافق معلوم ہو مگر اصل میں وہ دوست نہیں ہوتا ۔ جب پانی ملوث ہو تو وہ پانی سے صاف نہیں ہو سکتا ۔ ایسی مکر کی دوستی بے ریا دوستی سے نہیں درست ہوتی ۔

جو دوست غم و شادی میں تیرا یار ہو ، اس کو دوست شمار کر ۔ دنیا میں بہت کم کار ایسے ہیں کہ بے یار کے ہو سکیں ۔ پس اگر کوئی یار تیرے کار میں نہ ہو تو افسوس کی بات ہے ۔

غرض یوں یار تو بہت ہوتے ہیں مگر ایسے یار جو تیرا یار کھینچیں ، تھوڑے ہوتے ہیں ۔ دوست خون کی گرمی سے پیوند جان ہوتا ہے ، زبان سے پیوند جسم ۔ خدا اس کو نظر بد سے بچائے

جو یاروں کے لیے اپنی جان کو سپند بنادے (فنا کر دے) ۔ جو یار دل سوز نہیں وہ کسی کام کا نہیں ۔ ایسے آدمی کی طرف میل کر کہ جس میں صفائی ہو ، گل رنگین نما پر فریفتہ نہ ہو ۔ آئینہ وہی بہتر ہوتا ہے کہ جو لوہے سے بنتا ہے ، جو اصل میں تیرہ ہوتا ہے مگر صیقل سے صاف ہوجاتا ہے ۔ سونا آئینہ نہیں بنتا ، گو ظاہر میں صاف ہے ۔

غرض دوست بنانے میں انسان اور شیطان کی تمیز کرنی چاہیے۔ خس کا پنکھا جیسے جام پر مکھی کو نہیں بیٹھنے دیتا ، ایسا ہی سفلہ کسی دوسرے کا کام نہیں بننے دیتا ۔ اگر کسی حاسد دوست کو تو اپنے دسترخوان پر بٹھائے تو وہ اسے دیکھ کر جل جائے گا ؛ نان اتنی نہیں کھائے گا جتنا کہ غم ، قدح خوش گوار اتنا نہیں پیے گا جتنا اس کو خمار ہوگا ۔ نہ کباب اتنے کھائے گا اور نہ شراب اتنی پیے گا ، جتنا وہ اپنا جگر اور خون جگر کھائے پیے گا ۔ نمک سے شراب حرام حلال ہو جاتی ہے ۔ مگر یہ گندہ نمک نمک کھانے سے اور زیادہ نمک حرام ہو جائے گا ۔ جو حاسد ہیں وہ دوستوں کو دیکھ کر یوں جلتے ہیں اور جو مکرم ہیں وہ مہر و نوازش ایسی کرتے ہیں کہ جیسے درخت تبر زن پر کہ وہ اس پر کلہاڑی مارتا ہے اور یہ اس پر سایہ ڈالتا ہے ۔ یا جیسے کہ گل ، تو اس کو آگ پر رکھتا ہے اور وہ اپنی سوزش سے گلاب کی خوشبو دیتا ہے ۔

اگر تیرا ہم سروں پر پایہ بلند ہو جائے تو اپنے ہم نشینوں سے آگے نہ بڑھ اور اپنے قریبوں سے منہ نہ پھیر ۔ صحبت دیرینہ کو نہ چھوڑ اور تکبر کو سینے میں جگہ نہ دے ۔ جو تیرے دوست مفلس ہوں ، اُن کی پرسش کر ۔ جو نامرد ایسے ہوں کہ کوئی اُن کو نہ پوچھے ، تو اُن کی پرورش کر ۔ تو آہوے صحرا

ہیں کہ وہ اپنا مغز بادشاہ کے واسطے خورش بناتی ہے ، تو اپنے پوست کو درویشوں کے حوالے کرتی ہے ۔ تو ماہی نہ بن کہ باوجود کہ سر تا پا درم میں غرق ہوتی ہے مگر اپنا لقمہ کسی کے منہ میں بے خار نہیں دیتی ۔

افسوس اُس مدبر ناقص عیار پر ہے کہ اپنے اقبال میں یار کو بھول جائے ۔ تو صندل کا درخت بن، جب بلند ہوتا ہے تو اپنے پاس کے سو درختوں کو خوشبودار کرتا ہے ۔ بید کا درخت نہ بن کہ خواہ کتنا ہی بلند ہو مگر سایہ نشیں کو اپنے پتوں سے تلوار ہی لگاتا ہے ۔ جب تک تیری گٹھڑی میں متاع ہو ، اس کو باہر رکھ کیوں کہ اُس کے خریدار موجود ہیں ۔ جو کچھ پاس ہو یاروں کو دے دے ورنہ روزگار تجھ سے خود لے لے گا ۔ گو بختیاروں کی دولت بد بختوں پر نثار ہوتی ہے مگر دل بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اُن کے پاس جہان بھی ہو تو بھی نان دینے میں کمی کرتے ہیں ۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس دائرۂ لاجورد میں کس نے دست گاہ پائی ہے کہ پا گم نہیں کیا ۔ جس سر میں تکبر کی ہوا سمائی اُس کا وہ حال ہوا جو کوے کا مردار کی بو سے ہوتا ہے کہ اُس سے اس کے مغز کو راحت اور دماغ کو فرحت ہوتی ہے ۔ جس کے پاؤں تلے سیلابِ سیم چلے ، پھر اُس کے پاؤں سلیم نہیں رہتے ۔

بعض امیروں کو یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ پاجی اور کمینے، جو اُن کے گھروں میں کتے کی طرح ریزہ‌خوری کرتے تھے ، جب اُن کو ثروت و وقعت و جاہ حاصل ہوا تو پھر اُن کی طرف نگاہ بھی نہیں کی ۔ ان کے سلام کے جواب میں علیکم بھی نہ کہا ۔ پہاڑ جو سنگ ہے ، اُس کو سلام کرو تو وہ جواب دیتا ہے مگر ان پر ایسے پتھر پڑے کہ سلام کے جواب میں وہ پتھر سے بھی بدتر ہو گئے ۔

غرض خدا جن آدمیوں کو مروت ، فتوت ، مردمی عطا نہیں کرتا وہ شیطان ہوتے ہیں ، اُن سے صحبت چاہنی خطا کرنی ہے ۔ تجھے چاہیے کہ تو اُنھی کی طرف میل کر جو تیرے ساتھ وفا کریں ۔ تیرے بلاؤں کے تیروں کی سپر بن جائیں ۔ بے وفا دوستوں سے کتا اچھا کہ وہ وفا بے ریا کرتا ہے ۔ دنیا میں دوست بہت ملتے ہیں مگر وفادار کم ہوتے ہیں ۔ بس تو صحبت اُن لوگوں سے کر جن میں صدق و صفا و وفا ہو ۔

۱۰ ۔ عزیز و اقربا ، اهل و عیال کے ساتھ نیک سلوک اور اقربائے بد کی تکالیف

۔ اگر ایک خلف روشن تیرے تن سے پیدا ہو تو یہ سمجھ کہ دولت و بخت تیرا پیدا ہوا ہے ، وہ نالائقوں کو لائق بنا دے گا ۔ جیسے ایک خط سو صفروں کو ، جو بے کار ہوتے ہیں ، بے شمار بنا دیتا ہے ۔ انسان کی بڑی شہرت نیک اولاد سے ہو جاتی ہے ۔ جو اولاد صاحب اقبال ہوتی ہے ، اُس کی سب جگہ عزت ہوتی ہے ۔ ایک خلف رشید بہت ناخلف فرزندوں سے اچھا ہوتا ہے ، جیسے ایک میٹھا پھل بہت تلخ پھلوں سے بہتر ہوتا ہے ۔ کتے کے بہت پلے پیدا ہوتے ہیں اور شیر کے کم مگر ایک شیر کا بچہ کتے کے دس پلوں سے اچھا ہوتا ہے ۔ نالائق اولاد دھوئیں کی طرح ہوتی ہے کہ اُس سے آنکھیں تیرہ ہوتی ہیں ۔ نیک اختر اولاد مثل نور کے ہوتی ہے کہ اُس سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں ۔ جو اولاد اپنے ماں باپ سے تنگ روشی سیکھتی ہے ، وہ اُسی رنگ کی ہوتی ہے ۔ جس کوزے کا سوراخ تنگ ہوگا اُس میں پتلی دھار نکلے گی ۔ جن جنھوں نے بخل کی عادت ماں باپ سے سیکھی ہے ، وہ کشادہ دست کیسے ہو سکتے ہیں ۔ ہمیشہ اُن کا کاسہ سیاہ اور مطبخ سفید رہے گا ۔ خلق جو کسی کی دعاگو ہوتی ہے ، وہ اپنے فائدے کے

سبب سے ہوتی ہے - پس جن کے مانندے سے کچھ فائدہ نہیں ، اُن کا کون دعا گو بنتا ہے - جو خالی چرب زبانی کرتے ہیں اور دیتے کچھ نہیں ، اُن سے فراغ کیسے حاصل ہو سکتا ہے - چراغ پر دیگ نہیں پختہ ہو سکتی - جو کشادہ کف سخی ہیں ، اُن کے گھر پر نقارہ ہمیشہ آدمیوں کو بلاتا رہتا ہے ، جیسے گندم و جو کے[1] بھرے ہوئے خوشے اس سبب سے خالی رہتے ہیں کہ روٹی دینے کی صفت اُن میں ہوتی ہے - اسی طرح جو عزیزوں کی دم بدم صلا کرتے رہتے ہیں اُن کی گرہ میں نقد ذخیرہ کم ہوتا ہے -

تیرا باپ مشک ناف ہو اور تجھ میں اُس کی بو نہ ہو تو تیرا اور اُس کا تعلق ایسا ہے جیسے کہ خطا و صواب کا - اگر تیرے باپ میں جہاں ہو اور تجھ میں وہ نہ ہو تو تجھے کیا ، وہ اُسی کا حق ہے ، تیرا اُس میں کیا رکھا ہے - کچھ ضرور نہیں کہ جو کریم ہوں اُن سب کی اولاد بھی عزیز ہو - تخم خیار (کھیرا) کے بیج بھی بہت سے تلخ ہوتے ہیں - جس شخص کے حویش و بیگانے بدبخت ہوتے ہیں ، اُس کا گھر خانۂ وبا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے اُلو کی دلہن کا جہیز ویران دہ ہی ہوتا ہے - جو کچھ تم اپنے خویشوں کو دو اُس کی شہرت مت کرو - ان کے دینے کی خبر فقط تیرے ہاتھ ہی کو ہو - یہ سفلوں کا کام ہے کہ کسی عزیز کو ایک پشیز (دمڑی) دے کر اپنی شہرت چاہتے ہیں - اگر تو اپنے خویشوں میں بزرگ ہو گیا ہے تو شبان بن ، نہ بھیڑیا - جو تیرے قریب بڑے ہوں اُن کو بزرگ مان ، اُن پر احسان کر مگر منت اُن کے سر پر نہ رکھ ، بلکہ اُن کی منت اپنے اوپر مان - تجھے ماں کے پاؤں چومنے چاہئیں ، باپ کا روپیہ اُس کے سبب

---

[1] - اصل میں "کے" نہیں تھا - مرتب

پر نہیں مارنا چاہیے ۔ اگر تو اس کو شہد کھلانے اور پھر اُس
کو زبان پر لائے تو وہ زہر ہے ۔ نشتر لگانے سے یہ بہتر ہے کہ
اول سے شکر ہی نہ کھلائے ۔ اگر تیرے ناخن انگلیوں سے بڑھ
جائیں اور آزار پہنچائیں ، یا آنکھ کے اندر بال نکل آئیں جو زیادہ
آنسو بہائیں ، اُن کا کاٹ ڈالنا ہی بہتر ہے ۔ اسی طرح اگر قرہ العین
تیرا آزار جو ہو تو رو کر اُس سے ہاتھ دھونا ہی اچھا ہے ۔ اندھوں
کے ہاتھ میں عصا دینا چاہیے ، یعنی جو اقارب محتاج ہوں اُن کی مدد
کرنی لازم ہے ۔ مگر جو کور دل ہوں اُن سے منہ پھیر لینا چاہیے ۔
وہ رگ کج رشتۂ پیچاں ہے جو کشش سے ہی سیدھا ہوگا ۔ جس
اولاد میں باپ کی بزرگی و نیکی کی رگ پائی جاتی ہے وہ معظم ہونا
ہے جیسے کہ رشتہ تعویذ سے مکرم ہوتا ہے ۔ باپ کے ساتھ مکر
نہیں کرنا چاہیے ، جس کی جان کا تو ایک پارہ ہے اور اسی کے
چشمۂ حیوان کا ایک قطرہ ۔ وہ تو اپنی جان بھی تیرے لیے دریغ
نہیں رکھتا ہے ۔ افسوس ہے کہ تو نان اس سے دریغ رکھے ۔

خوب سمجھ لے ماں نے جو تیرے لیے رنج کھینچے ہیں ، اُس
کی ایک رات کے رنج کا معاوضہ تو دونوں جہان سے نہیں کر سکتا ۔
اُس نے اپنا خون تجھے دودھ بنا کر پلایا ہے اور تیرے لیے
بہشت کی جوئے شیر بہائی ہے اور اس محنت میں خود خستہ ہو کر
پیر فرتوت بنی ہے ۔ اگر تو اپنے ماں باپوں کا دل خستہ نہیں کرے
گا تو تیری اولاد بھی تجھے آزار نہیں پہنچائے گی ۔ اگر تو اپنے باپ
کی آنکھ میں کانٹا چبھوئے گا تو یہی حال تیرا بیٹا کرے گا ۔ اگر تو
باپ کے ساتھ بد رگ نہیں ہے تو تیرا لڑکا بھی سگ تیرے لیے نہیں
بنے گا ۔ جو آدمی ہوتے ہیں وہ نیش و جراحت کب لگاتے ہیں ، یہ
کام تو مار و کژدم کا ہے ۔ اگر تو بد ہوگا تو تیری اولاد بدتر
ہوگی ۔ سانپ جب اپنے بچوں کو کھاتا ہے تو اُس کے بچے بچہ خوار

ہوتے ہیں - جو درخت خود خار پیدا کرتا ہے ، وہ اُن کا نشتر کھاتا ہے -

پس تو اپنے آپ ، باپ اور بزرگوں کا ادب کرکے لڑکے کو پہلے ہی سے ادب سکھا - نئی کنگھی چرب کرنے سے درست ہوتی ہے کہ بالوں کو نہیں توڑتی ، پرانے ہوئے پر پھر کچھ اثر نہیں ہوتا - ایسا ہی لڑکوں کا حال ہوتا ہے کہ ابتدا میں درست ہو سکتے ہے -

اولادِ بد کو تو امر و نہی کی کشمکش میں نہ ڈال - آنکھ سے ناخنہ کو ناخن سے نکالتا ہے ، اس سے کچھ فائدہ نہیں کیوں کہ جو بد ہوتے ہیں وہ باپ کی بات نہیں سنتے ، اپنی بات سنتے ہیں - بڑا بیٹا باپ کی باتوں پر خروش کرتا ہے - باپ اس لیے بادوں کے سننے کے لیے ہمہ تن گوش بنتا ہے ، اولاد اگرچہ خاکستر ہی کیوں نہ ہو مگر مادر و پدر اُس کو اپنی آنکھ کا سرمہ بناتے ہیں - اگرچہ بدکاری سے اُن کی آنکھوں میں خون اُترتا ہے مگر وہ آنکھ کی پُتلی کو دور نہیں کر سکتے - اگرچہ آنکھوں میں درد ہو مگر درد کے لیے آنکھ تو نہیں نکالی جاتی - یہ میوۂ دل (فرزند) میوۂ جان ہوتا ہے - اس سے دور رہنا گراں ہوتا ہے - جن کے اولاد ہوتی ہے ، وہی جانتے ہیں کہ اُن کی پرورش میں کیا دشواری ہے ، جس کے اولاد نہیں ہوئی وہ کیا جانے کہ کیا ہوتا ہے - بانجھ عورت جننے کی مصیبت کو کیا جانتی ہے -

غرض یہ مہر مادری ہے جو تمام عالم آباد ہے - اگر وہ اولاد کا رنج نہ کھینچتیں تو یہ دہر جالوروں سے کبھی پُر نہ ہوتا - جو اولاد تجھ سے پوست میں جانور ہوئی ہے وہ تیری دشمنِ جان ہے - اگر غور سے دیکھے ، آدمی اپنے سینے سے خود اپنا دشمن پیدا کرتا ہے - اُس کے منہ میں تو لقمہ رکھتا ہے جس کے

لیے وہ کچھ تکلیف نہیں دکھاتا ۔ کبھی اس کا منہ لقمے سے خالی نہیں چاہتا ہے ۔ تو یوں اس کے لیے جان مارتا ہے ۔ تیری جان جانے کے وقت ورثہ لینے کے لیے وہ کھڑا ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ بچے کو چین ہو ، ماں رنج و تکلیف اٹھاتی ہے ، اس کی پرورش کے ناز اٹھاتی ہے ۔ خدا وہ دن نہ کرے کہ پیرانہ سری میں باپ بندۂ فرزند روٹیوں کے لیے بنے ۔ ایک پدر دس پسر کو آسودہ رکھتا ہے مگر دس پسر ناخلف ایک پدر کو گھر سے باہر نکال دیتے ہیں ۔

کم بخت و بد نصیب اولاد کا حال کتے کا سا ہوتا ہے کہ جب وہ غصے ہوتا ہے تو بھائی کے منہ میں سے لقمے کو نکال کر خود کھا جاتا ہے ۔

ایک گروہ جس کو آدمی خویش و اقارب کہتا ہے ، اگر وہ بد ہو تو اس پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ ''الاقارب کالعقارب[1]۔'' وہ کژدم کی طرح نیش زنی کرتے ہیں ، حسد سے ایک دوسرے کے عیب جو اور زشت گو ہوتے ہیں ۔ خویش مثل ریش ہوتے ہیں کہ جتنی اس کی کاوش کیجیے اتنا ہی رنج زیادہ ہوتا ہے ۔ اگر گھر میں دختر و خواہر ہیں تو ان کے لیے داماد کا تلاش کرنا اور پھر سب چیز کا سامان کرنا عذاب جان ہے ۔

بڑے بھائی سے دوست اچھا ہوتا ہے اور چھوٹا بھائی ہے تو وہ چاہتا ہے کہ بڑا بھائی باپ بن کر میرے نخرے اٹھائے ۔ اگر بڑا بھائی ہے تو وہ چاہتا ہے کہ چھوٹا بھائی میرا غلام رہے ۔ ''سگ باش برادر خرد مباش''۔ جب تک باپ زندہ ہے ، بھائی دم ساز ہیں ، جب وہ مر جائے تو خصم و انباز ہیں ۔ اگر آدھا آدھا حصہ

---

[1] یعنی رشتہ دار بچھوؤں کی طرح ہوتے ہیں ۔ مرتب

ورثے کا تقسیم ہو گیا تو خیر ہے ورنہ پھر ایک دوسرے کے دو ٹکڑے کرنے کو موجود ہیں۔

غرض بری برادری سے سوائے خون جگر کھانے اور ذلّت و رنج اٹھانے کے اور کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ فرزند بد کا پالنا تو اپنا عدو پالنا ہے جو زندگی میں مال چھین کر لے جائے اور مرنے پر ثواب۔ جس کی اولاد بد ہوئی اس کا طالع منحوس ہو گیا۔ اگر لڑکے بد ہوئے تو تمام گھر کی عزت گئی ، اگر زنِ بد گھر میں ہے تو پھر گھر جہنم ہے۔ عم[1] و خال[2] جو ہوتے ہیں ، وہ تیرے جاہ و مال کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ظاہر میں تو وہ گربۂ مسکین کی طرح تیرے دسترخوان پر بیٹھتے ہیں لیکن اندر ہی اندر وہ موش سے زیادہ دسترخوان کو کترتے ہیں۔ عم جو بدگو و پر ستم ہو وہ عم نہیں ہے ، درد و غم ہے۔ اپنی بڑائی کے لیے کہتے ہیں کہ تیرے باپ ہیں ، مگر پرورش کے وقت وہ تجھ کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ حکم کرنے میں یگانے بنتے ہیں مگر دینے میں بیگانے۔

غرض عم غم ہے ، خال وبال ہے ، ان سے بچ۔ خال تیری ماں کی میراث کو خالی کرنا چاہتا ہے۔ اگر تیرے پاس زر ہو تو وہ تجھ سے اپنا رنگ جماتے ہیں اور اگر تو مفلس ہو تو تجھے تنگ رکھتے ہیں۔ جب تیرا کام بنا ہو تو تجھے خواجہ کہتے ہیں ، جب کام بگڑ جائے تو غلام زادہ۔ اگر مال ہے تو تجھے شاہ زادہ بناتے ہیں ، اگر بد حال ہو تو کنیزک زادہ کہتے ہیں۔

کسی سفلے سے قرابت قریبہ ہو تو اس سے بدتر ہے کہ جنگل کے چوہے دکان میں آ جائیں۔ اگر وہ صاحب مال ہوتا ہے تو اپنا

۱۔ عم : چچا۔
۲۔ خال : ماموں۔

نام خدا رکھتا اور خال و عم کو گدا کہتا ہے ۔ پدر پیر سے دربانی کراتا ہے ۔ جب مال اور حکومت دونوں جمع ہو جاتی ہیں تو بیوی ، دوست ، گھر سب کو بدل ڈالتا ہے ۔ وہ زبردستی اپنے رشتہ داروں کو بلاتا ہے اور اپنی شیخی بگھارتا ہے کہ وزیر اور بادشاہ اُس کے حال پر ایسے مہربان ہیں ۔ رشتہ دار بھی روٹیوں کے لیے کبھی اُس کے مزدور بنتے ہیں ، کبھی غلام ۔ جب عزیز و اقارب بد ہوتے ہیں تو ان سے یہ تکلیفیں پہنچتی ہیں ۔

۱۱ ۔ عشق

عشق بھی کیا دل بر اور دل ربا ہے ۔ آب آتش افروز اور آتش آب سوز ہے ۔ جس دل میں یگانگی نہیں وہ ایک مرغ خانگی ہے جس کے پر ہیں مگر وہ کسی بلندی پر نہیں اُڑ سکتا ۔ بس دانہ کھا لینا اور اپنے گھر کے گرد پھر لینے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا ۔ معشوق کا عشق اختیاری نہیں ہوتا ، عشق کی راہ میں عقل دیوانہ ہے ، اس لیے عاشقی کارِ فرزانہ نہیں ۔ عقل و جان پر عشق برتری رکھتا۔ مردِ صورت پرست پر عشق معنی پسند غالب ہوتا ہے ۔ اُس کو کفش و دستار و زنار کی کچھ خبر نہیں رہتی ۔ وہ ہر ہنر سے عشق کو بہتر سمجھتا ہے ۔ عشق کو ہی اپنا تاج سر جانتا ہے ۔ عقل کو طوطی و عشق کو بوتی مار بناتا ہے ۔ عشق کی گلی میں عقل اندھی ہوتی ہے ۔ شعلۂ عشق لاؤبالی ہوتا ہے ۔ عقل نقد حالی کی تلاش میں ہوتی ہے ۔

غرض عشق و عقل میں ہمیشہ سے بیر چلا آتا ہے ۔ عقل میں بالغ بہت ہوتے ہیں مگر عشق کے مزے سے بہت کم لوگ آشنا ہوتے ہیں ۔ عقل و نفس و طبیعت کا حال عشق کے مقابلے میں یہ ہے کہ نفس نقش ہے ، عقل نقاش ہے ۔ طبع گرد تھی عشق فراش ہے ۔ جب عقل نقش کرتی ہے تو نفس امارہ دور ہو جاتا ہے اور

جب عشق منہ دکھاتا ہے تو طبیعت مردہ ہو جاتی ہے ۔

اس عالم اسباب میں آدمیوں کو اپنی شراب و جام و خواب سے عشق ہوتا ہے ۔ جہاں شوخی و خوشی ہوتی ہے ، وہیں اُن کا دل لگتا ہے ۔ عبادت کی بھی خواہش اس لیے ہوتی ہے کہ اُس سے بہشت کی اُمید ہوتی ہے جس میں اکل و شرب موجود ہے ، مے و شیر و عسل کی ندیاں اُس میں رواں ہیں ۔ دنیا کے رنج و تعب سارے ملبوس و مطعم و مشرب کے لیے[1] ہیں ۔

کوئی آدمی دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُس کو خدا سے عشق ہوتا ہے ۔ وہ اُس کی رضا و تسلیم میں سر رکھتا ہے ۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اُس کو خیر جانتا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ عالم خدائے عز و جل کا ہے ، اُس میں مجھ کو کچھ دخل نہیں ۔ اُس کی حکمت میری دعا کی اجابت کی مانع ہوتی ہے ۔ بہت سی چیزیں ظاہر میں خوب معلوم ہوتی ہیں مگر وہ باطن میں معیوب ہوتی ہیں ۔ عقل اس کا ادراک نہیں کر سکتی ہے ۔ جو کچھ خدا کرتا ہے وہ خوب ہوتا ہے ۔ ہمارے حکم سے کب باد ہماری کشتی کے بادبان کو چلاتی ہے ۔ خدا ہمارے کہنے میں کب چلتا ہے ۔ جو کچھ دنیا میں سوز و ساز ہے اُس میں خدا تعالیٰ کا ایک راز ہے جو انسان کو نہیں معلوم ہوتا ۔ قضائے الٰہی پر آہ کرنا فرومایہ اور گمراہ کا کام ہے ۔ جو قضا کے ساتھ رضا نہیں رکھتا بخدا وہ خدا کو نہیں پہچانتا ۔ تن و جان مئے قضا سے مست ہونی چاہیے ۔ دل کو سو شکر بھیجنے چاہیئں ۔ خدا کا حکم و تقدیر بلا نہیں ہوتی ۔ جو کچھ وہ دیتا ہے عطا ہوتی ہے ۔ عشق الٰہی اسی کا نام ہے ، جو کچھ وہ کرے اُسی سے آدمی خوش ہو ۔

---

۱ ۔ اصل میں 'لیے' نہیں ہے ۔ مرتب

۱۲ - عشق

خوشتر آں باشد کہ سرّ دل براں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

دل میں عشق ایک چنگاری ہے جو کبھی بجھتی نہیں - وہ ایک بیماری ہے جو سودا و صفرا سے نہیں پیدا ہوتی - اس کا پانا نہایت دشوار ہے - اگر آدمی کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے تو وہ گھٹنے پر رکھ لیتا ہے ، سوئی لے کر تلاش کرتا ہے - جب وہ ملتا ہے تو اپنے لب سے تر کرتا ہے ، اُسے نکالتا ہے - جب پاؤں کا کانٹا پانا اتنا دشوار ہو تو دل میں جو کانٹا چبھا ہو اُس کا دریافت کرنا کیوں نہ دشوار تر ہوگا - جیسے لکڑی کے دھوئیں[1] کی بو لکڑی کو بتلا دیتی ہے ، ایسے ہی یہ دل کی بیماری اپنے سبب کو بتلاتی ہے - علت عشق[2] اور علتوں سے جدا ہوتی ہے - عشق اسرار الٰہی کا اسطرلاب ہے - عشق ہی سے خود عشق اور عاشقی کا بیان ہوتا ہے - آفتاب ہی دلیل آفتاب ہوتا ہے -

۱۳ - محبت کیا کرتی ہے ؟

محبت کیا کرتی ہے ؟ تلخ کو شیریں ، مس کو زر ، دُرد کو صاف ، درد کو شافی ، خار کو گل ، سرکے کو مُل ، دار کو تخت ، سنگ کو روغن ، آہن کو موم ، سقم کو صحت ، قہر کو رحمت ، مردہ کو زندہ ، شاہ کو بندہ ، غم کو شادی ، غول کو ہادی ، نیش کو نوش ، شیر کو موش ، غرض محبت نتیجۂ دانش ہے -

۱۴ - تودد و تألف

تودّد و تألف سے مراد خلق خدا کے ساتھ شفقت سے ملنا ہے

---

۱ - اصل میں اس لفظ کی املا 'دھنوئے' ہے -

۲ - اصل میں 'علت عاشق' ہے - مرتب

دنیا میں یہ ملنا ہی بڑی چیز ہے - یار یار سے کسب کمال کرتا ہے ، جاہ و جلال حاصل کرتا ہے - یار یار کے ساتھ ہم جان و ہم تن ہوتا ہے ، روح و بدن کا سا پیوند ان میں ہوتا ہے - تن جان سے زندگی اندوز ہوتا ہے - جان تن کو بندگی آموز ہوتی ہے - تن بے جان مردار ہے اور جان بے تن بے کار ہے - صحبت ہی سے گل کی پانی گلاب بنتا ہے - گل و ریحان پر جب صبا چلتی ہے تو تیرے[1] دماغ کو معطر کرتی ہے ، جب خس و خار پر چلتی ہے تو تیری آنکھ کو انگار کرتی ہے - جب تو لوگوں کی صحبت میں نشست کرے تو بزرگوں کی صحبت میں ادب سے بیٹھ اور ان کے[2] نیک و بد کو نیک ہی خیال کر، کیوں کہ وہ بد کام کرتے ہی نہیں - اُن کی باتوں سے ایمان اور دین کو سیکھ - رفیقوں کے ساتھ مروت سے پیش آ ، ان کے ساتھ ایثار اور فتوت اختیار کر - جب ان کا عیب پردے سے باہر ہو تو اپنی آنکھ کو اس سے پردے کے اندر کر لے - اپنے سے کم تروں کے ساتھ شفقت کر ، اگر وہ خطا کریں اُن کی رہنمائی پند و نصیحت سے کر - اگر تو نیک آدمیوں کی صحبت میں بیٹھنا چاہتا ہے تو نیک بن - ایک خوے نیک تجھے اس لائق کردے گی کہ تو نیکوں میں بیٹھے -

۱۵ - اتفاق

خدا تعالیٰ مسبب آثار اتفاق ہے ؛ یعنی اُس نے اتفاق کو مسبب بنا کر ساری دنیا کو پیدا کیا ہے - اُس نے کل اپنی کائنات کا مدار اتفاق پر رکھا ہے - موالید ثلاثہ یعنی حیوانات ، نباتات جمادات کی بقا اتفاق پر موقوف ہے - نر مادہ میں ، بیج و ہوا ،

---

۱ - اصل میں 'تیری' تھا -

۲ - اصل میں 'کے' نہیں تھا - مرتب

زمین ، پانی ، روشنی میں ۔ عناصر میں اگر اتفاق نہ ہو تو حیوانات اور نباتات کی کوئی نسل باقی نہیں رہ سکتی ہے ۔ جمادات میں کوئی چیز جلوہ گر نہیں ہو سکتی ہے ۔

غرض اگر اتفاق نہ ہو، دنیا کی ساری چیزیں معدوم ہوجائیں یا عدم و[1] وجود اُن کا یکساں ہو جائے ۔ پس یہی حال انسان کے اخلاق کا ہے کہ اگر دل کو اتفاق سے انفاق ہوا تو ساری بھلائیاں جلوہ گر ہونے لگیں اور اگر نفاق سے اتفاق ہوا تو ساری برائیاں ظاہر ہونے لگیں ۔ ظاہر و باطن میں یک‌جہتی اور دل و زبان میں یکتائی نہ رہی ، دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ ۔ دل تاریکی سے بھر گیا ، دوستی کے لباس میں دشمنی کرنے لگے ۔ ظاہر میں برادری کے ساتھ رنج و شادی میں شریک مگر دل میں اَوروں کے رنج سے خوش اور خوشی سے ناخوش ۔ ظاہر میں بڑوں کی تعظیم مگر دل میں حقارت ۔ زبان سے کہتے ہیں ابّا[2]، دل میں دغا ، زبان سے نیک خواہ دل سے بدخواہ ۔ بہ ظاہر بچوں کے زبان سے بوسے لیں اور دل میں کوسیں ، دغا کریں ، کہیں کہ یہ دل لگی کی بات تھی ۔

جس قوم میں نفاق کی وبا پھیل گئی وہ پایۂ عزت سے گر کر ذلت کے گڑھے میں گر گئی ۔ آس میں ایک دوسرے کا بد خواہ ، اپنے تفوق کے لیے بھائی‌بندوں کے آزار کے درپے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر بڑے بڑے جھگڑے قائم ۔ نہ ہمسائے کی مروت ، نہ دوستی کے حقوق کا خیال ، اخلاق اور علمی مجلسوں سے گریز ۔ غرض سعادت کی جگہ شقاوت ، نصیحت کی جگہ فضیحت ۔ کوئی کوشش

---

۱ ۔ اصل میں واؤ نہیں تھی ۔

۲ ۔ اصل میں صرف 'با' ہے ۔ قیاساً 'ابّا' پڑھا گیا ۔ مرتب

نہ شائستگی کے لیے نہ تہذیب کے واسطے ۔ زبان کو بدگوئی اور گالی گلوج میں مزہ ، کانوں کو اوروں کے عیب اور غیبتوں کے سننے کا شوق ۔ ہاتھ پاؤں کو اوروں کی ایذا رسانی میں جنبش ۔ غصہ آئے تو کبھی ٹھنڈا نہ ہو ، کسی سے عداوت و کینہ پڑ جائے تو پشت ہا پشت میں بھی انتقام کا خیال فرو نہ ہو ۔ کوئی احسان کرے تو احسان نہ مانیں ، اگر کوئی نیکی کرے تو اس سے بدی سے پیش آئیں ۔ غرض سارے کام وہ کرتے ہیں جس سے سوائے ذلت و رنج کے کچھ اور نہ حاصل ہو ۔

اب ان سب برے کاموں کے برخلاف بھلے کام اتفاق کراتا ہے کہ دل کو روشن کرتا ہے ، ظاہر و باطن کو ایک بنا دیتا ہے ۔ سارے کام وہ کراتا ہے جس سے قومی عزت حاصل ہو ۔ اگر سلطنت ہو تو اس کو تقویت ہو ۔ جس قوم میں اتفاق پیدا ہو گیا، ساری اچھی چیزیں پیدا ہو گئیں ۔ دولت و عزت پانے کے لیے منصوبے ، علمی مجلسوں میں گہما گہمی ، علوم و فنون کی مجلسوں میں گرما گرمی ، دوستوں کی محفلوں میں چہل پہل ، تجارت کی جماعتوں میں دولت کی ریل پیل ، اتحاد و وداد کو رونق ، اختلاف و نفاق کا منہ فق ، خستہ دلوں کے واسطے شگفتگی کا سامان ، غم زدوں کے واسطے شادی کا اسباب مہیا ۔ اگر کہیں عداوت کی آگ سلگی تو سب پانی لے کر اس کی طرف دوڑے اور فوراً اس کو بجھا دیا ۔ قومی ہم دردی ، قومی اتحاد و باہمی ارتباط؛ قومی موافقت سے دین و دنیا کی ساری نعمتیں انسانوں کو حاصل ہوتی ہیں ۔ نفاق سے حسد ، بغض ، کینہ ، خبث باطن ، غرض وہ باتیں کہ جن سے نہ عزت حاصل ہو نہ دولت نہ حکومت ۔ ہمارے ملک میں نفاق کو رونق ہے اس لیے ہمارے سب کام بے رونق ہیں ۔ ہم ایک دوسرے پر حسن ظن نہیں رکھتے ہیں ، ساتھ مل کر کوشش نہیں

کرتے - کسی شخص کو بخت و اتفاق سے کوئی جاہ و منصب حاصل ہو گیا تو اس کی تذلیل و تحقیر کے درپے ہوتے ہیں ؛ اس کی قدر و منزلت نہیں کرتے -

نفاق تختۂ تہذیب کو الٹ دیتا ہے - تہذیب درجہ بدرجہ آشتی محبت سے ترقی پزیر ہوتی ہے جو صلح و اتفاق کے ساتھ کی جاتی ہے - ذہن زمین ، اس کی زراعت تہذیب ہے جس کی سرسبزی اتفاق کے ہاتھ میں ہے - وہی سارے حاصلات اس کے پیدا کرکے لوگوں میں تقسیم کرتا ہے جس سے لوگ مرفہ الحال ہوتے ہیں -

۲ - مرد و زن کے قران و اتفاق سے بشر - آہن و[1] سنگ کے قران سے شرر - خاک و باراں کے قران سے میوے ، سبزے ، گل و ریحان - آدمی اور سبزے کے قران سے دلی خوشی و بے غمی و خرمی - خرمی و جان کے قران سے خوبی و احسان - خون اورخوشی کے قران سےگلگونی و سرخ روئی - عقل میں قوت اتفاق سے ، منافق کے کام میں قوت شیطان کے اتفاق سے پیدا ہوتی ہے -

---

۱ - اصل میں 'و آہن سنگ' تھا - مرتب

باب ششم

گناہ و توبہ

۱ - گناہ

کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں حکم الٰہی کی مخالفت کا نام گناہ ہے - یوں تو انسان کے اوصاف اور اخلاق بہت سے ہیں مگر جن خصلتوں سے کہ گناہ سرزد ہوتے ہیں ، وہ یہ چار ہیں : ربوبیت ، شیطانیت ، بہیمی ، سبعی -

صفتِ ربوبیت مقتضی ایسے امور کی ہوتی ہے جیسے کہ کبر ، فخر ، جابر ہونا ، اپنی مدح و ثنا کی محبت ، عزت ، تونگری ؛ ہمیشہ باقی رہنے کی محبت ، سب خلق پر بلندی چاہنا ، یہاں تک کہ ''انا ربکم الاعلیٰ[۱]'' پر نوبت پہنچائی - اس صفت سے ایسے گناہِ کبیرہ سرزد ہوتے ہیں کہ لوگوں کو اُن کی خبر بھی نہیں ہوتی اور ان کو گناہوں میں شمار نہیں کرتے حالانکہ وہ بڑے مہلک ہیں اور اکثر گناہوں کی جڑ ہوتے ہیں -

دوسری صفت شیطانی سے حسد ، سرکشی ، حیلہ ، مکر ، جھگڑے ، بری بات کا حکم کرنا ، کھوٹ[۲] اور نفاق پیدا ہوتے ہیں -

تیسری صفت بہیمی سے یہ قباحتیں متفرع ہوتی ہیں : شدتِ حرص ، طمع ، شہوت ، چوری ، یتیم کا مال ہضم کرنا ، مال حرام

---

۱ - یعنی میں ہی تمھارا بڑا رب ہوں -
۲ - اصل میں 'کھوٹا' تھا - مرتب

جمع کرنا ۔

چوتھی صفت سبعی ہے ۔ اس سے یہ برائیاں نکلتی ہیں : غضب ، کینہ ، لوگوں پر مارپیٹ ، گالی گلوچ کرنا ، قتل کرنا ، ضائع کرنا ۔

یہ چاروں صفات[1] بتدریج انسان میں پیدا ہوتی ہیں ۔ سب سے پہلے بہیمی صفت غالب ہوتی ہے اور اس کے بعد صفت سبعی ظاہر ہوتی ہے اور یہ دونوں جمع ہو کر عقل کو مکر و فریب اور حیلے میں لگاتے ہیں ، اور اس سے صفت سیطانی کا زور ہوتا ہے ۔ پھر سب سے آخر میں صفات ربوبیت ۔ غرض گناہوں کا مبداء اور عصیان کا منبع تو یہی چار باتیں ہیں ۔ پھر ان میں سے اعضا پر گناہ پھیل پڑتے ہیں ۔ بعض ان میں خاص دل کے متعلق ہوتے ہیں ، جیسے کفر و بدعت ، نفاق ، لوگوں سے برائی دل میں رکھنی ۔ بعض متعلق کان آنکھ سے ، بعض پیٹ سے ، بعض ہاتھ پاؤں سے ، بعض تمام بدن سے ۔

۲ ۔ خیر و شر کی تقسیم

واضح ہو کہ دنیا کے جتنے اسباب ہیں ان میں سے ہر ایک میں بھلائی کے ساتھ برائی ملی ہوئی ہے ۔ ان کی تین نوع ہیں : اول وہ جن کا نفع ضرر کی نسبت زیادہ ہو ؛ مثلاً مال و جاہ اور بعض اور اسباب بقدر حاجت اور کفایت ۔ دوسرے یہ کہ اکثر لوگوں کے حق میں اس کا ضرر نفع کی نسبت زیادہ ہو ، مثلاً مال و جاہ کثیرہ ۔ تیسرے یہ کہ ضرر و[2] فائدہ دونوں مساوی ہوں اور یہ وہ باتیں ہیں کہ لوگوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں ۔ بہت سے نیک بخت آدمی

---

۱ ۔ اصل میں 'صفت' تھا ۔

۲ ۔ اصل میں واؤ نہیں تھی ۔ مرتب

اس طرح کے ہیں کہ وہ بہت سے مال سے بہت فائدہ خود اٹھاتے ہیں اور اوروں کو نفع پہنچاتے ہیں - ان کے حق میں مال و جاہ نعمت ہے - اور بہت سے آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ تھوڑے مال سے ضرر پاتے ہیں ، یعنی ہمیشہ اس کو کم جانتے ہیں اور خدا سے شکوہ اور طلب زیادتی کی کیا کرتے ہیں - ان کے واسطے مال مصیبت ہے -

جتنی باتیں نیک ہیں وہ ایک اعتبار سے تین قسم کی ہیں : اول وہ جو بذاتہ مقصود و محبوب ہوں جیسے سعادات آخروی - دوسرے وہ کہ دوسری چیز کے پیدا کرنے کے لیے چاہتے ہوں جیسا کہ روپیہ ، اشرفی کہ اگر اس سے حاجت روا نہ ہو[1] تو روپیہ اشرفی اور پتھر کنکر برابر ہیں - تیسرے وہ کہ دونوں بذاتہ اور لغیرہ مطلوب ہوں ؛ مثلاً صحت و سلامتی کہ انسان اس لیے بھی چاہتا ہے کہ دین و دنیا دونوں کے کام اچھی طرح کر سکے اور وہ بذات خود بھی محبوب ہیں -

اب ایک اور اعتبار سے تین قسمیں کی جاتی ہیں : اول لذیذ جن کا نفع اسی وقت معلوم ہو - دوسری نافع جو اخیر کو مفید ہوں - تیسری جمیل جو سب احوال میں اچھی معلوم ہوں -

اور برائی بھی تین قسم کی ہیں : ضار ، قبیح ، ایذا رساں -

پھر خیر و شر کی دو قسمیں ہیں : مطلق و مقید -

خیر مطلق اس کو کہتے ہیں جس میں تینوں اوصاف کے خیر جمع ہوں جو اوپر مذکور ہوئے ، مثلاً علم و حکمت کہ ارباب حکمت و علم کے نزدیک وہ نافع بھی ہیں اور جمیل و لذیذ بھی - شر مطلق جیسے کہ جہل کہ وہ مضر و قبیح و ایذا رساں ہے -

---

۱ - اصل میں 'ہوں' تھا - مرتب

دوسری قسم مقید یہ ہے کہ جس میں کچھ اوصاف خیر کے اور کچھ اوصاف شر کے ملے ہوں ؛ مثلاً بعض اوقات ایک نافع چیز سے ایذا ہوتی ہے جیسے کوئی انگلی بےکار یا رسولی وغیرہ سے[1] کٹوا دئے ۔ اور کبھی نافع چیز قبیح ہوتی ہے جیسے کہ حمق کہ بعض اعتبار سے نافع ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے یہ قول مشہور ہے : ''استراح من لاعقل لہ'' یعنی بے عقل آدمی چین سے رہتا ہے کیوں کہ اس کو انجام کا اہتمام نہیں ہوتا ، اسی واسطے سردست راحت میں رہتا ہے ۔ کبھی کوئی چیز من وجہ مضر ہوتی ہے اور من وجہ نافع ہوتی ہے ؛ جیسے ڈوبنے کے خوف کے وقت مال کو دریا میں پھینک دینا کہ ہر چند اس سے مال کو ضرر ہوتا ہے مگر نفس کو نفع ملتا ہے کہ اس کی نجات ہو جاتی ہے ، یعنی بوجھ کے اتار ڈالنے سے کشتی بچ جاتی ہے ۔

۳ ۔ توبہ

انسان کے خمیر میں خیر اور شر آپس[2] میں ایسے مضبوط ملے ہوئے ہیں کہ ان کو آپس سے جدا کرکے خیر محض بن کر فرشتہ ہونا یا شر محض بن کر شیطان بننا[3] ناممکن ہے ۔ انسان بغیر گناہ کیے نہیں رہ سکتا ۔ انسان کی سرشت ایسی ہے کہ وہ شر سے خیر کی طرف اور خیر سے شر کی طرف رجوع کرتا ہے ۔ جب حضرت آدم[4] نے خطا کی اور بعد خطا کے توبہ کی ، یعنی خیر سے شر کی طرف اور پھر شر سے خیر کی طرف رجوع کی ، تو آدم زاد پھر کیوں نہ ایسا کرے کیوں کہ مثل مشہور ہے ''باپ پر پوت ، پتا

---

۱ ۔ اصل میں 'سے' نہیں ہے ۔
۲ ۔ اصل 'اکوس' غلط تھا 'آپس' صحیح ہے ۔
۳ ۔ اصل میں 'بنا' ہے ۔ مرتب

پر گھوڑا ، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا ۔"
جو شخص یہ جانتا ہے کہ گناہ کرنے سے دین و دنیا دونوں میں ضرر ہوتا ہے ، یہاں بھی اور وہاں بھی اُس سے کالا منہ ہوتا ہے اور اُس کا یقین دل پر غالب ہو جاتا ہے ، تو وہ جب گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل میں رنج و افسوس ہوتا ہے ، جس کو ندامت کہتے ہیں ۔ جب اس ندامت سے دل میں رنج غالب ہوتا ہے تو انسان قصد کرتا ہے کہ میں اس برے کام کو عمر بھر نہ کروں گا ۔ پس ان تینوں علم ، ندامت ، ارادۂ ترکِ فعل کے مجموعے کا نام توبہ ہے ۔ توبہ ایک ایسا نور انسان کے سامنے ہے کہ جس سے وہ تاریکیِ جہالت کو مٹا سکتا ہے ۔ ساری حرکات مذمومہ کو افعال محمودہ سے بدل سکتا ہے ۔ اس سے فقط یہی نہیں کہ وہ زمانۂ حال میں اپنے فعل بد کو چھوڑ دے گا بلکہ اُس کے استقبال میں اُس کے ترک کا ارادہ کرے گا ، گزشتہ کے لیے حزن و ملال کرے گا اور اُس کی مکافات کے درپے ہوگا ۔ جیسے آدمی زہر کھا جائے تو اُسی وقت قے کرکے معدے سے نکالتا ہے ، ایسے ہی انسان کو چاہیے کہ جس وقت گناہ سرزد ہو تو اُس کا توبہ سے علاج کرے ، نادم ہو اور آئندہ اُس کے ترک کا ارادہ کرے ۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو زہر کا اثر چڑھ جائے گا اور پھر وہ لاعلاج ہو جائے گا ۔ جہاں انسان نے گناہوں کی عادت اختیار کی ، پھر دل میں نہ ندامت پیدا ہو ، نہ ترک گناہ کا ارادہ ہو ۔ اگر ارادہ بھی ہو تو گناہ کا چھوڑنا پھر اختیار سے باہر ہو جاتا ہے ۔
ہر انسان کو توبہ کرنی ضرور ہے ۔ اس لیے کہ ہر شخص کے اعضا گناہ سے خالی نہیں ۔ ممکن نہیں کہ آنکھوں سے وہ کسی کو بری نگاہ سے نہ دیکھے یا بری بات کانوں سے نہ سنے ، پاؤں سے بری راہ میں نہ چلے ۔ اگر اعضا کے گناہ سے بعض وقت بچ جائے گا

تو دل سے گناہ کرنے کے قصد سے نہیں بچے گا - اگر تو دل میں قصدِ گناہ نہ کرے گا تو اور وسوسوں سے نہیں بچے گا - خیالات پریشان دل میں آئیں گے - اگر ان وسوسوں سے بھی بجات ہو تو خدا تعالی اور اُس کی صفات و افعال کی واقفیت میں غفلت و قصور کرے گا -

غرض ان سب خطاؤں سے بچنا انسان کا محال ہے - آدمی کے دل پر گناہ کرنے سے تاریکی ایسی آتی ہے جیسے کے آئینے پر منہ کی بھاپ سے - گناہ متواتر کرنے سے دل ایسا سیاہ ہو جاتا ہے جیسا آئینہ مورچہ لگنے سے یا متواتر منہ کی بھاپ لگنے سے - جس طرح آئینے کی صفائی کے لیے یہی کافی نہیں ہے کہ اُس پر آگے کو بھاپ اور سیاہی نہ ڈالیں ، بلکہ پہلی بھاپ اور زنگ کو مٹائیں ، جب اُس میں صورت نظر آئے ؛ اسی طرح جلائے دل کے لیے یہی بات کافی نہیں کہ اتباع شہوت آئندہ کے لیے چھوڑ دیں بلکہ ضرور ہے کہ جو تاریکی پہلے گناہوں کے سبب سے دل پر آگئی ہے اُس کو بھی مٹائیں - اور یہ مٹانا اس طرح ہو سکتا ہے کہ آدمی نیکیاں کرے - نیکی کا نور چہرۂ دل سے بدی کی تاریکی کو دور کر دیتا ہے اور اس نور کے سامنے معاصی کی تاریکی کی کچھ تاب نہیں ، جیسے رات کا اندھیرا دن کے اجالے کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا یا جیسے میل کی کدورت صابون کی سفیدی کے سامنے نہیں رہتی -

جو شخص یہ کہتا ہے کہ دل سے بدی کی کدورت کو نیک کام نہیں دور کرتے ، وہ یہ کہتا ہے کہ آفتاب سے اندھیرا نہیں جاتا ، یا صابون کے دھونے سے کپڑے کا میل نہیں چھوٹتا - مگر ہاں یہ سچ ہے کہ اگر میل کی تہہ کپڑے کے جگر میں گھس جائے تو پھر صابون سے اُس کو دور نہیں کر سکتے - اسی طرح اگر گناہوں کے پے در پے کرنے سے دل پر بڑا زنگ لگ گیا ہے

تو توبہ سے بھی وہ نہیں چھوٹے گا۔ گو ایسے گناہ‌گار زبان سے توبہ توبہ کہتے ہیں مگر اُن کے دل میں ندامت اور ترک گناہ کا خیال نہیں آتا۔ دھوبی کی زبانی کہنے سے کہ کپڑا دھل گیا، کپڑے کی میل نہیں چھوٹنے کی، بلکہ جب وہ اُس کے چھٹانے کی تدبیر کرے گا تو دور ہوگی اور کپڑا اُجلا ہوگا۔

جو لوگ دنیا پر گرے ہوئے ہیں اور خدا سے پھرے ہوئے، اُن کا حال ایسا ہی ہے کہ زبان پر توبہ، دل میں گناہ۔ جو شخص گناہ سے دل میں نادم ہوتا ہے، اس پاس گناہ بھی آتے ہوئے شرمندہ ہوتے ہیں، دور ہی سے بھاگتے ہیں۔ نیکی کو بدی ایسا ہی مٹاتی ہے جیسے کہ پیاس کو پانی بجھاتا ہے۔

۴۔ توبہ کی ہدایت

ایک وقت تجھ پر ضرور ایسا آئے گا کہ دوست تجھ پر غم کریں گے، دشمن خوش ہوں گے۔ وارثوں کا حلقہ تیرے سر کے گرد ہوگا۔ ظاہر میں گریاں اور دل میں خنداں ہوں گے۔ تیرے مال لینے کی فکر میں ہوں گے۔ تیرے اعمال کا خیال اُن کو کچھ نہ ہوگا۔ پہلے اس سے کہ یہ واقعہ تجھے پیش آئے، تُو توبہ سے اپنا چارہ کر، ہوا و نفس پرستی سے دست کش ہو۔ جو کچھ برا کیا ہو اُس سے باز رہ اور پشیمان اور اشک افشاں ہو۔ پھر خطا و جفا و عصیان کی سرحد میں قدم نہ[1] رکھنے کا عہد و پیمان کر۔ اس توبہ کے باغ کے سب گل یک رنگ ہیں، سب مرغ اس کے ہم‌آہنگ ہیں۔ اس کا جو میوہ اس سال میں کھائے گا وہی دوسرے سال میں چکھے گا۔ جو کار بار بار کیا جاتا ہے اُس میں مزہ نہیں رہتا۔ پس معاصی کے مزے کیا بار بار چکھتا ہے، توبہ

۱۔ اصل میں 'نہ' نہیں ہے۔ مرتب

کا بھی مزہ چکھ کہ وہ بہت لذیذ ہے - توبہ کے بعد چاہیے کہ
پھر تیری طبیعت گناہ کی طمع نہ کرے -

توبہ تو آدمی کی خاصیت میں داخل ہونی چاہیے، اس لیے
کہ وہ حضرت آدمؑ کی اولاد ہے جنھوں نے خطا پر خود توبہ کی
ہے - پس چہرے کو خاک نیاز سے پُر گرد اور خون جگر سے
رنگین کر - میل گنہ کے حرف کو دل سے نراش اور خدا کے
آگے ہاتھ دعا کے لیے اُٹھا کہ اے خطا بخش! تو میری خطا کو
معاف کر ، میں اب گناہ سے توبہ کرتا ہوں - گناہ کی آگ نے
میرے دل کو جلا کر کباب کیا ہے ، تُو میرے دل پر توبہ کا
دروازہ کھول دے اور اُس کا اثر میرے دل پر ڈال دے - ہمارا
کام گناہ ورزی ہے تیرا کام گناہ آمرزی ہے - توبہ کرنا ہماری نہاد
میں ہے مگر اُس کی کشاد تیرے ہاتھ میں ہے - ہم جو گناہ کے
جنگل میں گمراہ ہوئے ہیں ، سوائے توبہ کے کوئی ہمارا رہ‌نما نہیں -
پس تو توبہ کی اور اُس پر ثبات کی توفیق دے اور اس توبہ کی
نخوت کو بھی ہمارے دماغ سے نکال کیوں‌کہ اس توبہ پر مغرور
ہونا بھی گناہ ہے -

۵ - توبہ کا قبول ہونا

باز آ باز آ ہرانچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

تو گناہ کے پیڑ لگائے تو اُن کو توبہ کا پانی دے ، جس سے
حزون ندامت کا پھل آئے - ندامت کے جھروکے پر بیٹھ کر اپنے
گناہوں کے صحیفے کو پڑھنا شروع کر ، جس کا نتیجہ یہ ہوگا
کہ نفس پر خوف چھائے گا اور اُس سے نا اُمیدی کی خندق کو

ٹ لیے گا۔ ہوائے نفسانی کے پلوں سے[1] اُتر کر میدان علم میں
چے گا اور چشمۂ حکمت سے سیراب ہوگا اور ہوشیاری کی کشتی
، سوار ہو کر نجات کا بادبان چڑھائے گا اور بحر سلامت میں
کر اُٹھا کر ساحل راحت اور عزت و کرامت پر پہنچ جائے گا۔

۹ ۔ توفیق ، ھدایت ، رشد ، عصمت

ہر شخص کو توفیق کی ضرورت ہے۔ توفیق کے معنی یہ ہیں
ہ بندے کے ارادے اور قضا و قدر الٰہی میں تالیف ہو اور ربط
۔ اور ربط کا ہونا خیر و شر دونوں میں شامل اور سعادت و
اوت دونوں میں داخل ہے۔ مگر عادت یہ ہوگئی ہے کہ توفیق
ص اس کو کہتے ہیں جو قضا و قدر سعادت کے موافق ہو۔
حال توفیق کی حاجت ہونے میں کچھ شک نہیں ، جیسا حضرت
خ سعدی فرماتے ہیں :

از حق نہ توفیق خیرے رسد کے از بندہ خیرے بغیرے رسد

ہدایت کا حال یہ ہے کہ اُس کے بدون کوئی شخص سعادت
طالب نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے کہ انسان کا ارادہ کبھی ایسی
ز کی طرف ہوا کرتا ہے جس میں اُس کی آخرت کی بہتری ہو
کن جب یہی نہ جانتا ہو کہ میری صلاح و بہتری کس چیز
ں ہے ، یہاں تک کہ فساد کی شے کو بہتری کی چیز جان لے، تو
ف ارادے سے کیا نفع ہوگا۔ غرض کہ ارادہ اور قدرت اور
باب سے جب تک عقل خیر و شر کا طریقہ نہ بتائے ، کچھ فائدہ
ں ہوتا۔

رشد سے مراد وہ عنایت الٰہی ہوتی[2] ہے جو انسان کو

---

[1] ۔ اصل میں 'سے' کی بجائے 'کو' تھا۔

[2] ۔ 'ہوتی' سے پہلے ایک 'ہے' اصل میں زائد تھا جسے حذف کر دیا
گیا ۔ مرتب

اپنے مقصد کی طرف متوجہ ہونے کے وقت مدد کرتی ہے جس کو تائید کہتے ہیں ؛ یعنی اگر مقصد مذکور میں اس کی بہتری ہوتی ہے تو اس کو قوت دیتی ہے اور اگر اس کے حق میں برائی ہوتی ہے تو اس کو سست کر دیتی ہے ، اس کو تسدید کہتے ہیں -

عصمت کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کے دل میں وہ عنایت پروردگار ہو جس کے باعث آدمی خیر پر جرأت کرنے پر اور شر سے احتراز کرنے پر قادر ہو - گویا کوئی اندرونی روکنے والا بیٹھا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا -

غرض یہ نعمتیں توفیق ، رشد ، ہدایت ، عصمت کی جب آدمی کو میسر ہوتی ہیں کہ فہم صاف و تیز ہو ، گوش حق نیوش ، دل بصیرت منزل ، تواضع گزیں ، مراعات آئیں ہو ، استاد خیر خواہ ملے ، مال اتنا ہو کہ اس کی کمی کے باعث مہمات و ضروریات سے قصر ہو ، نہ کثرت کی جہت سے مانع اشغال دینی ہو ، اور عزت اتنی ہو کہ جس سے احمقوں کی جہالت اور اعدا کے ظلم سے بچا رہے -

---

باب ہفتم

دنیا و محبت دنیا

۱ ۔ دنیا کی محبت

بزرگان دین کا ارشاد ہے کہ دنیا کی خباثت میں سے ہے کہ آدمی اُس کے لیے خدا کی نافرمانی کرتا ہے ، اور جب تک یہ نہیں چھوٹتی آخرت نہیں ملتی ۔ دنیا کو گزرگاہ سمجھو اور مسافروں کی طرح اس پر سے گزر جاؤ ، عمارت وغیرہ نہ بناؤ ۔ اور جان رکھو کہ سب برائیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک گھڑی کی خواہش نفس بہت دنوں کے رنج کا موجب ہوتی ہے ۔ بعضوں کی خود طالب دنیا ہے اور بعض دنیا کے طالب ہیں ۔ جو لوگ طالب آخرت ہیں ، اُن کی تو زندگی بھر دنیا طالب ہے اور جو طالب دنیا ہیں اُن کو آخرت بلاتی رہتی ہے ، یہاں تک کہ موت آن کر گردن پر سوار ہو جاتی ہے ۔ آدمی کہا کرتا ہے کہ یہ میرا ہے ، یہ میرا ہے ، حالاں کہ اس کا اُس قدر ہے جو کھانے میں کھو دیا یا پہن کر اُڑا دیا یا خیرات دے کر جمع کر دیا ۔

صلحا کے نزدیک دنیا ایسی ذلیل ہے جیسے کہ جذامی کے ہاتھ میں استخوان خوک بے گوشت ، یا ٹڈی کے منہ میں سبزی ۔ دنیا اُن کے سامنے کیسے ہی بن سنور کر آئے ، وہ اُسے منہ نہیں لگاتے ۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ کسی کے پاس نہیں رہے گی اور نہ کوئی اُس پاس رہے گا ۔ انسان کے دل میں دنیا و آخرت کی محبت

کا جمع ہونا ایسا ہے جیسے ایک برتن میں پانی اور آگ کا جمع ہونا۔ یہ دو بیگانے کبھی آپس میں نہیں ملتے۔ دو[1] مخالف نغمے ایک تار سے نہیں نکلتے، ایک بام پر دو ہوائیں نہیں ہوتیں۔

حضرت امیرالمومنین کا قول ہے کہ دنیا و آخرت بہ منزلہ مشرق و مغرب کے ہیں۔ چلنے والا جتنا ایک کے نزدیک ہوتا ہے، دوسرے سے دور ہوتا ہے۔ دنیا میں سلطنت بغیر کشت و خون و ظلم کے، تونگری بدون فخر اور بخل اور محنت کے نہیں حاصل ہوتی۔ دنیا کو لوگ اس طرح چاہتے ہیں جیسے کہ بچہ ماں کو چاہتا ہے کہ جب سامنے آئی خوش ہو گیا اور جب چلی گئی تو رنجیدہ ہو کر رونے لگا۔ جو لوگ دنیا سے محبت نہیں کرتے، خدا ان سے محبت کرتا ہے۔ اکثر آدمی آخرت کی خیر و شر کو ایسا یقینی نہیں جانتے جیسے کہ دنیا کی بھلائی برائی کو جانتے ہیں۔ آخرت غائب ہے دنیا موجود ہے، اس لیے نقد سردست کی محبت غالب ہے۔ یہ وجہ محبت نہایت پوچ ہے کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو امور آدمی کے سامنے نہیں ہوتے اور صرف موہوم ہوتے ہیں ان کے لیے صدہا طرح کی مصیبتیں آدمی اٹھاتا ہے اور رنج دکھ سہتا ہے اور بہت طرح کی حرکتیں اس کے حصول کے لیے کرتا ہے۔ ذرا سی ملنے پر انسان بشاش بشاش ہوتا ہے اور تھوڑی سی چیز کے نقصان پر رنجیدہ اور افسردہ۔ مگر دین کے نفع و نقصان سے اس کو ایسی شادی و غم نہیں ہوتے:

مال دنیا دام مرغان ضعیف
ملک عقبیٰ دام مرغان شریف

---

۱ - 'دو' سے پہلے لفظ 'یہ' زائد تھا جسے حذف کر دیا گیا - مرتب

سوے دریا عزم کن زین آب گیر
بحر جوی و ترک این گرداب گیر

جیسے مریض کی اشتہاے طعام، جس پر مدار زندگی ہوتا ہے ، جاتی رہتی ہے تو لذیذ کھانا بھی برا معلوم ہوتا ہے ، ایسا ہی جو دل حبِ دنیا کی حرص میں مبتلا ہے وہ یاد الٰہی[1] ، جس پر حیات جاودانی منحصر ہے ، بھول جاتے ہیں ، اُس کے ذکر کے قریب نہیں جاتے ۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو فرمایا کہ دنیا ایک گہرا سمندر ہے ، اُس میں بہت سے لوگ ڈوب گئے ، تم اپنی کشتی دنیا میں تقوے اور ایمان کو بناؤ اور توکل کا بادبان چڑھاؤ تا کہ اس بوجھ سے نجات پاؤ ۔ دنیا ہڈیوں کو پرانا کرتی ہے اور اُمیدوں کو نیا اور موت کو نزدیک کرتی ہے اور آرزو کو دور ۔ جس کو ملتی ہے مشقت میں پڑتا ہے اور جس کو نہیں ملتی وہ رنج اُٹھاتا ہے :

بلائے زین جہان آسوب تر نیست
کہ رنج خاطر ست ار ہست وگر نیست

۲ ۔ ایک حکیم کہتا ہے ''دنیا تھی اور میں نہ تھا اور وہ رہے گی اور میں نہ رہوں گا ۔ میں اُس کی طرف رغبت نہیں کرتا اس لیے کہ اُس کی زندگی تلخ ہے اور اُس میں کدورت کا نام صفائی ہے ۔ اہل دنیا کو ایک نہ ایک خوف لگا رہتا ہے ، خواہ نعمت کے دور ہونے کا ، یا مصیبت کے آنے کا ، یا موت کے کام کر جانے کا ۔''

بعض کا قول ہے کہ یہ دنیا کے عیبوں میں سے ہے کہ کسی

---

۱ ۔ اصل میں 'یاد الٰہی' کے بعد 'ہے' زائد معلوم ہوا جسے حذف کر دیا گیا ۔ مرتب

کو استحقاق کے موافق نہیں دیتی - کمی بیشی خواہ مخواہ ہوتی ہے - نااہلوں کے حوالے کی گئی ہے - جو دنیا کو محبت سے طلب کرتا ہے، جتنی اس کو ملتی ہے، اس سے زیادہ کا[1] طالب ہوتا ہے :

گفت چشم تنگِ دنیادار را یا قناعت پُر کند یا خاک گور

یحییٰ بن معاد کا قول ہے کہ دنیا شیطان کی دکان ہے، اس میں کچھ مت چراؤ، نہیں تو وہ تمھارے پیچھے لگے گا اور پکڑ لے گا -

حضرت فضل کا قول ہے کہ اگر دنیا سونے کی ہوتی اور فنا ہو جاتی، اور آخرت ٹھیکری ہوتی اور باقی رہتی، تو بھی عقلا کو یہی چاہیے کہ باقی چیز کو پسند کرتے اور فانی کو چھوڑتے - مگر اب تو یہ فانی چیز ٹھیکری ہے اور باقی چیز سونے کی - معلوم نہیں کیوں انسان واہیات چیز کو عمدہ چیز سے زیادہ پسند کرتا ہے - انسان کو دنیا سے ایسی محبت ہے کہ سارے دن اس کا ذکر کیا کرتا ہے -

۳ - اکثر آدمیوں کا یہ حال ہے کہ نہ کچھ دنیا کے مزے اڑاتے ہیں، نہ کچھ دین سے کام رکھتے ہیں - نہ عقبیٰ کے اجر کی امید پر دنیا کو چھوڑے ہیں، نہ دنیا سے زیادہ خدا کے عاشق ہوتے ہیں - بعضوں کا قول ہے کہ دنیا مردار ہے، جو کوئی اس میں سے کچھ لینا چاہے تو کتوں کے ساتھ رہنے پر صبر و تحمل کرے - اور دنیا کی برائی میں حافظ شیراز فرماتے ہیں :

مجو درستیِ عہد از زمانِ سست نہاد
کہ این عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

---

۱ - اصل میں 'کا' ندارد - مرتب

قریب عشوۂ حسن از جہان پیر مخور
کہ ہر کہ کرد بہ او اختلاط ناشاد است

۴ - دنیا ایک دوست کے لباس میں دشمن ہے - حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ ایسے مکان کی کیا تعریف کروں کہ جو اس میں تندرست ہے، بیماری سے نڈر نہیں، جو بیمار ہو تو نادم ہو اور جو مفلس ہو جائے تو غم کرے اور تونگر ہو تو بلا میں پھنسے - مال حلال ہو تو حساب دینا پڑے اور حرام ہو تو عذاب میں مبتلا ہو -

۵ - دنیا ایک جادوگرنی ہے، وہ تھوڑا بہت سب کے دلوں پر جادو کرتی ہے - حضرت ابو سلیمان کا قول ہے کہ جب آدمی کے دل میں آخرت ہوتی ہے تو دنیا اس کا مقابلہ کرتی ہے، لیکن اگر دنیا دل میں ہوتی ہے تو آخرت مقابل نہیں ہوتی - اس لیے کہ آخرت شریف ہے اور دنیا کمینی، کمینے کا مقابلہ شریف نہیں کیا کرتا -

سیار بن حکم فرماتے ہیں کہ دنیا و آخرت دونوں دل میں اکٹھے ہوتے ہیں ؛ اُن میں جو غالب ہو جاتی ہے، دوسری اس کی تابع ہو جاتی ہے -

حضرت مالک دینار کا قول ہے کہ جتنا دنیا کے لیے تردد کرو اتنا ہی آخرت کی فکر دل سے جاتی رہتی ہے، اور جتنا آخرت کا تردد کرو اُتنا ہی دنیا کی فکر دل سے ٹل جاتی ہے -

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ دنیا اور آخرت دو سوکنیں ہیں - جس قدر ایک راضی ہوگی، اُسی قدر دوسری ناخوش ہوگی -

۶ - دنیا میں بے شک[1] بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے

---

۱ - 'بیشک' سے پہلے ایک 'بے' زائد تھا - مرتب

نزدیک دنیا خاک پا سے بھی زیادہ ذلیل ہوتی ہے - اُن کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ دنیا کدھر سے آئی اور کدھر چلی گئی ، کس کے پاس رہی اور کس کے پاس سے جاتی رہی -

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ دنیا ہشیاروں کے لیے غنیمت ہے اور جاہلوں کے لیے غفلت ، یعنی دانا آدمی اس میں اعمال نیک کرنے کو لوٹ اور مفت سمجھتے ہیں اور نادان ان کو پہچانتے نہیں -

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ جب سے تو دنیا میں پیدا ہوا وہ ہٹتی چلی جاتی ہے اور آخرت منہ کے سامنے آتی جاتی ہے - پس اپنے تئیں وہاں پہنچا جو نزدیک اور ساتھی ہے ، دور کی جگہ جانے سے کیا فائدہ -

۷ - دنیا میں انسان پر رات دن گزرے جاتے ہیں - کبھی مصیبت ہے کبھی راحت ہے - جب آدمی دنیا سے جاتا ہے تو اس کو یہ حسرتیں ہوتی ہیں کہ جو جمع کیا تھا اس سے سیر نہ ہوا ، جو تمنا تھی وہ پوری نہ ہوئی ، آخرت کا توشہ تیار نہ ہوا - دنیا میں تونگر وہی ہے جو دنیا کی غلامی سے آزاد ہو جائے -

ایک حکیم سے کسی شخص نے پوچھا کہ دنیا کسے ملتی ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ جو اسے چھوڑ دے - پھر پوچھا کہ آخرت کس کو ملتی ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ جو اُس کو طلب کرے -

بکر بن عبداللہ کا قول ہے کہ جو کوئی دنیا کو اس غرض سے چاہے کہ مجھے دنیا کی حاجت نہ رہے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی آگ کو گھاس سے بجھانا چاہے -

۸ - حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ دنیا میں چھ چیزیں ہوتی ہیں : کھانا ، پینا ، پہننا ، سواری ، نکاح ، خوشبو - سب کھانوں میں عمدہ شہد ہے ، وہ مکھی کا لعاب ہے - پینے کی

چیزوں میں اچھا پانی ہے جس میں سب نیک و بد برابر ہ
پوشاک میں حریر افضل ہے ، وہ کپڑوں کے ریشم سے بنتا ہے
اور سواریوں میں افضل گھوڑا ہے جس پر لڑائی میں مارے ج
ہیں ۔ اور منکوحات میں اشرف عورت کی صحبت ہے جو پیشاب
کا پیشاب گاہ میں جانا ہے ۔ سونگھنے کی چیزوں میں عمدہ مشـ
ہے جو حیوان کے خون سے بنتا ہے ۔ غرض سب چیزیں ایسی
واہیات ہیں ۔

۹ ۔ دنیا میں کوئی دم شادی ۔. غم نہیں ہوتی اور کـ
خوش حال بے ملال نہیں ہوتا۔ ہر عشرت میں اس کی زہر حسرت
اور ہر سرور میں اس کے شر و شور ۔

خرمی ۔. غم نمی باشد درین باغ خراب
خندہ گل دارد از پے اسک ریزان گلاب

دنیا جائے محنت ہے نہ جائے راحت۔ ہر سود میں زیان ،
کمال میں نقصان ، ہر گنج پر مار رنج ، دانۂ طرب کے سا
دام تعب ۔

۱۰ ۔ حُبِ دنیا کے اصول اور فروع

دنیا کو یوں سمجھو کہ ایک درخت ہے جو وسوسہ پا
شیطانی کی باغبانی سے نشو و نما پاتا ہے، اور شہوات اور آرزوؤں
ریشے دل میں دوڑا کر محکم کرتا ہے ، اور صفات ذمیمہ کی شا
در شاخ نکالتا ہے ۔ ارتکاب گناہ کے شگوفے کھلاتا ہے ۔ جن
ثمرہ سوائے رحمت الٰہی کی نا امیدی کے کچھ اور نہیں ہوتا ۔ اس
شجر کو مواعظ اور نصائح کے تیشے سے کاٹو ۔

۱۱ ۔ تمام نفسانی شہوتیں اور آرزوئیں سات قسم کی ہیں :
اول شہوت جاہ و جلال ۔ دوم شہوت ملک و مال ۔ سوم شہوت
عمارات و مکانات عالی شان ۔ چہارم شہوت معاشرت شاہدان زیبا .

پنجم شہوت اطعمہ و اشربۂ خوشگوار ۔ ششم شہوت البسہ و اقمشۂ فاخرہ ۔ ہفتم شہوت مجالست و مصاحبت ظرفا و ندمائے شیریں کار اور ساقی شوخ کے ہاتھ سے بادۂ گلنار اور عمر گراں بہا کو رود و سرود و لہو و لعب میں گزارنے کی ۔

ان شہوتوں کے ریشہ و دانہ سے یہ صفات ذمیمہ پیدا ہوتی ہیں : اول تکبر ، دوم بخل ، سوم غضب ، حقد و حسد ، چہارم طمع ، پنجم ریا و سمعہ ، ششم ظلم ، ہفتم تند خوئی ۔ ان سب صفات ذمیمہ کے ریشوں کے کاٹنے کے لیے ہم نے اپنے بیان کو تیشہ بنایا ہے ، جا بجا دیکھ لو کہ وہ ان کو کاٹتا چلا جاتا ہے ۔

۱۲ ۔ دنیا کی مذمت کے باب میں نصیحتیں اور مواعظ

بعض اکابر کا قول ہے کہ زندگی پر مت بھولو ۔ خدا سے ڈرو ، نیک عمل کرو ۔ دنیا کے طالب نہ ہو ، نہ اس پر راغب ہو ۔ دنیا بڑی مکار اور دغا شعار ہے ۔ اول اپنے مغالطوں کو چکناتی ہے ، پھر آرزوؤں کے جال میں پھنساتی ہے ۔ اپنا بناؤ سنگار وہ دلھن کی طرح دکھاتی ہے ، اس پر سب کی نگاہ پڑتی ہے ، اس پر دل و جان سے شیفتہ و فریفتہ ہوتے ہیں ۔ وہ اپنے عاشقوں کو خاک میں ملاتی ہے ، جو اس پر بھروسا کرتا ہے ، اس کو وہ رسوا کرتی ہے ۔ اس میں آفتیں بہت ہیں ۔ اس کا ہنر شر ہے ، اس پر عاشق ہونا سراسر خطا ہے ۔ وہ تیرے لیے عطائے حق نہیں ہو سکتا ۔ وہ ایک اژدہا ہے جس نے تیرے باپ دادا کو کھایا ہے ، تو اس کو اپنے پاس نہ بلا ۔ کبھی تو اس پدر کش سے خوش نہیں ہو سکتا ۔ اس سے آزار پر آزار پہنچتا ہے ، اس کی راہ میں دین نشو و نما نہیں پا سکتا ۔ یقین کو تاب و تابش نہیں ہوتی ۔ اس نے اپنے تئیں حور بنا رکھا ہے ، بہت چابک و تر و تازہ و خوش و نغز معلوم ہوتی ہے ۔ مگر دین کی نظر میں وہ زنگیِ درشت رو

و بد چشم نظر آتی ہے - عاقلوں کے نزدیک اس کا منہ کالا اور بال سفید ہیں - وہ اپنے مہندی[1] لگے ہوئے ہاتھ میں ایک جام زریں رکھتی ہے جس میں تیری جان کے واسطے زہر گھلا ہوا ہے -

۱۳ - دنیا میں جو نیا ہے وہ پرانا ہوگا ، جو موجود ہے وہ فنا ہوگا۔ بھائیو ! خواب غفلت سے بیدار ہو اور بے ہوشی سے دور بھاگو ، پیس نر اس سے کہ تم سے لوگ کہیں ''تمھارا تن نازنین بیماری کے بستر پر ناتواں ہو رہا ہے -'' دوست اس کی علالتِ سخت کی خبر سن کر عیادت کے لیے آتے ہیں ، شفیق و مہربان دوا ادھر اُدھر ڈھونڈھتے پھرتے ہیں ، طبیب کو بلا کر لاتے ہیں - وہ تم کو دیکھ کر کہتا ہے کہ شفا کی توقع نہیں - یہ سن کر دوستوں کو فکر ہوتا ہے کہ دیکھیے بیماری سے عاقبت میں کیا ہوتا ہے -. اب تمھارے چہرے کا حال متغیر ہوتا ہے ؛ رنگِ ارغوانی زعفرانی بنتا ہے ، زبان بند ہوتی ہے - نہ بھائیوں سے بولو ، نہ عزیزوں کو پہچانو اور نہ لب کھولو ، موت کے فرستے نظر آئیں - غرض روح و جسم آپس میں متفرق ہو جائیں - اُنھیں دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آئیں ، مرغ روح قفس تن سے پرواز کرے - گھر میں آہ و فغاں کا غل سور مچے کہ ہائے تم مر گئے - تمام برادری اور احباب جمع ہوں - تابوت ، پنبہ ، کفن لائیں ، مردہ شُو کو بلائیں ، کفن سئیں ، غسل دے کر کفن پہنائیں ، نعش کو لبِ گور تک پہنچائیں ، نماز پڑھائیں ؛ پھر کچھ لوگ اپنے گھر کو جائیں ، کچھ جسم کو خاک دان میں محبوس کر جائیں - جو عزیز خُرد ہیں وہ تمھارے مال کی جستجو میں ہوں ، باغ و مکان و مال و اسباب کے تقسیم کی گفتگو ہو -

---

۱ - اصل میں اس لفظ کا املا 'مہدی' ہے - مرتب

غرض دنیا اپنے حال بدلتی رہتی ہے ؛ ابھی ایک آدمی کو وہ ہنساتی ہے ، اسی اثناء میں دوسروں کو اس پر ہنسی آتی ہے - ابھی ایک آدمی دوسرے کے لیے روتا ہے کہ تھوڑی دیر بعد اس پر تیسرا آدمی روتا ہے - اگر کسی کو وہ دینے پر آتی ہے تو دے کر بعد چندے واپس لینے کے لیے ہاتھ پھیلاتی ہے - اگر آج کسی کے سر پر تاج و افسر رکھتی ہے تو کل سر تلے خاک و پتھر - کوئی جائے ، کوئی رہے ، کوئی آئے ، اس کے نزدیک برابر ہے - اگر جانے والے کا کوئی عوض رہے تو واہ واہ اور اگر نہ رہے تو واہ واہ - ہر وقت ایک نہ ایک کو فنا کرتی رہتی ہے - جو اس کو عزیز جانتا ہے اس کو ذلیل کرتی ہے ، جو اس کو جمع کرتا ہے اس کو فقیر کرتی ہے - اس کا حال زہر کا سا ہے کہ جو کھاتا ہے وہ ہلاک ہو جاتا ہے - اس میں اس طرح رہنا چاہیے جیسے کوئی اپنے زخم کا علاج کرتا ہے کہ تھوڑے دنوں پرہیز اس خوف کے سبب سے کیا کرتا ہے کہ بہت دنوں تک تکلیف نہ اٹھانی پڑے - چند روز دوا کی تلخی پر صبر کرتا ہے کہ کہیں درد مدت تک نہ رہے - مگر افسوس ہے کہ گزشتوں کو دیکھ کر پس ماندوں کو عبرت نہیں ہوتی - لوگ ایسے دنیا پر مرتے ہیں کہ جہاں ان کی حاجتیں پوری ہوئیں اور دنیا حسب دل خواہ ملی ، مغرور و سرکش ہوگئے ، معاد کو بھول گئے - اپنی عقل کو اس میں اتنا لگاتے ہیں کہ ان کے قدم جادۂ مستقیم سے لغزش کھا جاتے ہیں - وہ یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا کا حال یہ ہے کہ دنیا دار کو کسی خوشی میں اطمینان نہیں - جو دنیا میں خوش ہوتا ہے وہ رنج میں پڑتا ہے ، جو آج نفع پاتا ہے وہ کل نقصان اٹھاتا ہے - اس میں وسعت عیش بلا ہے اور بقا کا مآل فنا ہے - ہر خوشی غم آگین ہے اور ہر زحمت رحمت سے

قرین - جو اس میں سے گزر جاتا ہے وہ پھر واپس نہیں آتا - دنیا کی تمام آرزوئیں دروغ ہیں اور تمام امیدیں بے فروغ - جو نعمتیں موجود ہیں اُن کے جانے کا اور مصیبتوں کے آنے کا ڈر سدا رہتا ہے -

گنج بے رنج ندید است کسے گل بے خار نچیداست کسے

۱۴ - خوب سمجھ لو کہ دنیا مصیبت کا گھر ہے - اُس کی ہر چیز کا انجام زوال ہے اور اس کا کسی کے پاس ہمیشہ رہنا محال - نہ اُس کے حالات تبدیل سے مامون ہیں ، نہ اُس کے باشندے آفات سے مصئون - جب آدمی کو اُس میں راحت اور خوشی پہنچتی ہے ، یکایک مصیبت آ د:تی ہے - اُس کے احوال مختلف باہم دگر[1] ہیں اور مراتب متغیر - نہ اُس کے عیس کو ثیام نہ راحت کو دوام - موت ہر ایک کے سر پر کھڑی ہے - آج دنیا میں ہمارا حال ایسا ہے ، جیسا ہم سے پہلے لوگوں کا تھا ، جو ہم سے عمر میں زیادہ ، قوت میں قوی ، مکانات و سامان دنیا مں اعلیٰ ، اُن کے شہروں کی آبادی زیادہ - مگر اب دنیا کے طول انقلاب سے اُن کی آواز نہیں نکلتی - اُن کے جسم سڑ گئے ، شہر اُلٹ گئے ، مکانات گر گئے - یا وہ مکان عالی شان اور گاؤ تکیے اور عمدہ فرش تھے یا اب پتھر اور اینٹیں اور خاک اور گوشۂ لحد ہے - کھنگی نے اُنھیں پیس ڈالا اور پتھر و مٹی نے ان کا کچومر نکال ڈالا - خاک میں اپنے یاروں سے جا ملے اور ایسے گئے کہ پھر نہ پھرے - قطعاً جان لو کہ جو اُن کا حال ہوا وہی تمھارا ہوگا ؛ وہی تنہائی ہوگی ، وہی خاک میں سڑنا گلنا ، اُسی خواب گاہ میں سونا ہے -

۱۵ - بعض حکما کا قول ہے کہ زمانہ تیرانداز ہے اور

---

۱ - اصل میں 'گر' ہے لیکن صحیح 'دگر' ہے - مرتب

آدمی نشانہ کہ ہر روز عمر کے دن رات کو اپنے تیروں سے اڑاتا رہتا ہے ، یہاں تک کہ تمام عمر پوری ہو جاتی ہے ۔ اگر آدمی کو اپنے اوپر زمانے کی تاثیر معلوم ہو کہ ہر گھڑی عمر کا نقصان کرتی جاتی ہے تو دنوں کے گزرنے سے نفرت ہو اور ساعات کے چلے جانے سے وحشت ۔ مگر خدا تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اس کا خیال نہیں آتا ۔

غافل تجھے گھڑیال یہی دے ہے منادی
خالق نے گھڑی عمر سے اک اور گھٹا دی

زمانے کا کام یہی ہے کہ جماعتوں کو متفرق کرے ، جتھوں میں ابتری ڈالے ، دولت کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچائے ۔ اس کے امل بہت طویل اور زندگانی بہت قلیل ۔ انسان کی کسی نعمت سے خوشی پوری نہیں ہوتی کہ نعمت کی جدائی سر پر آن موجود ہوتی ہے جس سے اس کو رنج ہوتا ہے ۔ دنیا پر لعنت کر کے آخرت کا خیال رکھنا چاہیے ۔ دین کو زیر کلاہ رکھنے سے گناہ پر رغبت ہوتی ہے ۔ کلاہ کو اتار ، سر کو ظاہر کر اور گزشتہ گناہ سے توبہ کر ۔ اگر سر پر افسر نہ ہو تو بلا سے ۔ خرد سر کے اندر ہوتی ہے ، سر کے اوپر نہیں ہوتی ۔ یہ سارے رنج و عنا اسی سبب سے ہوتے ہیں کہ خدا ہم سے غیر ہو جاتا ہے ۔ اللہ کے لیے زینت حال دین سے ہوتی ہے ، کچھ اسپ زرین سے نہیں ہوتی ۔ دنیا کی مہر بے کینہ کے نہیں ہوتی ، وہ لوزینہ[1] میں سیر رکھتی ہو ۔

۱۶ - دنیا کی تمثیلات و تشبیہات

دنیا کو سائے سے مثال دیتے ہیں ؛ جیسے کہ سائے کو قیام نہیں ،

---

۱ - لوزینہ : بادام کا حلوہ ۔ مرتب

اسے ڈھلنا ضرور ہے ، ایسے ہی دنیا کو قیام نہیں ۔ ظاہر میں سایہ
حرکت کرتا ہوا نہیں معلوم ہوتا مگر حقیقت میں متحرک ہوتا ہے
ایسا دنیا کا حال ہے کہ ظاہر میں ٹھہری ہوئی ہے مگر جلد جلد
وہ چلتی ہے ۔ سال و ماہ سے اُس کے نقصان کا حال معلوم ہوتا
ہے ۔ اُس کو خواب سے تشبیہ دیتے ہیں ؛ جیسے کوئی آدمی
خواب میں بری بھلی باتوں سے رنجیدہ یا خوش ہوتا ہے ، ایسے ہی
دنیا میں لوگ بھی گویا خواب میں رنج و راحتِ دنیاوی دیکھ
رہے ہیں ، مرنے کے بعد جو آنکھ کھلے گی تو کچھ نہ دیکھیں گے ۔

دنیا خواب است و زندگانی در وے
خوابے است کہ در خواب نہ بینی آں ہرا

ایں قدر طول امل رہ میدہی در دل چرا
مصحف خود را بایں خط مے کنی باطل چرا
عیش دنیا احتلام خواب غفلت بیش نیست
از خیالے ایں قدر آلودگی اے دل چرا

اس کو ایسی عورت سے مثال دیتے ہیں کہ مردوں کے
واسطے اپنے تئیں بنائے سنوارے اور جب کسی سے بیاہی جائے تو
اُسے ذبح کر ڈالے ۔ اُس کو ایسی بڑھیا عورت سے بھی تشبیہ
دیتے ہیں کہ جو بد صورت ہو ، مگر اوپر خوب زرق برق کی
پوشاک و زیور بیش قیمت پہن لے اور سر پر برقع ڈال لے اور
لوگوں کو فریب دے اور تالیاں بجائے اور ناچے ۔ اُس کے پیچھے
خواستگار ہو کر لوگ بھی تالیاں بجائیں اور ناچیں ۔ یہی حال
دنیا کا ہے ؛ ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ ہے ۔ دنیا کو ایک پل
سے بھی تشبیہ دیتے ہیں کیوں کہ آخرت میں پہنچنے کے لیے
زندگیِ دنیا ایک پل ہے جس کا ایک ستون مہد ہے اور ایک

کر کشتی میں ہو بیٹھے ، مگر اس اپنی حرکت سے نادم تھے کہ ناحق درد سر مول لیا ۔ کچھ لوگ جنگلوں میں گھس کر کشتی کو بالکل بھول گئے اور اتنی سیر کی کہ ناخدا کی آواز بھی نہ سنی ۔ مگر درندوں کا خوف دل میں تھا اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس نشیب و فراز میں لغزش بھی ہوگی اور مصیبت اٹھانی پڑے گی ۔ پاؤں اور کپڑوں میں کانٹے چبھیں گے ، ٹہنیوں سے بدن پر چرکے لگیں گے ، ہول ناک آوازوں سے کلیجا کانپے گا ، جھاڑیوں سے کپڑے ایسے پھٹ جائیں گے کہ ننگے رہ جائیں گے ۔ پھر الٹے جا بھی نہ سکیں گے ۔ کشتی والوں کی آواز سن کر سر پر بوجھ کے گٹھے لیے کنارے پر پہنچے تو اس میں جگہ نہ پائی ۔ کنارے ہی پر بھوکے پیاسے مر گئے ۔ بعض کو کشتی والوں کی آواز بھی نہ سنائی دی اور کستی بھی چل دی تو وہ درندوں کی خوراک بنے ۔ کچھ تھک تھک کر حیران پریشان مر گئے ؛ بعض دلدل میں پھنس گئے ، بعض کو سانپ بچھو کھا گئے ۔ غرض اسی طرح سب کے سب خوار و نزار ہو کر مردار ہو گئے ۔

اب لوگ جو کشتی میں سر پر بوجھ رکھ کر سوار ہو گئے تھے ، اُن کو اُن چیزوں کی حفاظت کی فکر ہوئی ۔ مکان تنگ پہلے ہی سے تھا ، کچھ عرصے کے بعد پھول مرجھا گئے ، میوے سڑ گئے ، بدبو آنے لگی ۔ جواہر کے رنگ متغیر ہو گئے ۔ یک نہ شد دو شد کا مضمون پیش آیا کہ پہلے صرف رکھنے ہی کی دقت تھی ، اب بدبو سے ایذا ہونے لگی ۔ پھر تو کچھ علاج بجز اس کے نہ سوجھا کہ اُن کو دریا میں ڈال دیا ، مگر اس کی بدبو اور خوراک کی تاثیر اُن پر ایسی ہو گئی تھی کہ گھر پہنچنے تک بیمار پڑ گئے اور بہت دنوں تک پینگ لگا کیے ۔ اور جو اُن سے پہلے کشتی میں بیٹھ گئے تھے ، اُن کو خاطرخواہ آسائش تو نہ ملی الاّ وطن میں

پہنچ کر صحیح سالم رہے اور وطن میں بھی راحت اور آرام سے رہے۔
پس یہی حال دنیا کے لوگوں کا ہے کہ وطن اصلی کو بھول کر اس جزیرے کے گلزار اور جواہر اور چاندی سونے پر ایسے غافل ہیں کہ انجام کی فکر ذرا نہیں کرتے۔ یہ معلوم نہیں کہ[1] مرنے کے وقت یہ سب زینت کی چیزیں وبال گردن ہوں گی۔ گو اب اُن کے آنے کی خوشی اور جانے کا غم ہوتا ہے۔ اس مصیبت میں سب ہی مبتلا ہیں، الاّ جس کو خدا بچائے۔ خدا نے اپنے بندوں کے لیے دنیا کو ضیافت خانہ بنایا ہے کہ اس میں سے اپنا توشۂ آخرت لے لیں۔ مہمان یہ نہ سمجھیں جو عطردان یہاں ہم کو سونگھنے کو پیش ہوا ہے، وہ ہماری ملک سے ہے۔ جب تم عطر سونگھ لو گے تو عطردان مالکِ خانہ واپس لے گا۔

۱۷ - دنیا کی حقیقت اور ماہیت

دنیا و آخرت دل کے دو احوال کا نام ہے؛ جو حال کہ دل سے قریب ہے، یعنی موت سے پہلے، اُس کو دنیا کہتے ہیں کہ 'دنو' (یعنی قریب) سے مشتق ہے اور جو حال متاخر، یعنی بعد موت کے ہے، اُس کو آخرت بولتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو چیزیں ایسی ہیں کہ اُن سے غرض اور خواہش اور لذت موت سے پہلے ملتی ہے وہ آدمی کے حق میں دنیا میں داخل ہیں۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جس چیز کی طرف رغبت ہو وہ خواہ مخواہ بری ہو، بلکہ وہ تین قسم کی ہیں:

اول وہ اشیا جو آخرت میں ساتھ رہیں اور اُن کا ثمرہ بعد موت کے معلوم ہو، وہ علم و عمل ہیں۔

دوسری قسم وہ حظوظ اور لذات ہیں جس سے صرف زندگی میں

---

۱ - 'کہ' کے بعد ایک 'یہ' زائد تھا جسے حذف کر دیا گیا - مرتب

فائدہ اور آخرت میں کچھ ثمرہ نہ ملے جیسے گناہوں سے لذت یاب ہونا یا مباحات زائد از ضرورت سے مستفید ہونا جس کو رفاہیت و رعونت کہتے ہیں -

تیسری قسم کی وہ لذات ہیں کہ اُن دونوں قسموں میں متوسط ہیں - غرض دنیا میں اول و سوم محمود اور دوم مذموم - جو آدمی کہ غذا و لباس و مسکن بقدر ضرورت آخرت کے لیے حاصل کرتا ہے وہ دنیا دار نہیں کہلاتا ہے اور یہ دنیا اس کے حق میں مزرعۂ آخرت ہوتی ہے -

حظ دنیاوی کی بھی دو قسم ہیں ؛ ایک تو وہ جس سے رغبت کرنے والا عذاب آخرت کا مستحق ہو ؛ اس کو حرام کہتے ہیں - دوم وہ کہ اس درجے پر نہ پہنچے ؛ اُس کا نام حلال ہے -

افسوس ہے کہ جب کسی اپنے ہم سر کا[1] امارات دنیاوی میں بڑھنا دیکھتے ہیں تو کیسے اُس کے ایے حسرت کرتے ہیں ، حالاں کہ[2] اس دنیاوی رتبے کو کچھ قیام نہیں - یہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے اور انجام کو بالکل منقطع ہو جاتا ہے - دنیاوی لذات پر جب یہ حسرت ہو تو سعادات اُخروی پر بدرجۂ اَولٰی ہونی چاہیے - اس لیے کہ وہ نعمتیں پائدار اور خارج از وصف اور بے انتہا ہیں جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا - ایسی نعمتوں کے نہ ملنے سے دل پر کیا کیا گزرتا ہے -

۱۸- ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ تم دنیا کو اپنی دایہ اور آخرت کو ماں جانو - جب لڑکا سن شعور کو پہنچتا ہے تو دایہ کو ترک کرتا ہے اور ماں کے پاس رہتا ہے - پس اے دلِ کودک خصال!

---

۱ - اصل 'کو' -
۲ - اصل 'حالاکہ' - مرتب

تو بھی اس بوڑھی دایہ کو چھوڑ کر مادرِ عقبٰی کے سینے سے لپٹ ۔

۹ ۱ ۔ دنیا کے وہ شغل جن میں ساری دنیا ڈوبی ہوئی ہے

دنیا اُن اشیائے خارجی کا نام ہے جن سے انسان کو حظ ہوتا ہے اور اُن کی درستی میں وہ مصروف رہتا ہے ۔ تمام روے زمین کی چیزیں تین قسم کی ہیں : معدنیات ، نباتات ، حیوانات ۔ نباتات کو انسان اس غرض سے چاہتا ہے کہ اُس سے غذا اور دوا حاصل ہوا کرے ۔ معدنیات کا طالب اس وجہ سے ہے کہ اُن سے آلات اور برتن بناوے جیسا کہ تانبے اور لوہے وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں ۔ یا نقد رکھنے کے لیے اُن کا طالب ہوتا ہے جیسے کہ سونے چاندی کو اسی غرض کے لیے رکھتا ہے یا اور غرضوں کے واسطے ان کی طلب ہوتی ہے ۔ اور حیوان کی دو قسمیں ہیں : انسان اور بہائم ۔ بہائم گوشت کے اور باربرداری اور زینت کے واسطے رکھتے ہیں ۔ اور انسان سے کبھی تو یہ غرض ہوتی ہے کہ اُن سے خدمت لیویں جیسا غلاموں سے ، یا صحبت مراد ہوتی ہے جیسے کہ عورتوں سے ، یا دلوں کو اپنی طرف کرنا منظور ہوتا ہے کہ وہ تعظیم و اکرام کریں ، اس کو جاہ کہتے ہیں ، یعنی مالک ہونا لوگوں کے دلوں کا جاہ کہلاتا ہے ۔

ان چیزوں کے ساتھ انسان کے دو علاقے ہیں ؛ ایک علاقہ دل کے ساتھ ہے ، یعنی ان چیزوں کی محبت اور حفاظت اور ہمہ تن ہمت کو اُن کی طرف مصروف کرنا کہ گویا بندۂ دنیا یعنی عبدالدنیا بن جائے ۔ اور اسی علاقے میں تمام دل کی صفتیں جو دنیا سے متعلق ہیں ، داخل ہیں ، جیسے کبر و کینہ اور حسد اور ریا اور شہرت اور بدگمانی اور ذہن کی سستی اور تعریف کی محبت اور شیخی وغیرہ ؛ اس علاقے کو دنیائے باطنی کہتے ہیں ۔ اور دنیائے ظاہری

اُن چیزوں کا نام ہے جن کا ذکر اُوپر ہوا ۔

دوسرا علاقہ بدن کے ساتھ ہے ؛ یعنی بدن کو ان چیزوں کی درستی میں مصروف کرنا تاکہ وہ قابل اپنے اور غیر کے حظ اٹھانے کے ہو جائیں ۔ اس علاقے میں تمام پیشے اور حرفے آ گئے جن میں لوگ مشغول اور مستغرق ہیں اور انھی دونوں علاقوں یعنی علاقۂ قلبی اور علاقۂ بدنی کی جہت سے خلقت کو نہ اپنے نفس کی ، نہ دنیا میں اپنے آغاز اور انجام کی خبر ہے ۔ اگر آدمی اپنے نفس کو اور اپنے پروردگار کو پہچانے اور دنیا کی حکمت اور اسرار کو جانے تو معلوم کر لے کہ یہ سب چیزیں جن کو ہم نے دنیائے ظاہری لکھا ہے اس لیے پیدا ہوئی ہیں کہ جس سواری پر خدا کی طرف جانا منظور ہے اس کا گھاس دانہ اس سے ہو جائے ۔ اور سواری سے غرض ہماری بدن انسانی ہے کہ وہ بدون کھانے پینے اور لباس و مسکن کے باقی نہیں رہتا ۔ جیسا کہ حج کے راستے میں اونٹ کو دانہ پانی اور جھول نہ ملے تو وہ بھی زندہ نہیں رہے گا ۔

جو آدمی کہ دنیا میں اپنے نفس اور مقصود کو بھول جاتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی حاجی منزلوں میں ٹھہرے اور ہمیشہ اپنی سواری کے لیے کہیں سے گھاس لائے ، کہیں سے ٹھنڈا پانی اس کو پلائے ، یہاں تک کہ اسی فکر میں قافلے سے علیحدہ ہو جائے ، اور اس کو معلوم بھی نہ ہو کہ اگر ایسا کروں گا تو حج سے بھی محروم رہوں گا اور مع سواری دام و دد کا لقمہ ہوں گا ۔ جو حاجی ہوشیار ہوگا اُس کا دل تو کعبے اور حج میں مصروف رہے گا اور سواری کی خدمت بہ قدر ضرورت کرے گا کہ جس سے اُس میں رفتار بنی رہے ۔

اس طرح جو شخص سفر آخرت میں دانا بینا ہوتا ہے وہ بدن کی خدمت ضروری کرتا ہے ؛ جیسے کوئی پاخانے میں حاجت کے

وقت جا بیٹھتا ہے ۔ پیٹ میں کچھ ڈالنے اور پھر اس کو پاخانے کی راہ (سے) دور کرنے میں کچھ فرق نہیں ۔ دونوں باتیں ضرورت کے واسطے ہوتی ہیں ۔ پس ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا نہ چاہیے ۔ جیسے قضائے حاجت میں بہ قدر ضرورت مصروف ہوتے ہیں ، شکم سیر کرنے میں بھی بہ‌قدر ضرورت مصروف رہتے ہیں ۔ انسان حظوظِ دنیاوی کے لیے اپنے واسطے شغل پر شغل نکالتا چلا جاتا ہے ، اُن میں کام بے انتہا نکلتے چلے آتے ہیں ۔ انھی شغلوں میں حیران پریشان رہتا ہے اور اصلی مقصود کو بھول جاتا ہے ۔ انسان نے فقط اپنی ان ہی[1] ضرورتوں غذا ، پوشاک ، مسکن کے لیے ہزاروں پیشے اور صنعتیں اور کام نکالے ہیں کہ جن کے اندر مشغول رہنے کے سبب سے اُس کو ایک دم کی فرصت نہیں ہوتی ۔

۲۰ ۔ تغیراتِ جہان

دنیا میں بھی کیا کیا تغیرات عجیب و غریب ہوتے ہیں کہ ابھی آفتاب نارگوں نکلتا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد سرنگوں ہو گیا ۔ ابھی طاقِ آسمان پر ستارے روشن تھے کہ غائب ہوگئے ۔ چاند اپنا جمال ستاروں میں دکھا رہا تھا کہ دق کے رنج سے ہلال ہو گیا ۔ زمین ابھی ساکن با ادب تھی کہ زلزلے سے تب لرزہ میں آ گئی ۔ ہوا روح کے ساتھ مقترن تھی کہ متعفن ہو گئی ۔ پانی کہ روح کی ہمشیرہ تھا ، حوض میں زرد ، تلخ و تیرہ ہوگیا ۔ ابھی آگ جس ہوا سے موچھوں کو تاؤ دے رہی تھی ، اُسی سے بجھ گئی ۔ وہی خاک جو موسم بہار میں مایۂ گل تھی ، ناگہاں ہوا ہی نے اسے برباد کردیا ۔

دریا کے اضطراب و جوش کو دیکھ کر سمجھ لو کہ کیا کیا

---

۱ ۔ اصل میں 'ان میں' غلط ہے ۔ مرتب

تبدیلیاں ہوش ربا ہوتی ہیں ۔ چرخ گرداں کو دیکھو کہ اس کی حالت میں بھی وہی تبدل ہوتا ہے جو اس کے فرزندوں کے حال میں کہ کبھی اوج و حضیض پر ، کبھی سعد و نحس ، کبھی شرف و صعود ، کبھی وبال و ہبوط ، کل اجزا سے مرکب ہوتا ہے ۔ پس جس کل میں تغیر ہو اس کے اجزا میں کیوں نہ ہو ۔ جب مہتروں کے نصیب میں درد و رنج ہو تو کہتروں کو کب گنج مل سکتا ہے ۔ جب کلیات میں رنج و درد ہو تو ان کی جزئیات کا[1] کیوں نہ رنگ زرد ہو ۔ خاک ، باد ، آب ، آتش ، ان اضداد کی آشتی کا نام زندگانی ہے اور اُن کی جنگ کا نام موت ہے ۔ ان دشمنوں کی صلح تو اس جہان کی عمر ہے اور اُن کی جنگ اس جہان کی عمر جاوداں ۔ یہ دشمن آپس میں مصالحت کر لیتے ہیں ، عاقبت کار سب آپس میں جدا جدا ہو کر اپنی جنس کے ساتھ مل جاتے ہیں ۔

خدا اپنے لطف سے پلنگ و بکری و خرگوش میں اُلفت پیدا کر دیتا ہے اور ان کی جنگ موقوف کر دیتا ہے ۔ اگر بھیڑ بھیڑیے سے ڈرے تو تعجب کی بات نہیں لیکن بھیڑ بھیڑیے سے دل لگائے تو تعجب ہے ۔

۲۱ ۔ مالِ دنیا

مال اُن چیزوں کا نام ہے جو روے زمین میں ہیں[2] اور لوگ ان سے منتفع ہوتے ہیں ۔ ان میں سے اعلیٰ غذائیں ہیں ، پھر رہنے کے مکانات ، پھر کسب معیشت کی جگہ مثل دکان ، کھیت وغیرہ ؛ پھر لباس ، اثاث البیت اور اس کے آلات ، پھر آلات کے آلات ؛ اور بعض اوقات آلات بھی حیوان کی قسم کے ہوتے ہیں ، جیسا کتا کہ آلۂ شکار

---

۱ ۔ اصل میں 'کا' کی جگہ 'میں' تھا ۔

۲ ۔ اصل میں یہ الفاظ (میں ہیں) نہیں ہیں ۔ مرتب

ہے ، بیل کاشت کاری وغیرہ کا آلہ ہے ، گھوڑا لڑائی کا آلہ ہے ۔

دنیا میں سب سے بڑی چیز مال ہے ؛ وہ فائدے اور نقصان سے خالی نہیں ۔ اگر آدمی پاس مال نہیں ہوتا تو افلاس بدکار بنا دیتا ہے ، اگر ہوتا ہے تو آدمی سرکش ہوجاتا ہے ۔ انسان کے حظوظِ زندگانی کا نام دنیا ہے ۔ اس کے بہت سے حصے ہیں ، ان میں سے ایک مال ہے اور ایک جاہ ہے ۔ ایک اتباع شہوت اور غصہ و حسد ، ایک شیخی و تعلی ۔ غرض کہ اسی طرح بہت سے اجزا ہیں جن سے آدمی کو حظِ زندگانی ہوتا ہے ۔ دنیا کا کارکنِ عظیم مال ہے جس کے ہونے سے آدمی تونگر اور نہ ہونے سے فقیر ہوجاتا ہے ۔ یہ دونوں اوصاف ایسے ہیں کہ ان سے آدمی کا امتحان ہوا کرتا ہے ۔

مفلس کی دو حالتیں ہوا کرتی ہیں ؛ قناعت و حرص ۔ ایک ان میں سے اچھی دوسری بری ۔ حریص کے دو حال ہیں ؛ یا تو وہ لوگوں کے مال میں طمع کرتا ہے یا دوسروں کے مال سے دستبردار ہو کر حرفے اور پیشے کے کرنے میں مستعد رہتا ہے ۔ ان دنوں حالتوں میں پہلی حالت بری ہے ۔

تونگر کے بھی دو حال ہیں ؛ ایک تو بخل کے سبب امساک کرنا ، دوسرے خرچ کرنا ہے ۔ ان میں سے بھی ایک صورت اچھی اور ایک صورت بری ہے ۔ پھر ہر خرح کرنے والے کے دو حال ہیں ؛ ایک اسراف ، دوسری میانہ روی ۔ میانہ روی عمدہ ہے ۔ جو مال نیک کمائی سے کمایا جائے وہ اچھا کہلاتا ہے اور جو بری طرح سے حاصل کیا جاتا ہے وہ برا کہلاتا ہے ۔ جب مال نیک کاموں میں خرچ کیا جاتا ہے تو اس کی تعریف ہوتی ہے اور جب برے کاموں میں صرف ہوتا ہے تو اس کی برائی کی جاتی ہے ۔ مال نہ بالکل خیر ہے نہ بالکل شر ہے بلکہ وہ دونوں خیرو شر، کا سبب

ہوا کرتا ہے - اور جو چیز سببِ خیرو شر دونوں ہو ، وہ مدح و مذمت دونوں کے قابل ہوتی ہے -

مال انسان کے واسطے ایک ضروری چیز اِس وجہ سے ہے کہ اُس سے غذا اور لباس ، جو بدن کی بقا اور کمال نفس کے لیے ضروری ہے ، حاصل ہوتا ہے اور کمال نفس میں خیر و سعادت ہے - یوں مال بھی کمال نفس کا ذریعہ ہے - پس جو مال کمال نفس کے لیے کام میں آئے ، اچھا ہے - مال سے ایسے کام بھی ہو سکتے ہیں کہ نفس کو سعادت اُخروی سے باز رکھے - مال ذریعہ اور وسیلہ مقاصد کے حاصل کرنے کا ہے - پس ان مقاصد کے موافق مال کا حال اچھا برا ہو گا - اگر مال اتباع شہوات کے کام میں آتا ہے تو اُس کی برابر آفات نہیں اور اگر وہ نیک کاموں میں کام آتا ہے تو اُس کی برابر خوبیاں نہیں - مال (کے) بغیر اچھے برے کام نہیں ہو سکتے - مال میں سانپ کی طرح زہر بھی ہے اور زہر مہرہ بھی - زہر اُس کی آفات ہیں اور زہر مہرہ اُس کے فوائد - پس جس شخص کو مال کے فوائد اور آفات دونوں معلوم ہوں وہ شر سے بچے اور خیر کا طالب ہو -

۲۲ - مال کے دینی و دنیوی فوائد و نقصان

پھر مال کے فوائد کی دو قسمیں دنیاوی اور دینی ہیں - دنیادی فوائد مال کے تو ظاہر معلوم ہوتے ہیں - دینی فوائد تین طرح کے ہیں ؛ اول مال کو اپنے نفس ، اپنی عبادت میں خرچ کرے - دوسری قسم یہ ہے کہ اور لوگوں پر صرف کرے - مروت کے سبب سے لوگوں کی حفظ آبرو میں ، نوکروں اور ملازموں کے غنی کرنے میں اور شرفا کے ہدیے اور دعوت اور اعانت میں - آدمی کے ایسے خرچوں سے بہت سے دوست ہو جاتے ہیں اور ایسے اخراجات سے سخاوت کی صفت آ جاتی ہے - صفت سخاوت کی

جب تک نہیں حاصل ہوتی ، جب تک احسان اور مروت سے لوگوں
کے ساتھ نہ پیش آوے اور بدلہ اُن کو نہ دے ۔

تیسری قسم کے خرچ وہ ہیں کہ کسی انسانِ معین پر نہ
ہوں بلکہ اُس سے فائدۂ عام ہو جیسے مسجد ، پل ، سرائے ،
شفا خانہ ، مدرسہ ، کنواں بنوانا ، خیرات کے لیے زمین و جائداد
وقفِ مساکین کر دینا ۔ یہ ایسے خرچ ہیں جن سے ہمیشہ کو
مرنے کے بعد خیرات ہوتی ہے اور صلحا خرچ کرنے والے کے
حق میں مدتوں تک دعا کیا کرتے ہیں ۔ اسی کو خیر جاری کہتے
ہیں ۔ مال کے ہونے میں یہ آفات بھی ہیں کہ انسان پر شہوات کا
تقاضا ہمیشہ رہتا ہے ، مگر بے مانگی سے کچھ نہیں کر سکتا ۔
''عصمت بی بی از بے چادری ۔'' افلاس تقاضے کو پورا نہیں ہونے
دیتا ۔ جب تک کسی گناہ کا سامان نہیں ہوتا تب تک اُس کا شوق
نہیں اُبھرتا ۔ جب آدمی اپنے میں اُس کے کرنے کی قدرت دیکھتا
ہے تو اُس سے شوق اُبھرتا ہے ۔ چوں کہ مال سے یہ قدرت
آ جاتی ہے اسی واسطے تقاضاے معصیت سلسلہ جنبانی کرتا ہے ۔
اُس وقت اپنی خواہش کے موافق ارتکاب کرنے لگے گا تو آفات
میں مبتلا ہوگا ۔ اگر صبر کرے گا تو رنج اُٹھائے گا ، اس لیے کہ
باوجود قدرت صبر کرنا بہت سخت ہے ۔

دوم تنعم میں بھی زیادتی ہوتی جاتی ہے ۔ ایک تکلف پر
دوسرا تکلف بڑھاتا جائے گا ۔ اُس کو ضرورت اس سبب سے بہت
سے آدمیوں کی طرف ہوگی جن کے راضی کرنے میں جھوٹی سچی
باتیں بنانا پڑیں گی ۔

سوم ایک بڑی آفت مال کی ، جس میں تھوڑے بہت سب ہی
گرفتار ہیں ، یہ ہے کہ وہ مال کی اصلاح اور درستی میں خدا تعالیٰ
سے غافل ہو جاتا ہے ۔ غرض مال کا وجہِ حلال سے حاصل کرنا

دشوار ہے ، پھر اس کا حق طور پر خرچ کرنا مشکل ہے - اس کے اکتساب میں خدا کی یاد سے غافل نہ ہونا اور سخت دشوار ہے - مال والے کے ذمے سیکڑوں جھگڑے لگے رہتے ہیں ؛ صبح شام کبھی کسانوں سے ، کبھی شرکاء سے ، کبھی خریداروں سے جھگڑا ہے ، کبھی حساب کا بکھیڑا ، کبھی پانی اور حدود کی تکرار ، کبھی سرکار کی جواب دہی ، اس کے نوکروں سے خراج و ضبطی کا بکھیڑا ، معمار اور مزدوروں سے الجھنا کہ کام تھوڑا کیا ، کبھی کسانوں پر چوری اور خیانت کا الزام لگانا ، کبھی اپنے شریک سوداگر سے اندیشہ اس بات کا کہ یہ نفع زیادہ لیتا ہے اور کام کم کرتا ہے ، مال تلف کرتا ہے - خواہ آدمی پاس کسی قسم کا مال ہو ، اس کو تردداب پیش آتے رہتے ہیں -

۲۳ - مال کی خرابیاں

مال کا پیدا کرنا اور اس کی حفاظت ، یہ دونوں کام انسان کے بڑی محنت اور مشقت کے کام ہیں - مال جمع کرنے میں دل کو ملال ہوتا ہے - زر و گوہر کے حاصل کرنے میں گرداب تفکر میں غوطہ لگانا پڑتا ہے - بہت سی اشیا کی حسرت میں آسیا کی طرح دست تاسف ملنا پڑتا ہے- جب ملک و مال بہت ہو جاتا ہے ، اسباب ثروت و حشمت مہیا ہوتا ہے تو توسن نفس سرکشی ہوتا ہے اور عصیان میں لے جاتا ہے - مال کی محبت دل میں نفاق پیدا کرتی ہے اور وہ اس کو ایسا بڑھاتی ہے جیسا کہ ابر گھاس کو -

دنیا میں ہر روز اور ہر ساعت دیکھ لو کہ دو فرقوں میں کیسے کیسے جھگڑے مال کے سبب سے اٹھتے ہیں - یاران دیرینہ کے صاف سینے کیسے حسد و کینہ کے ناخن سے خراشیدہ ہوتے ہیں - کبھی دو گز زمین پر دو عزیزوں کی جان جاتی ہے - اسی لیے عاقلوں نے مال کو مردار سے تشبیہ دی ہے اور اس کے طالبوں

کو کتنا مقرر کیا ہے۔

اکثر آدمی دنیا میں مال و جاہ کو دین و ایمان سمجھتے ہیں اور سیم و زر کی جمعیت کو بخت و دولت جانتے ہیں، مگر انقلاب روزگار اُن کو خطاؤں پر مطلع کرتا ہے۔ وہ دست تاسف ملتے ہیں اور حسرت میں مرتے ہیں۔ آدمی کی زندگانی کے واسطے مال ہے لیکن مال کے واسطے زندگانی نہیں۔ مال بے عمر کے بے کار ہے اور عمر کچھ مال سے بڑھتی نہیں۔

۲۴ ۔ دیانت و خیانتِ مال

دیانت کی مدح و خیانت کی مذمت زبانوں پر چڑھی ہوئی ہے۔ قطع نظر مذہب کے، یوں عقل سے بھی نظر آتا ہے کہ اہل خیانت تھوڑے دنوں میں خلق کے آگے انگشت نما مشہور ہوتے ہیں، اور جہاں وہ نزدیک اور دور کے لوگوں میں خیانت کے ساتھ نام زد ہوئے تو ان کے معاملات میں فرق آتا ہے اور خلق کو نفرت ہوتی ہے۔ بیگانے و یگانے اُن سے معاملہ کرنا چھوڑتے ہیں۔ اس سبب سے اُن کے دخل اور نفع میں خلل پڑتا ہے۔ جو مالِ دنیا بے ایمانی سے جمع ہوتا ہے وہ بھی رفتہ رفتہ ضائع ہوتا جاتا ہے۔ ایک گروہ بے ہوش اور گندم نما[1] جو فروش ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے حق مارنے کو اپنے مال کی افزونی اور احوال کی ترقی کا سبب جانتے ہیں و بے ایمانی سے اَوروں کے نقصان پہنچانے کو اپنا فائدہ گنتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ خیانت خرمنِ ثروت کے لیے برق ہے۔ جو مال کہ خیانت سے جمع ہوتا ہے وہ خیانت ہی میں جاتا ہے۔ جو چیز ہوا لاتی ہے، ہوا ہی

۱۔ اصل میں 'گندم جو فروش' ہے جو صحیح نہیں۔ محاورے کی صحیح شکل 'گندم نما جو فروش' ہے۔ مرتب

اُس کو لے جاتی ہے -

ایک شخص کچھ کپڑے چرا کر بازار میں بیچنے گیا ، ایک دلال اُس سے وہ کپڑے اُڑا کر لے گیا - کسی شخص نے پوچھا کہ کپڑے کتنے کو بیچے ؟ اُس نے جواب دیا کہ جتنے کو خریدے تھے ، ''مال حرام بود بجائے حرام رفت ''- ملازمت ہو ، تجارت ہو ، کوئی راہ سود اور نفع کے لیے بہتر راستی اور امانت سے نہیں ہے - امانت ہی سعادت و اقبال کی کیمیا ہے - مال میں اسی سے برکت ہوتی ہے - امانت ہی کی دلالی سے تجارت کے بازار میں ہزارہا نفعے ہوتے ہیں -

۲۵ - جاہ

دنیا کے دو رکنِ اعظم مال اور جاہ ہیں - مال کے معنی تو یہ ہیں کہ جن چیزوں سے نفع ہو ان کا مالک ہونا - جاہ کے معنی یہ ہیں کہ جن دلوں سے اپنی تعظیم و طاعت مطلوب ہے ، ان کا مالک ہونا - مال دار اور غنی اپنی دولت کے ذریعے سے تمام مقاصد نکالتے ہیں اور شہوات اور حظوظِ نفسانی پورا کرتے ہیں - اسی طرح صاحب جاہ لوگوں کے دلوں کو قابو میں رکھ کر اپنے تمام مقاصد و مطالب پورے کرتے ہیں - جیسے دولت مختلف معاملات کے ذریعے سے پیدا ہوتی ہے ، ایسے ہی لوگوں کے دل بھی مختلف معاملات سے تسخیر ہوتے ہیں کہ کسی کو کسی بات میں معتقد علیہ جانیں -

پس جس دل میں کسی شخص کی نسبت کسی وصفِ کمال کا اعتقاد ہوگا ، وہ اُسی اعتقاد کے موافق اُس کا مسخر ہو جائے گا ؛ یہ کچھ شرط نہیں ہے کہ وہ وصف فی نفسہ بھی کوئی کمال ہو ، بلکہ یہی کافی ہے کہ اُس شخص کے عندیے اور اعتقاد میں وہ کمال ہو - بعض اوقات وہ ایسی چیز کو بھی کمال

اعتقاد[1] کرلے گا جو واقعے میں کمال نہ ہو ۔ معتقد علیہ میں اس وصف کمال کا یقین معتقد کر لیتا ہے اس لیے اُس کا دل ضرور ہی منقاد ہو جاتا ہے ۔ دل کی ایک کیفیت کا نام انقیاد ہے ۔ دل کی کیفیات تابع اپنے اعتقادات اور علوم و تخیلات کی ہوتی ہیں ۔ پس جیسا اعتقاد ہوگا ویسی ہی کیفیت اُس پر طاری ہوگی ۔ مال داروں کے لونڈی غلام لوگ زبردستی سے بنتے ہیں اور آزادی کے موقعے ڈھونڈتے ہیں ، مگر صاحبِ جاہ کی[2] اطاعت لوگ خوشی سے کرتے ہیں اور آزاد طبع اپنی خواہش سے اُس کے تابع ہوتے ہیں ۔

خلاصہ یہ ہے کہ جاہ کے معنی یہی ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں جگہ ہو ، یعنی ایک شخص کے کسی وصف عالی کا دلوں میں اعتقاد ہو جانا ۔ پس جس قدر کہ اُس کے کمالوں کا لوگوں کے دلوں میں اعتقاد ہوگا اُسی قدر دل بھی منقاد ہوں گے، اور جس قدر دلوں کا انقیاد ہوگا ، اُسی قدر صاحب جاہ کو لوگوں کے دلوں پر اختیار ہوگا ، اور جس قدر اختیار ہوگا اُسی قدر اُس کو فرحت اور محبت جاہ سے ہوگی ۔ یہی سبب ہے کہ سب آدمیوں کو دولت سے زیادہ جاہ کی چاہ ہوتی ہے ۔ جیسے روپے اشرفی کو بذات خود نہ کھا سکتے ہیں نہ پی سکتے ہیں ، نہ لباس بنا سکتے ہیں ؛ اس اعتبار سے روپے اشرفی اور کنکر میں کچھ فرق نہیں ۔ مگر ان کے ذریعے سے ہم اپنی محبوب چیزیں حاصل کر سکتے ہیں ، اس لیے ان سے محبت ہوتی ہے ۔ یہی حال جاہ کا یعنی دلوں کے مالک ہونے کا ہے کہ وہ بذات خود کارآمد نہیں بلکہ وسیلہ حصول اغراض کا ہے ۔

جاہ کو مال پر ترجیح ہے؛ اول اس لیے کہ صاحبِ جاہ ، مال

---

۱ ۔ اعتقاد کر لے گا : یعنی سمجھ لے گا ۔
۲ ۔ اصل میں 'کو' ہے ، صحیح 'کی' ہے ۔ مرتب

جتنا چاہے حاصل کر سکتا ہے مگر صاحب مال ، جاہ نہیں حاصل کر سکتا - دوم مال معرض تلف میں آ سکتا ہے ، حفاظت کا محتاج ہے اور بہت سی آفتیں مال پر آ سکتی ہیں مگر جب دل ملک میں آ جاتے ہیں تو مال کی آفات میں سے کوئی آفت اُن پر نہیں واقع ہو سکتی - ہاں ایک آفت شاذ و نادر یہ آ سکتی ہے کہ کوئی صاحب جاہ کی برائی بیان کرکے بہکاوے اور اعتقاد بدل دے - سوم دلوں کی ملکیت بے رنج و مشقت بڑھتی جاتی ہے اور ایک سے دوسرے میں سرایت کرتی جاتی ہے ، اس لیے کہ دل جب کسی کے وصف کمال کے معتقد ہوتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا عالم یا عاقل ہے ، تو زبان خود بخود اُس کی ثنا میں کھلتی ہے ، اور جس چیز کے خود معتقد ہوتے ہیں وہ دوسرے کے سامنے بیان کرتے ہیں - پس دوسرے شخص کا دل بھی اُسی حال میں گرفتار ہو جاتا ہے - مال کے بڑھانے میں بہت رنج و تعب اُٹھانے پڑتے ہیں - غرض جاہ کو مال پر سب طرح سے ترجیح ہے -

انسان کو مال و جاہ کی محبت بے شک ہونی چاہیے اس لیے کہ جو چیز محبوب چیزوں کے وصول کا وسیلہ و ذریعہ ہو ، اُس کو آدمی کی طبیعت محبوب جانتی ہے - ایک اہل جاہ مستحق ہوتے ہیں کہ لوگوں کے دل اُن کے منقاد ہوں ، مگر اکثر آدمی جھوٹے جاہ کے مدعی ہوتے ہیں - اُن کو جاہ کی طلب کا سودا دیوانہ بناتا ہے - وہ بزرگی اور برتری و مہتری کو بڑی بے تابی کے ساتھ تلاش کرتے ہیں اور دنیا کے مناصبِ نا مناسب پر اپنی ترقی چاہتے ہیں -

اگر دنیا کے تمام مفاسد عظیمہ پر نظر ڈالو تو اُن کا سبب یہی حبِ جاہ ہوگا - نمرود ، فرعون ، شداد ، دقیانوس کے سبب سے جو مفاسد برپا ہوئے ، اس کا سبب یہی حبِ جاہ تھا -

جو جاہ و جلال کے مشتاق ہوتے ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے ابنائے روزگار میں معزز و مکرم ہوں اور مسند تفاخر پر بیٹھیں اور ہمیشہ نہالِ عمر و زندگانی سے عیش و کامرانی کے میوے چکھیں ۔ اس لیے وہ چشم طمع کھولتے ہیں اور دست تعدی لوگوں کے مال پر دراز کرتے ہیں ۔ اگر وہ حاتمی کرتے ہیں تو اوروں کی تھیلیوں سے ، اگر بزرگی دکھلاتے ہیں تو اوروں کے چھوٹا ہونے سے ۔ اُن کے خوان کی رنگینی مسکینوں کے دلوں کے خون سے ہوتی ہے اور اُن کے کھانے میں چربی ضعیفوں کے پہلوؤں سے ۔ غرض وہ اپنے منصب کے برقرار رکھنے میں طرح طرح کی محنت و بلائیں اپنے سر پر لیتے ہیں اور انقلاب زمانہ کے ہاتھ میں گرفتار ہو کر بڑے ذلیل و خوار ہوتے ہیں :

مرد جاہل جاہ دنیا را لقب دولت نہاد
ہم چناں کاماس را بینی و گوئی فربہی

جو حکومت دنیا پر مفتون ہوتے ہیں وہ نفس و ہوا کے محکوم ہوتے ہیں ۔ حکومت ، جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا ، وہ اپنے نفس امارہ کی حکومت ہے جس سے طبیعتِ سرکش مغلوب ہوتی ہے ۔ جو اس حکومت میں منافع ہیں وہ کسی میں نہیں ۔ دولت و جاہِ دنیا ایک بازیچہ ہے ، اُس کے پیچھے دیوانہ بننا اور دین کو اُس کے لیے رشوت میں دینا عقل کے خلاف ہے ۔

۲٦ ۔ مال و جاہ کا نعمت و مصیبت ہونا

مال ایک سانپ ہے جس میں تریاق نافع اور زہر ہلاہل، دونوں موجود ہیں ۔ اب اگر سانپ کو کوئی سپیرا پکڑے گا ، جو زہر سے بچنے کی ترکیب اور تریاقِ نکالنے کی تدبیر سے ماہر ہے ، تو اُس کے لیے سانپ کا پکڑنا نعمت ہے ۔ لیکن اگر گنوار مغرور اُس کو پکڑے گا تو اُس کے لیے مصیبت ہے ۔

یا مال ایک سمندر ہے جس کی تہ میں طرح طرح کے موتی اور جواہر ہیں ؛ تو جو شخص فن شناوری اور غوطہ زنی میں یکتا ہوگا اور سمندر کی آفات سے بچنے کی گھاتیں جانتا ہوگا ، اُس کو سمندر کی نعمتیں ملیں گی ۔ اور اگر ہر ایک امر سے نا واقف ہے تو پھر اُس کے ڈوبنے میں کیا شبہ ہے ۔ پس جو شخص جاہ و دولت کے استعمال کو اچھی طرح جانتا ہے ، اُس کے حق میں یہ نعمتیں ہیں اور نہیں (تو) مصیبتیں ۔

۲۷ ۔ انسان کو اپنا کمال و غلبہ[1] پسند ہوتا ہے

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ آدمی میں چار طرح کی صفات ہوتی ہیں : بہیمی ، سبعی ، شیطانی ، ربوبیت ۔ انسان میں ایک امرِ ربانی یعنی روح بھی ہے اس لیے اُس کو ربوبیت پسند ہے اور ربوبیت کے معنی یہ ہیں کہ کمال میں یکتا ہونا اور وجود مستقل میں یگانہ ہونا ، اس لیے انسان کو کمال محبوب بالطبع ہے ۔ اور وہ کمال کے ساتھ یہ بھی پسند کرتا ہے کہ میں اس میں یگانہ ہوں ۔ مگر یہ صفت یگانہ ہونے کی خدا کے ساتھ مخصوص ہے ۔ انسان خواہ کیسا ہی متفرد بالکمال ہونا چاہے مگر ہو نہیں سکتا ۔ انسان کا نفس ، متناہی کمال کے حاصل کرنے میں عاجز ہے ۔ انسان کو بالطبع سب پر غالب ہونا پسند ہے کیوں کہ اس میں بھی ایک کمال پایا جاتا ہے ، مگر یہ غلبہ اشیاء پر جب ہوتا ہے کہ ان میں تاثیر و تغیر کی قدرت اپنے ارادے سے حاصل ہو کہ جس طرح چاہے اُن کو اُلٹ پھیر دے ۔

پس انسان کو یہ بات محبوب ہوئی کہ جو چیزیں اُس کے ساتھ موجود ہیں ، سب پر اپنا غلبہ اور تصرف کرے ۔ مگر

---

[1] ۔ اصل میں ہے 'کمال و اپنا غلبہ' ۔ مرتب

موجودات عالم میں بعض چیزوں میں تصرفات انسانی کو دخل ہے جیسے کہ زمین کی اشیاء ، اور بعض اُس کے تصرف سے باہر ہیں جیسے آسمان و صفات اللہ ؛ تو انسان نے اس بات کو محبوب سمجھا کہ ملکیات پر علم کی جہت سے مستولی ہونا چاہیے اور اُس کے اسرار اور دقائق کو جاننا چاہیے ، یہ بھی ایک طرح کا غلبہ ہے ۔ غرض یہ غلبہ کمال علمی سے حاصل ہوتا ہے ۔ زمین کی اشیاء پر تصرف و قدرت سے مستولی ہونا طبعاً محبوب ہے ۔ اب زمین کی اشیاء کی دو قسمیں ہیں : ایک اجسام دوسری ارواح ۔ اجسام جیسے کہ روپیہ اشرفی اور اسباب وغیرہ ۔ ان چیزوں میں انسان کو یہ بات محبوب ہے کہ ان کو جہاں چاہے رکھے ، جس کو چاہے دیوے ، جس کو چاہے نہ دیوے ۔ غرض ان پر تصرف اور قدرت کا خواہاں ہوتا ہے ۔ یہ قدرت ہی کمال گنا جاتا ہے ۔

غرض اسی طرح وہ لوگوں کے دلوں کو بھی غلام بنانا چاہتا ہے کہ اُن کے اجسام اور اعضا پر تصرف و قدرت ہو جائے ، گو جبراً و قہراً ہی ہو۔ اور دل کی ملکیت بھی حاصل ہو[1] کیوں کہ دلوں کی تسخیر تو بدون اعتقاد کامل کے نہیں ہوتی ۔ یہ ضرور نہیں کہ لونڈی غلاموں کے دل بھی آقا کے کمال کے معتقد ہوں ، قہر و جبر کا خیال البتہ دل میں رہتا ہے ۔ اسی سے اپنے اجسام سے اطاعت کرتے ہیں اور یہی دبدبہ و غلبہ اور قدرت حضرت انسان کو پسند ہے ۔ بلکہ اس غلبے سے زیادہ وہ غلبہ اور قدرت اُس کو پسند ہے جس سے[2] لوگوں کے دلوں پر اُس کو قدرت

---

۱ ۔ اصل میں 'نہ ہو' ہے ۔

۲ ۔ اصل میں 'جو' ہے لیکن 'جس سے' زیادہ بامعنی اور صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ مرتب

اور تصرف حاصل ہو اور قلوب ایسے مسخر ہو جائیں کہ اُس کے اشارے اور ارادے میں رہیں -

غرض ہر ایک دل کا مطلوب کمال ہے اور کمال علم و قدرت سے ہوتا ہے - پس ہر ایک انسان اسی قدر خوشی اور لذت پاتا ہے جس قدر کہ اُس کو کمال ہو - یہ وجہ ہے جس سے کہ علوم و مال و جاہ محبوب ہیں -

۲۸ - مدح و ثنا کی محبت اور خوشی اور ھجو کی نفرت

ہر انسان کو اپنی مدح و ثنا سے خوسی اور لذت حاصل ہوتی ہے اور ہجو سے نفرت اور بغض - انسان چار سببوں سے اپنی مدح سے لذت یاب ہوتا ہے :

اول مدح کے باعث ؛ نفس یہ جانتا ہے کہ میں صاحب کمال ہوں ، اور کمال ایک محبوب شے ہے جس کا اوپر ذکر ہوا - تو جب نفس کو اپنے محبوب کی واقفیت ہوتی ہے ، خواہ مخواہ خوشی اور لذت پاتا ہے - مدح سے ممدوح[1] کے نفس کو اپنے کمال کا شعور ہو ہی جاتا ہے ؛ اس لیے کہ جس وصف سے تعریف کی جاتی ہے ، دو حال سے خالی نہیں ؛ یا تو ظاہر ہوتا ہے یا مشکوک - اگر وصف ظاہر اور محسوس ہے تو لذت کم ہوتی ہے ، جیسے کسی کی تعریف میں کہیں کہ قد کا اونچا اور رنگ کا سفید ہے ، تو ہر چند یہ ایک طرح کا کمال ہے مگر نفس اس سے غافل رہتا ہے اس لیے اُس کی چنداں لذت بھی نہیں - مگر دوسرے کے جتانے سے جب اس کمال کا شعور ہوتا ہے تو کچھ نہ کچھ لذت حاصل ہوتی ہے - اور اگر وصف مذکور ایسی چیزوں میں سے ہو جن میں شک کو مجال ہو تو اس سے لذت بہت زیادہ ہوتی ہے ، مثلاً

---

۱ - اصل میں "ممدج" غلط چھپا ہے - مرتب

کسی کے کمال علم اور کمال ورع یا حسن خلق کی تعریف کرنی ، یہ اوصاف ایسے ہیں کہ آدمی کو ان میں اکثر شک ہوتا ہے کہ میرا حسن خلق یا علم یا ورع کامل ہے یا نہیں ، اور اس بات کا مشتاق ہوتا ہے کہ یہ شک مٹ جائے ، اور یقیناً معلوم ہو جائے کہ میں اس وصف میں بے نظیر ہوں ، تاکہ اطمینان ہو اور پھر اس وصف کے حاصل کرنے میں مشقت نہ کرنی پڑے ۔ پس جب دوسرے کی زبان سے اپنے کمال کو سنتا ہے تو دل کو تسکین ہوتی ہے اور دل کو وثوق ہوتا ہے اور نہایت لذت حاصل ہوتی ہے ۔ اور سب سے زیادہ تر لذت اس سبب سے اس وقت ہوتی ہے جب مدح و ثنا کوئی ایسا شخص کرے جو اس طرح کی صفات سے واقف ہو اور کلام بھی بے تحقیق اور بیہودہ نہ کہتا ہو ۔ مثلاً کوئی استاد اپنے کسی شاگرد کی ثنا کرے کہ بڑا ذکی اور دانا اور فاضل ہے ، تو اس سے شاگرد کو نہایت خوشی ہوتی ہے ۔ اور اگر کوئی بیہودہ اور لغوگو اس طرح کی ثنا کرے تو لذت کم ہوتی ہے ۔ ہجو اور مذمت کے برا معلوم ہونے کا سبب یہی ہے کہ نفس کو اپنے نقص کا شعور ہوتا ہے ۔ اور چوں کہ نقصان کمال کی ضد ہے اور کمال محبوب ہوتا ہے تو بالضرور نقصان برا معلوم ہوگا اور جب اس پر اطلاع ہوگی رنج ہوگا ، خصوصاً اس وقت جب کہ کوئی دانا بینا معتمد آدمی مذمت کرے ، جیسا کہ مدح میں بیان ہوا ۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ مدح سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعریف کرنے والے کا دل ممدوح کا مملوک اور مسخر و معتقد ہے ، اور دل کی ملکیت بہرصورت آدمی کو پسند ہے ۔ جب یہ معلوم ہوگا کہ مادح میرا معتقد اور اس کا دل میری مشیت کے تابع ہے ، لذت حاصل ہوگی ۔ خصوصاً جب ایسا شخص تعریف کرے

کہ جس کو قدرت زیادہ اور اُس کے دل تسخیر ہونے سے کام زیادہ نکلے تو اور بھی زیادہ خوشی اور لذت ہوگی ؛ مثلاً حکام اور اکابر کے دل کی تسخیر سے ۔ اور یہ لذت کم ہوتی ہے اگر کوئی ایسا شخص تعریف کرے جو بے قدر ہو ، اس لیے کہ اگر ایسے بے قدر کے دل کا مالک بھی ہوا تو کیا ہے ، ایک حقیر چیز ملکیت میں آئی ۔ اور اُس کی تعریف ممدوح میں قدرت ناقص کا اظہار کرتی ہے ۔ اور اسی وجہ سے ہجو کو بھی برا جانتا ہے اور دل پر صدمہ ہوتا ہے ۔ اور جب کوئی اکابر میں سے ہجو کرتا ہے تو اور زیادہ رنج ہوتا ہے کہ اس صورت میں بڑا مطلب فوت ہوتا ہے ۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص کا تعریف کرنا اس بات کا موجب ہی ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کا دل بھی اپنا معتقد ہو جائے ۔ خصوصاً جب ایسا شخص تعریف کرے کہ جس کے قول پر سب متفق ہوں اور اُس کا اعتبار کرتے ہوں ، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ تعریف لوگوں کے سامنے ہو ۔ پس جس قدر جمعیت زیادہ ہوگی اور تعریف کرنے والا لائق التفات ہوگا ، اُسی قدر تعریف سے زیادہ لذت حاصل ہوگی ۔ مثلاً میر مجلس یا حاکم ثنا کرے گا تو تعریف نہایت لذیذ معلوم ہوگی اور ہجو اُس کے برعکس شاق گزرے گی ۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ تعریف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح صاحبِ حشمت و رعب ہے کہ مادح اُس کی ثنا میں رطب‌اللسان ہونے کو مضطر ہے ، خواہ بہ ترغیب دل یا دباؤ سے ہو ۔ اپنا دباؤ بھی آدمی کو اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک طرح کا غلبہ پایا جاتا ہے ۔ اس جہت سے ممدوح کو اس تعریف میں لذت ہوتی ہے ، گو تعریف کرنے والا دل میں ان اوصاف کا ممدوح کے لیے معتقد نہ ہو ۔

اگر یہ چاروں اسباب ایک ہی تعریف کرنے والے کی تعریفہ میں جمع ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ نہایت درجے کی لذت ہوگی ، اور مختلف ہوں تو اُسی قدر لذت بھی کم ہوگی ۔ مگر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی تعریف پر پھولے نہیں ۔ پہلی تعریف کو جانے کہ اس میں مبالغہ ہے ، مجھ میں وہ کمال نفس نہیں ہے جس کی تعریف کی گئی ہے ۔ دوسری تعریف کو سمجھے کہ مادح اوپری دل سے کہتا ہے ، اپنے قول کا معتقد نہیں اور مجھ میں وہ صفت نہیں جو وہ بیان کرتا ہے ۔ اور ایسے ہی تیسرے سبب کو سمجھے۔ چوتھے سبب کو جانے کہ میرے خوف اور دباؤ سے ثنا نہیں کرتا، بلکہ مجھ کو بناتا ہے ۔

۲۹ ۔ مدح و ذم میں لوگوں کے حال مختلف ہوتے ہیں

مادح اور مذمت ساز کی نسبت لوگوں کے چار احوال ہوتے ہیں ۔

اول صورت یہ ہے کہ مدح سے خوش ہو کر شاکر ہوں اور مذمت سے ناخوش ہو کر مذمت کرنے والے سے کینہ رکھیں اور اُس سے انتقام لینے کو اچھا سمجھیں ۔ اکثر حال لوگوں کا یہی ہے ۔

صورت دوم یہ کہ مذمت باطن میں تو شاق معلوم ہوتی ہے مگر زبان اور اعضاے ظاہری پر اُس کی مکافات کی نوبت نہیں آتی ، اُن کو روکے رکھتا ہے ۔ اسی طرح مادح کی مدح سے باطن میں تو خوش ہوتا ہے مگر ظاہر کی حفاظت کرتا ہے ، اظہار سرور بہ ظاہر نہیں کرتا ۔

سوم یہ اعلیٰ درجے کی بات ہے کہ مدح و ذم مساوی معلوم ہوں ۔ نہ مدح سے سرور ہو نہ مذمت سے رنج ۔ یہ بات جس

میں ہوگی اُس میں یہ علامات پائی جائیں[1] گی کہ اُس کو مادح اور مذمت کرنے والے کا بیٹھنا برابر گوارا اور ناگوار ہوگا ۔ دوم جتنی خوشی اور فرحت مادح کی حاجت روائی میں ہوگی اتنی ہجو کرنے والے[2] کی کاربرآری میں ۔ سوم مجلس سے مدح اور ہجو کرنے والے کا چلا جانا برابر برا معلوم ہو ۔ چہارم دونوں کے مرنے کا غم و رنج برابر ہو ۔ پنجم دونوں کی مصائب اور اذیت پہنچنے پر اثر برابر ہو ، مگر یہ رتبہ کسی کو حاصل نہیں ہوتا ۔

چوتھی صورت یہ کہ مدح کو برا جانے اور مادح سے ناخوش ہو اور مذمت والے کو دوست جانے کہ اُس نے اُس کے عیب بتلائے اور جو بات ضروری تھی اُس کی طرف اُس کو ہدایت کی ۔ یہ مرتبہ نہایت سخت دشوار ہے ۔ ہم میں پرلے درجے کی خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ مذمت کرنے والے کی برائی اور مادح کی بھلائی دل میں ہو مگر اس کا اظہار قول اور عمل میں نہ ہو ۔

۳۰ ۔ دنیا کے امور میں تفاوت

دنیا کا حال ایسا ہے جیسے کسی بحر کا ہو کہ آدھا حصہ اُس کا شیریں اور روشن مثل شکر و قمر ہو ۔ دوسرا آدھا تلخ زہر ہو اور رنگ تیرہ ہو ۔ اب ان دونوں حصوں میں اوپر نیچے سے سمندر کی طرح لہریں اٹھ رہی ہوں ۔ کبھی یہ اوپر کبھی وہ اوپر ۔ کبھی صلح کی موجیں آٹھیں تو سینے بے کینے ہو گئے ، کبھی جنگ کی لہریں آٹھیں تو محبت زیر و زبر ہوگئی ۔ محبت تلخیوں کو شیریں کرتی ہے کیوں کہ اُس کا کام رشد و ہدایت

---

۱ ۔ اصل میں 'جائے' ۔ صحیح 'جائیں' ہے ۔
۲ ۔ اصل میں 'واکے' غلط ہے ۔ صحیح 'والے' ہے ۔ مرتب

ہے ۔ قہر ، شیریں کو تلخ کرتا ہے ۔ تلخ و شیریں آپس میں موافقت نہیں کرتے ۔ مگر یہ تلخ و شیریں اس نظر سے بھلے دکھائی دیتے ہیں کہ وہ عاقبت کے منظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔

چشمِ آخر بیں صحیح و درست دیکھتی ہے ۔ چشمِ اول بیں خطا کرتی ہے ۔ بہت سی شیریں چیزیں شکر نظر آتی ہیں مگر اُن میں زہر بھرا ہوتا ہے ۔ جو زیرک ہے وہ تو ان کو دور ہی سے پہچان جاتا ہے اور ہاتھ نہیں لگاتا ۔ بعض اُس کو سونگھ کر پہچانتے ہیں اور رد کرتے ہیں ، بعض اُس کو لب و دنداں سے چکھ کر تھوک دیتے ہیں ، بعض گلے کے اندر لے جا کر قے کرتے ہیں ، بعض کھا جاتے ہیں ، سارا بدن اُس سے اُن کا تکلیف پاتا ہے اور اُس کا اخراج مشکل سے ہوتا ہے ۔ اُن سے زندگی میں امراض پیدا ہوتے ہیں جو قبر میں لے جاتے ہیں ۔ وہاں بھی وہ اُن کو ستاتے ہیں ۔ ہر نبات و شکر پینے کے واسطے زمانے کی مہلت ضرور ہے ۔ مدتیں چاہئیں کہ آفتاب سے لعل میں رنگ و چمک پیدا ہو ۔ پانچ سات برس سے کم میں درخت پر پھل نہیں لگتا ۔ ایسے ہی اس تلخ و شیرینِ زمانہ کے نتیجے دیر میں نکلتے ہیں ۔ تصاریف غذائی سے زہر بھی خوش‌گوار ہو جاتا ہے ۔

دنیا کسی مقام میں زہر ہے ، کسی مقام میں دوا ، کسی جگہ گہر ، کسی جگہ شکر ، کہیں خار کہیں گل ، کہیں سرکہ کہیں مُل ، کہیں خوف کہیں رجا ، کہیں بخل کہیں سخا ، کہیں فقر کہیں غنا ، کہیں قہر کہیں رضا ، کہیں جور کہیں وفا ، کہیں طمع کہیں عطا ، کہیں دُرد کہیں صفا ، کہیں خاک کہیں گیاہ ، کہیں عیب کہیں ہنر ، کہیں سنگ کہیں گہر ، کہیں حنظل کہیں شکر ، کہیں خشکی کہیں تری ، کہیں ظلم کہیں عدل ، کہیں

جہل کہیں عقل ، کہیں ایک ہی چیز میں ایک جگہ گزند جان ، دوسری جگہ درمان ۔ غورہ میں ایک پانی ترش ہوتا ہے ، وہی انگور ہونے پر شیریں ہو جاتا ہے ، وہی خم میں تلخ اور حرام ہو جاتا ہے ۔ غرض ان تفاوتِ امور کا ظہور عاقل خوب جانتے ہیں ۔

باب ہشتم

معاملات دنیا

۱ - تجرد و تاہل کے فوائد و نقصان

تجرد سے مراد یہ ہے کہ آدمی عورت سے الگ رہے اور تأہل سے مراد یہ ہے کہ آدمی نکاح کر لے - ان میں سے ہر ایک کے جدا جدا نفعے اور نقصان ہیں - انسان کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں اس لیے انسان کے حق میں تأہل و تجرد کی منفعتیں اور مضرتیں بھی جدا جدا ہوتی[۱] ہیں - اگر ہر انسان کے حق میں اُن کے فوائد اور نقصانوں کا وزن میزانِ عدل میں کیا جائے تو اکثر آدمی ایسے ہوں گے جن کے حق میں تأہل کے فائدوں کا پلڑا جھکا ہوگا - بعض ہی شخصوں کے حق میں دوسرا پلڑا جھکے گا - نکاح کی رغبت اور اغراض بہ حسب اختلافِ حالات مختلف ہوتی ہیں - اُس کی منفعتیں اور مضرتیں بیان کرتے ہیں -

پہلا فائدہ نکاح کرنے کا اولاد کا ہوتا ہے - یہ سب کی اصل ہے اور نکاح اُسی کے لیے موضوع ہوا ہے - بقائے نسل اسی سے ہے ، بغیر اس کے جنس انسان سے عالم خالی ہوتا ہے - تأہل ایک تیراک ہے کہ اولاد کے موتی محیط عدم سے نکال کر ماں باپوں کی گردن کا زیور بناتا ہے - وہ باغبان ہے کہ عورت و مرد کی آمیزش سے ثمر اولاد سے ماں باپوں کو متمتع کرتا ہے - روشن گر ہے کہ آئینۂ خاطر کو عیال کی کدورت کی

۱- اصل میں 'ہونے' صحیح نہیں - مرتب

خاکستر میں غوطہ دیتا ہے کہ اندیشہاے نفسانی کا زنگ اُتر جائے۔ آتش زنہ ہے کہ خاندانوں کا چراغ روشن کرتا ہے۔ اولاد ہی اس خوان جہان کا نمک اور دیدۂ دل کی عینک ہے۔ جیسے جانوروں کے پھنسانے کے واسطے دانہ پھیلا دیا جاتا ہے، اسی کی چاہ میں وہ جال میں پھنس جاتے ہیں، اسی طرح عورت اور مرد کو تزویج کے جال میں پھنسانے کے لیے اولاد کا دانہ ڈالا جاتا ہے جس کی خواہش کے وہ دام میں آتے ہیں۔

عورت و مرد زوج پیدا کیے گئے ہیں اور اُن کے اندر ایسے اعضا بنائے گئے ہیں کہ جن کے خط عقد پر (جن میں نقوش و حروف اور آواز کو دخل نہیں ہے) یہ لکھا ہوا ہے کہ ان میں ازدواج ہو جس کا نتیجہ اولاد ہو۔ جس کو خدا نے چشم بصیرت دی وہ اس خط سے حکمتِ ازلی کے دقائق سمجھتا ہے۔ یہ ساز و سامان عورت و مرد میں اپنی زبان فصیح سے خالق کی مراد پر شہادت دیتا ہے اور عقل والوں کو بتاتا ہے کہ ہم کو اولاد کی غرض سے بنایا ہے۔ پس اُس کے پیدا کرنے میں وہ لذت ہے جس کی برابر کوئی دنیاوی لذت نہیں۔ پس جو نکاح کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کو جو چیز محبوب ہے، اُس کو پورا کرتا ہے۔ جو اس سے اعراض کرتا ہے وہ اس چیز کو ضائع و تلف کرتا ہے۔ ایسے کام اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔

اب یہ کہنا شاید قابل اعتراض ہو کہ خدا تعالیٰ کو نسل آدم کا قائم رکھنا محبوب نہیں ہے، اس سبب سے کہ خدا تو خود انسان کو موت سے معدوم کرتا ہے۔ اگر انسان نکاح سے اعراض کرکے نسل آدم کو معدوم کر دے تو کیا ناپسند کام کرتا ہے۔ اس کا جواب دینا انسان کی قدرت سے باہر ہے کہ کیوں انسان کے معدوم کرنے کے یہ طریقے مقرر کیے ہیں۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ نفس کی حفاظت شہوت کے فسادوں سے ہو ۔ انسان کی سرشت میں جوش شہوت ایسا ہے کہ جب وہ غالب ہوتی ہے تو عقل اور تقوے میں یہ قوت نہیں ہوتی کہ اس کو روک سکیں ۔ اس کی جوش کی حالت میں عقل و علم دونوں دھرے رہتے ہیں ۔ آدمی وحشیوں کے سے کام کرنے لگتا ہے ، اس لیے بری بری باتوں میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے ۔ تجرد محض نہیں رہ سکتا ۔ اگر تقوے نے بڑا زور کیا ، اعضائے ظاہری کو شہوت سے روک دیا مگر دل کا اس کے وسوسے و فکر سے بچانا اس کے اختیار میں نہیں ، اس لیے نفس ہمیشہ کشاکش میں رہتا ہے اور جو دل پر وسوسے گزرتے ہیں اس کو خدا ہی جانتا ہے ۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ نکاح کرنے سے نفس کو راحت پہنچتی ہے ۔ بی بی کے پاس بیٹھنے سے ، اس کا منہ دیکھنے سے دل خوش ہوتا ہے ، اس کی حرکتوں سے جی کو چین ہوتا ہے ۔ انسان کی سرشت میں ہے کہ جب اس کے نفس پر خلاف سرشت دباؤ ڈالا جائے گا اور زبردستی وہ کسی مخالف امر پر لایا جائے گا تو وہ کہنا نہیں مانے گا اور سرکشی کرے گا ۔ لیکن اگر اس کو کبھی کبھی لذتوں سے راحت ملتی رہے گی تو وہ خوش رہے گا ۔ عورتوں کے ساتھ دل بہلانے میں وہ راحت ہوتی ہے جس سے کرب دور ہوتی ہے اور دل مسرور ہوتا ہے ۔ جب نفس سے زبردستی کام لیا جاتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے ، اس لیے ضرور ہے کہ وہ حلال چیز سے لذت اور راحت حاصل کرے ۔ جب کوئی شخص غایت درجے کی محنت کرے تو ضرور ہے کہ وہ بیچ میں دم بھی لے ، کچھ ٹھہرے بھی ۔ پس جو آدمی سارے دن اپنے فکر معیشت میں بسر کرے تو چاہیے کہ کوئی اس کو آرام و راحت پہنچے جس سے وہ لذت یاب ہو ۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ گھر کا انتظام ہوتا ہے ؛ کھانا پکانا ، گھر کا صاف ستھرا رکھنا ، فرش بچھانا ، برتن مانجھنے اور لوازم خانہ داری مہیا کرنے سے مرد کے دل کو فراغت ہوتی ہے ۔ اگر آدمی اکیلا گھر میں رہے تو بڑی مشکل پڑے اس لیے کہ گھر کے سب کاموں کی کفالت از خود کرے تو اس کی اکثر اوقات اسی میں تلف ہو جائے گی اور کسی علم و عمل سے فارغ نہ ہوگا ۔ اس اعتبار سے ایک نیک بخت عورت کا گھر میں ہونا ایک نعمت عظمیٰ ہے ۔ وہ تدبیر منزل سے بالکل بے فکر کر دیتی ہے جس کو نیک بخت بی بی مل گئی گویا دنیا کی ساری خوبیاں ہاتھ لگ گئیں ۔

پانچواں فائدہ یہ ہے کہ نکاح سے تہذیب اخلاق ہوتی ہے اور نفس پر ایک مجاہدہ اور ریاضت ہوتی ہے ۔ گھر کی رعایت و ولایت[1] اور گھر والوں کے حقوق کا ادا کرنا اور اُن کی عادتوں پر صبر کرنا اور اُن سے تکلیف اُٹھانی ، اُن کی اصلاح میں کوشش کرنی ، اُن کو معاد و معاش کے طریقے سکھانے ، اُن کے لیے کسب حلال میں جانفشانی کرنی ، اولاد کی تربیت و تعلیم ، یہ سب امور بڑے مرتبے کے ہیں ۔ پس ان سب کاموں کے کرنے سے اپنے نفس کی اصلاح ہوتی ہے ۔ جو گھر سے ایذا اس کو پہنچتی ہے ، اس پر صبر کرتا ہے ۔ فقط اپنے نفس کی راحت و رفاہیت و اصلاح میں وہ ساعی نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ زن و فرزند کی فکر میں رہتا ہے کہ کیوں کر اُن کو راحت اور چین پہنچائے اور ان کی معاد و معاش کے باب میں اصلاح کرے ۔ وہ حلال کمائی کو اپنے ہی لیے طلب نہیں کرتا ہے

---

۱ ۔ اصل میں لفظ 'ولایت' کا سواد روشن نہیں تھا ، قیاس سے پڑھا گیا ۔ مرتب ۔

بلکہ غیروں کے لیے بھی ۔ یہی تہذیب و اخلاق کا جزو اعظم ہے ۔ وہ جو کچھ گھر والوں پر خرچ کرتا ہے وہ بڑی خیرات ہے ۔ حلال کمانا اور عیال پر خرچ کرنا بڑی نیکی ہے ۔

بعض اوقات بیویوں کی بدمزاجی سے خاوند بڑے نیک مزاج ہو جاتے ہیں ۔ بی بیاں زبان درازیاں کرتی ہیں ، ستاتی ہیں ، زیادتی کرتی ہیں ، وہ خاموش رہتے ہیں ۔ اور صبر کرنے سے اُن کے نفس کو جفا کشی اور غصہ مارنے کی عادتیں درست ہو جاتی ہیں ۔ اس لیے کہ جو شخص خود تنہا رہتا ہے تو اس سے اس کے نفس کی تہوں کی خواہشیں مترشح نہیں ہوتیں اور نہ باطن کے عیب ظاہر ہوتے ہیں ۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اپنے نفس کو ایسے بکھیڑوں میں ڈال کر آزماوے اور صبر کا عادی ہو کر مرتاض و معتدل عادات پیدا کرے ، تاکہ باطن صفات ذمیمہ سے پاک صاف ہو جائے ۔

ان فوائد کے ساتھ نکاح میں آفتیں بھی ساتھ لگی ہوئی ہیں ؛ اول سب سے زیادہ قوی آفت یہ ہے کہ جب اسباب معیشت کے اطوار بہتر ہو جاتے ہیں تو پھر آدمی حلال روزی کے پیدا کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے ۔ جب آدمی نکاح کرے گا تو نکاح کے سبب سے طلب بھی زیادہ ہوگی ۔ پھر گھر والوں کو کھلانا اس کے ذمے ہوگا جس میں وہ حرام حلال کی تمیز نہیں کرے گا ۔ اس کو بی بی بچوں کے اخراجات کے لیے وہ ناجائز کام کرنے پڑتے ہیں کہ اگر تنہا ہوتا تو ہرگز نہیں کرتا ۔

دوسری آفت یہ ہے کہ گھر والوں کے حقوق کو ادا کرنے اور اُن کی عادتوں پر صبر کرنے اور ایذا کی برداشت کرنے سے قاصر ہو ۔ زن و فرزند کے حقوق ادا کرنا سہل کام نہیں ہے ۔ جو کوئی اس سے پہلو تہی کرتا ہے ، وہ ایسا ہے جیسے

کوئی بادشاہ رعیت سے کنارہ کشی کرے ۔ انسان اپنے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کیا کرتا ہے ۔ نکاح کی صورت میں تو اس پر اور بہت سے حقوق ہو جاتے ہیں اس لیے بزرگ آزاد منش نکاح سے اعراض کرتے ہیں :

موش کے رہنے کو تنہا نہیں بل ہے کاف
اس کی دم میں بندھے جھاڑو تو وہ پھر کیسے رہے

تیسری آفت یہ ہے کہ تاہل کے سبب سے دنیا کی طلب میں آدمی ایسا محو ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کو بھول جاتا ہے ۔ ہر وقت یہ سوجھتی ہے کہ اولاد کے انتظام معیشت کے واسطے بہت سا مال جمع کیجیے اور اُن کے واسطے اپنے پیچھے چھوڑیے اور اس کے سبب اپنے ہم چشموں میں دون کی لیجیے ۔

غرض کچھ ایسی صورت ہوتی ہے کہ سارے کام وہ اس طرح کرتا ہے جن سے کہ اس کو خدا کا خیال ہی کچھ نہیں رہا ۔ یہ بڑے جواں مردوں کا کام ہے کہ ایسی حالتوں میں خدا کو بھولیں[1] نہیں ۔ نالیاں خس و خاشاک سے بھر جاتی ہیں ، سمندر میں اُن سے کچھ تبدل نہیں ہوتا ۔ ایسے ہی جو باخدا ہیں وہ اس اہل و عیال کے بار سے خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوتے بلکہ اس میں اور ترقی کرتے ہیں ۔ جو نااہل ہیں وہ تاہل سے خدا سے غافل ہو جاتے ہیں ۔ غرض گو فوائد اور آفات دونوں ہیں مگر انسان اپنی حالت کو دیکھ کر اُن کو عدالت کی ترازو میں تول لے ، جس طرف کا پلڑا جھکتا دیکھے ، اُس طرف جھک جائے ۔ خوب سمجھ لے کہ میرے حق میں کس حالت کے بہتر ہونے کا ظن ہے ، اُس کو اختیار کرے ۔

---

۱ ۔ اصل میں 'بھولے' ہے ۔ مرتب

۲ - کثرت اولاد

کثرت اولاد وہ غضب ڈھاتی ہے کہ آدمی کو تونگری میں مفلس بناتی ہے - دو دولت مندوں میں آپس میں مباحثہ ہو رہا تھا کہ کون دولت مند زیادہ ہے - ہر ایک قسم کی دولت میں وہ برابر نکلے ، تو ایک دولت مند نے کہا کہ تیری اولاد مجھ سے زیادہ ہے ، اس لیے تو مجھ سے زیادہ مفلس ہے - کمی اولاد بھی ایک قسم کی تونگری ہے -

۳ - نکاح کے طریقے

مسلمانوں کے ہاں مذہباً جب تک عورت مرد بالغ نہ ہوں ، اُن میں نکاح درست نہیں ہوتا - گو اُس کا رواج ہندوستان میں نہ ہو مگر اور ملکوں میں یہ امر مذہباً مباح ہے کہ نکاح سے پہلے عورت کو[1] اپنے خاوند کی سیرت و اخلاق سے بہتر طور پر آگاہی ہو اور مرد کو عورت کی سیرت و صورت دونوں سے ، خصوصاً صورت سے اپنے معائنے سے - کیوں کہ اگر عورت بدصورت ہو تو سرشت انسانی اس پر کفایت نہیں کرتی مگر حسن سیرت[2] کو حسن صورت[2] پر ترجیح ہے - اگرچہ یہ قاعدہ مشہور ہو رہا ہے کہ صورت و سیرت کا اچھا ہونا لازم و ملزوم ہیں ، یعنی جس کی صورت اچھی ہوگی اُس کی سیرت بھی اچھی ہوگی - خواہ کسی طریقے سے نکاح ہو ، ہر حالت میں بہت سے گھر ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر یہ شعر صادق آتا ہے :

زن بد در سرائے مرد نکو — ہم دریں عالم است دوزخ او

---

۱ - اصل میں 'کو' نہیں ہے - مرتب

۲ - اصل میں 'جن صورت' اور 'جن سیرت' ہے لیکن یہ صحیح نہیں - 'حسن صورت' اور 'حسن سیرت' صحیح معلوم ہوتا ہے - مرتب

جن کو عورت خوبصورت ، خوش خلق ، سیاہ چشم ، رنگ میں سرخ و سفید ، شوہر دوست میسر ہو تو اُس کو اس دنیا میں حور مل گئی جس سے گھر جنت بن گیا ۔

اکثر آدمی یتیم اور مفلس عورت سے تو نکاح نہیں کرتے ہیں کہ جس کے کھانا کھلانے اور کپڑا پہنانے میں اور نفقہ دینے میں ، تھوڑے سے مال پر راضی کر دینے میں آسانی ہو ، بلکہ دنیاداروں کی بیٹیوں سے شادی کرتے ہیں جو ہمیشہ اپنی نئی نئی فرمائشیں اور خواہشیں اُن کے سامنے پیش کرتی ہیں ۔ بہت سے لوگ جہیز کے لالچ میں آن کر نکاح کرتے ہیں ، گویا اُنھوں نے بیاہ کو بھی ایک تجارت اور ربا کی صورت بنا رکھا ہے ۔ بعض مہر اور دولت کے لالچ میں آن کر اپنی جوان کنواری لڑکیاں بوڑھوں سے بیاہ دیتے ہیں جس سے وہ بے چاری ساری عمر تباہی بھگتتی ہیں ۔ قرابت قریبہ میں شادی کرنی اچھی اس سبب سے نہیں ہوتی کہ اولاد ضعیف پیدا ہوتی ہے اور طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہوتی ہے ۔ مسلمانوں کے ہاں اس کا خوب تجربہ ہوتا ہے ۔

۴ ۔ شوھر و زوجه کے حقوق باھم

شوہر کو چاہیے کہ وہ عورت کے یہ حقوق مرعی رکھے کہ بیوی کی بدخلقی پر صبر کرنا ، اُس کے ساتھ خوش خلقی برتنا ، جس کے یہ معنی نہیں کہ ایذا نہ دے بلکہ یہ معنی ہیں کہ اگر وہ ایذا دے تو اُس کی برداشت کرے ۔ جب وہ غصہ کرے تو اُس کے غصے پر حلم کرے ۔ حضرت لقمان کا قول ہے کہ عاقل کو چاہیے کہ اپنے گھر میں بچے کی طرح رہے اور جب اپنی قوم میں ہو تو مرد بن جائے ۔ کبھی گھر والوں کے ساتھ سخت دل اور سخت زبان نہ ہو ۔ بیوی کے ساتھ مزاح کرے مگر اتنا نہ بڑھا دے کہ عورت کا مزاج بگڑ جاوے اور اُس کی نظر میں اپنی ہیبت

کچھ نہ رہے ۔ اس بات میں اعتدال کا لحاظ رکھے ۔ اسی طرح
جب کوئی بری بات دیکھے تو تنبیہ اور خفگی سے درگزر نہ کرے ۔
بری بات پر کبھی راضی نہ ہو بلکہ جب کوئی بات خلاف مروت
و عزت دیکھے تو سخت تنبیہ کرے ۔ جورو کا غلام بننا برا ہے ۔
ایسے گدھے نہ بنو کہ بیوی تمھاری پیٹھ پر پالان رکھ کر سوار ہو ۔

غرض بیوی کے ساتھ مخالفت و موافقت میں میانہ روی کا
طریقہ اختیار کرے اور ہر بات میں حق کی پیروی رکھے ۔ عورتوں
کے مزاج میں بدخلقی و کم عقلی و کج فہمی غالب ہوتی ہے ۔ اس
میں اعتدال جب ہی پیدا ہوگا کہ کچھ لطف اُن کے ساتھ کیا
جائے ، کچھ سیاست برتی جائے ۔

درشتی و نرمی بہم در بہ است　　چو فاصد کہ جراح و مرہم نہ است

ایسی شریر عورتیں بھی ہوتی ہیں کہ مرد کو بڑھاپے سے
پہلے بوڑھا کر دیتی ہیں ۔ جب شوہر پاس آئیں[1] تو گالی دیں ،
جب اُس کے پاس نہ ہوں تو اُس کے مال میں خیانت کریں ۔
عورت کی عزت میں ہمیشہ اعتدال رکھنا چاہیے ۔ جن امور کی خرابی
کا اندیشہ ہو اُن کی ابتدا سے غفلت نہیں کرنی چاہیے ۔ عورتوں پر
بدگمانی اور اُن کے باطن کی تلاش میں مبالغہ نہیں کرنا چاہیے ۔
عورت پر بدگمان ہونا بڑا گناہ ہے ۔ جس مرد کو بیوی کی غیرت
نہ ہو ، اُس کا دل اندھا ہے ۔ روٹی کپڑا اچھی طرح بیوی
کو دے ۔ نہ اُس میں تنگی کرے نہ اسراف ، یہ دونوں برے ہیں ۔
اعتدال چاہیے ۔ مرد کو تنہا خوری اچھی نہیں ، جو آپ کھائے
وہ سب کو کھلائے ۔

اگر زن و شوہر میں جھگڑا ہو جائے تو بہتر ہے کہ آپس

---

۱ ۔ اصل میں "آئے" ہے ۔

میں اُس کو دور کریں ۔ اگر وہ یوں نہ فیصل ہو تو برادری کی پنچایت میں اُس کو فیصلہ کرائیں ۔ عورت کو طلاق کوئی ایسی ہی سخت ضرورت آن پڑے تو دے ، نہیں (تو) طلاق دینا عورت کے دل کو رنج دینا ہے ۔ کسی کے دل کو رنج دینا اچھا نہیں ۔

اب یہ سنو کہ عورت پر مرد کے حقوق کیا ہیں ؛ بیوی بننا ایک طرح کا لونڈی بننا ہے ۔ اُس پر شوہر کی فرماں برداری واجب ہے ۔ اُس سے کبھی عورت کو نہیں چاہیے کہ زائد از حاجت کوئی چیز طلب کرے اور اُس پر وہ فرمائش کرے جو اُس کے مقدور سے باہر ہو ۔

ایک بزرگ نے اپنی بیٹی کو شادی کے وقت یہ سمجھایا کہ جس گھر میں تو آئی تھی ، اب اُس سے نکلتی ہے اور ایسے بستر پر جاتی ہے جس سے تو واقف نہ تھی ، اور ایسے آدمی کے پاس رہے گی جس سے پہلے الفت نہ تھی ۔ تو اُس کی زمین بن کہ وہ تیرا آسمان بن جاوے گا ۔ تو اُس کے لیے باعث آرام ہو تاکہ وہ تیرے لیے باعث آرام ہو ۔ تو اُس کی لونڈی بن تو وہ تیرا غلام رہے گا ۔ اپنی طرف سے اُس کے پاس مت جانا کہ تجھ سے نفرت کرے اور نہ اُس سے دور ہونا کہ تجھ کو بھول جائے ۔ بلکہ وہ اگر تیرے پاس ہو تو اُس کے قریب ہو اور اگر علیحدہ رہے تو دور رہ ۔ اور اُس کے ناک اور کان اور آنکھ کا خیال رکھ کہ تجھ سے بجز خوشبو کے اور کچھ نہ سونگھے اور سوائے اچھی بات کے تجھ سے کچھ اور نہ سنے اور نہ دیکھے ۔

ایک شخص نے بیوی کو سمجھایا[۱] کہ جب مجھے غصہ آئے تو اپنی زبان کو نہ ہلانا ۔ ڈھول کی طرح مجھے مت بجانا ۔

---

۱ ۔ اصل میں 'سمجھایا' کے بعد 'ہے' تھا جسے حذف کر دیا گیا ۔ مرتب

معلوم نہیں کہ مجھ سے[1] کون سی آواز عیاں ہو۔ کثرت سے شکوے نہ کرنا کیوں کہ دل بدلنے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ اور جب کچھ ایذا کا گمان ہوتا ہے تو دل میں دوستی نہیں باقی رہتی۔ پس تجھ کو حبیب جاوداں رہنا منظور ہے تو ان باتوں سے پرہیز کر۔

عورت کا یہ فرض ہے کہ خاوند کی خوشی کی خواہاں رہے، اس کے مال میں خیانت نہ کرے، شوہر کو کبھی نہ ستاوے اور جو کام کرے خاوند کی اجازت سے۔ شوہر کے لیے بناؤ سنگار کرے، جب شوہر نہ ہو تو نیک بخت اور پژمردہ رہے اور جب وہ آئے تو پھر وہی سامان عیش کرے۔

۵ ۔ صحبت و عزلت

صحبت کے معنی ساتھ رہنے کے اور عزلت کے معنی دور رہنے کے اور گوشہ نشینی کے ہیں۔ عقلا و حکما و اولیا کی رائے مختلف ہے کہ صحبت و عزلت میں کس کو ترجیح ہے۔ اب ہم دونوں کی برائی اور بھلائی بیان کرکے ثابت کریں گے کہ فی نفسہ ایک دوسرے سے افضل نہیں بلکہ اشخاص[2] اور احوال کے لحاظ سے کسی کے حق میں صحبت افضل ہے، کسی کے حق میں عزلت۔ اب یہ سنو کہ کون سی صحبت اچھی ہوتی ہے جس میں بیٹھنا چاہیے اور کون سی صحبت بری جس سے بچنا چاہیے۔

اول عاقلوں کی صحبت میں بیٹھنا چاہیے؛ اس لیے کہ عقل جو رأس المال اور اصل ہے، اس سے بڑھتی ہے۔ احمق کی صحبت سے

---

۱ ۔ اصل میں ایک 'مجھ سے' زائد تھا جسے حذف کر دیا گیا۔
۲ ۔ اصل میں 'اشخاص' سے پہلے لفظ 'وہ' بے جا تھا جسے حذف کر دیا گیا ۔ مرتب

احتراز کرنا چاہیے ۔ اس صحبت کا انجام وحشت اور جدائی ہے ۔ عقلا و علما کی صحبت آدمی کے حق میں ایسی ہوتی ہے جیسی زمین کے حق میں موسلادھار بارش ۔ جاہل کی صحبت عاقل کی عقل کو برباد کر دیتی ہے اور اُس کو جاہل بنا دیتی ہے ، کیوں کہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے ۔ احمق آدمی دوست کے نفع کا قصد کرتا ہے مگر اُس سے ضرر ہوتا ہے ۔ خردمند اگر دشمن بھی ہو تو خرد کا طریقہ ایک فن واحد ہوتا ہے ، اُس سے آدمی اپنے تئیں بچا سکتا ہے ۔ مگر دوست جو حمق کے جنون میں گرفتار ہو ، اُس کے فنون تو صدہا ہوتے ہیں ، اُس سے حفاظت نہیں ہو سکتی ۔ عاقل وہ شخص ہے کہ یا[1] تو خود وہ باتوں کو ایسی طرح سمجھے جیسے کہ وہ نفس‌الامر میں ہیں یا وہ سمجھانے اور سکھانے کے بعد بات کی اصل اور تہ کو معلوم کرلے ۔ ایسے سچے آدمی کی صحبت عیش کے وقت زینت دیتی ہے اور مصیبت کے وقت اُس کے دفع کرنے کا سامان مہیا کرتی ہے ۔

دوم یہ ضرور ہے کہ جن عاقلوں کی صحبت میں بیٹھو ، وہ خوش خلق بھی ہوں ۔ اگر ان پر غصہ و شہوت کا غلبہ ہوتا ہے یا بخل و نامردی کا دباؤ پڑتا ہے تو وہ اپنی خواہش کی اطاعت کر جاتے ہیں اور جو بات اُن کو معلوم ہوتی ہے اُس کے خلاف کرتے ہیں ۔ ایسے آدمیوں کے اخلاق درست نہیں ہوتے ، اُن کی صحبت سے کچھ نفع نہیں ۔

سوم بدکاروں کی صحبت سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو ۔ یہ صحبت تم کو بد بنا دے گی ۔ ایسے آدمیوں کی صحبت سے بچو جو حریص ہوں ، اُن کی صحبت زہر قاتل ہوتی ہے ۔ اس

---

۱ ۔ اصل میں 'کیا' ہے ۔ صحیح 'کہ یا' ہے ۔ مرتب

لیے کہ آدمی کی سرشت میں ہے کہ دوسرے کی مشابہت اور اقتدا کیا کرتا ہے ، بلکہ ایک کی طبیعت اپنے ہم نشین کی طبیعت میں سے کچھ باتیں چرا لیا کرتی ہے اور صاحب طبیعت کو خبر بھی نہیں ہوتی ۔ اس لیے حریص آدمیوں کی مجالست سے حریص ہو جاؤ گے ۔

ایک بزرگ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں کہ بیٹا تجھ کو اگر لوگوں کی صحبت کی ضرورت پڑے تو ایسے شخص کے ساتھ رہنا کہ جب تو اس کی خدمت کرے تو وہ تیری حفاظت کرے ، اور جب تو اس کے پاس بیٹھے تو تجھ کو زینت دے ۔ تجھ کو کوئی مشقت پیش ہو تو وہ برداشت کرے ۔ تو اپنا ہاتھ خیرات کے لیے پھیلاوے تو وہ پھیلا دے ۔ تجھ سے کوئی خوبی دیکھے تو اس کو شمار کرے اور برائی دیکھے تو اس کو روک دے ۔ جب تو اس سے لینے کا سوال کرے تو دیوے ، تو خاموش رہے تو خود ابتدا کرے ، تجھ پر بلا نازل ہو تو تیری غم خواری کرے ، جب تو کوئی بات کہے تو تیرے قول کی تصدیق کرے ، اگر تو کسی کام کا قصد کرے تو اچھا مشورہ دے ، اگر دونوں میں اختلاف ہو تو تجھ کو اپنے نفس پر ترجیح دے ۔ ایسا آدمی تو صحبت و محبت کے لیے ملنا دشوار ہے ۔

ایک حکیم کا قول ہے کہ جو شخص چار باتوں میں بدل جائے اس کی صحبت اختیار مت کر ؛ یعنی غصہ ، ہوا ، رضا ، طمع میں ۔ آدمی کو چاہیے کہ ان چاروں باتوں میں صادق الوفا ہو ۔ جو شخص کریم النفس ہوتے ہیں ان کا دستور یہ ہے کہ زشتی کو چھپاتے ہیں ، حسن کو ظاہر کرتے ہیں ۔ مگر لئیم جب دوستی کو ترک کرتے ہیں تو خوبی کو چھپاتے ہیں ، برائی ظاہر کرتے ہیں ۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ ایسے کے ساتھ صحبت اختیار کر

جو تیرے راز کو چھپاوے ، عیب کو ظاہر نہ کرے ۔ مصیبتوں
میں ساتھ دے : شعر

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی

اور نفیس چیزوں میں تجھ کو اپنے اوپر مقدم رکھے ، تیری
بھلائیوں کو پھیلاوے اور برائیوں کو تہ کرکے رکھے ۔ وہ
تیرا سچا دوست ہے جو تیرے ساتھ ہو ۔ تیرے بھلے کے واسطے
اپنا ضرر کرے : شعر

دنیا کے حادثوں سے جو ابتر ہو تیرا حال
آرام اپنا دور کرے تجھ کو چین دے

۶ ۔ آدمی چار طرح کے ہوتے ہیں : ایک بالکل شیریں، تو اُن
کی صحبت سے کبھی سیر نہ ہو ۔ دوسرا بالکل تلخ ، تو[1] ان سے
کچھ فائدہ نہ اٹھا ۔ تیسرے کھٹ مٹھا ، تو اُس سے کچھ حاصل کر
پیشتر اُس سے کہ وہ تجھ سے حاصل کرے ۔ چوتھے نمکین ، تو اس
کو بہ‌وقت حاجت کے اختیار کر ۔

۷ ۔ حضرت امام جعفر صادق[ع] کا قول ہے کہ پانچ آدمیوں
کی صحبت نہ اختیار کرو ؛ اول جھوٹا ، اس کا حال شراب کا سا
ہے کہ بعید کو قریب اور قریب کو بعید دکھلا دے ۔ دوم
احمق کہ اس سے تجھ کو کچھ نہیں ملے گا ۔ وہ تجھ کو نفع پہنچانا
چاہے گا ، اس کی بےوقوفی سے ضرر پہنچ جائےگا ۔ سوم بخیل ، جب
تجھ کو اس سے زیادہ ضرورت پڑے گی تو تجھ سے یارانے کی کٹی
کر دے گا ۔ چوتھا نامرد کہ سختی کے وقت تجھ کو چھوڑ کر
آپ رفو چکر ہو جائے گا ۔ پانچواں فاسق کہ تجھ کو ایک لقمہ

---

۱ ۔ اصل 'کہ تو' تھا ۔ مرتب

یا اس سے کم تر پر پیچ ڈالے گا ۔ غرض ایسی صحبت میں بیٹھنا چاہیے کہ دنیاوی معاملات میں اس سے مستفید ہو یا امر آخرت میں ۔

۸ ۔ صحبتیں تین طرح کی ہوتی ہیں : ایک دنیا کے لیے ، دوسری دین کے لیے ، تیسری دل بہلانے کے لیے ۔ یہ سب باتیں ایک صحبت میں نہیں مجتمع ہوتیں بلکہ متفرق ہوتی ہیں ، اس لیے ان کی شرائط بھی متفرق ہوتی ہیں ؛ ایک صحبت مثل غذا ہوتی ہے کہ جس سے کسی طرح مفر نہیں ہوتا ۔ دوم مثل دوا کہ کبھی اس کی ضرورت ہو اور کبھی نہ ہو ۔ تیسری مثل روگ کے کہ جس کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑے مگر امتحاناً اس سے بھی کام پڑتا ہے ۔ یہی صحبت ایسی ہوتی ہے کہ نہ جس سے امن ہو نہ نفع ۔

۹ ۔ کہتے ہیں کہ سب صحبتوں کی مثال ایسی ہے جیسے کہ درخت کہ ان میں بعض سایہ دار ہوتے ہیں اور ثمردار نہیں ہوتے ۔ وہ تو ایسی صحبتیں ہیں کہ جن سے دنیا میں فائدہ ہو مگر آخرت میں نہ ہو ۔ مگر دنیا کا نفع ڈھلتے ہوئے سائے کی طرح سریع الزوال ہوتا ہے ۔ بعض درخت ایسے ہوتے ہیں کہ پھل رکھتے ہیں ، سایہ نہیں رکھتے ۔ ایسی وہ صحبتیں ہیں کہ آخرت کے کام کی ہیں مگر دنیا کے کام کی[1] نہیں ۔ بعض درخت ایسے ہیں کہ جن میں پھل اور سایہ دونوں ہوتے ہیں ۔ وہ ایسی صحبتیں ہیں[2] کہ جن سے دین و دنیا دونوں کے فائدے حاصل ہوتے ہیں ۔ بعض درخت ایسے ہوتے ہیں کہ نہ جن میں پھل ، نہ سایہ ؛ جیسے ببول کا درخت کہ کپڑے پھاڑنے کا ہے ، نہ کھانے نہ پینے کا ۔

---

۱ ۔ اصل میں 'کے' غلط ہے ۔
۲ ۔ اصل میں 'ہیں' نہیں تھا ۔ مرتب ۔

یہ صحبتیں جن سے نہ نفع دین ہو نہ دنیا ، ایسے ہیں جیسے کہ حیوانات میں چوہا اور بچھو۔ غرض ہر فرد بشر کا نرالا مزہ ہے ، ان کا حال پھلوں کا سا ہے۔ کسی پھل میں مزہ اور شیرینی ہے ، کسی میں نہ ذایقہ ہے نہ شیرینی۔

۱۰ ۔ صحبت کا حال سن چکے ، اب عزلت کا حال سنو۔

اول اکثر عابدوں و زاہدوں کا میل اختیارِ عزلت کی جانب ہوتا ہے۔ اس کو وہ اختلاط اور صحبت پر اس سبب سے ترجیح دیتے ہیں کہ عزلت میں خدا کا ذکر فکر کرنے اور خدا کی عجیب صنعتوں اور زمین آسمان کی حکمتوں میں اور دنیا اور آخرت کے باب میں ، خدا کے اسرار میں غور کرنا خوب فراغت سے اس میں ہوتا ہے۔ وہ عزلت میں خدا کے ساتھ ہم نشین ہو کر باتیں کرتے اور آنس پیدا کرتے ہیں۔ غرض جو عابد حقیقت میں یہ کام کرتے ہیں ، اُن کی عزلت صحبت و اختلاطِ خلائق سے بزرگ تر ہے۔

دوم عزلت کی بدولت کثرت معصیت سے بچتے ہیں۔ یہ گناہ مخالطت کو لازمی ہیں کہ غیبت کرنا ، یا عیب سننا ، ریا ، نفاق۔ جب آدمی ملتا ہے تو بہت سی باتیں ایسی کرتا ہے کہ جو ریا اور نفاق سے خالی نہیں ہوتیں۔ مثلاً سلام علیکم کہتا ہے مگر دل میں تو یہ غرض نہیں ہوتی کہ وہ شخص دین و دنیا کی آفات سے بچا رہے جو اصل معنی و غرض اس کے ہیں۔

تیسرا فائدہ یہ ہے ؛ خصومت ، فتنہ و تعصب، جو ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ وہ گوشہ گزینی اختیار کرنے سے چھوٹ جاتا ہے۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کے شر سے نجات پاتا ہے اور آسودہ رہتا ہے۔ اس واسطے کہ جب تک لوگوں میں رہے گا تو اُن کی غیبت اور بدگمانی کے رنج سے نہیں بچے گا۔ غرض تنہائی میں

سب طرح سے سلامتی ہے : ع

ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را

بعض بزرگان دین نے اس گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر بہت سی باتیں معرفت الٰہی کی[1] ادراک کیں ہیں جن سے دنیا کو فائدہ پہنچا ہے ۔

یہ تو عزلت کے فائدے تھے ، اب اس کی آفات سنو کہ بعض مقاصد دینی اور کل مقاصد دنیوی اوروں کے بغیر نہیں حاصل ہوسکتے۔ وہ بغیر مخالطت کے بست[2] نہیں ہوتے۔ عزلت میں وہ فوت ہوتے ہیں ، ان کا فوت ہونا عزلت کی آفت ہے ۔ عزلت سے آدمی علم سیکھنے سکھانے سے محروم رہتا ہے ۔ بغیر علم کے عزلت اختیار کرنا حیوان بننا ہے ۔

دوسری آفت یہ ہے کہ نفع لینے اور نفع پہنچانے سے باز رہے گا ۔ کسب معاش جو ضروری ہے ، وہ بغیر مخالطت کے کیوں کر حاصل کر سکے گا ۔ اگر عیال دار ہو اور وہ کسب معاش کو چھوڑ کر عزلت اختیار کرے تو وہ ظالم ہے ۔

تیسری جو لوگوں کے اخلاق ذمیمہ پر صبر کرنے سے انسان کی نیک خوئی پیدا ہوتی ہے ، اس سے باز رہے گا ۔ ہاں جو یہ نیک خوئی حاصل کر چکے ہوں وہ اگر عزلت اختیار کریں تو مضائقہ نہیں ۔ نیک خوئی بڑی ریاضت سے حاصل ہوتی ہے ۔ ریاضت سے یہ غرض نہیں ہوتی کہ آدمی ہمیشہ رنج و تکلیف کھینچے ، جس طرح دوا سے تلخی نہیں مقصود ہوتی بلکہ بیماری کا جاتا رہنا مطلوب ہوتا ہے ۔ جب بیماری جاتی رہے تو اپنے تئیں ہمیشہ دوا کی تلخی

---

۱ ۔ اصل میں 'کے' ہے ۔

۲ ۔ اصل میں 'لست' ہے ۔ قیاساً 'بست' پڑھا گیا ۔ مرتب

میں گرفتار رکھنا کچھ ضرور نہیں ۔

چوتھی یہ آفت ہے کہ عزلت میں شاید وسواس پیدا ہوں اور ذکر الٰہی کے تواتر سے دل ملول ہو اور اچاٹ ہو جائے ۔ یہ امر لوگوں کی موانست اور ملاقات سے جاتا ہے ۔ دل جبر کرنے سے اندھا ہو جایا کرتا ہے ۔ آدمی کو چاہیے کہ کسی نیک دوست کی صحبت سے راحت حاصل کرے کہ اس سے دل کو فرحت اور نشاط زیادہ ہوتی ہے ۔

پانچویں آفت یہ ہے کہ عزلت میں نہ کسی کی[1] عیادت میں ، نہ تعزیت میں شریک ہو سکتا ہے جس کے سبب سے لوگوں کے حقوق تلف ہوں گے ، نفاق اور تکلف ان سے پیدا ہوں گے ۔

چھٹی آفت یہ ہے کہ مخالطت میں لوگوں کے حقوق کا ادا کرتے رہنا فروتنی کی ایک قسم ہے اور عزلت میں ایک نوع کا تکبر ہے ۔ اور اس تکبر سے یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ہم کسی کے پاس نہ جائیں ، لوگ ہماری زیارت کو آئیں ۔ غرض کبھی عزلت کے یہ سبب بھی ہوتے ہیں کہ آدمی تکبر کے سبب سے عزلت اختیار کرتا ہے ۔ جانتا ہے کہ محفلوں ، مجلسوں ، مجمعوں میں لوگ میری عزت نہ کریں گے ، یا یہ ڈرتا ہے کہ علم و عمل میں میرے نقصان لوگ جان جائیں گے تو وہ گوشہ نشینی کو اپنے نقصان کا پردہ بناتا ہے ، اور ہمیشہ اس آرزو میں رہتا ہے کہ میری زیارت کو لوگ آیا کریں اور مجھ سے برکت لیں ، میرے ہاتھ چوما کریں ۔ یہ عزلت نہیں عین نفاق ہے ۔ جو عزلت خدا کے واسطے ہوتی ہے اس کی دو علامتیں ہیں ؛ ایک تو یہ کہ گوشے میں آدمی کبھی بیکار نہ رہے؛ یا ذکر فکر میں مشغول رہے، یا علم و عبادت

---

۱ ۔ اصل میں "کی" ندارد ۔ مرتب

میں - دوسرے اس امر سے کراہت رکھے کہ لوگ اُن کی زیارت کو آئیں -

بعض بزرگ ایسے گوشۂ عزلت میں خدا پرستی کرتے ہیں کہ وہ کسی کے آنے کو اپنے پاس پسند نہیں کرتے ہیں - اور لوگ جیسے کسی کے آنے سے احسان مند ہوتے ہیں ، وہ نہ آنے سے ممنون ہوتے ہیں -

ایک فقیر کے پاس بڑا بادشاہ گیا - جب فقیر سے پوچھا کہ آپ کیا حاجت رکھتے ہیں ؟ تو اس نے کہا کہ میں یہ حاجت رکھتا ہوں کہ آپ مجھے دوبارہ نہ دیکھیں - جو لوگ گوشہ نشینی اپنی تعظیم کرانے کے لیے اختیار کرتے ہیں ، وہ بڑے نادان ہیں -

۱۱ - مصاحبت و مجالست

انسان مدنی الطبع ہے - اس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جائے اور آشنائی اور آمیزش کا دروازہ خلق کے لیے بند کر دے - وہ ہر امر میں معاد و معاش کے اندر آور آدمیوں کی اعانت کا محتاج ہے - اور خواص و عوام کی جماعت کے ساتھ اختلاط ناچار و لاعلاج ہے - جو عاقل بافراست اور ہوش‌مند، صاحبِ کیاست[1] ہے ، وہ تحقیق و تمیز کرکے لوگوں کے ساتھ قرین اور عام و خاص میں فرق کرکے ہم نشین ہوتا ہے کہ جن کی مصاحبت سے عمر بے بدل ضائع نہ ہو اور خدائے عزوجل سے غافل نہ ہو - یہ مصاحب اُس کی اصلاح حال میں ساعی ہو اور گمراہی سے آگاہی کی شاہ راہ پر ہادی ہو - ایسوں کے ساتھ ہم نشین ہونا چاہیے کہ جن کے اوضاع و اطوار کے ملاحظے سے خدا یاد آئے - اُن کی گفتار سننے سے علم و دانش بڑھے اور اُن کے کردار کے

---

۱ - اصل میں 'کیاست' ہے - مرتب

ہو کہ آخرت کو چھوڑ دے ، نہ آخرت میں ایسا مصروف و محو ہو کہ دنیا چھوٹ جائے ، دونوں برے ہیں ۔ تحصیل معیشت میں میانہ روی اچھی ہے ۔ سب جانتے ہیں کہ سونا چاندی تو برستا نہیں ، جب تک محنت و کسب نہ کروگے پیدا نہیں ہوتا ۔ جب تک آدمی محنت مزدوری نہ کرے وہ اوروں پر کرم نہیں کر سکتا ۔ ۔ کار آدمی سے زیادہ کوئی بدتر نہیں ہو سکتا ، اس لیے کہ نہ وہ کوئی دین کا کام کرے ، نہ دنیا کا ۔ سچا سوداگر سچے عابد سے بہتر ہے ۔ کوئی پیشہ کرنا جس سے کچھ مل جائے ، لوگوں سے[1] مانگنے کی نسبت[2] اچھا ہے ۔

۱۴ ۔ ایک بار سمندر میں طوفان آیا ، کشتی والوں نے حضرت ابراہیم ادھم سے ، جو کشتی میں آن کے ساتھ تھے ، عرض کیا ''دیکھیے حضرت! کیسی شدت ہو رہی ہے'' ۔ آپ نے فرمایا کہ شدت اس کا نام نہیں ، شدت یہ ہے کہ آدمی لوگوں کا محتاج ہو ۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ بازار کا پیچھا مت چھوڑو کہ تونگری ایک قسم کی سلامتی ہے ، یعنی لوگوں سے سلامت رہتا ہے اور کسی کا محتاج نہیں ہوتا ۔ انسان کو پرندوں کو دیکھ کر تو شرم کرنی چاہیے کہ وہ رزق کے طلب میں صبح کو ادھر اُدھر جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کے آتے ہیں ۔

کسی بزرگ کا قول ہے کہ طلب معاش میں مصروف ہونا میرے نزدیک مسجد کے کونے میں بیٹھنے سے اچھا ہے ۔ سر ہر

---

۱ ۔ اصل میں 'کے' ہے ۔

۲ ۔ اصل میں 'نسبت' کے بعد 'کر' بے معنی تھا ، حذف کر دیا گیا ۔
مرتب

لکڑیوں کا[1] گٹھا اٹھانے کی مشقت سوال کے کرنے سے بہتر ہے۔ غرض کہ سوال کی اور دوسرے شخص کی خدمت کے محتاج ہونے کی برابر کوئی ذلت دنیا میں نہیں۔ اگر کسی شخص کو بن مانگے ملی جاتا ہو تو بھی اس سے پیشہ کرنا افضل ہے، کیوں کہ لوگ اس کو اس نظر سے دیتے ہیں کہ وہ اپنی زبان حال سے سوال کرتا ہے، اور لوگوں میں اپنی احتیاج کھلا کھلی کہہ رہا ہے۔ غرض بھیک مانگنے سے اور بے کار رہنے سے ہر پیشہ کرنا اچھا ہے۔

۱۴ - لیکن جن معاملات میں آدمی کچھ پیدا کرے، اس میں درستی معاملہ، عدل، احسان، دین کا خوف ضرور ہے۔ تجارت سے خواہ یہ مقصود ہو کہ بہ قدر کفایت زائد از حد یا زائد از قدر حاجت حاصل ہو جائے تو اس میں اوپر کی چار باتوں کا لحاظ ضرور چاہیے کہ ہو۔ غرض ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ کوئی پیشہ یا تجارت اس نیت سے کرے کہ سوال کی ضرورت نہ پڑے اور لوگوں کا دست نگر نہ ہو۔ بلکہ حلال کی کمائی سے غنی ہو جاوے اور اپنے اہل و عیال کے حقوق ادا کرے، تاکہ اور سب اپنے بھائیوں آدم زاد کی خیرخواہی میں اپنا روپیہ صرف کر سکے۔ اور معاملات کرنے میں دوسروں کے لیے وہ بات پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔ حرام حلال کا خیال رکھے، دین کو دنیا کے لیے نہ فروخت کرے۔

۱۵ - توکل و جہد

توکل کا لفظ مشتق وکالت سے ہے جس کے معنی دوسرے پر اعتماد کرکے کام سپرد کرنے کے ہیں۔ جس کو کام سپرد کرتے

---

۱ - اصل میں 'کے' ہے۔ مرتب

ہیں ، اُس کو وکیل کہتے ہیں اور جو کام سپرد کرتا ہے اُس کو متوکل کہتے ہیں ، بشرطیکہ وکیل پر اُس کے نفس کا اطمینان اور اعتقاد ہو اور اُس کو متہم عجز و قصور کا نہ سمجھتا ہو ۔ غرض کہ توکل صرف وکیل پر اعتماد دلی کو کہتے ہیں ۔ جاہلوں کے نزدیک توکل کے معنی یہ ہیں کہ نہ بدن سے کوئی کام کرے ، نہ دل سے کوئی تدبیر کرے اور زمین پر پھٹے کپڑے کی طرح یا گوشت کے لوتھڑے کی مثال پڑا رہے ۔ یہ امر شرعاً حرام اور عقلاً ناجائز ہے ۔

توکل خدا پر کرنا بہتر ہے مگر اُس کے ساتھ حیلہ و تدبیر کرنی اور اسباب کا بہم پہنچانا ضرور تر ہے ۔ قول پیغمبر ہے کہ: ع باتوکل زانوے اشتر بہ بند ۔ الکاسب حبیب اللہ[1] ۔ انسان کی کوشش ان چار قسموں سے باہر نہیں ہوتی ؛ اول کسی نافع چیز کا حاصل کرنا جو اپنے پاس نہ ہو ، جیسے مال کا حاصل کرنا ۔ دوم اپنی اشیاے نافعہ کی حفاظت ، جیسے کہ ذخیرے کی ۔ سوم کسی ایذا رساں کو پہلے ایذا سے دفع کرنا ، مثلاً درندے یا چور کو ٹالنا ۔ چہارم جو مصیبت اپنے اوپر آ گئی ہو اُس کو دور کرنا ۔

اب ہر کوشش میں تدبیر و اسباب و جہد کا بیان کرتے ہیں ؛ نافع چیز کے حاصل کرنے کے تین قسم کے اسباب ہیں ؛ اول یقینی ، دوم ظن غالب و قابل اعتماد ، سوم وہمی کہ ان پر نفس کو اعتماد کامل اور اطمینان نہیں ۔ یقینی اسباب تو وہ ہیں کہ[2] اُن کے ساتھ مسببات خدا تعالیٰ کے حکم و مشیت سے وابستہ ہیں اور ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے ، اُس کے خلاف نہیں ہوتا ؛ مثلاً

---

۱ ۔ یعنی کمانے والا خدا کا دوست ہے ۔
۲ ۔ اصل میں 'ہیں کہ' ندارد ۔ مرتب

جب آدمی کے سامنے کھانا رکھا ہوا ہو اور وہ بھوکا بھی ہو مگر اس پر ہاتھ نہ بڑھائے اور کہے کہ میں متوکل ہوں، خدا تعالیٰ میرا بغیر کھانا کھلائے پیٹ بھر دے، تو یہ جنون ہے، توکل نہیں ہے۔

خدا تعالیٰ نے اسباب قطعی بنا دیے ہیں۔ جو اُس کی عادت خلق میں جاری ہے اُس کے برخلاف وہ نہیں کرتا۔ اگر آقا اپنے نوکر کے ہاتھ گرمی میں پنکھا دے اور کچھ نہ کہے تو نوکر سمجھ جائے گا کہ آقا کا مطلب کیا ہے۔ ایسے ہی جس کے ہاتھ ہیں وہ خدا کی رمز کو جانتا ہے کہ اُس کے دینے کا مقصد کیا ہے۔ اب کوئی کہے کہ میں متوکل ہوں، میری کھیتی[1] میں بغیر بوئے غلہ پیدا ہو جائے اور بغیر صحبت کے اولاد، تو اس ترک فعل کا نام توکل نہیں ہے۔ بلکہ توکل تو حال اور علم سے ہونا چاہیے؛ یعنی علم تو اس بات کا ہو کہ خدا نے ہاتھ اس کام کے لیے دیے ہیں۔ حال یہ ہو کہ سکون قلبی اور اعتماد خدا تعالیٰ کے فعل پر ہو کہ ہاتھ اس لیے دیے ہیں کہ ہم جہد و کسب کریں۔

دوسری قسم اسباب کی وہ ہیں کہ جو یقینی نہیں مگر غالب یہی ہے کہ مسببات کے بدون نہیں حاصل ہوتے، یا اگر حاصل ہوتے ہیں تو بہت دشواری سے۔ مثلاً کوئی شخص قافلے سے جدا ہو اور ویران جنگل میں چلا جائے جہاں آدمی، نہ آدم زاد کوئی ہو، اور زاد راہ ساتھ نہ لے، تو یہ توکل نہیں ہے بلکہ حماقت ہے، جان کو ہلاکت میں ناحق ڈالنا ہے۔ کوئی شخص دنیا کو چھوڑ کر کسی پہاڑی کی گھاٹی میں جا بیٹھے جہاں اُس کو کچھ کھانے پینے کو نہ ملے تو وہ متوکل نہ کہلائے گا بلکہ

۱۔ اصل میں 'میرے کہنے' بے معنی ہے۔ 'میری کھیتی' صحیح ہے۔ مرتب

جاگل ۔ یا کوئی شخص شہر میں رہے اور کوئی کسب نہ کرے تو یہ کاہلی ہے توکل نہیں ۔

اگر کوئی شخص رزق کے حاصل کرنے کی جہد نہ کرے اور کہے کہ خدا رزاق ہے ، وہ رزق پہنچائے گا ؛ جو باران برساتا ہے وہ ضرور نان دیتا ہے ، تو وہ یہ نہیں جانتا کہ خدا اپنے بندوں کو دوسروں کے ہاتھ سے رزق پہنچانا اس سے بہتر جانتا ہے کہ خود اپنے یدِ قدرت سے اُن کو دے ۔ غرض تمام اسباب سے دور رہنا مخالفِ حکمتِ الٰہی اور متضمنِ ناواقفیتِ عادتِ خداوندی ہے ۔ کسب کرنا اور عمل کرنا خدا تعالٰی کے دستور کے موافق ہے ۔ اس طرح توکل خدا تعالٰی پر ہو ، نہ اسباب پر ، یہی اصل توکل ہے ۔

تیسری قسم وہ اسباب ہیں کہ اُن سے مسبب پر پہنچنا وہمی بات ہے ، کچھ ظاہر کا اعتبار نہیں ؛ جیسے بڑی باریک تدبیریں ثقیلِ مآل بیں کرتے ہیں[۱] ۔ ضرور نہیں کہ جو تدبیریں کریں ویسا ہی ظہور میں آئے ۔ توکل کے معنی ترک تدبیر کے نہیں ۔ تدبیر کو حجاب خالق و مخلوق کے درمیان بعض آدمی بتلاتے ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ توکل کے ضعف سے تدبیر پیدا ہوتی ہے ۔ تدبیر پنجۂ تقدیر سے ستیز ہے ۔ توکل کا پیشہ یعنی کوئی پیشہ نہ کرنا سب سے بہتر ہے ۔ حکمِ حق کے آگے مردہ بننا چاہیے تاکہ خدا تعالٰی کی طرف سے کوئی زحمت نہ آئے ۔ غرض توکل کے لوگ ایسے معنی سمجھتے ہیں کہ جہد و سعی نہیں کرتے اور احمق بنتے ہیں ۔ کسب کو لقمۂ تذویر سمجھتے ہیں ، کسب کرنے کو کہتے ہیں کہ ایک بلا سے دوسری بلا کی

---

۱ ۔ اصل میں "کرتی ہیں" غلط ہے ۔ مرتب

طرف دوڑنا اور سانپ سے بچ کر اژدہے کے منہ میں جانا ہے۔ انسان جو حیلہ کرتا ہے وہی اس کا دام بنتا ہے؛ جس کو وہ جان جانتا ہے وہ خون آشام ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ کسب سوائے نام کے اور جہد سوائے وہم کے کچھ اور نہیں۔ افسوس ہے کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ کسب اسباب کی نردبان ہے، پایہ بہ پایہ چڑھ کے مطلب و مقصد کے بام پر پہنچتے ہیں۔ پاؤں خدا نے اس لیے نہیں دیے کہ لنگڑے بن کر بیٹھ رہیں، ہاتھ اس لیے نہیں دیے کہ لڑائی میں آستین کے اندر ان کو چھپا لیں۔ نعمتِ قدرت کا شکر سعی کرنا ہے۔ جملہ حال میں حیلہ ضرور ہے۔ جب تک جال نہ بچھاؤ گے، ہوا کے مرغ کیسے پکڑو گے۔ جو جہد نہیں کرتے وہ نادان ہیں، متوکل نہیں۔

ادخلوا الابیات من ابوابہا
و اطلبوا الارزاق من اسبابہا[1]

جو لقمہ کسب حلال سے کھائے گا وہ دل میں نور و کمالِ علم و حکمت و عشق و رقت پیدا کرے گا۔

۱۶ ۔ عورتوں کے ساتھ مباشرت و معاشرت

عورتوں کے ساتھ مباشرت و معاشرت ایک جلتی ہوئی آگ ہے۔ اگر وہ روغنِ عقل سے روشن ہوتی ہے تو وہ دین دنیا دونوں کے گھروں کو روشن کرتی ہے، اگر ہوا و ہوس کی خس و خاشاک سے سلگتی ہے تو دین دنیا دونوں کے خرمن کو جلا کر بھسم کرتی ہے۔ کیا وہ کم بخت بے سعادت ہے جو عقل کو چھوڑ کر،

۱۔ یعنی گھروں میں دروازوں سے داخل ہو (دیواریں پھاند کر نہیں) اور رزق حاصل کرنے کے لیے اسباب و ذرائع تلاش کرو۔ مرتب

نفس بہیمی کو بے باکی کے میدان میں چھوڑ کر بے مُہار بناتا ہے ۔ کیا وہ احمق بد بخت ہے کہ تزویج کی فضیلت کو ترک کرکے اندھوں کی طرح فسق و فجور میں پڑتا ہے ۔ جو شخص اپنی زن حلال کو چھوڑ کر زنا کرتا ہے ، وہ حقیقت میں پاکیزہ پختہ گوشت کو چھوڑ کر سڑے ہوئے کچے گوشت کو کھاتا ہے ، اور جو عورتیں اپنے خاوندوں کو چھوڑ کر اجنبی مردوں کے پاس جاتی ہیں ، وہ حلال کے دسترخوان سے آٹھ کر مُردار کھانے جاتی ہیں ۔

شاہدانِ بازاری کے ساتھ معاشرت کرنے پر جو لوگ راضی ہوتے ہیں اور فواحش کے ساتھ ہم آغوش ہوتے ہیں ، وہ سراپا اپنے تئیں تباہ و غارت کرتے ہیں ۔ اور جو شخص صورت پرستی کو اپنا کمال گمان کرتا ہے اور عورتوں کی کثرت کو اپنی مردانگی کا فخر سمجھتا ہے ، سر تا سر احمق اور بے عقل ہے ۔ یہ بات تو حیوانوں میں انسان سے زیادہ ہے اور بیل اور گدھا ، سؤر اس کام میں انسان سے بڑھ کر ہیں ۔ انسان کی بڑی جواں مردی یہی ہے کہ وہ اپنے نفس سرکش کو محرمات سے روکے اور نفس امارہ کو مارے ۔ یہی اس کا جہاد اکبر ہے ۔ یہ نہایت نامردی ہے کہ وہ ہوا و ہوس میں پھنس جائے ۔ نفس روباہ باز کے کتے اور شغالِ مست کو غفلت کے خوابِ خرگوش سے بیدار کرے اور حق کی بندگی کا پٹہ گلے میں ڈالے ۔ وہ شخص مردانہ اور بہادر ہے کہ جس وقت ہوائے نفس کی بادتند چلے تو ثبات قدم کو نہ چھوڑے ، اور میل طبعی کی[1] جب نسیم چلے تو سبزے کی طرح اس میں نہ لرزنے لگے ۔ خوش خرام اور سرو قامتوں کو دیکھ کر

---

۱ ۔ اصل میں 'کے' ہے ۔ مرتب

اُن کے پاؤں میں سانپ کی طرح لہ کر پڑے ۔ شیریں لبوں کا مگس نہ بن جائے ۔

غرض نفس کی ہوس خواہ کیسی ہی موج خیز ہو مگر اس میں وہ اپنے سفینۂ دل کو آتش گرداب سے بچائے ۔ انوار حق کے روبرو خورشید طلعتوں کے جمال کو کرمِ شب تاب سے کم تر جانے ، خوش صورتوں کا بندہ نہ بنے ، خدا کا بندہ رہے ۔ زلیخا طلعتوں کی آمیزش سے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح احتراز کرے :

اگر لذت ترک لذت بدانی　　　دگر لذت نفس لذت نخوانی

زنا ایک زہر قند نما ہے ، اس سے بچے تو شکر ملے گی ۔ اس عیب سے پاک ہو تو ہنر تیرے ہاتھ آئیں گے ۔ ان کنکروں کو چھوڑ تو گوہر ہاتھ لگیں گے ۔ جو شخص زنا کاری کرتا ہے وہ اپنے گھر کی قلتبانی کرتا ہے ۔ دیکھ لو کہ جس گھر کے مرد اوباش ہوتے ہیں ، اکثر ان کے گھروں کی عورتیں[1] بھی ایسی ہی خراب ہوتی ہیں ۔

۱۷ ۔ عاقلوں اور صاحب دلوں پر عورت غالب ہوتی ہے اور عورت پر جاہل غالب ہوتے ہیں ، اس لیے کہ اُن میں شفقت اور رقت نہیں ہوتیں ، تند مزاجی و خشم و شہوت ، یعنی قوائے حیوانی ان میں زیادہ اور لطف و کرم ، اوصاف انسانی کم ہوتے ہیں ۔

۱۸ ۔ نظر بازی

منگر در بتان آخر کار　　　نگرستن گرستن آرد بار

آنکھ کیا ہے ؟ جسمِ انسانی میں ایک رخنہ اور عجیب و غریب روزن ہے کہ جس کے اندر خانۂ دل میں ہزاروں خرابیاں جاتی ہیں اور کیا کیا ہنگامۂ فساد مچاتی ہیں ۔ دل بر ، سیم بر اسی

---

۱ ۔ اصل میں 'عورتوں' ہے ۔ مرتب

رخنے سے کمند نظر ڈال کر خانۂ دل سے صبر و شکیبائی کو نکال لیتے ہیں ۔ ابرو کمان اسی روزن سے اپنے غمزے کے خدنگ کو ڈال کر ہوش و حواس کو فنا کر دیتے ہیں ۔ حسن کے سودے عشق بازی کے بازار میں نظر ہی کی دلالی سے ہوتے ہیں ۔ صحیفۂ اعمال میں بہت سے گناہوں کی رقمیں نگاہ ہی کی قلم سے لکھی جاتی ہیں ۔ معشوقوں کی ہم آغوشی کا خیال نگاہ بغیر نہیں ہوتا ۔ یہ نگاہ بھول جاتی ہے کہ خدا بصیر ہے ، وہ ہمارے سب برے بھلے کاموں کو دیکھتا ہے ۔ سچ ہے نظرِ توبہ شکن سے بہت آفتیں پہنچتی ہیں ۔ جیسے صدف میں موتی چھپا ہوا ہے ، ایسا تُو بھی دیدے کو چھپا کہ جس سے تیر بلا کا ہدف نہ ہو ۔ جب دل کسی کی[1] دو آنکھوں پر مائل ہوتا ہے تو نظر ہی کا ہاتھ اُس کا رشتہ کس ہوتا ہے ۔ دیدہ جب بادام کی طرح بے پردہ ہوگا تو اُس کا مغز دہن کھائے گا ۔ جب غنچہ کھلے گا تو اُس کے اندر ہوا جائے گی ۔ پس آنکھ کی حفاظت کر کہ سب محرمات اس سے پوشیدہ رہیں ۔

۱۹ ۔ جوان عورت و مرد کو عصمت کے باب میں نصیحت

اے دختر ! تیرا رخ میری آنکھوں کا چشم و چراغ ہے ، تُو میرے باغ کا بہتر ثمر ہے ۔ اگرچہ تجھ سے زیادہ تیرے بھائی نیک اختر ہیں ، لیکن وہ میری آنکھوں میں تجھ سے بہتر نہیں ۔ دختر بغیر پسر نہیں ، صدف بدون دُر نہیں ۔ بخت نے تجھے ہمایوں فال بنایا ۔ مناسبِ حال دیکھ کر رواج کے موافق تیرا نام مستورۂ میمون رکھا گیا ۔ اب تیری یہ فرخندہ فالی جب ہے کہ تو

---

۱ ۔ اصل میں 'کی' ندارد ۔ مرتب

اپنے حال بے نام کو جال دے ۔ تیری عمر سات برس کی ہے اس لیے میری باتیں نہیں سمجھے گی ، مگر جب سترہ برس کی ہوگی تو جانے گی کہ میں کیا کہتا ہوں ۔ تو اپنی زندگی اس طرح بسر کر کہ جس سے تو اپنے خویشوں کا نام زندہ کرے اور میرا نام اس سبب سے روشن ہو کہ تو مجھ سے پیدا ہوئی ہے ۔ مرنے کے بعد پھر تو مجھے ایسا زندہ کر کہ لوگ سمجھیں کہ اب میں تجھ سے پیدا ہوا ہوں ۔ دُر ارجمند سے جیسے صدف مشہور ہوتا ہے ایسے ہی تو مجھے نام ور کر ۔ بہتر ہوگا کہ تو اپنے سامان کے واسطے اپنے پاؤں کو دامان میں کھینچ کر بیٹھ جائے ؛ جیسا دامان کوہ اپنی شکوہ کے سبب سے کبھی نہیں سرکتا ، اسی طرح تو اپنے دامان سے پاؤں کو نہ ہٹا ۔ جو قدم پس دامان بیٹھا اُس نے پردہ نشینی میں اپنا سامان کر لیا ۔ جو پاؤں سو جاتے ہیں وہ آرام پاتے ہیں ۔ جو عورت آسانی سے باہر چلی جاتی ہے وہ گھر کے سب آدمیوں سے ایسی ہراساں ہوتی ہے جیسے کفن چور رات کو کفن چرا کر دن کو مرد و زن سے ڈرتا ہے ۔ جو عورت لالہ زار میں جا کر گل چنتی ہے وہ دامن خار میں اٹکاتی ہے ۔ شراب پی کر آنکھوں کے گل سرخ بنانے سے بید کا رنگ رہنا اچھا ہے ۔ جب آنکھیں اُس کی شراب سے سرخ ہوں تو ان کا سفید ہونا بہتر ہے ۔ اپنی آنکھوں میں سرمہ اس طرح نہ لگا کہ منہ کالا ہو ۔ منہ پر سے جھوٹا گلگونہ اتار ڈال ۔ ایسی کوشش کر کہ بغیر غازے کے سرخ رو ہو اور تیرے صدق و صواب کا آوازہ بلند ہو اور تیرا رخ حمرا تجھ کو حمیر الخطاب بنائے ۔

مجھے زن کے پارسا ہونے کا ذان اس سبب سے نہیں ہوتا کہ عرق النسا کی سخت بیماری کا نام رگ زن ہے ۔ حالت فرسودگی میں عورت کی عصمت نہیں دیکھی جاتی بلکہ آسودگی میں ۔ بے مائگی

صاحب عصمت بناتی ہے۔ گھر جب مال سے پُر ہوتا ہے تو اس کے ہمسائے میں چور لگے رہتے ہیں۔ سارے شکر لب پر مگس ہوتے ہیں۔ شکر کے گرد جب تک مکھیاں کم نہیں ہوتیں کہ مگس راں نہ ہو۔

جو عورت کہ جوانی میں ملامت کے کام کرتی ہے، وہ بڑھاپے میں بڑی ندامت اٹھاتی ہے۔ جو عورت آسودگی سے آزاد رہتی ہے اس کا خانۂ ویران بھی آباد رہتا ہے۔ جو عورت کہ میل شراب میں آ جاتی ہے اس کا گھر خرابات بن جاتا ہے اور وہ خراب ہو جاتی ہے۔ جب اس کا وجود شریف مے آلود ہوتا ہے تو اس کے در و دیوار سے حریف آ موجود ہوتے ہیں۔ اگرچہ حجرے میں دور جام چلتا ہے لیکن اس کی بو ہمسائے کو پیام پہنچاتی ہے۔ شہر میں شیطاں سیرت انسانوں کا غوغا مچ رہا ہے، تو اپنے دروازے کو قفل لگا کر کنجی کو کہیں گم کر دے۔ پردہ نشین عورت کو اپنی بے پردگی سے آفت پیش آتی ہے۔ اگر تو یہ چاہے کہ میرے ہم دم مجھ پر طعنہ زنی نہ کریں تو نا محرموں سے پردہ کر۔ جس لقمے پر سرپوش نہ ہوگا وہ چیونٹیوں اور مکھیوں سے نہیں بچے گا۔ زات کو جس کھانے کی پتیلی پر چپنی نہ ڈھکی جائے گی وہ کتے بلی سے نہ بچے گی۔ عورت کا مقنعہ جو دام مگس نہیں بنتا ہے، وہ فرشتوں کا دام بنتا ہے۔ عورت کا جلوہ زنا شوہری[1] کے واسطے وہ نہیں ہے کہ پری کی طرح کرے بلکہ اس کا جلوہ پردے کے اندر شرم و ہراس ہے۔

اگر تو یہ چاہے کہ میرے اقربا مجھ پر خندہ زنی نہ کریں تو اپنے پردہ نشینوں سے پردہ کر۔ اپنے انوار میں آفتاب بن جا،

---

[1] - زنا شوہری : رشتۂ ازدواج۔

حیا کا پردہ اپنے رخسار پر ڈال - جس نے حیا کا نقاب چہرے پر سے الٹ دیا اس کی آبرو خاک میں مل گئی - پردۂ عصمت آلودگی سے رخنہ رخنہ ہو جاتا ہے - عورت فعل بد خواہ کیسا ہی پسِ داماں کرے ، وہ پنہاں نہیں ہو سکتا - بہت رلد اس کو آشکارا کردیں گے ، جن کی عادات یہ ہے کہ جو برے کام نہیں بھی کرتے ہیں تو بھی ان کے کرنے کی شیخیاں بگھارا کرتے ہیں -

بدکاروں کی یہ رسم ہے کہ جو کام بد کرتے ہیں ، اس کی شہرت کو اپنا شرف و فخر جانتے ہیں - جو زنِ رعنا رعنائی کرتی ہے اس کی دس پردوں کے اندر بھی رسوائی ہوتی ہے - زنِ بد کی تباہی پر اس کی شکل گواہی دیتی ہے - جفت حلال کے سوا اپنے خال کو بھی کسی کا منہ نہ دکھا - آفتاب سے بھی منہ چھپا کہ سایہ تیرا ہم قدم نہ ہو - خلوت میں سوائے شوہر کے کسی کے پاس نہ بیٹھ ، اگرچہ تیرا برادر ہی کیوں نہ ہو - غیر کو خیال میں بھی مقام نہ دینا چاہیے - جس گھر سے آسائش گم ہو جائے ، اگر وہ بہشت بھی ہو تو جہنم ہے - اور ایسا مطبخ ہے کہ جس میں روزن دھوئیں کے نکلنے کا نہیں ہے ، اس لیے لوگ روتے ہوئے اس سے بھاگتے ہیں -

زبان دراز بیوی کے ساتھ رہنا وحشی کتے کے ساتھ بندھنا ہے - جس کی بیوی گھر میں آہو کی طرح جولانیاں کرتی ہے ، وہ گرگ گزندہ ہے جو دانت مارتی ہے - اگر خاوند تونگر ہو تو بیوی کو چاہیے کہ زر و زیور سے صنم بنے لیکن اگر خاوند بے توشہ و مفلس ہو تو قناعت کو اپنا زیور اور پیشانی کے قطروں کو سلک مروارید بنائے ، ان سے بہتر زیور اس کے لیے اور نہیں ؛ اور فقط منہ کے دھو لینے کو آئینہ اور شانہ جانے - جو عورت انسان کی اولاد ہے وہ ایک شوہر رکھتی ہے اور جو ایک چھ

زیادہ رکھتی ہے، وہ خوک و سگ کی نسل سے ہے ۔ سب سے بڑا بدخواہ دشمن آدمی کا جو اُس کے گھر میں رہتا ہے ، وہ اس کا نفس ہے ، اس بدخواہ کا مارنا بڑی مردانگی ہے ۔ نفس کی رسی ڈھیلی نہ چھوڑ ، جہاں تک ہو سکے اُس کو قید میں رکھ ، وہ بدی کی طرف رہ نما نہ ہو ۔

جو عورت شہوت کے واسطے چراغ لیتی ہے ، اُس کی روشنی سے اس کو فروغ نہیں ہوتا ۔ جو مرد اپنے جادے سے قدم باہر رکھتا ہے ، خلق اس کے برے نام کو نیکی کے ساتھ یاد نہیں کرتی ۔ جو عروس اپنی رعنائی میں گرفتار ہوتی ہے ، رسوائی اس کے ساتھ ہوتی ہے ۔ برتن آلودہ پانی سے پاک ہوتا ہے ۔ مگر زن بد خاک سے پاک ہوتی ہے ۔ کوئی دوسرا شخص تیری برابر تیری نگہبانی نہیں کرسکتا ۔ پس جب ترا ہی نفس تیرے دروازے کو توڑ دے تو کون تری حفاظت کر سکتا ہے ، جو خود گرہ لگائے اُس کو دوسرا کون کھولے گا ۔ جو بکری بھیڑیے کے سامنے خود آئے اس کی پاسبانی کتا کیا کرے گا ۔ پس جس[1] کو خدا نے ادب دیا ہے وہ سر دے دے گا مگر فساد کی بات کو نہیں اختیار کرے گا ۔

۲۰ - پُر خوری

بعض نفس پرست ایسے شکم پرور ہوتے ہیں کہ شکم پرستی ان کا دین و ایمان ہوتا ہے ۔ معدہ ہر وقت آب و نان سے پُر ہوتا ہے ۔ فانوس بدن میں چراغ حیات کے لیے کھانا پینا بہ منزلہ روغن ہے ۔ جیسے روغن کی زیادتی[2] و کمی چراغ کے واسطے مضر ہوتی

---

۱ ۔ اصل میں 'جن' ہے ۔

۲ ۔ اصل میں 'زیادہ‌تی' ہے ۔ مرتب

ہے ، ایسے کھانے پینے کی افراط تفریط حیات کو معرض خطر میں ڈالتی ہے - اگر بھوکے پیاسے رہتے ہیں تو تمام قواء و حواس ضعیف ہوتے ہیں اور اگر ان کی افراط ہو تو پھر تمام بدن کے کارکن اپنی تدبیر و تصرف سے دست کوتاہ کرتے ہیں - امراض مہلکہ کا حملہ ہوتا ہے جو جان کو باہر نکال دیتے ہیں - کھانے پینے میں اسراف نہیں چاہیے- تمام علم طب اسی مسئلے میں آ جاتا ہے کہ معدہ خانۂ درد اور محل امراض ہے - امتلائے طعام و شرب سے اور غذا ہائے غلیظہ و نامناسب سے پرہیز کرنا اس کی دوا ہے اور دوا بھی ایسی ہے کہ اس سے کوئی زیادہ موثر نہیں -

۲ - خود آرائی

خود سازی و خود آرائی پر فریفتہ ہونا اور رعنائی و رنگینی لباس پر شیفتہ ہونا عورتوں کا شیوہ ہے - اے انسان صورت ، معنیٰ نشناس ، زشت طینت ، زیبا نمود ، بد گوہر ، رعونت اندود ، لالہ صفت ، خود نما ، سیاہ دروں و گلگوں قبا و سادہ لوح ، منقش لباس ، دشمن جاں ، عاشق تن ، خارستان شجر ، گل پیرہن ، زاغ سرشت ، طاؤس نما ، کرم طبع ، ابریشم قبا ! تو اس بات کو خوب جان لے کہ انسان کو اپنا لباس یہ بنانا چاہیے کہ بردباری و فروتنی کا پیراہن ہو ، عفت و پرہیزگاری کی ازار ، انکسار کی چادر ، صدمات و بلاؤں کی پاپوش ، تسلیم و رضا کا عمامہ ، بندگی و اطاعت کا کمر بند - وہی شخص صاحب سعادت ہے کہ اس خلعتِ والا سے مشرف ہو - جو اس تشریفِ دل آرا سے سرفراز ہوتے ہیں ، اُن کو کب پروا ہوتی ہے کہ جامہ نیا ہے یا پرانا ہے ، تن پوشیدہ ہے یا برہنہ - وہ اپنی خطائے نفس کی ندامت کو سو جامۂ چین و ختا سے اچھا جانتے ہیں اور اپنی شب بیداری کو ہزار خواب مخمل فرنگ سے بہتر سمجھتے ہیں -

جہد کن دل زندہ گرداں تن چہ آرای بہ زر
مردہ را سودے ندارد گورِ پر نقش و نگار

لباس کی شہرت چند قسم کی ہوتی ہے ؛ ایک یہ کہ بہت نفیس اور گراں بہا ہو اور اس کے پہننے سے امثال و اقران میں ممتاز ہو اور اس کے سبب سے لوگوں میں انگشت نما ۔

دوم یہ نہایت ہی برا ہو اور اس میں کثافت حد سے زیادہ بھری ہو ؛ جیسے کہ بد سیر فقیر اور طالب مرید پرور گدڑیاں اور ٹاٹ پہنتے ہیں اور بان کی رسیاں کستے ہیں ۔ پس بہتر ہے کہ آدمی لباس میں شیوۂ متعارف کو ہاتھ سے نہ دے اور ضابطۂ اعتدال کو نہ چھوڑے ، خود آرائی کو اپنا شیوہ نہ بنائے ۔

۲۲ - بیماری

بیماری اور مرض ، موت کا پیغام ہوتا ہے ۔ اس سے انسان کی حیات[1] متزلزل ہوتی ہے ۔ کچھ ضرور نہیں ہے کہ طبیب حاذق کا علاج مؤثر اور نافع اور اجل کا دافع ہو ۔ اکثر اُن کی تدبیریں خطا ہوتی ہیں اور بیماری بڑھاتی ہیں ۔ اگر وہ چارۂ مرگ میں بیچارہ نہ ہوتے تو پہلے اپنے تئیں موت سے بچاتے ۔ لقمان اور افلاطون کاہے کو مرتے ۔ پس جس وقت مرض پیش آئے طبیبان حاذق اس کے علاج سے عاجز ہوں تو مرنے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے ، جان جانے کا وقت قریب معلوم ہوتا ہے ۔ اگر اس بیماری سے بچ بھی جاتے ہیں تو مدتوں تک اس سے متاثر رہتے ہیں ۔ ہر ایک مرض بے خبروں کے لیے ایک خبر ہے ۔ جہل و غرور کے خونِ فاسد

---

۱ ۔ اصل میں ’حیات‘ کے بعد لفظ ’کی‘ زائد تھا جسے حذف کر دیا گیا ۔ یا ممکن ہے ’کی‘ زائد نہ ہو اور اس کے بعد کوئی لفظ کاتب سے رہ گیا ہو ۔ واللہ اعلم ۔ مرتب

نکالنے کے واسطے رگ دل پر ایک نشتر ہے ۔ حدیث ہے ''الحمیٰ قائد الموت'' (تپ پیش رو مرگ ہے) پس آدمی کو چاہیے کہ امراض و علل کو خدائے عز و جل کا فضل سمجھے ۔ قاصد صادق القول سے اپنے تئیں خبردار کرے اور اپنے تئیں واقعۂ ناگزیر کے لیے تیار کرے اور ہر درد کو یہ جانے کہ حکیم علی الاطلاق نے اپنے شفاخانے سے دوائے سود مند اور شربتِ مفید بھیجا ہے ۔

جو امراض کہ باطن کو مردہ بناتے ہیں اُن کا علاج حکیمانہ شروع کرے ۔ دنیا کی خواہشوں کی سرگرمی سے جو دلِ درد مند کو تپ لگ رہی ہے ، اسے دور کرے ۔ اندیشہ ہائے فاسد کے اخلاط سے جو سینہ ہائے خاطر گراں ہو رہے ہیں اُن کو سبک کرے ۔ ہوس ہائے نفسانی کی ذات الجنب سے پہلو کو خالی کرے ۔ وسوسہ ہائے شیطانی کی ذات الصدر کے مرض کو سینے سے دور کرے ۔ روز جزا کے انفعال کی زرد روئی کے رقاق سے اپنے تئیں نجات دے

خلاصہ یہ ہے کہ اسقام و آلام جسمانی سے امراض باطنی دور کرے اور مرگ کے لیے تیار ہو ۔ سفر عقبیٰ کی فکر کرے ، علائق دنیا کا جو بار گراں ہے ، اُس سے سبک ہو ، تاکہ سفرِ آخرت ہلکا ہو ۔ جو شخص مرگ کے لیے تیار نہیں ہوتا اور اپنی بھلائی کا خیال نہیں رکھتا تو وہ ایسا مرتا ہے کہ گویا مرگ مفاجات آیا کہ ناگہانی مر گیا ، گو بیماری کے سبب سے بستر پر سال بھر سے پڑا ہو ۔ غرض آدمی کو چاہیے کہ بیماری میں اور بیماری کے بعد عمل نیک کرے اور برے کاموں سے ہاتھ اٹھائے ۔ ہر درد ، دلِ پُردرد کے واسطے دوا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس دوا کا اثر آدمی پر کمتر ہوتا ہے ۔

۲۳ - خواب و بیداری

انسان کے ستۂ[1] ضروریہ میں سے خواب ہے - انسان کے واسطے وہ ضرور ہے اور اس سے اس کا بدن برپا رہتا ہے ، مگر وہ اس قدر پسندیدہ ہے جس قدر مزاج صحیح اور معتدل متقاضی ہو - جو اس سے کم ہوتا ہے وہ ضعیف کرتا ہے اور جو زیادہ ہوتا ہے ، آزار و رنج پہنچاتا ہے - خواب کا حال کھانے پینے کا سا ہے کہ اگر وہ حدِ اعتدال سے باہر نہ ہو تو نیک و مستحسن ہے اور جب اس سے تجاوز کرے تو بدن کی خرابی کا باعث ہے ، اور بدن کی خرابی سے دل بھی سیاہ ہوتا ہے اور نقد عمر عزیز بھی اس سے تباہ و ناچیز ہوتا ہے اور فرصت و دولت بھی بھاگتی ہے - بہت سونے سے دین و دنیا دونوں خراب ہوتے ہیں کیوں کہ اس میں بیکاری ہوتی ہے - نہ کوئی دین کا کام ہو ، نہ دنیا کا -

خواب اتنی طرح کے ہیں : خواب غفلت ، خواب شقاوت ، خواب لعنت ، خواب عقوبت ، خواب راحت ، خواب رخصت ، خواب حسرت -

خواب غفلت تو وہ خواب ہے جو ذکر خدا کی مجلس میں واقع ہو - خواب شقاوت وہ ہے جو نماز میں نیند آ جائے - خواب لعنت وہ خواب ہے جو صبح کے وقت ہو - خواب عقوبت وہ ہے جو صبح کی نماز کے بعد ہو کیوں کہ وہ سبب محرومیِ رزق کا ہوتا ہے - خواب راحت وقت قیلولہ کے جو چاشت کے بعد ہوتا ہے - خواب رخصت جو عشا کی نماز کے بعد ہو - خواب حسرت شب جمعہ کا خواب - غرض سب سے بدتر و شوم خوابِ صبح ہے جس سے آدمی رزق سے دور ہوتا ہے اور چہرہ بھی اس سے متغیر

---

۱ - ستۂ ضروریہ : چھ ضروری چیزیں -

اور زرد و زشت ہوتا ہے ۔ اس خواب سے اجتناب چاہیے ۔

ہوش مند بیدار دل جانتا ہے کہ جب آدمی اپنے بستر پر سو جاتا ہے ، خواب کا چور عقل و ہوش کی متاع ، جو حرکات آزادانہ کی سرمایہ ہے ، سرائے بدن سے چرا لے جاتا ہے ۔ چراغ شعور کا بخارات کے ہجوم سے بجھ جاتا ہے ۔ حواس کے پھول ہجوم خواب کی سموم سے مرجھا جاتے ہیں اور بحکم "النوم اخ[1] الموت" آدمی مُردوں کی برابر ہو جاتا ہے ۔ ہستی اس کی نیستی کے برابر ہو جاتی ہے ۔ کد خدائے روح خواب کی فوج کے استیلا سے سرائے تن سے فرار کرکے بیکاری و بے استقلالی کے گڑھے میں جا کر چھپ جاتا ہے ۔ وہ پھر عزم کرکے اپنے مقام پر عود کرتا ہے اور پھر عقل و روح اپنے گھر میں اقامت کرتی ہیں اور حواس اپنا کام انجام دیتے ہیں ۔ گویا اس سے تو حیات تازہ اور نعمت بے اندازہ انسان کو ملتی ہے ۔ بس سب سے پہلے بیدار ہوتے ہی انسان کو درگاہِ الٰہی میں اس نعمت کا شکر اور خدا کے سامنے سجدہ کرنا چاہیے ۔

۴۲ ۔ خواب بھی کیا عجیب و غریب چیز ہے کہ اس میں نہ قیدیوں کو قید خانے کی خبر ہوتی ہے ، نہ بادشاہوں کو اپنی دولت کی ، نہ سود و زیاں کا غم و اندیشہ ہوتا ہے ۔ نہ اس کا ، نہ اس کا خیال ہوتا ہے ۔ یہی حال عارفوں کا دنیا کی نسبت بیداری میں ہوتا ہے ، گویا وہ احوالِ دنیا سے دن میں بھی شب کی طرح خواب میں ہیں ۔

---

۱ ۔ نیند موت کی بہن ہے ۔ یعنی سویا ہوا آدمی اور مرا ہوا برابر ہیں ۔ مرتب

باب نہم

رذائل و فضائل اخلاق ، صفات انسانی

۱ - غضب کی حقیقت

غضب ایک قوت آدمی کے دل میں خدا نے رکھی ہے جو مضر اور مہلک چیزوں کو انسان سے رفع کرتی ہے - اس کو انسان کی سرشت میں آگ سمجھنا چاہیے - جب آدمی کسی مطلب سے روکا جاتا ہے یا اُس کی خلافِ مرضی کوئی چیز پیش آتی ہے تو وہ آگ بھڑک اٹھتی ہے - اس کا شعلہ ایسا تیز ہوتا ہے کہ دل کے اندر کا خون جوش کھا کر رگوں میں اوپر کی طرف چڑھ آتا ہے - یہی وجہ ہے کہ غصے کے وقت آدمی کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں ، چہرے کا پوست نرم ہوتا ہے ، اُس میں خون ایسا جھلکنے لگتا ہے جیسے شیشے کے اندر کوئی چیز جھلکتی ہے - یہ حالت اُس وقت طاری ہوتی ہے کہ کسی اپنے سے کم رتبہ آدمی پر غصہ آوے ، مگر جس وقت غصہ اپنے سے بڑے پر آتا ہے تو خون ظاہری جلد سے بستہ ہو کر قلب کی طرف رجوع کرتا ہے اُور رنج اور غم کے سبب سے چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا ہے ، اور اگر کسی برابر والے پر غصہ آتا ہے تو دونوں کیفیتیں طاری ہوتی ہیں کہ چہرے کا رنگ لال پیلا ہوتا ہے -

غرض غضب کا اثر دل پر ہوتا ہے ، یعنی بدلہ لینے کے واسطے خون دل کا جوش کرتا ہے - اول یہ قوت موذی چیزوں کے دفع پر متوجہ ہوتی ہے اور قبل ایذا اُن کا دفعیہ چاہتی ہے ، اور بعد ایذا تشفیِ دل کے لیے انتقام کے درپے ہوتی ہے - اس قوت

کی اشتہا اور غذا انتقام ہے اور اسی میں اُس کو لذت ملتی ہے اور بدون انتقام چین نہیں لیتی ۔

ابتدائے پیدائش سے اس قوت کے تین درجے ہیں ۔ اول تفریط یعنی کمی ، یہ مذموم ہے ، ایسے[1] ہی شخص کو بے غیرت کہا کرتے ہیں ۔ جس شخص کو غصہ دلانے پر غصہ نہ آئے ، وہ گدھا ہے ، کمینوں کی سی ذلت اُسے اُٹھانی پڑتی ہے ۔

دوسرا درجہ افراط کا ہے یعنی زیادتی کا ، وہ یہ ہے کہ غصہ اس درجے پر غالب ہو کہ آدمی عقل اور دین کی سیاست و طاعت سے نکل جائے اور بالکل آپے سے باہر ہو جائے۔ یہ غلبۂ غضب پیدائشی ہوتا ہے کہ ابتدائے عمر سے آدمی زود رنج اور زود غضب ہوتا ہے ۔ یا اُس عادت سے ہوتا ہے جو مغلوب الغضب و سریع الانتقام آدمیوں کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے ۔ وہ اس غصے کو شجاعت جانتے ہیں اور فخریہ کہتے ہیں کہ ہم کو ذرا برداشت نہیں اور ہم کو کوئی ذرا سی بات کہے تو ہم اُس کا منہ نوچ لیتے ہیں ۔ اس کہنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم کو ذرا عقل اور حلم سے بہرہ نہیں ۔ پس جو شخص ایسے لوگوں کی صحبت میں رہ کر ایسی باتیں سنتا ہے تو وہ غصہ کرنے کو اچھا جانتا ہے اور ایسا ہی خود بننا چاہتا ہے ؛ اس لیے غصہ بڑھ جاتا ہے ، تن بدن میں پتنگے لگ جاتے ہیں ۔ اپنی عقل و نفس سے استفادہ کرتا ہے ، نہ کسی دوسرے کی نصیحت سے ۔ غصے کی آگ کا دھواں اُٹھ کر دماغ کو تیرہ و تاریک کر دیتا ہے کہ اس میں عقل کا چراغ روشن نہیں ہو سکتا ۔

حکما اس حال کی تمثیل ایسے غار سے دیتے ہیں کہ دھوئیں

---

۱ ۔ اصل میں 'ایسي' ہے ۔ مرتب

سے بھرا ہو اور سوائے غوغا اور شراروں کے کوئی چیز نہ نکلتی ہو ۔ ایسی صورت میں علاج مشکل ہے ۔ جتنی بجھانے میں کوشش کی جائے گی اتنا ہی وہ بھڑکے گا ۔

آدمی کا حال غصے میں اُس سے بھی بدتر ہو جاتا ہے جو کشتی کا طوفان میں ہوتا ہے کہ نفس کی کشتی کا نا خدا دل تھا ، وہی غصے کے سبب سے اندھا اور بہرا ہو گیا ، پھر تدبیر کون کرے ۔ شدت غضب میں آدمی کا رنگ بدل جاتا ہے ، ہاتھ پاؤں[1] کانپنے لگتے ہیں ، افعال بے ترتیب صادر ہوتے ہیں ، کلام میں لغزش ہوتی ہے ۔ غرض ایسی صورت بگڑ جاتی ہے کہ آدمی آئینے میں دیکھے تو شرم کے مارے غصہ جاتا رہے ۔ صورت سے بدتر حال باطن کا ہوتا ہے کیوں کہ صورت ظاہری تو اصل صورت باطنی کی فرع ہے ۔

سب سے زیادہ غصے کا اعلان زبان کرتی ہے ۔ جب آدمی دوسرے پر غصہ نہیں نکل سکتا تو اپنے اوپر نکالتا ہے کہ کپڑے پھاڑتا ہے اور اپنا منہ پیٹتا ہے ، یا زمین پر ہاتھ دے مارتا ہے یا بدہوشوں کی طرح دوڑتا ہے ۔ کبھی ایسا گر پڑتا ہے کہ پھر اُٹھ نہیں سکتا ۔ کبھی اپنے تئیں ہلاک کر ڈالتا ہے ، کبھی دیوانوں کی حرکات کرنے لگتا ہے ، جمادات اور حیوانات کو مارتا ہے ۔ مثلاً برتن توڑ ڈالا ، دسترخوان اُلٹ دیا ، گلنے ، بیل ، گھوڑے کو گالیاں دینے لگا ، ایسی ایسی باتیں کرنے لگا کہ گویا وہ اُس کی باتوں کو سمجھتے ہیں ۔

اب تیسرا درجہ یہ ہے کہ غصہ عقل کے اشارے کا منتظر رہے ۔ جہاں عقل غصے ہونے کا فتویٰ نہ دے وہاں حلم و صبر

---

۱ ۔ اصل میں 'پاؤں' کے بعد ایک 'کا' زائد تھا جسے حذف کردیا گیا ۔

اختیار کرے ۔ اسی کو ''خیر الامور اوسطہا[1]'' کہتے ہیں ۔ غرض انسان کے مزاج غضب کے قبول کرنے میں مختلف ہوتے ہیں ۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ شدت غضب میں اپنے نفس کو روک نہیں سکتے، گو جلد بہ حالت اصلی آجاتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ابتدا میں تو نفس کو روک لیتے ہیں مگر ہمیشہ کو کینہ و بغض دل میں رکھتے ہیں ۔ اس اعتبار سے ان لوگوں کی چار قسمیں ہیں : اول وہ لوگ کہ گھاس کی طرح جلد جل جاویں اور جلد بجھ جاویں ، یعنی جلد غصہ آئے اور جلد اتر جائے ۔ دوسرے وہ کہ پتھر کے کوئلے کی طرح دیر کر سلگیں اور دیر ہی میں بجھیں ۔ یعنی دیر کر غصے میں آئیں اور دیر تک غصے رہیں ۔ تیسرے وہ کہ تر لکڑی کی طرح دیر میں جلیں اور جلد بجھ جائیں ، یعنی دیر میں غصے ہوں اور جلد اُن کا غصہ اُتر جائے ۔ یہ سب سے بہتر قسم کے لوگ ہیں ۔ چوتھے یہ کہ وہ سوکھی لکڑیوں کی طرح جلد بھڑک اٹھیں اور دیر کے بعد ٹھنڈے[2] ہوں ، یعنی زود غضب ہوں اور غصہ اُن کا دیرپا ہو ۔ یہ سب سے بدتر قسم کے آدمی ہیں ۔ اس مضمون کو مبادی الانشاء[3] کے حصۂ دوم میں دیکھو ۔

۲ ۔ حلم

حلم اس کو کہتے ہیں کہ غصہ جوش پر نہ آئے اور اگر آئے تو اُس کے فرو کرنے میں کچھ تعب و مشقت نہ اُٹھانی پڑے ۔ اگر غصہ آئے اور آدمی اسے پی جائے تو یہ بہ تکلف حلم بننا[4]

---

۱ ۔ یعنی میانہ روی سب سے بہتر ہے ۔
۲ ۔ اصل میں 'ٹھنڈی' ہے ۔
۳ ۔ 'مبادی الانشاء' مولوی ذکاء اللہ کی ایک اور تصنیف کا نام ہے جو چار جلدوں میں ہے مرتب
۴ ۔ اصل میں 'بنا' ہے ۔

ہے ۔ حلیم طبعی ، عادت جبلی ہے جس سے کمال عقل ثابت ہوتا ہے اور قوت غضبی فرماں بردار اور مغلوب رہتی ہے مگر ابتدا میں بزور و تکلف غصہ مارنے اور پینے سے ملکہ حلم کا حاصل ہوتا ہے ۔

علم کی بڑی زینت حلم ہے ، عقل کا بڑا رکن حلم ہے ۔ حلیم کو حلم کے سبب اول عوض تو یہی ملتا ہے کہ سب آدمی اُس کے طرف دار ہو کر اُس کے بدخواہ کے درپے ہوتے ہیں ۔ آدمی اجتہاد اور تجویز کے درجے پر نہیں پہنچتا ، جب تک کہ حلم جہل پر غالب نہ ہو ۔ مردوں میں بہادر وہ ہے جو اپنے حلم کے سبب سے جہل کو ہٹا دے ۔ بڑا پہلوان وہی ہے جو حلم کے زور سے غصے کو پچھاڑ دے ۔ جاہلوں کے ساتھ حلم کرنا بڑی نیکی ہے ۔

حضرت حکیم لقمان کا قول ہے کہ تین شخص تین باتوں سے پہچانے جاتے ہیں ؛ حلیم تو غصے کے وقت ، بہادر لڑائی کے وقت ، دوست حاجت کے وقت ۔

ایک حکیم کے ہاں ایک دوست آیا ، اس نے ماحضر پیش کیا ۔ بیوی بدمزاج تھی ، دسترخوان اٹھا لیا اور میاں کو گالیاں دینی شروع کیں ۔ وہ مہمان غصے ہو کر اٹھ گیا ۔ حکیم اس کے پیچھے گیا اور کہا کہ تم کو یاد ہے کہ ایک بار ہم تمھارے ہاں کھانا کھاتے تھے ، اتنے میں ایک مرغی آئی اور اس نے دسترخوان پر کی چیزوں کو خراب کر دیا تو ہم میں سے کوئی غصہ ہوا تھا ؟ اس نے کہا کہ کوئی نہیں ۔ حکیم نے کہا کہ تُو اب بھی ایسا تصور کر ۔ مہمان ہنس پڑا اور خفگی جاتی رہی اور وہ کہنے لگا کہ حکما کا قول درست ہے کہ حلم ہر درد اور چوٹ کی دوا ہے ۔

ایک شخص نے ایک حکیم کے پاؤں میں ضرب ایسی ماری کہ اس کو دکھ معلوم ہوا مگر غصے نہ ہوا ۔ لوگوں نے اس کا

سبب پوچھا - اس نے کہا کہ میں نے یہ سمجھ لیا کہ میرا پاؤں کسی پتھر پر سے پھسل گیا اور چوٹ لگ گئی ، اس وجہ سے غصے نہیں ہوا - جو حلیم ہوتا ہے وہ انجام کار پر نظر رکھتا ہے ، کچھ نامردی اور عجز کے سبب سے حلیم نہیں بنتا - ایک لڑکے میں حلم ہو تو اس کی وقعت اور ہیبت ایک جوان اور ادھیڑ کی برابر ہوتی ہے -

۳ - جب کہ تیرے جہل پر تیرا حلم غالب نہ رہے گا تو تجھ پر بہت سی بجلیاں چمکیں گی اور رعد کڑکیں گے ، یعنی تجھ کو تیرے بدخواہ ستایا کریں گے - پس حلم کا استعمال کرنا ضرور ہے - حلم کشتی ہے اور غضب طوفان ہے ، حلیم کشتی بان ہے - اگر طوفان کے دن کشتی ٹوٹ گئی تو کشتی بان بھی موجِ ہلاکت میں پڑے گا -

۴ - انتقام میں جو باتیں کہنی جائز ہیں

یہ امر تو محض ناجائز ہے کہ ظلم کے بدلے میں ظلم کیا جائے یا بدی کا مقابلہ بدی سے کیا جائے -

بدی را بدی سہل باشد جزا[1]
اگر مردی 'احسن الی من اسا'

غیبت کے عوض میں غیبت کرنی اور گالی کے عوض میں گالی دینی اور علیٰ ہذا القیاس ، معصیت میں داخل ہے ، مگر بعض لوگ یہ فرماتے ہیں کہ کسی کے مقابلے میں ایسے لفظ کہنے جن میں جھوٹ نہ ہو ، درست ہیں ؛ جیسے بدخلق ، بے حیا ، عیب جو وغیرہ کسی شخص کو کہہ دینا بشرطیکہ یہ باتیں اس میں ہوں ، یا یہ

---

۱ - یعنی برائی کا بدلہ برائی سے دینا تو آسان ہے لیکن تمہاری جواں مردی یہ ہے کہ جو برائی کرے ، اس کے ساتھ نیکی کرو - مرتب

کہنا کہ اگر تم میں شرم ہوتی تو ایسا نہ کہتے اور تم اپنی حرکت سے میری آنکھوں میں نہایت حقیر ہوگئے اور خدا تم سے عوض لے یا تم سے سمجھے۔ اور اسی قبیل کی باتیں گو دوسرے کو ایذا دیتی ہیں، مگر جھوٹ نہیں ہوتیں۔ غرض جو بات جھوٹ نہ ہو وہ انتقام میں کہنی جائز ہے۔ مظلوم کو اپنا انتقام لینا جائز ہے۔

غرض بعض اکابر سلف اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ جس قدر کسی کو اول ایذا پہنچے اس قدر یہ بھی عوض لے لے، مگر اس مقدار کا ترک کرنا افضل ہے، اس لیے کہ اس سے زیادتی کی نوبت پہنچ جاتی ہے اور مقدار واجب پر کفایت کرنا نہیں بن سکتا کیوں کہ ہر ایک آغاز کی انتہا مخفی ہوا کرتی ہے، اس لیے جواب دینے سے سکوت ہی افضل ہے۔

۵۔ حقد یعنی کینہ

جب آدمی غصے کے وقت بہ مجبوری انتقام نہیں لے سکتا اور غصہ پینا پڑتا ہے تو وہ انتقام باطن میں حقد بن جاتا ہے۔ اور حقد کے معنی یہ ہیں کہ دل میں ہمیشہ کسی کو ثقیل و گراں جاننا اور اس سے بغض و نفرت کرنی۔

غرض غضب کا نتیجہ حقد ہے اور حقد سے یہ آٹھ باتیں پیدا ہوتی ہیں: اول حسد، یعنی کینے کے باعث اس بات کی تمنا ہو کہ دوسرے کے پاس سے کوئی نعمت جاتی رہے۔ اور اگر اس کو کچھ نعمت ملے تو خود غم کرے اور اگر اس پر مصیبت آئے تو خوش ہو۔ دوسری غیر پر جو بلا آئے اس پر شماتت کرنی۔ تیسری دوسرے آدمی سے ایسا بیزار ہونا کہ اگر وہ ملنا بھی چاہے تو نہ ملے۔ چوتھی اسے حقیر و ذلیل سمجھنا۔ پانچویں زبان سے کلمات ناجائز کہنا۔ چھٹی اسے مسخرا بنانا اور اسے ہنسی میں اڑانا۔

ساتویں ایذائے جسمانی پہنچانا ۔ آٹھویں اس کے جو حقوق اپنے اوپر
ہوں اس کے ادا سے باز رہنا ، مثلاً قرض کا نہ دینا یا صلہ٘ رحم
بجا نہ لانا یا کوئی چیز اس کی دبا لینی ، وہ واپس نہ کرنی ۔ آدمی
کے لیے بہتر ہے کہ ان آٹھوں باتوں سے احتراز کرے ۔ بلکہ اتنا
کینہ رکھنا بھی برا ہے کہ اس کو دل میں برا جانے اور جو
باتیں اس کے ساتھ پہلے کرتا تھا وہ نہ کرے ۔ مثلاً دیکھ کر
خوش ہونا اور نرمی اور عنایت کرنی اور اس کی حاجتوں کے وقت
کام آنا اور اس کے نفع میں مددگار ہونا ۔

۶ ۔ عفو و رِفق

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

اگـــر توقعِ بخشائشِ خـــدا داری
زروے عفوو کرم برگناہگاراں بخش

عفو کے معنی یہ ہیں کہ اپنا حق جو دوسرے کے ذمے ہو ،
اُسے چھوڑ دے ؛ مثلاً قرض جو کسی کے ذمے ہو اس سے اُسے بری
کر دے ۔ جو شخص باوجود قدرت انتقام رکھنے کے معاف کردے
وہ بڑے رتبے کا آدمی ہوتا ہے ۔ سب سے زیادہ صاحب عزت وہی
ہے جو قابو پا کر معاف کرے ۔

حضرت امیر معاویہ کا قول ہے کہ جب تک تم کو انتقام
کا قابو اور موقع نہ ملے تب تک حلم اور برداشت کرو اور جب
موقع مل جاوے تو عفو اور احسان کرو ۔ بعض اکابر کا قول ہے
کہ حلم اس کا نام نہیں کہ ظلم کے وقت تو چپ ہو رہے اور جب
قدرت و موقع پاوے تو بدلہ لے ، بلکہ حلیم وہ ہے کہ ظلم کے
وقت حلم کرے اور قدرت کے وقت معاف کرے ۔ قدرت اور قابو
پانا ، کینے اور غصے کو کھو دینا حلم ہے ۔ جتنا بڑا گناہ ہو اتنا

بھی اس کے عفو کا فضل زیادہ ہے :

گر عظیم است از فرودستاں گناہ
از بزرگاں عفو کردن اعظم است

عفو میں ہمیشہ نرمی ہوتی ہے ۔ نرمی کے مقابلے میں تیزی اور نک چڑھا پن ہے ۔ نرمی حسن خلق کا نتیجہ ہے اور تیزی و تندی اس کے برعکس غصے اور درشتی کا نتیجہ ہے ۔ کبھی تو تیزی و تندی غصے سے ہوتی ہے اور کبھی شدت و غلبۂ حرص سے ہوتی ہے ۔ اس میں آدمی کو سوچ سمجھ نہیں رہتی اس واسطے استقلال جاتا رہتا ہے ، مگر نرمی بہر صورت حسن خلق کا ثمرہ ہے ۔ یہ ملائمت بھی حلم کی ہم پلہ ہے ۔ علم آدمی کا دوست جانی ہے ، حلم اس کا وزیر ہے اور عقل رہنما ، عمل سربراہ کار اور رفق اس کا والد اور نرمی بھائی اور صبر سپہ سالار ۔ رفق کے ٹھیک معنی یہ ہیں کہ ہر موقع اور مقام پر ہر ایک امر کو برتنا ۔ شدت کی جگہ شدت اور نرمی کی جگہ نرمی ۔ غرض نرمی کے ساتھ درشتی کا بھی اختلاط ضرور چاہیے ۔ شیخ سعدی :

درشتی و نرمی بہم در بہ است
چو فاصد کہ جراح و مرہم نہ است

غرض درجۂ اوسط ، جو اخلاق کا کلیہ ہے ، وہ یہاں بھی نرمی اور درشتی میں محمود ہے ۔ اپنے اپنے موقع پر حسب مصلحت وقت دونوں اچھی ہیں ۔ مگر جس شخص کو رفق سے بہرہ نہیں ہوتا اس کو حماقت سے نقصان ہوتا ہے اور تجربوں سے مستفید نہیں ہوسکتا ، اور اس سبب سے عالی درجہ نہیں پا سکتا ۔ جو لوگ سخت اور درشت کلام بولتے ہیں ان کے ہم معنی الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ نرم ہوتے ہیں :

چو کارے برآید بہ لطف و خوشی
چہ حاجت بہ تندی و گردن کشی

غرض دنیا میں جتنے کام رفق اور نرمی سے نکلتے[1] ہیں ، اتنے درشتی سے نہیں نکلتے۔ وہ بہت بہ کار آمد ہے ، اور تھوڑے موقعے ایسے ہوتے ہیں کہ جہاں درشتی سے کام نکلتا ہے ۔ رفق کی عادت کے سبب سے انسان غضب نہیں ہوتا ۔ دوسرے کو ادب سکھاتا ہے ۔ اب جاہل نہیں بنتا ، دوسرے کو عاقل بناتا ہے ۔ درشت کلامی قطعیت کا سبب ہوتی ہے اور نرمی و بلاغت ، اتحاد و مودت کا ۔

بہ شیریں زبانی و لطف و خوشی
توانی کہ پیلے بہ موئے کشی

۷۔ جو شخص تجھ کو بند کردے ، تو اس کو آزاد کر ؛ جو تیرا بد اندیش ہوتو اس کا نیک اندیش ہو۔ جو خطا کیش ہو، تو اس کا مصلحت کوش ہو ۔ تو اوروں کے جفا کے رنج کو گنج جان ۔ جو تجھے داغ دیں ، تو اسے باغ سمجھ ۔ عفو کو اپنا پیشہ بخوبی و خوشی بنا ۔ کینہ کشی کی ناخوشی کو چھوڑ ، عفو و کرم کا منتظم ہو ، کنش مکشش منتقم کو چھوڑ ، کینہ خواہی مردوں کی روش نہیں ۔ جو آدمی احسان نہ کرے وہ انسان نہیں ۔ بے احسان ہو کر دائرۂ انسانی سے باہر نہ جا ۔

۸ ۔ حسد و غبطہ (رشک)

حسد کینے کی شاخ ہے اور کینہ غصے کی شاخ ہے ؛ تو حسد غصے کی شاخ در شاخ ہوئی اور غصہ اصل اصول ٹھہرا ۔ اب پھر حسد کی اتنی شاخیں پھیلتی ہیں کہ ان کا حصر مشکل ہے ۔

---

۱ ۔ اصل میں 'نکلتی' ہے ۔ مرتب

حاسد اس شخص کا دشمن ہوتا ہے جس کو خدا تعالیٰ کوئی نعمت دیتا ہے - پس جو کچھ خدا تعالیٰ نے لوگوں کے حق میں مقدر کردیا ہے، اس سے وہ راضی نہیں ہوتا -

بعض حکما کا قول ہے کہ حسد ایک زخم ہے کہ کبھی نہیں بھرتا ، اور جو کچھ حاسد پرگزرتا ہے اس کی سزا کے واسطے وہی کافی ہے -

ایک اعرابی کا قول ہے ''میں نے کسی ظالم کو مظلوم کے مشابہ سوائے حاسد کے نہیں دیکھا کہ جب دوسرے کی نعمت کو دیکھتا ہے ، گویا اس کے چھریاں لگتی ہیں'' - بعض اکابر کا قول ہے کہ حاسد کو مجلسوں میں تو ذلت ہوتی ہے اور مذمت کی جاتی ہے ، اور فرشتوں سے لعنت اُن پر برستی ہے، اور خلق سے غم و غصہ پہنچتا ہے اور رنج میں ہول و شدت ، اور قیامت میں عذاب و فضیحت ہوتی ہے -

قاعدہ ہے کہ حسد نعمت ہی پر ہوا کرتی ہے - پس اللہ تعالیٰ کسی بندے کو نعمت عطا فرمائے تو حاسد کے دو حال ہوتے ہیں :

اول یہ کہ وہ نعمت اس کو بری معلوم ہو اور یوں چاہے کہ اس کے پاس نہ رہے - اس حال کا نام تو حسد ہے - غرض حسد کی تعریف در حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کی نعمت کو برا جاننا اور اس کے پاس سے جاتے رہنے کا خواہاں ہونا -

ددسرا حال یہ ہے کہ نہ تو وہ نعمت بری معلوم ہو اور نہ اس سے زوال کا خواہاں ہو بلکہ یوں دل چاہے کہ ایسی ہی نعمت ہم کو بھی ملے - اس کا نام غبطہ و منافست ہے - جو شخص دوسرے کی نعمت پر غبطہ کرے اور اپنے واسطے بھی ویسا ہی چاہے اور دوسرے سے اس کا دور ہونا پسند نہ کرے اور نہ اس کے پاس اس نعمت کا ہمیشہ رہنا برا معلوم ہو ، تو اس میں کچھ

حرج نہیں ۔ غبطہ کرنے والا اپنے تئیں ناقص جانتا ہے اور سب سے
پیچھے رہنا برا سمجھتا ہے اور نعمت والے کی برابری چاہتا ہے اور
اپنا کمتر رہنا برا جانتا ہے ۔ تو وہ بالضرور اپنے نقصان کو پورا
کرنا چاہے گا ۔ اور اس کے نقصان جاتے رہنے کی دو ہی صورتیں
ہیں : یا یہ کہ دوسرے شخص کے پاس بھی وہ نعمت نہ رہے اور
دونوں برابر ہو جائیں ، یا اس کے پاس ویسی ہی نعمت آ جائے اور
مساوی ہو جائے ۔ اور جب ایک صورت نہیں بن پڑتی تو بالضرور
بہ مقتضائے بشریت آدمی کا دل دوسری کی طرف میل کرے گا ۔
اگر دوسرے کے پاس سے وہ نعمت جاتی رہے تو یہ بات اس کے
جی کو بھلی لگے گی ، بہ نسبت اس کے کہ دوسرے کے پاس
وہ نعمت ہمیشہ رہے ، کیوں کہ اس کے دور ہونے سے یہ اور
وہ برابر ہو جائیں گے ۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے کہ بہت کم اس
سے دل خالی ہوتے ہیں ۔

اس صورت میں یہ تدبیر اولیٰ ہے کہ غبطے کا حال یوں
دریافت کرے کہ اگر دوسرے کی نعمت کا اختیار مجھ کو حاصل
ہو تو میں کیا کروں ۔ اگر یہ بات دل میں آئے کہ میرا بس ہو
تو میں اس نعمت کو اس سے دور کردوں ، تو معلوم کرنا چاہیے
کہ یہ خواہش حسد ہے ۔ اور اگر یہ خیال ہو کہ باوجود اختیار
اور قابو کے دل دوسرے کی نعمت کا علیحدہ کرنا پسند نہ کرے
تو جان لے کہ غبطہ ہے ، اور وہ جائز ہے کہ اپنی عقل اور دین
کے رو سے دوسرے کی زوال نعمت نہیں چاہتا ، بلکہ یہ منظور ہے
کہ مجھے بھی ویسی نعمت مل جائے ۔ اس میں کوئی برائی نہیں
اور نفس الامر میں یہ بات انسان سے بعید ہے کہ جب وہ خود
دوسرے کا ہم سر کیا جائے اور حصول نعمت سے عاجز ہو تو اس
بات کا خیال نہ کرے کہ یہ نعمت اس کے پاس بھی نہ رہے ۔

کیوں کہ دوسرے کے پاس نعمت کے ہمیشہ رہنے سے ہمیشہ یہ کمتر ہی رہے گا۔ پس اس طرح کی منافست ناجائز حسد کے ہم پلہ ہے ، اس میں احتیاط کرنی ضرور ہے ۔ اکثر اپنے اقارب اور یگانوں ہی میں بعض کو اعالی رتبے پر دیکھتا ہے تو ان کی برابری چاہتا ہے ، اسی سے کبھی اس حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے جو نہایت بری بات ہے ۔

۹ ۔ حسد کے چار مراتب ہیں : اول تو یہ کہ دوسرے کی نعمت کا زوال چاہے ، گو وہ نعمت اس کے خود پاس نہ آئے ۔ یہ درجہ سب میں بدتر ہے ۔ دوسرے یہ کہ اس نعمت کا اپنے پاس آنا چاہتا ہے ، اس سے غرض نہیں کہ دوسرا اس سے کیوں مستفید ہے ، اور نہ یہ چاہتا ہے کہ کسی کے پاس سے وہ جاتی رہے ۔ مثلاً کوئی عمدہ مکان یا حکومت وغیرہ ہے ، اس کا دل چاہتا ہے کہ یہ میرے پاس آ جائے ۔ یہ نہیں چاہتا کہ دوسرا اس پر کیوں مسلط رہے ۔ تیسرے یہ کہ خاص اس نعمت کو اپنے لیے نہیں چاہتا بلکہ اس کا مثل اپنے لیے چاہتا ہے ، اور اگر مثل نہ ملے تو اس کا زوال چاہتا ہے کہ تا مساوات اور برابری ہو جائے ۔ چوتھے یہ کہ نعمت کا مثل اپنے لیے چاہتا ہے اور اگر نہ ملے تو اس کا زوال دوسرے کے لیے نہیں چاہتا ۔ پس یہ آخر صورت جائز ہے ، خواہ وہ نعمت دینی ہو یا نعمت دنیوی ۔ اور مرتبۂ دوم میں کچھ بھلائی ہے ، کچھ برائی ہے ، یعنی کسی کی نعمت کا زوال نہ چاہنا تو اچھی بات ہے مگر جس شے پر دوسرا قابض ہے اس کا اپنے واسطے چاہنا اچھا نہیں ۔ اور تیسرا مرتبہ دوسرے کی نسبت بڑا ہے اور پہلا تو برا ہی برا ہے ۔ مرتبۂ ثانی اور چہارم حقیقت میں حسد نہیں ہے ۔

۱۰ ۔ جب حسد آدمی کا گلا پکڑ لیتی ہے تو شیطنت کو بڑا

غلو ہو جاتا ہے ۔ آدمی کو چاہیے کہ حسد سے وہ ننگ رکھے کیوں کہ وہ سعادت سے جنگ کرتی ہے ۔ یہ اخلاق کی راہ میں بڑی بڑی کٹھن گھاٹیاں ہیں ۔ جس کے ہمراہ اس میں حسد نہیں ہے وہ شخص بہت ہی آسودہ اور آرام سے رہتا ہے ۔ جب یہ جسد خانۂ حسد بنتا ہے تو خانماں سب خراب ہوتا ہے ۔ بادشاہی بھی ہو تو عذاب بن جاتا ہے ۔ خدا ہی اس حسد کو جسد کے گھر سے نکالتا ہے ۔ جو بے جسد کے ساتھ حسد کرتا ہے وہ اپنے دل کو سیاہ کرتا ہے ۔ حسد کے معنی عقل کے قاموس میں یہی لکھے ہیں کہ تقدیر الٰہی پر خشم ناکی اور اس پر ناراضی ۔ حاسد یہی رونا ہے کہ زید و عمرو کو کس واسطے ثروت و مال دیا گیا ، مجھے نہیں دیا گیا ۔ خالد و بکر کو کس واسطے قدر و منزلت دی گئی ، مجھے نہیں دی گئی ۔ جو فضل و کمال فلاں شخص کو ہے وہ مجھے ہوتا چاہیے تھا ۔ آدمی کو چاہیے کہ ہر حالت میں ، دولت و نکبت میں ، خواری و عزت میں ، بیماری و صحت میں ، مال داری اور عسرت میں جو خدا نے دیا ہو اس سے خوش ہو ۔ کسی کے مال و نعمت پر تنگ چشمی کی نظر نہ رکھے ، ناخن حسد سے دل کو نہ خراشیدہ کرے ۔

۱۱ - حسد کے اسباب

حسد مذموم کے اسباب یہ ہیں :

اول عداوت ؛ آدمی جو دوسرے آدمی کی نعمت کو برا جانتا ہے اس کا سبب کوئی عداوت ہوتی ہے ۔ دشمن کا بھلا کون چاہتا ہے ۔ دستور ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو ستاتا ہے یا اس کی مطلب برآری میں خلل انداز ہوتا ہے تو وہ اس سے کینہ اور بغض رکھتا ہے اور اس پر غصہ آتا ہے ، اور اس سبب سے انتقام کے درپے ہوتا ہے ۔ اگر کوئی بلا اس شخص پر نازل

ہو جاتی ہے تو یہ جانتا ہے کہ زمانے نے انتقام اُس سے میرا لیا ، خدا نے میری سن لی ۔ ایسی صورت کو بغض کے مارے اپنی جہالت سے وہ اپنی کرامت جانتا ہے ۔ اور اگر دشمن کو کوئی نعمت مل جاتی ہے تو جانتا ہے کہ خدا کے ہاں میری شنوائی نہیں ہوئی کہ جو ایذا مجھے پہنچاتا ہے ، اس کو اور نعمت زیادہ ملتی ہے ۔

غرض بغض و عداوت کو حسد لازم ہے ۔ اور یہ کچھ برابر والے پر موقوف نہیں ؛ کمینہ آدمی بادشاہ سے حسد کرنے لگتا ہے ، یعنی بغض کے سبب سے یہ چاہتا ہے کہ بادشاہ کی دولت جاتی رہے ۔ انسان کو چاہیے کہ اس طرح کے حسد کو دل سے دور رکھے ۔ بعض دفعہ اس کے سبب سے کشت و خون کی نوبت آ جاتی ہے یا نزاع کو طول ہو جاتا ہے ۔ دوسرے کے زوالِ نعمت کی تدابیر میں تضیع اوقات ہوتی ہے ، ہمیشہ اُس کی چغلی اور پردہ دری کے درپے رہنا پڑتا ہے ۔

دوسرا سبب حسد کا یہ ہوتا ہے کہ حاسد[1] یہ گمان کرتا ہے کہ اگر کوئی اپنا ہمسر برتر ہو گیا تو ہم کمتر معلوم ہوں گے ، اور وہ اپنے کبر اور فخر کے سبب سے اُس کی برداشت نہیں کرتا ۔ اُس کو تعزز کہتے ہیں ۔ مثلاً کوئی برابر والا ، دولت ، حکومت ، علم میں بڑھ جائے تو حاسد کو خوف ہوتا ہے کہ کہیں یہ اس بات سے مجھ پر فخر و تکبر نہ کرنے لگے ، تو اُس کو دوسرے کی شیخی کی برداشت نہیں ہوتی ، اُس کی حسد کرنے لگتا ہے ۔

تیسرا سبب تکبر ہوتا ہے کہ دوسرے کو آدمی حقیر و ذلیل سمجھتا ہے اور متوقع اس سے خدمت اور اطاعت کا رہتا ہے ۔

---

۱ ۔ اصل میں 'حاسد کو' تھا ۔ مرتب

جب اُس کو اتفاقاً نعمتیں ملتی ہیں تو حاسد کو خوف ہوتا ہے
کہ وہ کہیں میری برابری کا دم بھرے تو ہماری شیخی کرکری
ہوگی ، اس کو تکبر کہتے ہیں ۔

چوتھا سبب تعجب ہوتا ہے ؛ آدمی اپنے ہمسر یا اپنے سے
کم تر کو دیکھتا ہے کہ کوئی بڑا عہدہ یا کوئی اور بڑی نعمت
مل گئی جس سے وہ ہم سے بہتر اور افضل ہو گیا ، تو حاسد کو
تعجب ہوتا ہے کہ مجھے یہ رتبہ نصیب نہ ہوا !

پانچواں سبب خوف اپنے مقصود کے فوت ہونے کا ، یعنی
دوسرے کی نعمت کے سبب اپنا مطلب جاتا رہے گا ۔ وہ نعمت کے
سبب حاسد کی غرض پوری نہ ہونے دے گا ۔ یہ حسد اکثر
وہاں ہوتی ہیں جب ایک مقصد کے حاصل کرنے کے دو مدعی
ہوتے ہیں ۔ پس جب کسی ایک کو ان دونوں میں سے مقصد حاصل
ہو جاتا ہے تو دوسرے کو خواہ مخواہ اُس پر حسد ہوتا ہے کہ
وہ کیوں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ۔ اس قسم کی حسد دو
سوکنوں میں ہوتی ہے کہ مطالب زوجیت کی ہر ایک مدعی ہوتی ہے ۔
اور دو بھائیوں میں بھی ہوتی ہے کہ ہر ایک کو ماں باپوں کے
دل میں جگہ کرنی منظور ہوتی ہے کہ جس سے وہ زیادہ مہربان
ہوں ۔ ایسے ہی ایک استاد کے شاگردوں میں ، بادشاہوں کے خواص
اور مصاحبوں میں بادشاہ سے دولت و جاہ کے حاصل کرنے میں ۔

چھٹا سبب ریاست و جاہ کی محبت ہوتی ہے ، یعنی اس بات
کو چاہنا کہ جیسا ہم کو کوئی فن آتا ہے ، ایسا دوسرے کو نہ
آئے ۔ ہماری تعریف یہ ہوا کرے کہ اپنے فن میں یکتائے روزگار
اور کاملِ زمانہ ہیں ۔ آج کوئی ہمارا مقابل نہیں ۔ تو ایسے لوگ
جب دوسرے کو اپنا نظیر سنتے ہیں تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے

اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ یا[1] تو وہ مر جائے یا اس کے پاس یہ فن نہ رہے جس کے سبب سے وہ ہمارا نظیر و سہیم سمجھا جاتا ہے۔ یہ فن کوئی سا ہو ، خواہ شجاعت ہو یا حلم یا عبادت یا پیشہ یا جمال یا ثروت وغیرہ ؛ غرض اپنے آپ کو فرد جاننے کے سبب سے جو خوشی ہوتی ہے اس کی محبت سے یہ حسد واقع ہوتی ہے۔ "ہمچو من دیگرے نیست" کا خبط ایسا سماتا ہے کہ جس سے حسد کا رنج اٹھانا پڑتا ہے۔ آج کل یہ مسلمانوں میں حسد کا بڑا سبب ہے۔

ساتواں سبب صرف بخل اور خبث نفس ہو اور کوئی اور سبب نہ ہو کہ بعض آدمیوں کی سرشت ایسی ہوتی ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نعمت اس کے بندوں پر بری معلوم ہوتی ہے۔ ان کو اپنا تعزز و تکبر حسد سے مقصود نہیں ہوتا بلکہ ان کی طبیعت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب وہ دیکھتے بھالتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا فضل کسی کے حال پر ہوا تو یہ امر ان کو شاق گزرتا ہے ؛ اور جب کسی کی پریشانی اور بدبختی اور ناکامیابی اور عیش کے تلخ ہونے کا بیان کیا جاتا ہے تو خوش ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ بندگانِ خدا کی بدبختی کے خواہاں رہتے ہیں اور ان کی آسودہ حالی سے جلتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو شجیح کہتے ہیں۔ یہ بخیل سے بدتر ہوتے ہیں۔ بخیل تو اسے کہتے ہیں کہ اپنا مال کسی کو نہ دے اور شجیح اس کو کہتے ہیں کہ دوسرے کے مال میں بخل کرے۔ غرض وہ رذالت اور خبث نفس کے سبب سے اس حسد کی بلا میں مبتلا ہوتے ہیں۔

---

۱ - اصل میں 'کیا' ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی مقامات پر 'کیا' استعمال ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ دراصل 'کہ یا' ہے جسے مخفف کر کے 'کیا' بنایا گیا ہے۔ مرتب

نیش عقرب نہ از پۓ کین است
مقتضائے طبیعتش این است

اس قسم کی حسد کا علاج نہایت سخت ہے اور اسباب حسد تو عارضی ہیں ۔ ان میں یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر سبب جاتا رہے گا تو حسد بھی جاتی رہے گی ۔ اور یہ تو سرشتی خباثت ہے ، اس سے نکلنا نہایت دشوار کیا بلکہ محال ہے ۔

یہ سات سبب حسد کے ہوتے ہیں ۔ ان میں سے بعض یا اکثر جب ایک شخص میں جمع ہو جاتے ہیں تو حاسد کی حسد کا بڑا زور ہو جاتا ہے اور وہ اس کو چھپا نہیں سکتا ۔ نہ کسی سے بہ مروت پیش آتا ہے ، بلکہ ملت و محبت کو بالائے طاق رکھ کر علانیہ عداوت کرتا ہے ۔ فی زماننا جو حسد پائی جاتی ہے ، اکثر میں ان اسباب میں سے بہت اکٹھے ہوتے ہیں ، ایک سبب تنہا نہیں ہوتا ۔

۱۲ ۔ اہل علم کو مال و جاہ کی محبت کے سبب سے حسد پیدا ہوتی ہے ۔ وہ ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے کے قول کو رد کرکے دوسرے کی ہتک عزت و حرمت کرتے ہیں ۔ حسن سیرت کے یوسف کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتے ہیں ۔ ایک دوسرے کے نخل اعتبار کو ناہمواری اور خردہ گیری کی آری سے کاٹتے ہیں ۔ اپنے اعتبار کے نخل کو اوروں کے آب خجالت سے بڑھاتے ہیں ۔ آئینے کی طرح ایک دوسرے کے احوال کو عیب بینی کی آنکھ سے دیکھتے ہیں ۔ ایک دوسرے کے نوشتوں پر بہ قصد ابطال و تضییع خط بطلان کھینچتے ہیں ۔ اپنے اوراق کو پر لگا کر ایک دوسرے کی طرف اڑاتے ہیں ۔ ان کا عصائے قلم ایک دوسرے کے عیب لکھنے کے لیے اور نفی کرنے کے واسطے اپنا اثبات منحصر کرتا ہے ۔ ہر ایک دوسرے کے ساکت کرنے کو اپنے نطق کی حجت قاطع جانتا ہے ۔

عیب ہم را ہمہ چشمند و زباں چوں مقراض
روز و شب ہم دم یک دیگراند در پرخاشند

جو لوگ یہ صفت رکھتے ہیں وہ بحکم حدیث * "الحسد یذیب الجسد[۱]" گاہ و بے گاہ غصہ عمر کاہ کی آگ میں جلتے ہیں ۔ بمقتضاء "الحسود لا یسود[۲]" برخلاف مقصود ہمیشہ پستی کے گڑھے میں گر کے اہل روزگار کی نظر میں بے اعتبار ہوتے ہیں ۔ سب خواص و عام کو چاہیے کہ اپنے گوہر دل کو اس کدورت بے حاصل کی آلایش سے پاک رکھیں اور اس صفتِ دل خراش کے خار بُن کو سینے سے اکھیڑیں ، صفائی سینہ کے چشمے سے زلال خوش حالی پئیں ، ایک دوسرے کی عیب پوشی سے خلعت کرامت پہنیں ، ناخن حسد سے ایک دوسرے کے چہرۂ حرمت کو نہ خراش دیں ، آپس میں ایک دوسرے کے جمال و کمال کو مدح و ثنا کے موتیوں سے آرایش دیں ۔ آئینۂ خاطر کو آپس میں آمد و رفتِ مشتاقانہ سے صیقل دیں ۔ ہمیشہ ایک دوسرے کی تقصیرات کے واسطے عذرِ دل پزیر کریں ، ایک دوسرے کی ناپاکی کو آبِ توجیہات سے دھوئیں ۔

۱۳ ۔ ہمسروں و برابر والوں و یگانوں میں زیادہ حسد ہوتا ہے

اس کا سبب یہ ہے کہ جو اسباب ہم نے اوپر بیان کیے ہیں ، اُن کی زیادتی جن لوگوں میں ہوگی انہی کی حسد بھی قوی ہوگی اور جب ان اسباب میں سے کئی کئی ایک شخص میں جمع ہو جائیں یعنی ایک ہی شخص تعزز کے باعث اور وہی تکبر اور عداوت کے سبب سے حسد کرے تو اور بھی حسد کو افزائش ہوگی ۔ اور یہ سبب اُن لوگوں میں زیادہ ہوتے ہیں جن میں بہت سے روابط

---

۱ ۔ یعنی حسد جسم کو نڈھال کر دیتا ہے ۔

۲ ۔ یعنی حاسد کبھی آسودہ نہیں ہوتا ۔ مرتب

اور علاقے ہوں کہ اُن کے باعث مجلسوں میں بیٹھ کر آپس میں گفتگو کرتے ہیں اور اپنی اپنی غرض بیان کرتے ہیں ۔ اُس وقت اگر کوئی شخص اُن میں سے کسی مطلب کے خلاف کہتا ہے تو غرض مند اُس سے متنفر ہو کر بغض و کینہ دل میں رکھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کا بدلہ لوں اور جیسے اس نے میری مطلب برآری میں پاؤں اڑا دیا ہے ، میں بھی اُس کے کام میں اڑنگا لگاؤں ۔

پھر جہاں ایک سبب حسد (کا) پیدا ہوا ، اور سب اسباب ایک دوسرے کے پیچھے جمع ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ بہر حال حسد پاس کے بیٹھنے اور غرض کی باتیں کرنے سے پیدا ہوتا ہے ۔ اس لحاظ سے اگر ایک شخص کسی شہر میں رہتا ہو اور دوسرا کسی اور شہر میں ، ان میں حسد نہیں ہوتی ، بلکہ اگر دور دور محلوں میں رہتے ہوں تو بھی حسد نہیں ہوتی ۔ البتہ جب ایک مجلس میں یا مدرسے میں یا مسجد میں یا بازار میں جمع ہوں اور ایک ہی مطلب کے مدعی ہوں تو حسد پیدا ہوتی ہے ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا ۔ اس واسطے عالم شخص عالم کی حسد کرتا ہے ، عابد کی نہیں کرتا ۔ سوداگر دوسرے سوداگر سے حسد کرتا ہے ۔ موچی موچی سے حسد رکھتا ہے ، بزاز سے نہیں رکھتا ۔ وجہ یہی ہے کہ دونوں ہم پیشہ ہیں ۔ اور اسی وجہ سے برادری میں بہ نسبت غیروں کے آپس میں زیادہ حسد ہوتا ہے ۔ دونوں سوکنیں آپس میں بہ نسبت ساس نندوں کے زیادہ حاسد ہوتی ہیں ۔ غرض جہاں کہیں دو شخصوں کا مطلوب واحد ہوگا اور اُن میں اجتماع و نشست و برخاست باہم دگر واقع ہوگی ، وہاں حسد زیادہ ہوگی ۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک بزاز کپڑے کی دکان کرتا ہے تو خریداروں کی کثرت چاہے گا ، جس میں کچھ فائدہ ہو ۔ تو جو

شخص اس مطلب میں حریف ہوگا ، اسی کے ساتھ حسد کرے گا ،
دوسرے سے کیا مطلب پڑا ہے - اب اگر حریف کی دکان پاس ہے
تو دور کے بزازوں کی نسبت وہ اس سے زیادہ حسد کرے گا -
اسی طرح ایک بہادر آدمی دوسرے بہادر سے حسد کرتا ہے ،
عالم سے نہیں کرتا کیوں کہ پہلوان اور بہادر کا مقصد یہ ہوتا
ہے کہ جرأت و شجاعت میں یکتائے زمانہ مشہور ہو اور یہ صفت
دوسرے میں نہ پائی جائے - پس اس صفت میں جو اس کا سہیم و
مزاحم ہوگا اس کی حسد کرے گا - عالم شخص عالم کی حسد
کرتا ہے اور ان میں بھی واعظ آدمی واعظ کی حسد زیادہ کرتا
ہے ، فقیہ اور طبیب کی اتنی نہیں کرتا - بہر حال بنائے حسد
دشمنی ہوتی ہے اور دشمنی کی اصل ایک مقصود میں شریک ہونا ہے ،
اور شرکت مقصود دور کے شخصوں میں معلوم نہیں ہوتی ، پاس
والوں میں پھوٹ ڈالتی ہے - اسی واسطے پاس والوں میں حسد
زیادہ ہوتی ہے - لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ جس کو تمام
جہان میں شہرت اور آوازہ منظور ہو ، وہ البتہ دنیا میں جہاں
کہیں اپنا مقصود سنے گا اس کی حسد کرے گا -
غرض کہ جتنے اسباب حسد ہیں ، سب کا منشا اگر بہ نظر غور
دیکھا جائے تو محبت دنیا ہے ، اس لیے کہ دنیا ہی کی چیزیں ایسی
ہیں کہ سہیموں اور شریکوں کو وافی نہیں ہوتیں - اگر ایک کے
پاس گئیں تو دوسرا ہاتھ خالی رہ جاتا ہے ، مگر آخرت کی چیزوں
میں تنگی نہیں ، ان میں بہت گنجائش ہے -

۱۴ - حسد کے مرض کی دوا

جاننا چاہیے کہ حسد دل کے برے مرضوں میں سے ہے اور
امراض دلی کا علاج علم و عمل سے ہوا کرتا ہے - حسد کی بیماری
کو جو علم مفید ہے وہ یہ ہے کہ اس بات کو یقیناً آدمی جان لے

کہ دنیا اور آخرت میں حسد سراسر اس کو مضر ہے اور جس
سے حسد کرتا ہے اس کا دین اور دنیا میں کچھ بھی ضرر نہیں
بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے - جب یہ بات اچھی طرح جان لے گا اور اپنے
نفس کا دشمن اور دشمن کا خیرخواہ نہ ہوگا تو بالضرور حسد
چھوڑ دے گا - حسد کے باعث جو حاسد کو دین میں ضرر ہوتا ہے ،
وہ یہ ہے کہ حسد کے سبب وہ حکم خدا سے راضی نہیں ہوتا اور
جس نعمت کو اس نے اپنے بندوں پر تقسیم فرمایا ہے اور اپنے
عدل و حکمت سے کارخانے جاری کیے ہیں ، ان کو برا جانتا ہے -
پس اس سے بڑھ کر دین میں کون سا گناہ ہوگا کہ خدا کی تقدیر
پر راضی نہ ہو - یہ خباثت حسد آدمیوں کی نیکیوں کو ایسا کھا
جاتی ہے[1] جیسے آگ لکڑیوں کو ، اور ایسا نشان ان کا مٹا دیتی
ہے جیسے کہ رات دن کا - اور دنیا میں حاسد کا ضرر یہ ہے کہ
ہمیشہ رنج و عذاب اور غم و الم میں مبتلا رہتا ہے ، اس لیے کہ
اللہ تعالٰی اس کے دشمنوں کو نعمتیں دیتا رہتا ہے اور وہ جلتا
رہتا ہے -

حاسد کی تمنا تو یہ ہوتی ہے کہ دشمنوں کو رنج پہنچے مگر
خود دم نقد وہ خود رنج و غم میں پھنس جاتا ہے - آدمی جس
شخص کی حسد کرتا ہے اس کو دین و دنیا میں حسد کے باعث
ضرر کا نہ پہنچنا صاف ظاہر ہے ، اس لیے کہ حسد کے باعث
اس کی نعمت دور نہیں ہوتی ، بلکہ جو کچھ خدا تعالٰی نے کسی
کے لیے اقبال و نعمت مقدر کیا ہے ، وہ وقت مقررہ تک بے شک
رہے گا - پس حاسد ناحق اپنے تئیں رنج دیتا ہے اور حاصل حصول
کچھ بھی نہیں -

---

۱ - اصل میں 'ہیں' ہے - مرتب

اگر حاسد کو یہ یقین ہو کہ میرے حسد کے سبب سے محسود کا زوال نعمت ہوگیا تو اُس کو خود اندیشہ کرنا چاہیے کہ اس طرح اُس کے حاسد کے حسد کے سبب سے اس کا بھی زوالِ نعمت ہو جائے گا۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو تمام دنیا میں سوائے زوالِ نعمت کچھ اور نہ رہے گا۔ کوئی رنج و دکھ حسد کے رنج سے بڑھ کر نہیں۔ دشمنوں کی غایت تمنا یہ ہوتی ہے کہ اپنے آپ چین کریں اور اُن کے حاسد حسرت و غم میں مبتلا رہیں۔ پس حاسدوں کی یہ تمنا پوری کرتا ہے کہ وہ عیش کرتے ہیں اور یہ رنج کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن اپنے حاسد کی موت نہیں چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ حاسد کی عمر زیادہ ہو تاکہ حسد کی آگ میں وہ مدام جلتا رہے۔ وہ اپنی نعمت کی خوشی اتنی نہیں کرتا جتنی حاسد کے رنج کی خوشی۔ اگر حاسد اس بات پر غور کرے تو جان لے کہ میں قطعی اپنے نفس کا دشمن ہوں اور دشمن کا خیرخواہ۔

اب عملی علاج یہ ہے کہ جس کام کو حسد مقتضی ہو اُس کے خلاف عمل کرے، خواہ قول ہو یا فعل۔ مثلاً اگر حسد اس بات کو چاہے کہ محسود کی برائی بیان کی جائے تو اپنی زبان سے بزور اُس کی مدح و ثنا کرے، اور اگر حسد کے مارے تکبر کو جی چاہے تو بہ تکلف اُس سے بہ تواضع اور عذر پیش آئے۔ اور حسد مقتضی اس کے نہ دینے کی ہو تو جتنا پہلے دیتا تھا اُس سے زیادہ دینے کی عادت کرے۔ جب یہ باتیں کوشش اور اجتہاد سے کرے گا اور محسود کو معلوم ہو جائے گا تو وہ راضی ہو جاوے گا اور محبت کرنے لگے گا۔ اور جب اُس کی طرف سے محبت ہوگی تو حاسد کو بھی خواہ نخواہ محبت پیدا ہوگی اور آپس کے اتفاق سے مادہ حسد کا منقطع ہو جائے گا، اس لیے کہ مدح و ثنا

اور نعمت پر اظہار سرور سے بھی نعمت والے کا دل کھنچ آتا ہے اور غلام بن جاتا ہے ، اور یہ مہربانی پیش آتا ہے ، اور اُس کے عوض میں سلوک کرنا چاہتا ہے۔ اور جب اس کی طرف سے سلوک ہوتا ہے تو دوسری طرف سے بھی انسان بندۂ احسان کا مضمون پیش ہو کر جو باتیں بہ تکلف سرزد ہوتی تھیں[1] ، اب طبعاً ہونے لگتی ہیں -

خوش معاملگی ایسی چیز ہے کہ خواہ وہ طبعاً ہو یا تکلفاً ، طرفین کی عداوت کو فرو کر دیتی ہے اور حسد کے دانت کھٹے ہو جاتے ہیں - دل محبت و الفت کی طرف رجوع کرتا ہے - یہ حسد کا علاج ہے مگر نہایت تلخ :

داروے تلخ است دفع مرض خود

مشہور ہے - پس جو شخص تلخیِ دوا پر صبر نہ کرے گا وہ شیرینی شفا بھی نہیں چکھے گا - حسد تھوڑا بہت سب آدمیوں میں ہوتا ہے اس لیے کہ جو شخص ہم کو ایذا اور تکلیف پہنچاتا ہے ، طبعاً اُس پر غصہ آتا ہے اور ہم اُس کو برا جانتے ہیں ، اور یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اُس کی نیک حالی بد حالی کو یکساں جانیں ، اور اُس کو جب کوئی نعمت ملے تو ہم کو برا نہ معلوم ہو - مگر دل میں برا معلوم ہونا ایک اور بات ہے اور اُس کا اظہار اختیاری قول و فعل میں اور بات ہے - حسد وہی بری ہے کہ ہم کسی کے ساتھ اپنے اختیاری قول و فعل میں ظاہر کریں - فقط دل میں برا جاننا جو طبعاً ہے وہ ایک امر مجبوری ہے اور وہ مذموم بھی نہیں - مذموم بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے اختیاری قول اور فعل سے محسود کی برائی کرنے لگیں -

---

۱ - اصل میں 'نہیں' غلط ہے - مرتب

۱۵ - حاسد کی حالت

جو حسد کسی کو تجھ پر ہو تو ہے یہ تیری خوبی
کہ جو تو نہ خوب ہوتا تو وہ کیوں حسود ہوتا

حاسد بدبخت بے مرض کے ہمیشہ رنجور ہوتا ہے اور بغیر مصیبت کے سدا ماتم میں شور کرتا ہے ۔ جب کوئی دوستوں کا حلقۂ جمعیت دیکھتا ہے ، اُس کو اژدہا جانتا ہے کہ وہ دل کو کھائے جاتا ہے ۔ جب وہ دوستوں میں محبت دیکھتا ہے تو اُس کو اپنے رشتۂ زندگانی کی مقراض سمجھتا ہے ۔ وہ اپنے اندیشہ ہائے دور میں موج سراب کی طرح خشک لب رہتا ہے اور اس خوے زشت کا شعلہ اُس کو شمع کی طرح شب بھر جلاتا ہے ۔ حاسد کو دنیا کی نعمتوں کی لذت اَوروں سے کم ملتی ہے کیوں کہ اُس کی طبعِ زشت کا مذاق زہر حسد سے ہمیشہ متغیر ہوتا رہتا ہے ۔

ارسطو سے پوچھا کہ حاسد کا کیا حال ہے ؟ تو اُس نے کہا کہ سب سے زیادہ غم اُس کو اس سبب سے ہوتا ہے کہ جیسے اَور خلائق غم کھاتی ہے ، وہ بھی غم کھاتا ہے اور جس قدر اَور آدمیوں کو شادمانی ہوتی ہے اُتنا ہی اُس کو رنج اور زیادہ ہوتا ہے ۔ غرض اپنے رنج و الم کے سوا اَوروں کی شادی کا غم اُس کے پیچھے اَور زیادہ ہوتا ہے ۔ خدا سے یہ دعا مانگنا کہ ہمارے حاسد بہت سے ہوں ، اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا ہم میں بہت سی خوبیاں پیدا کرے ۔

۱۶ - کبر کا بیان

کبر دو قسم کا ہوتا ہے ؛ ایک ظاہری ایک باطنی ۔ کبرِ باطن تو نفس کی عادت کا نام ہے اور کبر ظاہر اعمال ہیں جو اعضا سے سرزد ہوں ۔ واقعے میں عادت باطنی ہی کا نام کبر رکھنا درست ہے ۔ اعمال تو اس عادت کے ثمرات ہیں ، اور وہ عادت موجب اعمال

کی ہوتی ہے ۔ اسی واسطے جب اعضا پر اُس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو کہتے ہیں تکبر کیا اور جب تک ظاہر نہیں ہوتے تب تک کہا جاتا ہے کہ اُس کے نفس میں کبر ہے ۔ غرض اصلی کبرِ نفس اخلاق میں سے ایک خلق کا نام ہے اور وہ یہ ہے کہ نفس اپنے آپ کو دوسرے پر فائق دیکھ کر راحت پائے ۔

کبر کے لیے کئی چیزیں چاہئیں ؛ اول تکبر کرنے والا ، دوم جس پر تکبر کرتا ہے ، سوم جس چیز سے تکبر کرتا ہے ۔ تکبر میں یہ ضرور ہے کہ اپنے نفس کا مرتبہ سمجھے اور ایک غیر کے نفس کا ، پھر اپنے مرتبے کو غیر کے مرتبے سے بہتر جانے ۔ جب یہ تین باتیں اعتقاد میں ہوں گی ، تب کبر پیدا ہوگا ۔ صرف اپنے مرتبہ سمجھنے کا نام کبر نہیں بلکہ اس سمجھنے اور عقیدے سے دل میں سامان اور حرکت اور خوشی اور میل اپنے عقیدے کی طرف پیدا ہوتا ہے اور اس سبب سے نفس میں ایک عزت اورعظمت آتی ہے ۔ اس عزت اور عظمت و حرکت و میلان کو خلقِ کبر کہتے ہیں ۔ پھر یہ عظمت اعمال ظاہری اور باطنی کا سبب ہوتی ہے جو اُس کے ثمرات کہلاتے ہیں اور اُن کو تکبر کہتے ہیں ۔ جب آدمی کے نزدیک اپنا رتبہ دوسرے کی نسبت بڑا ٹھہرا تو اپنے سے کمتر کو حقیر جانے گا ۔ اُس کے ساتھ کھانا پینا ، برابر بیٹھنا ناگوار گزرے گا ۔ یہ چاہے گا کہ وہ مجھے سلام کرے ، مجھ سے آگے نہ چلے ۔ اگر کچھ حجت و مناظرہ کرے تو میں جواب نہ دوں ۔ غرض سارے کاموں میں اُس کی برابری نہیں چاہے گا ، اپنی برتری چاہے گا ۔

کبر والے کو اگر کوئی نصیحت کرتا ہے ، وہ نہیں سنتا ہے اور اگر خود نصیحت دوسروں کو کرے تو نہایت تند مزاجی سے ۔ اگر کوئی اُس کی بات کا انکار کرے تو غصے ہو جائے ، اور کسی کو تعلیم کرے تو سیکھنے والے پر نرمی نہ برتے بلکہ

شاگرد کو ذلیل و خوار سمجھے ، اس پر احسان جتلوے ، اور اس سے کام خدمت لے ، اور عوام کو جاہل اور حقیر تصور کرے اور گدھا سمجھے ۔ غرض جو کبر سے افعال سرزد ہوتے ہیں وہ روزمرہ دیکھنے میں آتے ہیں ۔ خواص و عوام سب ان کو جانتے ہیں کہ متکبر آدمی میں تواضع نہیں ہوتی ۔ وہ کینہ و حسد ترک نہیں کر سکتا ۔ صدق اور راستی پر اس کو مداومت نہیں ہو سکتی ۔ غضب و غصہ کے پینے پر قادر نہیں ہو سکتا ۔

خلاصہ یہ ہے کہ کوئی بری عادت نہیں جو کبر و عزت والا اپنی عزت کے بچاؤ کے لیے اس کی طرف مضطر نہ ہو ، اور کوئی عمدہ عادت ایسی نہیں جس کو متکبر بہ خوف اپنی عزت جانے کے چھوڑ نہ دے ۔ کبر کی سب سے بری قسم وہ ہے جو علم سے استفادہ نہ کرنے دے اور امر حق کو نہ ماننے دے اور نہ اس کا نفاذ ہونے دے ۔ متکبر امر حق سے غافل ہوتا ہے اور لوگوں کے عیب بیان کرتا ہے ۔ تکبر وہ عیب انسان میں ہے کہ جس کے سبب اس نے خدا کی برابری کا دعویٰ کیا ۔ پیغمبروں اور ولیوں اور بادشاہوں سے اپنے تئیں برتر جانا ، اس سے زیادہ کیا کوئی اور برائی ہوگی ۔

۱۷ ـ جن چیزوں کا تکبر ہوتا ہے

تکبر وہی شخص کیا کرتا ہے جو اپنے نفس کو بڑا سمجھے ، اور نفس کو بڑا وہ آدمی سمجھتا ہے جو یہ جانے کہ اس میں کوئی صفت صفات کمال سے ہے ۔ اور کمال یا دینی ہوتا ہے یا دنیوی ۔ دینی کی دو قسمیں : علم اور عمل ۔ اور دنیاوی کمال پانچ ہیں : نسب ، جمال ، قوت ، مال ، کثرت احباب ۔ تو یہ سب سات ہوئے ۔ اب ہر ایک کا جدا حال بیان کیا جاتا ہے ۔

۱۸ - تکبرِ علم

علما کو بہت جلد تکبر ہو جاتا ہے ۔ عالم علم کی جہت سے متعزز رہتا ہے اور اپنے جی میں جاہل و کمالِ علم سے واقف ہو کر اپنے تئیں بڑا فاضل اور لوگوں کو حقیر و جاہل جانتا ہے ، اور اُن کی طرف ایسے دیکھتا ہے جیسا کہ جانوروں کی طرف کوئی دیکھتا ہے ، اور اس بات کا متوقع ہوتا ہے کہ مجھے پہلے سلام کریں ، اور اگر اتفاقاً کسی کو آپ سلام کر لیا یا خوشی سے کسی کے سلام کا جواب دے دیا ، تعظیم کو اٹھ کھڑا ہوا یا دعوت منظور کرلی ، تو اُس شخص پر ان باتوں کا احسان چاہتا ہے ، اور اپنا شکر گزار ہونا اُس پر لازم سمجھتا ہے ، اور اعتقاد کرتا ہے کہ میں نے اس کو سرافراز کیا اور ایسا کام کیا جس کا وہ مستحق مجھ جیسے شخص سے نہ تھا ۔ اس احسان کے عوض میری توقیر و خدمت ضرور ہے ۔ بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ لوگ عالم کے ساتھ سلوک کرتے ہیں اور وہ خود کسی کے ساتھ سلوک نہیں کرتا ۔ اُس کے پاس سب آتے ہیں ، وہ کسی کے پاس نہیں جاتا ۔ اُس کی عیادت سب کرتے ہیں ، وہ کسی کی بیمار پرسی نہیں کرتا ۔ اگر کوئی اُس سے زیادہ خلا ملا رکھتا ہے تو اُس سے اپنا کاروبار کراتا ہے ۔ اگر اُس سے خدمت میں قصور ہو جاتا ہے تو برا جانتا ہے ۔ گویا سب اُس کے مزدور اور غلام ہیں اور لوگوں کو سکھانا پڑھانا ایک احسان و سلوک ہے جس سے اُس کا حق اُن پر ہو گیا ۔

یہ حال تو دنیا کے کاروبار میں ہے ۔ اور دین کے باب میں اُس کو یہ تکبر ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو خدا کے نزدیک جانتا ہے اور لوگوں کی بہ نسبت اعلیٰ اور افضل سمجھتا ہے ۔ اور اپنے واسطے نجات کی توقع بہ نسبت اور لوگوں کے زیادہ کرتا ہے ہم

ایسے عالم کو جاہل گننا چاہیے ، اس لیے کہ وہ علم جس سے آدمی خدا کو اور اپنے نفس کو پہچانے ، وہ نہیں جانتا ۔ علم کا نتیجہ تو یہ ہے کہ آدمی میں تواضع ہو اور سب آدمیوں کو اپنے سے بہتر جانے۔ علم وہی ہے جس سے بندگی اور ربوبیت اور عبادت کا طریق معلوم ہو اور اس سے تواضع اکثر پیدا ہو ۔ جس شخص کا اخلاق علم سے اچھا نہ ہو ، اسے یہ جاننا چاہیے کہ جب اس نے علم شروع کیا ، اس کا باطن اچھا نہ تھا ۔ نفس نکما اور اخلاق بد اس کے ساتھ تھے ، تہذیب و تزکیہ اور تنزیہ نفس کی طرف وہ متوجہ نہیں ہوا اس لیے اس کے دل میں علم کو اچھی جگہ نہیں ملی ۔ خبیث جگہ میں علم رہا اس لیے اس کا ثمرہ بھی اچھا نہ ہوا ۔ نہ خیر میں کچھ اثر اس کا ظاہر ہوا ۔

علم کا حال ایسا ہے جیسا کہ آسمان کے پانی کا کہ صاف اور شیریں ہوتا ہے مگر درخت اس کو اپنی رگوں اور نسوں میں جذب کر کے اپنا سا ذائقہ اس میں پیدا کر دیتے ہیں ۔ اس سے تلخ درخت کی تلخی زیادہ ہو جاتی ہے اور شیریں درخت کی شیرینی ۔ یہی حال علم کا ہے کہ لوگ جو پڑھتے ہیں ، جیسی ان کی ہمت اور خواہش ہوتی ہے ویسا ہی یہ علم ان کے حق میں ہو جاتا ہے ۔ متکبر کا کبر بڑھ جاتا ہے اور متواضع کی تواضع زیادہ ہوتی ہے ۔ عالم اپنے علم کا تفاخر یوں ظاہر کیا کرتے ہیں کہ میں ہر فن میں ایک فنی ہوں ، حقائق سے آگاہ ہوں ، بڑے بڑے استادوں کو دیکھا ہے اور ان کی تصنیفات کو پڑھا ہے جس سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کو آتا کیا تھا ۔ اگر کہیں مناظرہ ہوتا ہے تو اس میں بھی اپنی مباہات کی طرف خیال رکھتا ہے ۔ اس میں اپنی خوبیوں اور اوروں کے عیوب ظاہر کرنے کا بڑا خیال ہوتا ہے ۔

۱۹ - اکثر جو نقود علم میں نو دولت ہوتے ہیں ، اُن میں یہ عُجب و غرور کی عجیب صفت خبیثہ پیدا ہو جاتی ہے ، جس سے وہ پختہ کاروں کی نظر میں خام اور کامل عیاروں کی نگاہ میں ناتمام معلوم ہوتے ہیں ، آدمی سیرت ان کو ابلیس سیرت جانتے ہیں۔ اگرچہ علم و دانش کا گوہر نظر بینش میں نہایت قیمتی اور گراں بہا ہے اور اپنے مالک کا شرافت بخش و کرامت افزا ہے لیکن اس گوہرعلم کی قیمت و بہا جب ہے کہ وہ عمل کے ساتھ ہو، اور اس کی فروتنی سے تزئین ہو اور آلائش بے دینی سے پاک ہو۔ خودستائی و خود فروشی کی دکان میں قفل خاموشی ہو ؛ خود بینی و خود پسندی کے آئینے کو نفس کی سخت گیری کے سنگ نے توڑا ہو ، تونگری کے ساتھ درویش نہادی اور فقیر منشی ہو ، باوجود مسند صدر نشینی کی قابلیت کے خاک ساری ی تلاش ہو۔ آفتاب کی طرح سب کے سروں کا تاج ہو اور سب کا پاے بوس بھی ہو۔ کبر و غرور کی خصلت اہل علم کے شعور اور فہمید سے بعید ہے۔ خود پسندی کی صفت ناپسندیدہ ہے۔ غرض کمالات معنوی اور ملکات و اخلاق زکیہ و فنون و علوم عقلیہ اس وقت سرمایۂ سعادت و اقبال ہوتے ہیں کہ عُجب و غرور سے فاسد نہ ہوں اور گندہ دماغی کی آفت سے محفوظ ہوں۔

۲۰ - تکبرِ عبادت

زاہد و عابد ، کبر اور نخوت اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے سے خالی نہیں ہوتے۔ ان سے دنیا و دین دونوں میں کبر مترشح ہوتا ہے۔ دنیا میں تو اس طرح کہ دوسروں کا آنا اپنے پاس ان کو اچھا معلوم ہوتا ہے ، بہ نسبت اپنے جانے کے غیروں کے پاس۔ اور لوگوں سے متوقع رہتے ہیں کہ ہماری حاجتیں پوری کریں اور توقیر کریں ، مجالس میں صدر جگہ میں بٹھلائیں

اور ورع اور تقویٰ سے یاد کریں اور سب امور میں ہم کو مقدم جانیں ؛ گویا عبادت کیا کریں ، ہیں تو خلق پر احسان کرتے ہیں ۔ دین میں کبر اُن کا یہ ہے کہ اپنے نفس کو ناجی خیال کرتے ہیں ، اور لوگوں کو تباہ کار اور ہلاک شدہ ۔ مگر ایسے متکبر عابد سے جاہل متواضع اچھا ہے ۔ خدا تعالیٰ تو اپنے بندوں کے دل کے قصد کو دیکھتا ہے ۔ جو گناہ گار جاہل خدا سے ڈر کر تواضع کرتا ہے ، وہ خدا کا زیادہ مطیع ہے ، بہ نسبت عابد کے جو متکبر ہے ۔

بہت کم عابد ہوتے ہیں جو تکبر سے خالی ہوتے ہیں ۔ کمبل پوش فقیر بہ نسبت حریر پوش امیر کے زیادہ غرور رکھتے ہیں ۔ گلیم پوش کے آگے حریر پوش فروتنی کرتا ہے اور افضل اُس کو جانتا ہے ، اور گلیم پوش اپنے تئیں افضل سمجھتا ہے ۔

عالموں اور عابدوں میں کبر کے تین مراتب ہیں :

اول درجہ تو یہ ہے کہ دل میں کبر موجود ہے کہ اپنے نفس کو دوسرے سے بہتر سمجھتا ہے مگر کوشش کرکے تواضع کرتا ہے ، اور ایسے افعال کرتا ہے جیسے وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو اپنی نسبت بہتر سمجھتے ہیں ۔ تو ایسے شخص کے دل میں کبر کا درخت تو جما ہوا ہے مگر اُس نے اُس کی شاخیں بالکل کاٹ ڈالی ہیں ۔

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ افعال میں کبر کو ظاہر کرے ؛ مثلاً اونچا بیٹھے ، ہم سروں سے آگے بڑھے ، جو کوئی اُس کے حق میں قصور کرے اُس کو برا جانے ، کسی سے رخ پھیرے ، کسی سے ترش روئی کرے ، کسی سے چین بہ جبیں ہو ، مگر یہ نہیں سمجھے کہ علم و تقویٰ نہ رخ پر ہے ، نہ رو پر ، نہ جبین پر ؛ وہ تو دل میں ہے ۔

- تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ دل کبر سے ایسا بھرا ہوا ہو کہ مغفرت و مباہات، تزکیۂ نفس اور اپنے احوال و مقامات کی بزرگی کا دعویٰ ، اور دوسروں پر علم و عمل میں غالب ہونے کا بیان ہر وقت زبان پر ہو۔ اوروں کے بہت سے عیب بیان کرکے پھر اپنی تعریف بیان کرے۔ عابد ہوتا ہے تو اور عابدوں کی عبادت کے عیوب بتاتا ہے اور اپنی عبادت کا افضل ہونا ظاہر کرتا ہے۔ غرض اپنی بڑائی اور اوروں کی برائی سے کام ہے۔

۲۱۔ حسب و نسب کا تکبر

جس کسی شخص کا نسب شریف ہوتا ہے ، وہ ایسے شخص کو حقیر جانتا ہے جس کا نسب ویسا نہ ہو اور شرافتیں علم و عمل کی وہ زیادہ اس سے رکھتا ہو۔ بعض آدمی نسب کا وہ تکبر کرتے ہیں کہ گویا دوسروں کو اپنا غلام تصور کرتے ہیں۔ ان کے ملنے جلنے ، پاس بیٹھنے سے نفرت کرتے ہیں اور اپنے نسب کا تفاخر ان کی زبان پر ہوتا ہے۔ دوسروں سے کہتے ہیں کہ تو کیا اصل رکھتا ہے ، تیرا باپ کون تھا ؛ میں فلانے کا بیٹا ، فلانے کا پوتا ہوں۔ تجھ جیسے کی کیا طاقت ہے کہ میرے سامنے بولے یا میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ اور تو ہم جیسوں سے بولتا ہے ؟ یہ ایک ایسی چھپی آگ نفس میں ہے کہ نسب والے اس سے خالی نہیں ہوتے ، اگرچہ نیک بخت و عاقل ہوں۔ اعتدالِ احوال کے وقت تو وہ یہ امر ظاہر نہیں کرتے لیکن غلبۂ غضب میں نورِ عقل تاریک پڑ جاتا ہے۔ اس وقت وہ سبھی کچھ فرماتے ہیں۔ یہ ناقص آدمیوں کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کی شرافت سے فضیلت اپنی فضلا پر جتلاتے ہیں۔ جو تھوڑی فضیلت کہ کسی شخص کی ذات میں ہو ، وہ اس بہت سی فضیلت سے اچھی ہوتی ہے جو غیر میں ہو۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بنی نوع انسان

کا باپ آدم[۲] اور ماں حوا ہے ، اس لحاظ سے ہم سب برابر اور سب ایک دوسرے کے برادر ہیں۔ پس اصل و نسب پر افتخار کرنا اور اوروں کو دناءت نسب کے ساتھ منسوب کرنا اور زبانِ طعن و تعریض[۱] کے دراز کرنے کی کوئی وجہ نہیں :

نسب چہ سود دہد چوں تو بے ہنر باشی
ز آب جُو چہ برش تیغہائے چوبیں را

چو فضلہ ایست کہ میراند از غذائے لطیف
کسے کہ فخر کند بر نسب ز بے ہنری

اپنے سینے میں ہنر دکھا ، نسب دیرینہ کو چھوڑ۔ پرانے موتیوں میں آب و تاب نہ تلاش کر۔ موتی جب پرانا ہو جاتا ہے تو زرد رُو ہو جاتا ہے۔ زندہ ہو کر مُردے کو اپنے کمال کے لیے نہ تلاش کر بلکہ خود مُردوں کا نام روشن کر۔ جو مردہ کو زندہ کرتا ہے وہ سچا فر ہے اور جو مردہ کا دم بھرتا ہے وہ خر ہے۔ اے جوان! پدر مردہ پر نہ لاف کر۔ تو کتا نہیں ہے جو استخوان سے خوش ہوگا۔ گوہر دانش سے تاج بنا ، نہ استخوان بوسیدہ سے۔ عاج سے بہتر گوہر ہوتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نسب کی مذمت میں فرماتے ہیں کہ آدمی اپنے اعمالِ نیک کی اولاد ہیں اور ہر ایک انسان کی قیمت وہی چیز ہے جو اس کو اچھا کردے۔

بعض اکابر کا قول ہے کہ آدمی اپنی ذات سے ہے ، نہ باپ سے :

۱۔ اصل میں 'طعن و تعرض کی' ہے لیکن یہ خلاف محاورہ ہے ، اس لیے تصحیح کی گئی۔ مرتب

دی شنیدم کہ احمقے می گفت
پدر من وزیر خاں بودہ است
گرچہ معلوم من نبود ایں امر
فرض کردم کہ ہم چناں بودہ است
ہیچ ذاتے کسے کہ گہ خوردہ است
بہ خیال ایں کہ پیش ناں بودہ است

۴۲- تکبرِ جمال و مال

مال و جمال پر تکبر اکثر عورتوں کو ہوتا ہے جس کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے نقصان و عیب و غیبت زبان پر آتی ہے۔

مال کا تکبر بادشاہ اپنے خزانوں پر اور تاجر اپنے مال تجارت پر اور گاؤں والے اراضی پر اور ارباب آرائش اپنے اسبابِ آسائش و لباس و سواری پر کیا کرتے ہیں۔ جو غنی ہوتا ہے وہ فقیر پر تکبر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "تو بھک منگا اور مسکین ہے، میں چاہوں تو تجھ جیسے کو خرید لوں، اور تجھ سے اچھوں سے خدمت لوں؛ اور تیری اصل کیا ہے، میرے گھر کا سامان تیرے سارے مال سے بڑھ کر ہے، تو جتنا سال بھر میں کھاتا ہے، اتنا میں ایک روز میں دے ڈالتا ہوں۔" اس طرح باتیں اس سے کرتا ہے کہ تونگری کو بڑا اور مفلسی کو حقیر جانتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ تونگری میں کیا کیا آفتیں اور مفلسی میں کیا کیا فضیلتیں ہیں۔ یہ شعر یاد رکھو:

بر مال و جمال خویش مغرور مشو
کانرا بہ شبے برند و ایں را بہ تبے

۴۳ - بعض خود فروشوں کا سرمایۂ فخر و ناز حسن و جمالہ اور دل ربائی خط و خال ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ چیز

مستعار اور عارضی ہے اور نہایت بے اعتبار اور زود گسل ۔ گلشن جمال کی طراوت اور حسن صورت کی آب عہد شباب تک ہے ۔ جہاں پیری کی خزاں آئی ، جوانی کی بہار گئی ۔ تناسب اعضا کے ارکان کو رعشۂ پیری نے منہدم کیا اور صفائی بشرہ پر شکنوں کا پردہ پڑا ۔ رعونت قامت نخل خمیدہ ہوا ، سفیدی موئے جوش حسن کو خاک میں ملایا ؛ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ سرخی چہرہ نقش بر آب اور پیچش زلف و کاکل بے اصل نر موج سراب سے تھی ۔ وہ اس قابل نہ تھی کہ اس پر اس قدر ناز و اعتیاو اور افتخار کوئی کرے ۔ اب اس پیری سے زیادہ آفت جوانی کے لیے مرگ ہے کہ جو بدن کو خشک کرتا ہے اور قامت خرامانہ کو خاک کے حوالے کرتا ہے ۔ غرض معنی شناسوں کے بازاروں میں متاع حسن بہت کاسد و ناروا ہے ۔ بلکہ سعادت دارین جس صورت پر موقوف ہے ، وہ حسن سیرت ہے ۔ خداوند تعالی شکستگی دل پر نظر رکھتا ہے ، درستی شکل اور راستی قامت پر نہیں ۔

۲۴ ۔ تکبر قوت و زور و کثرت تابعین و مددگاران

جو قوی بازو و تنومند توانائی اور زور کو سرمایۂ مباہات جانتے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ یہ امر مستعار اور نہایت ناپائدار ہے ۔ اُن کی بنا تندرستی اور جوانی پر ہے جو معرض زوال میں ہیں ۔ ایک دو روز کی تپ میں زائل ہوتی ہے ۔ اگر ہستم بیمار ہو تو کروٹ بغیر دوسرے کی استعانت کے نہیں لے سکتا ۔ پس یہ زور و توانائی قابل فخر نہیں ۔ بادشاہ کثرت لشکر پر اور علما کثرت شاگردوں پر ، پیر اپنے مریدوں کی کثرت پر ؛ غرض جب تابعین اور مددگار ، شاگرد ، غلام ، کنبے رشتے کے آدمی زیادہ ہو جاتے ہیں تو آدمی اُن پر بھی فخر کیا کرتا ہے ۔ بحاصل اِن سب امور کا یہ ہے کہ جو نعمت کا کمال واقعی ہو یا تصور ہو سکے ؛

گو وہ واقعے میں کمال نہ ہو ، اس سے تکبر کرنا ممکن ہے ، یہاں تک کہ خدمتی بھی اپنے ہم سروں پر تکبر کرنے لگتا ہے کہ میں اس صنعت میں زیادہ ماہر ہوں ۔ فاسق اپنے فسق و فجور ہی پر فخر کرتا ہے کیوں کہ وہ اسی کو اپنا کمال جانتا ہے ، گو یہ ان کی غلطی ہے ۔

۲۵ ۔ تواضع و تکبر

تواضع و تکبر آپس میں متضاد ہیں ۔ جو حرکات و سکنات متکبر کرتے ہیں اُن کے خلاف متواضع کرتے ہیں ۔ متکبر چہرہ پُھلاتے ہیں ، ناک بھوں چڑھاتے ہیں ، گفتگو میں آواز کو بناتے ہیں ۔ بعض کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ہمارے سامنے کھڑے رہیں ، اگر بیٹھیں تو برابر نہ بیٹھیں ۔ جو کوئی ہمارے ساتھ چلے تو پیچھے چلے ۔ کوئی بیمار ہو تو اُس کی عیادت کو نہ جائیں ، اُس کو پاس نہ بٹھائیں ، اُس کو ہاتھ نہ لگائیں ، اُس سے گھن کھائیں ۔ اپنے گھر کی کوئی چیز ہاتھ سے نہ اُٹھائیں ، باہر سے کوئی چیز خود اُٹھا کر گھر میں نہ لائیں ، اصل ہیئت ظاہری کے بناؤ سنگار کا بڑا خیال رکھیں ۔ متواضع ان سب کاموں کے برعکس خوگر ہوتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں ۔ اگر وہ ان کاموں کو کریں اور خوش نہ ہوں تو متکلف کہلائیں گے ، متواضع نہیں ۔ اُن کی[1] ساری حرکات و سکنات سے فروتنی ظاہر ہوتی ہے ۔ جو انسان اپنی ہستی اور خدا کو پہچانتا ہے ، وہ یہ خوب سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات کے[2] ساتھ کبر مخصوص ہے ، مجھ مشت خاک ناپاک کو کبر زیبا

---

۱ ۔ اصل میں 'کو' ہے ۔

۲ ۔ اصل میں 'کی' ہے ۔ مرتب

نہیں ۔ میرا سودا جاہ و دولت کا ، بادۂ نخوت کی مستی اور خود بینی اور بالا نشینی اور خود ستائی و خود پرستی جنابِ مالک الملک کے رتبے سے مخالفت کرنی ہے ۔ میں نہایت عاجز و ناتواں ہوں ، کوئی قدرت ، حسن ، مال ، دولت اور کوئی چیز ایسی نہیں کہ جس پر مجھے تکبر ہو ۔ جو چیز میرے پاس ہے وہ آج ہے[1] کل نہیں رہے گی ۔ بزرگی کا دعویٰ کرنا اور اپنے[2] اندازے سے باہر قدم رکھنا حضرت آفریدگار کے ساتھ منازعت و ہم چشمی ہے ۔ جو بندگان خدا ہیں وہ تواضع کرتے ہیں اور جو خدا سے دور ہیں وہ غرور کرتے ہیں ۔ یہ صفتِ زشت ایسی ناپسندیدہ ہے کہ جو اس طائفے کا مقصود ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کی نظروں میں معزز و مکرم و مخدوم و مطاع معلوم ہوں ، وہ بھی نہیں حاصل ہوتا بلکہ جو وہ مقدمات ترتیب دیتے ہیں اُن کے نتیجے نقیضِ مدعا پیدا ہوتے ہیں ۔

۲۶ ۔ شیوۂ خاکساری حسن افعال کا آب و رنگ ہے اور صفات کمال کی معراج ، سر بلندی کا درۃ التاج ، آدمیت کے چہرے کا گلگونہ اور انسانیت کے چہرے کا مرغولہ ، پاکیِ گوہر کی نشانی اور اصالت جوہر کی برہان ، آتش عناد کی مسکّن ، سلسلۂ وداد کی محرّک ، کینوں کے گرد کی جاروب ، سینوں کے آئینے کی صیقل ، پادشاہ و گدا دونوں کی جامۂ زیبندہ اور کوچک و بزرگ دونوں پر پھبتی ہے ۔ خاکساری دیدۂ دشمن میں خاک ڈالتی ہے اور عاقبت کا دروازہ کھولتی ہے ۔ متکبر نادان یہ گمان کرتا ہے کہ فروتنی اور خاکساری کا شیوہ باعث ذلت و

---

۱ ۔ اصل میں 'ہی' ہے ۔
۲ ۔ اصل میں 'اپنی' ہے ۔ مرتب

خواری ہوتا ہے - یہ خیال اس کا غلط ہے ، اسی سے سربلندی اور سر افرازی ہے ، وقعت[1] و عزت و ارجمندی ہوتی ہے - تواضع و افگندگی کی صفت مورث سعادت و فرخندگی ہوتی ہے - یہی شیوۂ خجستہ مرد کی قدر کو اور زندگی کو بڑھاتا ہے -

خواہی کہ بود بر سر خلقت مسکنے
اول بباید خاک قدمہا گشتن
تا آب بپائے سرو نگزارد سر
کے بر سر شاخ میتواند رفتن

جیسا پانی میں ستارے کا عکس پڑنا اس کی پستی کا سبب نہیں ہوتا ، ایسا ہی بزرگوں کی فروتنی باعث کسر شان نہیں ہوتی ؛ جیسے دھوئیں کو بلند ہونے سے منزلت نہیں ہوتی ، ایسے ہی سفلوں کو گردن کشی کے دعوے سے مرتبہ نہیں حاصل ہوتا -

۲۷ - عُجب

عُجب کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے حق میں ایک ظن کاذب کسی منزلت کے استحقاق کا کر لے جس کا وہ فی الواقعہ مستحق نہیں ہے - معجب کو یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ میں سعید ہوں اور اپنے مطلب کو پہنچ چکا ، اور تحصیل حاصل اور امر محال کو کوئی طلب نہیں کرتا - عجب والا اپنے تئیں جانتا ہے کہ سب کچھ حاصل ہوگیا ، مجھے کچھ پروا نہیں - وہ اپنے نفس میں اعتقاد رکھتا ہے کہ میں نیکوکار ہوں - وہ اپنے گناہوں کو بھول جاتا ہے ، کبھی ان کو یاد اور تلاش نہیں کرتا - اگر کوئی گناہ یاد آگیا تو اس کو صغیرہ جانتا ہے ، اس کے تدارک میں کوشش نہیں کرتا - وہ اپنے نیک عمل کرنے کو خدا پر احسان کرنا

---

۱ - اصل متن 'وقعت' سے پہلے 'ذی' بے موقع تھا - مرتب

جانتا ہے اور خدا کی نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ اعمال پر عجب کرنے سے ان کی آفات میں اندھا ہو جاتا ہے۔ وہ عذاب الٰہی سے اپنے تئیں مامون جانتا ہے ، خدا کے نزدیک اپنے تئیں صاحب رتبہ جانتا ہے۔ گویا خدا پر اس کا حق اور احسان ہے۔ جب اپنی رائے اور عمل و عقل پر عجب ہوتا ہے تو استفادہ اور مشورہ لینے اور پوچھنے سے محروم رہتا ہے ، اپنی ہی رائے پر اصرار کرتا ہے۔ اپنے سے زیادہ عالم سے سوال کرنے کو ننگ و عار جانتا ہے۔ اکثر اپنی رائے خطا ہی پر عجب کرکے اس وجہ سے خوش ہوتا ہے کہ یہ بات مجھ کو سوجھی ، اگر دوسرے کو سوجھتی تو خوش نہ ہوتا۔ اسی وجہ سے اس پر اصرار کرتا ہے اور کسی ناصح اور واعظ کی بات نہیں سنتا بلکہ اوروں کو جاہل کی طرح دیکھتا ہے اور اپنی خطاؤں پر مصر[1] ہوتا ہے۔ اگر یہ رائے امر دنیاوی میں ہوئی تو نیل مرام سے محروم رہتا ہے اور اگر امر دینی میں تو گمراہ ہوتا ہے۔

سب سے بڑی آفت عجب میں یہ ہے کہ آدمی اس گمان سے کہ میں مطلب کو پہنچ گیا اور بے پروا ہو گیا ، کوشش و سعی میں سستی کرتا ہے اور اس سے بربادی ہوجاتی ہے۔ عجب ہمیشہ ایسی وصف میں ہوا کرتا ہے جو حقیقت میں کمال نہ ہو۔ معجب وہ شخص کہلاتا ہے جو نہ اس کمال کے زوال سے خوف کرے اور نہ خوش اس سبب سے ہو کہ یہ رفعت خدا تعالیٰ کی نعمت و عطا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے اطمینان و فرحت ہو کہ یہ کمال میری طرف منسوب ہو اور میرا ہی وصف ہے اور میں نے اس کو پیدا کیا ہے۔ یہ عجب محض جہالت ہے ، وہ معرفت سے دور ہوسکتی ہے۔

---

۱ - اصل میں "حصر" غلط ہے - مرتب

تو گی عجب و کبر کن تا قبلۂ عالم شوی
مبین ابلیس را بگذار تا آدم شوی

ز خاک آفریدت خداوند پاک
پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک
حریص وجہاں سوز و سرکش مباش
ز خاک آفریدت چو آتش مباش

۲۸ - غرور

غرور ایک قسم کی جہالت کا نام ہے کیوں کہ جہالت اسے کہتے ہیں کہ کسی چیز کو جیسی وہ ہے، ویسی نہ جانے۔ غرور بھی ایک جہل ہے مگر ہر جہل غرور نہیں، بلکہ غرور کے لیے مغرور فیہ اور مغرور بہ بھی ضرور ہے۔ غرور کی تعریف یہ ہے کہ شبہ و مکر کے باعث نفس ایسی چیز پر جم جائے جو ہوائے نفسانی اور خواہش طبع کے موافق ہو۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جو شخص کسی نکمے شبہے سے حال یا مآل میں چیز کا معتقد ہو وہ مغرور ہے۔ اکثر آدمیوں کا یہی حال ہے کہ اپنے نفسوں کے لیے ایک چیز کو بہتر گمان کرتے ہیں حالانکہ ان کا یہ گمان بہتری غلط ہوتا ہے۔ اکثر لوگ مغرور ہوتے ہیں، گو اُن کے اقسام غرور جدا ہیں اور درجات بھی مختلف۔ بعض کا غرور بعض کی نسبت ظاہر تر اور شدید تر ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ غرور بدکاروں اور گناہ گاروں کا ہوتا ہے۔ وہ ایسی دلیلیں کیا کرتے ہیں کہ دنیا نقد اور آخرت ادھار ہے، اور نقد بہ نسبت ادھار کے اچھا ہوتا ہے۔ اس لیے دنیا بہ نسبت آخرت کے اچھی ہے۔ اب اس جملے میں کہ نقد بہ نسبت ادھار کے اچھا ہے، مغالطہ ہے۔ یہ جملہ تو اس صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ نقد اور ادھار مقصود میں برابر ہوں۔ اگر نقد

بہ نسبت ادھار کے کم ہے تو ادھار بہتر ہے ۔ اگر طبیب مریض کو لذیذ کھانوں سے منع کرے۔ تو گو لذت اُن کی نقد ہے اور مرض کی سختی آیندہ ہوگی مگر وہ اُس سختی کے خوف سے اس لذت نقد کو چھوڑ دیتا ہے ۔ سوداگر خشکی و تری میں مصیبتیں صردست اٹھاتے ہیں تا کہ آیندہ راحت اور نفع ملے، اور کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ نقد بہ نسبت ادھار کے بہتر ہے ۔

پس یہی حال دنیا اور آخرت کے نقد اور ادھار کا انسان کی سمجھ کے لیے ہے ۔ دنیا کی لذت میں سب طرح کی کدورت ، اور رنج و مصیبت ہیں اور آخرت کی لذت پاک صاف حلوائے بے دود ہے ۔ مغرور یہ بھی کہتے ہیں کہ یقین شک سے بہتر ہے ، اور آخرت مشکوک اور دنیا یقینی ہے ۔ اس میں مغالطہ ہے ۔ یقین بہتر ہے شک سے ، یہ جب ہے جب دونوں مساوی ہوں ورنہ ظاہر ہے کہ سوداگر مشقت تو یقیناً کرتے ہیں اور نفع مشکوک ہوتا ہے ۔ اور طالب علم تحصیل علم میں محنت یقیناً کرتے ہیں ، فضل و علم کے مرتبے پر پہنچنا مشکوک ہے ۔ شکاری شکار کی تلاش میں گشت یقینی کرتا ہے مگر شکار کا ملنا مشکوک ہے ۔ بیمار بدمزہ تلخ دوا کا ذائقہ یقینی چکھتا ہے مگر شفا میں شک ہوتا ہے ۔ غرض جتنے امور عقلا کے نزدیک احتیاط میں داخل ہیں وہ سب اسی طرح کے ہیں کہ امر مشکوک کے لیے یقین کو چھوڑنا پڑتا ہے ۔

تاجر کہتا ہے کہ اگر میں تجارت نہ کروں اور مصیبت نہ اٹھاؤں تو بڑا نقصان ہو اور بھوکا مروں ۔ سوداگری میں محنت تھوڑی ہوتی ہے اور فائدہ بہت ۔ اسی طرح مریض کہتا ہے کہ دوا کی بدمزگی کا ضرر تھوڑا ہے بہ نسبت خوف مرض کے جس کا انجام موت ہے ۔ پس اس بنا پر جو شخص آخرت میں شک کرکے کہتا

ہے ، اس پر بہ حکم احتیاط واجب ہے کہ یوں کہے کہ زندگی کے چند روز کا صبر کر لینا میرے حق میں اچھا ہے ، اُن امور کی نسبت جو آخرت میں لوگ کہتے ہیں ، کیوں کہ بالفرض آخرت کے معاملات جھوٹ ہوئے تو مجھے کیا نقصان ہوا ، ایک چند روزہ زندگی کے لیے عیش جاتے رہیں گے ۔ ازل سے اب تک بھی تو میں ایسا ہی تھا کہ عیش نہ کرتا تھا ، میں جانوں کا معدوم ہی رہا ۔ اگر معاملات اُخروی سچ ہوئے تو ابدالاباد تک آگ میں جلوں گا جس کی برداشت نہیں ہو سکے گی ۔

۲۹ ۔ آدمی کو چاہیے کہ کبر و غرور کی صفت سے ، جو اکثر عیوب اور صفات ذمیمہ کا سرچشمہ ہے ، اگر اپنے میں اثر دیکھے تو اس کے دفع کرنے میں سعی کرے اور تواضع کے اوصاف میں تفکر و غور و تامل کرے ۔ سخنانِ حق کے تریاق سے غرور کے زنبور کے زہر کا علاج کرے اور خودپسندی کے مواد کو دور کرے ۔ تواضع و فروتنی کے شیرہ پینے کی عادت ڈالے اور خلق میں سوائے اپنے کسی کو کم تر نہ جانے ، اور مجالس و محافل میں اپنے مرتبے سے کم تر جگہ میں بیٹھے اور سب وضیع و شریف سے پیش سلامی کی تلاش کرے ۔ دوست دشمن کو اپنے اوپر تقدیم دے ۔ جس کو عمر میں بڑا دیکھے اسے یہ سمجھے کہ اس نے عبادت و نیک کام مجھ سے زیادہ کیے ہیں اس لیے قابل تعظیم ہے ، اور جب کسی چھوٹے سے ملے تو جانے کہ اس نے مجھ سے گناہ کم کیے ہیں تو اس کی تکریم کرے ، اور جو برابر والے سے ملاقات ہو تو جانے کہ مجھے اپنے اطوار کی زشتی خوب معلوم ہے اور اس کا حال مجھ پر پوشیدہ و مشتبہ ہے ، اس کی منزلت خدا کے آگے زیادہ ہے ، اس لیے اس کو اپنے سے بہتر جانے ۔ جب کوئی جماعت اس کے ساتھ بہ تواضع و تعظیم پیش

آئے تو جانے کہ یہ ان کا غایت اشفاق اور حسنِ اخلاق ہے؛ میری لیاقت و استحقاق نہیں۔ اور جب وہ اپنے ساتھ بے التفاتی کرے اور خواری کی نظر سے مجھے دیکھے تو جان لے کہ یہ میری زشتی اور ناقابلی کے سبب سے ہے، نہ اس کی نا فہمیدگی اور جاہلی کے سبب سے۔ جب کسی غنی کو دیکھے تو جانے کہ خدا نے اسے لائق دیکھا اور جب کسی مفلس کو دیکھے تو جان لے کہ اس کا تعیش اولیا کا سا ہے۔

جامہ و پوشش میں بہت کوشش نہیں چاہیے۔ لوگوں کی طرح طاؤس وش لباس منقش نہیں کرنا چاہیے۔ لباس کا تکلف تواضع کی نظر سے چھوڑنا عزت زیادہ کرتا ہے۔ اپنے خدمت گار و غلام و کنیزکوں کے ساتھ مشفقانہ و پدرانہ سلوک کرنا چاہیے۔ اپنے آقا اور ان کی خدمت گزاری پر فخر نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اپنے تئیں اور ان سب کو برابر خدا کا بندہ سمجھنا چاہیے، اور اپنی فرماں روائی اور ان کی خدمت گاری کو اپنے حق میں فضل الٰہی جاننا چاہیے۔ ان سے زیادہ تعظیم و ادب کرا کے اپنی سرافگندگی کے نخل پر آرہ نہ لگانا چاہیے۔

ایک شخص خدا کی بندگی کی رسوم سے آشنا تھا، وہ غلام کو اپنے ساتھ ہمیشہ کھلاتا تھا۔ ایک شخص جو رسوم و تعارف کا پابند تھا، اس نے ملامت کی کہ تو غلام کے ساتھ ہم‌کاسہ ہوتا ہے جس سے وہ بے ادب ہو جائے گا۔ اس دانش مند نے جواب دیا کہ غلام میرا میری خدمت میں بے ادب بلا سے ہو جاوے مگر میں خدا کی بندگی میں بے ادب نہ ہوں۔ نفس مغرور کی تادیب کے قصد سے آدمی اگر اپنی گھر کی حوائج کی چیزوں کو خود اٹھا کر لے جائے تو شیوۂ پسندیدہ اور صفت حمیدہ ہے، گو وضعِ زمانہ کا تقاضا اس کام پر اقارب سے سببِ ملامت ہو۔

کوچہ و بازار میں وقت رفتار آدمی آنے جانے والوں کی گندہبوئی سے نہ بھاگے اور اپنے نفس بد طینت کی نخوت سے آمد و رفت آدمیوں پر تنگ نہ کرے ۔ آگے سے آدمیوں کو نہ ہٹائے ۔

جب لوگوں سے ملے تو خواہ ادنٰی ہوں یا اعلٰی ، تو ان سے سلام کرنے میں پیش دستی کرے ۔ تواضع کے معنی یہی ہیں کہ آدمی جس سے ملے، پہلے سلام کرے ۔ اگر اہل علم میں سے ہو اور کوئی مسئلہ اس سے پوچھا جائے ، اگر اُس پر علم نہ ہو تو اپنے جہل کا اقرار کرے ، علمائے گردن کش کی طرح اپنی نخوت کے سبب سے بے تامل جواب نہ دینے لگے، اور نہ یہ ہو کہ مسئلے کے جاننے کی صورت میں مغرور ہو ، اور نہ اپنے تئیں نادانوں میں شمار کرے ۔ یہ جان لے کہ اگر بے تحقیق لا علمی کی حالت میں کوئی مسئلہ بتاؤں گا تو خدا کا عتاب ہوگا ۔ اس سے آدمیوں کی ملامت اٹھانا آسان ہے ۔ آدمی خود حق نہ جانے اور جو حق کو جانیں اُن پر طعن کرے اور قول ان کا سمعِ قبول میں نہ لائے ، یہ مناسب نہیں ۔

جو صاحب ہوش ہو وہ اپنی خود نمائی خلق کی دلق کو دوش پر سے ڈال دے اور مرأت خاطر کو عجب و غرور کے زنگ سے صاف کرکے اہل حق کا تمام امور میں تابع ہو ۔ جو غریب مسکین عارضۂ بیماری میں یا مصیبت و بلا میں مبتلا ہو تو اس کی پرسش میں اپنی کسر شان نہ جانے ۔ خود اس سے پرہیز کرکے مرضِ انانیت میں نہ گرفتار ہو ۔ صائب

زکاۃ صحت جسم است خستہ پرسیدن
نگاہ بانیِ عمر است پشت پا دیدن

غرض ایسی طرح کی باتوں میں جن سے کہ طبعِ مغرور کی اصلاح ہو ، آدمی کو کوشش کرنی چاہیئے تاکہ نفس میں سرکشی

نہ پیدا ہو - جب تک آدمی تواضع اور انکساری کی عادت نہیں اختیار کرتا ، عافیت نہیں حاصل ہوتی - ذائقۂ عقل کی اصلاح نہیں ہوتی اور اس کی لذت نہیں آتی - مگر یاد رکھو کہ شیوۂ تواضع ہر شخص کے ساتھ نیک اور مستحسن ہے مگر متکبروں کے ساتھ نہیں - ان کے ساتھ جواب عربی بہ عربی[1] اور سزائے بے ادبی، بے ادبی ہو - شاید اس سے ان کی طبیعتِ نخوت سرشت کو سزا ہو اور وہ تمردی سے باز آئیں -

۳۰ - حرص و طمع کی مذمت - و قناعت اور لوگوں سے توقع نہ رکھنے کی عادت

اگر جمعیت دل ہے تجھے منظور قانع ہو
کہ اہل حرص کے کب کام خاطرخواہ ہوتے ہیں

جو کنج قناعت میں ہے تقدیر پہ شاکر
ہے ذوق برابر اسے کم اور زیادہ

حرص نفس کا حال یہ ہے کہ سب چیزوں کی طرف نیت دوڑتی ہے - یہ چاہتا ہے کہ ساری چیزیں میرے پاس آ جائیں - اسی غرض سے کبھی کسی کے پاس حاجت لے جاتا ہے ، کبھی کسی کے پاس - جب وہ شخص حاجت پوری کر دیتا ہے تو گویا اب اس کی تکمیل اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے - جہاں چاہتا ہے وہ پھراتا ہے اور جو کام چاہتا ہے وہ لیتا ہے :

"مرا ناں دہ و کفش بر سر بزن"

کا قصہ ہوتا ہے - یہ شخص جہاں اس کو دیکھتا ہے خوشامد کے مارے سلام کرتا ہے - اور وہ بیمار پڑتا ہے تو اس کی عیادت

---

۱ - 'عربی بہ عربی' محاورہ نہیں ہے - غالباً 'ترکی بہ ترکی' کی طرح مولف نے یہ محاورہ وضع کیا ہے - مرتب

کرتا ہے۔ پس اگر حاجت نہ ہوتی ، اس کے لیے اچھا ہوتا۔
حکما کا قول ہے کہ انسان میں بڑے تعجب کی بات یہ ہے
کہ اگر بالفرض اُس کو سنا دیا جائے کہ تو ہمیشہ دنیا میں رہے
گا تو اس قدر عمر کی درازی میں جتنی حرص اُس کو ہوگی اُس سے
زیادہ اب وہ کرتا ہے ، حالاں کہ اب تھوڑے ہی دنوں کی زندگی
ہے اور آخر کو فنا کی توقع ہے۔ انسان کی طمع و حرص سے
نجات اور قناعت یوں ہو سکتی ہے کہ آدمی معیشت میں میانہ روی
اور خرچ میں کفایت کرے۔ حتی الوسع خرچ کے دروازے اپنے
نفس پر بند کرے اور صرف ضروری خرچوں پر اکتفا کرے ،
اس لیے کہ جس کا خرچ اور دہش زیادہ ہوگی وہ قناعت نہیں کر
سکتا۔ سردست بہ قدر کفایت آدمی کے پاس موجود ہو تو آیندہ
کے لیے زیادہ اضطراب نہ کرے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ قناعت
کے فائدے سے آگاہ ہو کہ اُس کے باعث استغنا اور بے پروائی کی
عزت حاصل ہوتی ہے ، اور حرص و طمع کی جہت سے رسوائی اور
ذلت ہوتی ہے۔ حرص میں مشقت سے ، طمع میں ذلت سے نہیں بچتا۔
قناعت میں صرف شہوات فضول سے صبر کرنے کی مشقت ہے۔
یہ مشقت و تکلیف ایسی ہے کہ اُس کو سوائے خدا کے کوئی اور
نہیں جانتا۔ حرص و طمع ایسی چیزیں ہیں جن کو لوگ دیکھ
سکتے ہیں۔ کثرت طمع و حرص میں نفس کی بزرگی اور حق بات
کی متابعت میں قدرت مفقود ہوتی ہے کیوں کہ کثرت حرص و طمع
مقتضی اس بات کی ہے کہ لوگوں سے بہت کام نکالیں ؛ پھر ایسی
صورت میں اُن کو حق بات کا مائل کرنا کہاں بن سکتا ہے ،
بلکہ اُن کی برائیاں دیکھ کر مداہنت اور اغماض کرنا پڑے گا
جس سے کہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔
جو شخص بہ قدر کفایت پر قانع ہوتا ہے وہ اغنیا کے گروہ

میں داخل ہوتا ہے ۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ جس سے چاہو بے پروا ہو جاؤ ، اس کی نظیر[1] اور اسی کی مانند ہو جاؤ گے ۔ اور جس کی طرف دل چاہے حاجت لے جاؤ ، اسی کے پابند ہو جاؤ گے ۔ اور جس پر چاہو احسان کرو اس کے امیر بن جاؤ گے ۔ اگر عقل کی شمع کو روشن رکھنا چاہو تو پردۂ طمع کو اٹھا دو ۔ یہ پردہ چشم دل کو کبھی روشن نہیں ہونے دے گا ۔ خیال جاہ و زر اس کی آنکھ کے آگے ایسا ہوتا ہے جیسا آنکھ میں بال ۔

۳۱ ۔ طمع کی مصیبت مخدوم کو خادم بناتی ہے

طمع کی مصیبت مخدوم کو خادم بناتی ہے اور آزاد کو بندگی میں ڈالتی ہے ۔ ہمیشہ اہل طمع کو دیکھو کہ وہ ارباب جاہ کی رکاب کے ساتھ پڑے پھرتے ہیں اور ادب کے ساتھ ان کی خدمت میں دست بستہ پھرتے رہتے ہیں ۔

بعض بزرگوں کا قول ہے کہ غلام تین ہوتے ہیں ؛ ایک وہ غلام جن کی خرید و فروخت ہوتی ہے ، دوم بندۂ شہوت ، سوم بندۂ طمع کہ سیم و زر کی طمع کے سبب سے خط غلامی لوگوں کو لکھ دیتے ہیں اور ناکسوں کی فرماں برداری قبول کر لیتے ہیں ۔ بعض کو یہاں تک طمع ہوتی ہے کہ حکام و سلاطین کی استرضا[2] میں خدا کے احکام کا بھی خیال نہیں کرتے ۔ ایسے آدمی چھوٹے بڑوں کی نظروں میں خفیف و بے اعتبار ہو جاتے ہیں ۔ اپنے حوائج کے رفع کی طلب نشان بے قدری اور مورث بے حیائی اور بے شرمی ہے ۔ جو لوگ توقع احسان خلق کی نہیں رکھتے اور استغنا مزاج میں رکھتے ہیں ، اگرچہ وہ مفلس اور تنگ دست ہوں مگر وہ اغنیا اور متکبروں میں شمار ہوں گے ۔ استغنا کچھ کثرت مال کا نام

---

۱ ۔ اصل میں 'نظر' ہے ۔ ۲ ۔ استرضا ۔ طلب رضا ، رضا جوئی ۔ مرتب

نہیں ہے بلکہ نفس کی بے نیازی کا نام ہے۔ وہی غنی ہیں کہ جو کچھ پاس رکھتے ہیں ، اسی پر قناعت کرتے ہیں ۔

حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں کہ تو دل میں غنی ہو اور اُمید بخشش اور طمع نوازش کسی سے نہ رکھ ۔ جب محتاج و تنگ دست ہو جائے تو اُس کا اعتبار کسی طرح نہ کر کیوں کہ اس سے تو بے مقدار ہو جائے گا ۔ لیکن اپنی حاجت فضل الٰہی سے اور نقد مدعا اس کے خزانۂ نامتناہی سے چاہ ۔ طمع سے زیادہ ذلیل کوئی چیز نہیں ۔ لوگ جامہ و دستار کی درندگی کو پردہ دری عزت جانتے ہیں اور اس سبب سے تھوڑی عسرت میں لوگوں کے گھروں پر پڑے پھرتے ہیں ؛ مال‌داری میں شرف و سلامتی جانتے ہیں ۔

۳۲ ۔ صبر

صبر کے معنی ہیں طبیعت کا روکنا ، خواہ وہ غضب سے ہو یا ہویٰ (ہوا) سے ، یعنی شہوت سے ۔

صبر کی دو قسمیں ہیں : اول صبر بدن سے کرنا ، مثلاً بدن پر مشقت کا متحمل ہونا اور اُس پر مستقل رہنا ۔ پھر اُس کی بھی دو صورتیں ہیں ؛ یا تو خود کوئی فعل کرنا یا دوسرے کے فعل کی برداشت کرنی ۔ اول کی مثال جیسے کسی مشکل کام کا یا عبادت کا بجا لانا اور دوسرے کی مثال جیسے سخت مار کو پی جانا ، یا بڑے مرض کو اور زخم مہلک کو سہنا ۔ پہلی قسم کبھی عمدہ ہوتی ہے مگر دوسری قسم کے صبر میں کمال عمدگی پائی جاتی ہے کیوں کہ اس میں نفس کو طبیعت کے مقتضیات اور باعث ہونے سے روکنا ہوتا ہے ۔ اب اس صبر کے نام مختلف طرح سے لیے جاتے ہیں ؛ شہوت شکم وغیرہ سے صبر کرنے کا نام عفت ہے ۔ اگر کسی مصیبت میں ہو تو اُس کو صبر ہی کہتے ہیں ۔ اور اُس

کی ضد وہ حالت ہے جس کو[1] جزع و فزع کہتے ہیں ، یعنی مقتضاے ہوا کو مطلق العنان کر دینا کہ خوب چیخے اور پیٹے اور گریبان پھاڑے ۔ اگر تونگری برداشت کرنے میں صبر ہو تو اُسے ضبط نفس کہتے ہیں ، اور اُس کے مقابل اترانا ہے۔ اور اگر صبر مقام جنگ اور صف قتال میں ہو تو اُسے شجاعت کہتے ہیں جس کا مقابل نامردی و بزدلی ہے ۔ اگر غصے کے پینے میں ہو تو اُس کا نام حلم ہے جس کی ضد غضب ناکی ہے ۔ اگر زمانے کی کسی آفت پر صبر ہو تو اُس کا نام فراخیِ حوصلہ ہے اور اُس کی ضد کم حوصلگی ۔ اگر کلام کے خفیہ رکھنے میں ہو تو اُس کو رازداری ، اور جس شخص میں یہ صفت ہو اُس کو رازدار کہتے ہیں ۔ اگر عیشِ زائد از حاجت سے ہو تو اُس کا نام زہد ہے جس کی ضد حرص ہے ۔ اگر ہر ایک حظ نفسانی سے قدر قلیل پر صبر ہو تو اُس کو قناعت کہتے ہیں ، اُس کا مقابل شرہ ہے ۔

اکثر نیک اخلاق صبر میں داخل ہیں ۔ انسان کو صبر کی طرف بڑی حاجت ہے ، اس سے گریز نہیں ہو سکتی ۔ جو حالات اس زندگی میں انسان کو پیش آتے ہیں ، وہ دو حال سے خالی نہیں ہوتے ؛ یا تو اُس کی خواہش کے موافق ہوتے ہیں یا ناموافق ۔ صبر کی حاجت دونوں حالوں میں ہے ؛ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو ہر حال میں صبر کی حاجت ہے ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قسم اول یعنی وہ احوال جو ہماری خواہش کے موافق ہوں ، وہ صحت اور تندرستی اور مال و جاہ کا ہونا اور بہت سا جتھا ہونا اور کثرت سے اسباب کا ہونا ، یار اور مددگار و خدمت گزار بہت سے ہونے اور تمام لذائذ کا موجود ہونا ۔ ان احوال میں بندے کو

---

۱ ۔ اصل میں 'جس سے' تھا ۔ مرتب

صبر کی بڑی خواہش ہے ، اس واسطے کہ آدمی اگر لذات دنیاوی میں پڑ کر اپنے نفس کو نہ روکے گا اور اُن میں مطلق العنان اور ڈوبا رہے گا تو گو وہ لذائذ مباح ہی ہوں مگر آخر کو سرکشی اور اترانے پر پہنچا دیں گے ۔ اس واسطے کہ انسان کا قاعدہ ہے کہ جب اپنے آپ کو غنی جانتا ہے تو طغیانی کرتا ہے ۔ سچ یہ ہے کہ بلا و مصیبت میں صبر کرنا ایسا سخت نہیں ہوتا جیسا کہ عافیت اور تونگری پر ۔ بڑا مرد وہ ہے جو عافیت پر صبر کرے[1] ، اور عافیت پر صبر کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اُس کی طرف رغبت نہ کرے اور جانے کہ یہ چند روزہ ودیعت ہے ، جلد مجھ سے جاتی رہے گی ، اور اُس سے زیادہ خوش نہ ہو ، اور تنعم اور لذت اور لہو و لعب میں ڈوبا نہ رہے ، بلکہ حق جو انعام اللہ کے اُس پر ہیں اُن سے حقوق اللہ تعالیٰ کے ادا کرے ۔ مثلاً مال کو خدا کی راہ میں دینے سے اور بدن سے دوسروں کی اعانت کرکے اور زبان سے سچ بول کر خدا کا حق ادا کرے ۔ اس طرح کا صبر شکر کے متصل ہے ۔ جب تک آدمی شکر پر قائم نہ ہوگا تب تک یہ صبر کامل نہ ہوگا ۔

عافیت پر صبر کرنا اس لیے سخت تر ہے کہ اُس میں قدرت موجود ہے ورنہ "عصمت بی بی از بے چادری" مشہور ہے ۔ جس کو قدرت ہی نہ ہو وہ اگر صبر نہ کرے تو کیا کرے ۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ بھوکا آدمی ، اگر کھانا اُس کے سامنے نہ ہو ، تو صبر آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے ، بہ نسبت اس صورت کے کہ عمدہ کھانا لذیذ اُس کے سامنے ہو اور اُس کو قدرت بھی کھانے کی ہو ۔ اس لحاظ سے عافیت میں صبر سخت تر ہے ۔

---

۱ ۔ 'کرے' کے بعد ایک 'اور' زائد تھا ۔ مرتب

دوسری قسم جو خواہش طبیعت کے ناموافق ہونے کی ہے، اُس کی تین صورتیں ہیں ؛ اول تو وہ جو بندے کے اختیار سے مربوط ہو جیسے طاعات اور معاصی - دوم وہ جو اُس کے اختیار میں نہ ہوں جیسے کہ مصائب و حوادث - سوم شروع میں تو اختیار کو کچھ دخل نہ ہو مگر اُس کا دور کرنا اختیار میں ہو جیسے موذی سے بدلہ لینا -

صورت اول یعنی وہ افعال کہ بندے کے اختیار سے وابستہ ہوں اور اُس میں بندے کے عام افعال جو طاعت اور معصیت سے ہو سکتے ہیں ، داخل ہیں ، اُن کی دو نوع ہیں ؛ نوع اول طاعت اور دوسری نوع معصیت ، اور ہر ایک میں صبر کی حاجت ہے - طاعت پر صبر کرنا دشوار ہے ، اس واسطے کہ نفس کو طبعاً عبودیت سے نفرت ہے ، یہ ربوبیت کو چاہتا ہے - نفس انسانی میں انا ربکم الاعلیٰ[1] بھی ہے - اسے دیکھو کہ آدمی اپنے غلام و نوکر اور محکوم اور زبردست اور مطیع سے ان کے قصور کے وقت کیسا نیلا پیلا ہوتا ہے اور قصورِ خدمت کو اُن سے بعید جانتا ہے - اُس کی وجہ اگر کبر باطنی اور دعویِ ربوبیت نہیں تو اور کیا ہے - اس سے معلوم ہوا کہ عبودیت نفس پر شاق ہے - بعض عبادتیں کسل کے سبب سے ، بعض بخل کے سبب سے ، بعض دونوں کسل و بخل کے سبب سے ناگوار ہوتی ہیں - پس طاعت پر صبر کرنا بہت سے شدائد پر صبر کرنا ہے -

نوع دوم معصیت پر بھی صبر کرنا بڑا ضروری ہے - صبر کے اقسام میں زیادہ شدید اُن معاصی پر صبر کرنا ہے جو عادت کے باعث مالوف ہوگئے ہوں ، اس لیے کہ عادت بھی ایک دوسری

---

۱ - یعنی میں ہی تمھارا مالک و مربی ہوں - مرتب

طبیعت ہوتی ہے ۔ جب خواہش نفس پر عادت زیادہ ہو جاتی ہے
تو آدمی اُس کے قلع و قمع پر قادر نہیں ہوتا ۔ پھر اگر وہ گناہ اُن
افعال میں سے ہوں جن کے کرنے میں کچھ دقت نہیں ہوتی ، بآسانی
ہو سکتے ہیں تو اُس سے صبر کرنا نہایت دشوار ہے ۔ مثلاً زبان
کو گناہوں ، مثل غیبت اور جھوٹ و خصومت اور اشارةً یا
صراحةً اپنے نفس کی تعریف کرنے سے صبر کرنا ، یا اقسام مزاح
سے جو دلوں کو ایذا دیں ، اور اُن کلمات سے جو بہ قصد تحقیر و
تذلیل بولے جائیں ، اور مُردوں کا ذکر کرنا اور اُن پر ، خواہ اُن کے
علوم اور سیرت و منصب پر اعتراض کرنا ، ان سب سے صبر کرنا
نہایت دشوار ہے ، اس لیے کہ ظاہر میں تو یہ غیبت ہیں مگر
باطن میں اپنے نفس کی ثنا پائی جاتی ہے ۔ غرض جب معصیت
کا سبب قوی یا ضعیف ہوگا ، ویسا ہی صبر کرنا بھی سخت یا
آسان ہوگا ۔

صورت دوم وہ افعال جن کا کرنا اختیار سے وابستہ نہ ہو
مگر اُن کے دفع کرنے کا اختیار ہو ۔ مثلاً کسی نے اپنے قول اور
فعل سے کسی کو ایذا دی یا اُس کے نفس یا مال میں کوئی قصور
کیا ، تو اُس پر صبر کرنا اور مکافات کا چھوڑنا کبھی تو واجب
ہوتا ہے اور کبھی صرف فضیلت کا سبب ، کیوں کہ ایذا پر صبر
کرنا انسان کے مراتب اعلیٰ میں داخل ہے ۔

صورت سوم ایسے امور جن کی ابتدا و انتہا کچھ بھی بندے
کے اختیار میں نہیں ، جیسے عزیزوں کا مرنا اور مال تلف ہونا ،
اور مرض سے تندرستی کا جاتا رہنا ، اور اعضا کا بگڑ جانا ، اور
تمام اقسام کے مصائب کہ اُن پر صبر کرنا مقامات صبر میں اعلیٰ
مقام ہے ، کیوں کہ ایسے مقام پر صبر کرنا نہایت سخت ہوتا

ہے۔ صبر کرنے کے معنی یہ ہیں[1] کہ خدا کی مرضی پر آدمی راضی رہے ، صبر کا کمال اس میں ہے کہ مرض اور افلاس[2] اور تمام مصیبتوں کو چھپائے۔

خلاصہ اس تمام بیان کا یہ ہے کہ سب احوال اور افعال میں صبر واجب ہے ۔ گو صبر کرنا بہت دشوار ہے مگر وہ علم و عمل سے حاصل ہو سکتا ہے ۔

۳۳ ۔ شکر

شکر کے واسطے تین باتیں ضرور ہیں : اول علم ، دوم حال ، سوم عمل ۔ اصل اصول علم ہے ، اس سے حال پیدا ہوتا ہے اور حال سے عمل ۔ علم سے غرض یہ ہے کہ نعمت کو منعم کی طرف سے جانے ، حال سے مراد یہ ہے کہ منعم کے انعام سے خوش ہو ، عمل سے مراد یہ ہے کہ جو منعم کا مقصود انعام سے ہو ، اس پر قائم رہے ۔

علم میں تین باتوں کو جاننا چاہیے ؛ ایک تو خود نعمت کا ، دوم اس نعمت کا اپنے حق میں نعمت ہونا ، سوم منعم کا اور اس کی صفات کا جن سے کہ صدور اس انعام کا اس پر ہوا ۔

انعام کے جاننے کے لیے یہ چیزیں ضروری ہیں : ایک نعمت ، ایک نعمت کا دینے والا اور ایک وہ جس پر منعم کے قصد اور ارادے سے نعمت پہنچتی ہے ۔ انسان کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ساری نعمتیں خدا کی طرف سے پہنچتی ہیں ۔ اصل منعم وہی ہے اور باقی اور جو نعمت پہنچاتے ہیں ، وہ پہنچانے کا واسطہ خدا کے حکم کے سبب سے ہوتے ہیں ۔ جیسے بادشاہ کوئی انعام دے تو بادشاہ کے اہلکار اس (کے) پاس پہنچانے کے بیچ میں واسطہ ہوں گے ،

---

۱ ۔ اصل میں 'یہ ہی' غلط ہے ۔ مرتب

مگر انعام دینے والا بادشاہ ہے۔ اگر وہ حکم نہ دیتا تو یہ اہلکار انعام کبھی نہ دیتے۔ ہم کو شمس و قمر و آسمان و زمین سے جو نعمتیں مل رہی ہیں، اُن کا دینے والا خدا تعالیٰ ہی ہے، اس لیے کہ جو ظاہر میں ہم کو چیزیں دے رہے ہیں، وہ سب اُسی کے مسخر و تابع ہیں، اُس کے حکم سے دیتے ہیں۔ غرض خدا کے انعام دینے میں جو کسی دوسرے کو شریک کرے گا تو اُس کی توحید میں شرک کرے گا۔

حال کی کیفیت یہ ہے کہ آدمی کو جب کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ تین وجہ سے خوش ہوتا ہے؛ اول جو فقط نعمت ہی سے خوش ہو، مثلاً ایک شخص کو گھوڑے کی ضرورت سفر کے لیے تھی، بادشاہ نے اُسے گھوڑا دے دیا، اب یہ شخص صرف گھوڑا ملنے سے خوش ہوتا ہے۔ اگر وہ اُس کو جنگل میں سے مل جاتا تو بھی اتنا خوش ہوتا۔ دوم منعم سے خوش ہونا جس کا انعام دینا اُس کی عنایت اور الفت پر دلالت کرتا ہے۔ اوپر کی مثال میں گھوڑا ملنے سے اس لیے خوش ہوتا کہ بادشاہ کی عنایت پر وہ دلالت کرتا ہے۔ وہ بادشاہ کی شفقت و التفات کا خواستگار تھا، کچھ گھوڑے کا طالب نہ تھا۔ تیسری خوشی اس سبب سے ہو کہ نعمت کے ذریعے سے میں منعم کی زیادہ خدمت کروں گا، مثلاً گھوڑا ملا تو اس سبب سے خوش ہوا کہ میں اُس کے سبب سے اور زیادہ بادشاہ کی خدمت خوش اسلوبی سے بجا لاؤں گا اور اس سبب سے مجھے بادشاہ سے اور تقرب حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔

اول صورت میں تو معنیِ شکر پائے نہیں جاتے کہ اس نعمت پانے والے[۱] کی غرض صرف گھوڑے ہی کی تھی، دینے والے سے کچھ

۱۔ نسخۂ اول (صفحہ ۲۸۵) میں 'والی' غلط ہے۔ مرتب

غرض نہ تھی - یہ حال ایسے لوگوں کا ہے جو نعمت پر اس وجہ سے خوش ہوتے ہیں کہ وہ لذیذ اور غرض کے موافق تھے - ایسے لوگ شکر سے بہ مراحل دور ہیں -

دوسری صورت اگرچہ معنیً شکر میں داخل ہے اور اس میں خوشی منعم کے ساتھ پائی جاتی ہے مگر منعم کی ذات کے اعتبار سے یہ خوشی نہیں بلکہ اس جہت سے ہے کہ عنایت سلطانی کا یقین ہوا جو آگے کو انعام کا باعث ہوگی - یہ حال اُن صلحا کا ہے جو خدا تعالیٰ کی شکر و عبادت بجا لاتے ہیں ، اس وجہ سے کہ اُس کے عتاب و عذاب سے خائف ہیں اور ثواب کے متوقع ہیں - اُن دونوں صورتوں میں شکر ناقص رہتا ہے - مگر تیسری صورت میں شکرِ کامل پایا جاتا ہے کہ بندے کو خوشی نعمتِ الٰہی پر اس نظر سے ہو کہ اس نعمت کے سبب سے خدا کا قرب حاصل کر سکتا ہے - غرض عوام تو ادائے شکر کھانے پینے ، پوشاک وغیرہ پر کرتے ہیں اور خواص اپنے دلوں کے احوال پر -

اب تیسری بات یہ ہے کہ جو خوشی معرفتِ منعم سے حاصل ہوتی ہے ، اُس کے موافق عمل کرنا - یہ عمل قلب اور زبان اور اعضا سے ، سب سے متعلق ہے - دل سے تو یہ چاہیے کہ خیر کا قصد کرے اور تمام خلق کے حق میں نیت خیر اور سلوک کرنے کا ارادہ خفیہ رکھے اور زبان سے اظہارِ شکر خدا ایسے الفاظِ حمد سے جو شکر پر دال ہوں ، چاہیے کہے - اور دوسرے اعضا سے اس طرح کہ ان کو نعمت الٰہی جان کر اُس کی طاعت میں لگائے اور اُن سے اُس کی نافرمانی پر مدد نہ لے - مثلاً آنکھوں سے ادائے شکر یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کا عیب دیکھے تو اُس کو چھپاوے ، اور کانوں کا شکر یہ ہے کہ اگر کسی بھائی کا عیب سنے ، اس کو افشا نہ کرے - اکابر سلف جو

آپس میں مزاج پرسی کرنے میں کہا کرتے تھے کہ خدا کا شکر ہے ، تو اُن کا مدعا اُس سے یہ ہوتا تھا کہ کسی طرح زبان سے شکر الٰہی نکلے ، کیوں کہ شکایت الٰہی یا اُس کے شکر سے سکوت کسی طرح روا نہیں ۔

خدا کی شکر گزاری اس قسم کی نہیں ہوتی جیسے اور ظاہری منعموں کی ، کیوں کہ اور منعم اپنے انعام سے کچھ نہ کچھ غرض رکھتے ہیں : مثلاً بادشاہوں کی غرض شکر گزاری سے یہ نکلتی ہے کہ اُن کی جگہ اور آدمیوں کے دلوں میں ہوتی ہے اور خلق میں اُن کا کرم مشہور ہوتا ہے ۔ اس شہرت سے آوازہ اور جاہ بڑھتا ہے ۔ دوم بجا آوریِ خدمت سے شکر کرتے ہیں تو اُس میں اُن کی بعض غرضوں پر اعانت ہو جاتی ہے ۔ غرض کہ شکر کے سبب کوئی نہ کوئی بات اس قسم کی منعم کے لیے ہوتی ہے ، مگر خدا تعالٰی کی ذات تو سب غرضوں اور مطلبوں سے پاک ہے ، اُس کو حاجت کسی خدمت اور اعانت کی نہیں ۔ ہم خدا کا شکر کسی طرح ادا نہیں کر سکتے ۔

از دست و زبان کہ برآید　　کز عہدۂ شکرش بدرآید

خدا کی نعمتیں بے شمار ہیں ، اُن کا شکر کیسے ہو سکتا ہے ۔ اب ہم نعمت کی تعریف لکھتے ہیں جس پر شکر واجب ہوتا ہے ۔

۴۳ ۔ نعمت جس پر شکر واجب ہے

ہر ایک چیز اور لذت و سعادت خواہ دنیاوی ہو یا اُخروی بلکہ ہر ایک مطلوب و موثر کا نام نعمت کہہ سکتے ہیں ۔

جتنے امور دنیا میں ہیں وہ چار حال سے خالی نہیں ہوتے : اول وہ جو دنیا و آخرت دونوں میں نافع ہوں ، جیسے علم و حسن خلق ۔ دوم وہ کہ دونوں میں مضر ہوں ، جیسے جہل و بدخلقی ۔ سوم وہ کہ دنیا میں مفید ہوں اور آخرت میں مضر ہوں جیسے اتباع شہوت

سے لذت پانا - چہارم وہ کہ دنیا میں مضر ہوں اور آخرت میں مفید ، جیسے شہوت کا استیصال اور نفس کی مخالفت - ان میں سے جو حال اور مآل میں[1] نافع ہیں ؛ وہ نعمت حقیقی ہے ، مثلاً علم اور حسن خلق - اور جو دونوں میں مضر ہیں[2] وہ اس کی ضد ہے اور مصیبت حقیقی ہے - اور جو حال کے نافع اور مآل کے مضر ہیں[3] وہ ارباب بصیرت اور ذکا کے نزدیک مصیبت ہے - مگر جہال اس کو نعمت گمان کرتے ہیں - اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بھوکا شخص شہد خالص پائے جس میں زہر ملا ہو ، تو وہ اگر زہر سے ناواقف ہوگا تو اس شہد کو نعمت جانے گا اور جب واقف ہو جائے گا تو جانے گا کہ یہ میرے حق میں بلا ہے - اور جو چیز حال میں مضر اور مآل میں مفید ہے وہ ارباب عقل کے نزدیک نعمت ہے اور جہال کے نزدیک بلا ہے - اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کڑوی دوا کہ حال میں اس کا ذائقہ برا ہے مگر انجام کو : کہ داروے تلخ است دفع مرض -

ناواقف لڑکے کو جب ایسی دوا پلائی جاتی ہے تو اس کو وبال جانتا ہے اور عاقل اس کو نعمت تصور کرتا ہے - اور جو شخص اس کو دوا پلاتا ہے یا اس کا سامان مہیا کرتا ہے اس کا ممنون و مشکور ہوتا ہے -

خدا تعالیٰ کی نعمتیں بہت مسلسل اور بے شمار ہیں - ہر ایک نعمت کا حال لکھنے کے لیے ایک کتاب چاہیے - نعمتوں میں سے ایک تندرستی بھی ہے ، اس کے اسباب میں سے ایک غذا ہے -

---

۱ - نسخۂ اول (صفحہ ۲۸۶) میں 'ہیں' ہے -
۲ - نسخۂ اول (صفحہ ۲۸۶) میں 'ہے' ہے -
۳ - نسخۂ اول (صفحہ ۲۸۶) میں 'ہے' ہے - مرتب

اس کا حال لکھنے کو ایک دفتر چاہیے ۔ ہر لذت ایک نعمت ہے جس میں سے کچھ ہم نیچے بیان کرتے ہیں ۔

۳۵ ۔ لذاتِ علم و حکمت و معرفت

لذتیں اس اعتبار سے کہ انسان سے مخصوص ہیں یا غیر میں بھی شریک ہیں ، تین طرح کی ہیں : اول عقلی ، دوم بدنی کہ بعض حیوانات کے ساتھ مشترک ہیں ، سوم بدنی کہ سب حیوانات اُن میں مشترک ہیں ۔

عقلی لذتوں کی مثال جیسے علم اور حکمت کی لذت کہ صرف قلب کو اس سے لذت ہوتی ہے ، حواس خمسہ اور اور اعضا کو اس سے بہرہ نہیں ۔ اس لذت کا وجود باوجودیکہ سب میں اشرف ہے، نہایت کم تر ہے ۔ اس کے کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ علم و حکمت کی لذت سوائے عالم و حکیم کے اور کوئی[1] نہیں پاتا ۔ اہل علم اور ارباب حکمت بہت ہی کم ہیں ، گو نام کو بہتیرے ہوں ۔ اکثر ان میں لذت علم سے قاصر ہیں ، ان کا قصور یا[2] تو اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان کو ذوق نہیں ۔ جس کو ذوق علم نہیں ، اس کو شوق علم نہیں ۔ شوق پر ذوق کو تقدیم ہے ۔ یا اس وجہ سے کہ لوگوں کے مزاج خراب ہوتے ہیں اور دل بہ باعث[3] اتباع شہوات کے روگی ہو جاتے ہیں ۔ تو جیسے بیمار کو شہد کا مزہ نہیں معلوم ہوتا اور اس کو کڑوا جانتا ہے ، ایسے ہی یہ لوگ علم کو اچھا نہیں سمجھتے ، یعنی ان کی طبیعت و دانائی میں

---

۱ ۔ اصل میں 'کوئی' کے بعد 'لذت' کا لفظ زائد تھا جسے حذف کر دیا گیا ۔

۲ ۔ اصل میں 'یا' کی بجائے 'کیا' تھا ۔

۳ ۔ اصل میں 'باعث' تھا ۔ مرتب

ابھی تک قصور ہے کہ ابھی تک وہ صفت جس سے کہ علم کی لذت معلوم ہوتی ہے ، ان میں پیدا نہیں ہوئی - جیسے شیرخوار لڑکا شہد اور پیڑوں کا مزہ نہیں جانتا ، اس کو سوائے دودھ اور کوئی چیز اچھی نہیں معلوم ہوتی ، سب چیزوں پر منہ بناتا ہے - اس کو اچھا نہ معلوم ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ چیزیں مزے دار نہیں اور نہ اس کے لذیذ جاننے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ لذیذ تر وہی ہیں -

غرض کہ جو لوگ لذت علم کے ادراک سے قاصر ہیں وہ تین طرح کے ہیں : ایک وہ کہ ابھی تک اُن کا باطن زندہ نہیں ہوا جیسے کہ لڑکے کا باطن ہوتا ہے - دوم وہ کہ اتباع شہوات کے باعث اُن کا دل مردہ ہو گیا ہے - سوم وہ کہ اتباع شہوات کے سبب دل مریض ہو رہا ہو -

دوسری لذت جس میں انسان بعض حیوانات کے شریک ہیں ، جیسے کہ ریاست و غلبہ کی لذت کہ شیر و چیتا اور بعض اور حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے -

تیسری لذت جس میں انسان اور[1] سب حیوانات شریک ہیں ، جیسے پیٹ وغیرہ کی لذت - یہ لذت سب لذتوں سے ادنٰی اور خسیس ہے مگر کثرت سے ہے ؛ اور اسی وجہ سے جتنے حیوانات زمین پر ہیں سب اس میں شریک ہیں - اس لذت کے توڑنے والے تو بہت سے صلحا موجود ہوتے ہیں ، مگر لذت ریاست کو دور کرنے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں - لذت ریاست ان لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے جو خدا کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں -

پس اس اعتبار سے دل کی چار قسمیں ہیں : ایک دل وہ جو

---

۱ - اصل میں 'اور' نہیں ہے - مرتب

سوائے خدا تعالیٰ کے کسی اور سے محبت نہیں کرتا ۔ دوسرا وہ دل کہ جس کو خبر ہی نہیں کہ لذت معرفتِ الٰہی کسے کہتے ہیں ۔ اس کی لذت صرف جاہ و ریاست اور مال اور تمامی شہوات بدنیہ سے ہے ۔ تیسرا وہ دل کہ اکثر تو خدا تعالیٰ سے مانوس رہتا ہے اور اس کی معرفت اور فکر سے لذت پاتا ہے مگر بعض اوقات اس کو اوصاف بشری پیش ہوجاتے ہیں جن کے سبب سے وہ لذت سے محروم ہوتا ہے ۔ چوتھا وہ دل کہ اکثر حالات میں تو اوصاف بشری سے لذت پاتا رہتا ہے ، الا کبھی کبھی علم اور معرفت سے بھی لذت پاتا ہے ۔ ان میں اول قسم کا دل تو غیر ممکن سا ہے ۔ بشر کی طاقت سے باہر ہے کہ اس صفت سے متصف ہو ۔ دوسری قسم کے دلوں سے دنیا پُر ہے ۔ تیسری اور چوتھی قسم کے دل بھی موجود ہیں مگر کم ہیں اور یہ ہمیشہ شاذ و نادر ہی رہیں گے ۔ پس اس صورت میں خدا کے[1] شکرگزار بہت کم ہیں ۔ اس کا حال آگے پڑھو ۔

۳۹ ۔ خلق شکر نہیں کرتی

خلق اپنی جہالت اور غفلت کے سبب سے شکر نہیں کرتی ۔ خدا تعالیٰ کی نعمتیں ایک عام ہیں ، دوسری خاص ۔ جو عام ہیں ان کو خلقت نعمت نہیں سمجھتی کہ اس کا شکر ادا کرے ۔ مثلاً آدمی اپنی جہالت کے باعث جو بات کہ سب لوگوں میں پائی جاتی ہے اور ہر حال میں ان کے پاس موجود ہے ، اس کو نعمت ہی نہیں جانتا ، اس لیے کوئی اس کا شکر گزار نہیں ہوتا ۔

ہوا ہے ، کوئی اس کا شکر ادا نہیں کرتا ۔ اگر ایک لحظہ گلا پکڑ لیا جائے کہ ہوا باہر کی اندر نہ جا سکے تو آدمی

---

۱ ۔ اصل میں 'کی' غلط ہے ۔ مرتب

مر جائے گا ۔ اگر کسی کنویں میں ، جس کی ہوا پانی کی تری سے بھاری ہوگئی ہو ، یا حمام میں جس کی ہوا گرم ہو ، آدمی بند کیا جائے تو گھٹ کر مر جائے گا ۔ ہاں اگر کوئی اس طرح بند کرکے پھر نکالا جائے تو البتہ ہوا کو بڑی نعمت سمجھے گا ۔ مثل مشہور ہے کہ :

قدر نعمت است بعد از زوال

یہ بڑی جہالت ہے کیوں کہ اس صورت میں شکر اس بات پر موقوف ہوا کہ نعمت ان سے چھن جائے اور پھر کسی وقت دی جائے ، جب اس کی قدر جان کر شکر گزاری کریں ۔ حالانکہ ہر وقت نعمت پر شکر گزاری لازم ہے ۔ رحمت الٰہی سب پر عام ہے اور ہر حال میں ہر ایک پر مبذول ہے ، تو اس کو جاہل آدمی نعمت نہیں جانتا ۔

غرض انسان کا یہ حال ہو رہا ہے کہ وہ اس نعمت پر شکر گزار ہوتا ہے جس میں کوئی اختصاص پایا جائے ؛ مثلاً مال مل جائے تو بہت شکر گزار ہوگا مگر بدن میں جو ہزاروں نعمتیں خدا نے پیدا کی ہیں ، ان کا شکر نہیں کرتا ۔

روایت ہے کہ بعض فقرا نے کسی اہل دل سے شکایت اپنی مفلسی کی کی اور اس کے باعث اپنا شدت سے غمگین رہنا بیان کیا ۔ حضرت اہل دل نے فرمایا کہ تمھیں یہ منظور ہے کہ اندھے ہو جاؤ اور دس ہزار درم لے لو ؟ انھوں نے انکار کیا ۔ ان حضرت نے فرمایا کہ دس ہزار درم لو ، گونگے ہو جاؤ ۔ انھوں نے انکار کیا ۔ پھر ان حضرت نے فرمایا کہ دس ہزار درم کی عوض تم کو لنجا لولا ہونا منظور ہے ؟ انھوں نے کہا کہ نہیں ۔ پھر ان حضرت نے کہا کہ دس ہزار درم کے عوض میں دیوانہ بننا منظور ہے ؟ انھوں نے کہا کہ نہیں ۔ پھر ان حضرت نے فرمایا کہ تم

کو اپنے آقا کی شکایت کرنے سے شرم نہیں آتی کہ باوجود کہ پچاس ہزار درم کی مالیت اُس نے تم کو دی ، پھر شکایت کرتے ہو ۔

غرض انسان کی طبیعتیں اسی طرف مائل ہیں کہ نعمتِ خاص ہی کو نعمت جانتے ہیں ، نہ عام کو ۔ لیکن اگر بشر اپنے حال پر غور کرے تو وہ اپنے میں ایک نعمت یا چند نعمتیں ایسی ضرور پائے گا جو اس کی ذات کے ساتھ مخصوص ہوں گی اور ان میں کوئی دوسرا شریک نہ ہوگا ۔

تین باتوں میں ہر کوئی اس کا مقر ہے :

اول عقل ، دوم خلق ، سوم علم ۔ عقل کے باب میں تو یہ مثل مشہور ہے کہ ''ہر کس عقل خود را بہ کمال نماید ۔'' کوئی خدا کا بندہ ایسا نہیں جو اپنی عقل سے خوش نہ ہو اور اپنے تئیں عقیل تر نہ سمجھتا ہو ۔ یہ عقل ہی کو شرف ہے کہ جو اس سے خالی ہے وہ بھی اس سے خوش ہے اور جو اس سے متصف ہے وہ بھی ۔ پس جب ہر کوئی اپنے اعتقاد کے موافق سب لوگوں سے زیادہ عقل رکھتا ہے تو واقعے میں اگر ایسا ہے تو اُس پر شکر اس نعمت کا واجب ۔

خُلق کا حال یہ ہے کہ کوئی بشر ایسا نہیں جو دوسرے شخص میں کچھ عیب نا پسند نہ کرتا ہو اور بعض اخلاق دوسروں کے برے نہ جانتا ہو ۔ دوسرے کی مذمت اس لیے کرتا ہے کہ اپنے تئیں ان اخلاق سے بری جانتا ہے ۔ جب اپنے میں دوسرے کی برائی نہ جانتا ہو تو چاہیے کہ خدا کا شکر بھیجے کہ میری عادت اچھی بنائی ہے اور بری عادت میں دوسروں کو مبتلا کیا ہے ۔

علم کا حال یہ ہے کہ کوئی بشر ایسا نہیں جو اپنے نفس کے

امور باطن اور افکار خفیہ ایسے نہ رکھتا ہو جو خاص اس میں ہوں۔ اور اگر ان پر ایک شخص بھی مطلع ہوجائے تو یہ فضیحت ہو جائے۔ اور اگر سب لوگ اس کی ان باتوں پر واقف ہو جائیں تو معلوم نہیں کہ کیا صورت بنے۔ غرض کہ ہر ایک بشر کو علم ایک امر خاص کا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی بندۂ خدا شریک نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں وہ شخص خدا تعالیٰ کی پردہ پوشی کا شکر گزار کیوں نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ نے اس کے عیوب پوشیدہ رکھے اور لوگوں کی نظر سے غائب رکھا، اور اچھی بات کو ظاہر کیا اور بری بات کا علم سوائے اس کے کسی اور کو نہ ہونے دیا۔ یہ نعمتیں خاص ایسی ہیں جن کا اقرار ہر ایک شخص کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ زن و مرد و جوان و پیر عالم ہوس میں کور چشم ہو کر مور و مگس بن رہے ہیں۔ قضائے الٰہی پر صابر ہو کر شاکر نہیں بنتے۔ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ خدا نے ہم کو اتنی نعمتیں دی ہیں کہ اگر ہمارا ہر بال زبان بن جائے اور وہ ہزار جان بن کر شکر ادا کرے تو بھی ادا نہ ہو۔

۳۷۔ خوف و رجا

اگر دل میں کسی چیز کے وجود کا خطرہ زمانۂ آئندہ میں ہو اور یہی خطرہ دل پر چھا گیا ہو تو اس کا نام انتظار اور توقع ہے۔ جس چیز کا انتظار ہے، اگر وہ بری ہو کہ اس سے دل پر صدمہ ہو تو اس کے انتظار کو خوف کہتے ہیں۔ غرض خوف درد دل اور سوزش درونی کا نام ہے جو زمانۂ آئندہ کے لیے بری توقع کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ اگر وہ شے محبوب ہو اور[۱] اس کے ساتھ لگاؤ رہنے سے اور اس کے سوچنے سے دل کو

۱۔ اصل میں 'اور' کی جگہ 'تو' تھا۔ مرتب

راحت اور لذت معلوم ہوتی ہو تو اس راحت حاصل کرنے کا نام رجا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ رجا کی تعریف یہ ہے کہ جو چیز دل کو محبوب ہو ، اس کے انتظار میں دل کا خوش ہوتا ۔ ظاہر ہے کہ جو چیز محبوب ہوگی اس کے توقع کرنے کا کوئی سبب بھی ہوگا ۔ پس اگر اس جہت سے اس کا متوقع ہے کہ اس کا اکثر سامان اپنے پاس موجود ہے تو ایسی توقع پر رجا کا کہنا درست ہے ۔ اگر اسباب بالکل نہ ہوں یا ابتر اور بے کینڈے ہوں تو اس صورت کی توقع کا نام غرور اور بے وقوفی رکھنا چاہیے۔ اس پر رجا کا نام نہیں پھبتا ۔

بہرحال رجا اور خوف ایسی اشیا پر بولتے ہیں جن کے ہونے میں تردد ہو۔ اور جن کا وجود یقینی ہو وہاں رجا نہیں بولتے ۔ مثلاً صبح میں آفتاب کے نکلنے کو رجا نہیں کہیں گے ، اور آفتاب کے شام کے غروب ہونے کو خوف نہیں کہیں گے کیوں کہ طلوع و غروب یقینی ہیں ۔ مگر یہ کہیں گے کہ مینہ برسنے کی رجا ہے اور خشکی کا خوف ہے ۔

اگر کسی کسان نے زمین اچھی تلاش کر لی اور اس میں بیج بھی اچھی قسم کا بویا ، گھاس اور کانٹوں سے بھی کھیت کو نلایا ، پانی بھی وقت پر دیا ۔ اور جو جو باتیں اس کے اختیار میں کھیت کی حفاظت کی تھیں وہ کیں ، اور پھر اللہ کے فضل کا متوقع ہوا کہ کھیتی کے تیار ہونے تک وہ ارضی و سماوی آفات سے محفوظ رکھ کر غلہ عنایت فرمائے گا تو اس کی توقع کو رجا کہتے ہیں ۔ اگر تخم کسی اونچی زمین میں ڈالا کہ جہاں پانی نہیں پہنچ سکتا اور بیج کی خبر نہ لی ، پھر منتظر کھیت کاٹنے کا ہوا تو اس کے انتظار کو رجا نہ کہیں گے بلکہ بے وقوفی اور حمق بولیں گے ۔ اگر تخم اچھی زمین میں بویا لیکن اس میں پانی نہ تھا

اور منتظر مینہ کا ایسے وقت میں رہا کہ جس میں اکثر پانی نہیں برستا ، تو ایسے انتظار کا نام بھی رجا نہیں ، اس کو تمنا کہتے ہیں ۔ انتظار بے سبب کا نام تمنا ہوتا ہے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ رجا صرف اس صورت میں ہوتی ہے کہ محبوب چیز کا انتظار ہو اور جتنے اسباب کہ بندے کے اختیار میں ہوں وہ سب ہو چکیں ۔ فقط وہی سبب باقی رہ جائے جو اس کے اختیار میں نہ ہو ، اور وہ فضل الٰہی کا شامل حال ہونا ہے ، جس کے سبب سے موانع[1] اور آفات دور رہیں ۔ اسی طرح اگر تخمِ ایمان مزرعۂ دل میں بووے اور اس کو طاعات کے پانی سے سینچے اور اخلاقِ بد کے کانٹوں سے زمینِ دل کو صاف کرے ، اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے منتظر ثبوت ایمان کا موت کے وقت تک اور متوقع حسن خاتمہ کا جو موجب مغفرت ہے ، رہے ، تو اس کا انتظار رجائے حقیقی اور بذات خود عمدہ کہلائےگا ۔ اور یہ رجا اس بات کی باعث ہوگی کہ جن اسباب ایمان سے لوازم مغفرت کامل ہوتے ہیں ان کی[2] مرتے دم تک مواظبت کرے ۔ اور اگر تخم ایمان کی تو خبر نہ لی اور طاعات کا پانی بھی نہ دیا ، یا دل کو اخلاق رذیلہ سے بھرا رکھا اور لذات دنیا کی طلب میں ڈوبا رہا اور پھر مغفرت کا منتظر ہوا تو یہ انتظار حُمق اور غرور ہے ۔ غرض بڑی غلطی ہے کہ گناہ سے نادم نہ ہو اور معافی کی توقع رکھے ۔ عمل نیک نہ کرے ، ثواب کی[3] آرزو رکھے ۔

ہر آنکہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت
دماغ بیہدہ پخت و خیال باطل بست

---

۱ ۔ اصل میں 'مواقع' ۔ معنی ہے ۔ 'موانع' تصحیح قیاسی ہے ۔
۲ ۔ اصل میں 'کے' ہے ۔
۳ ۔ اصل میں 'کی' نہیں ہے ۔ مرتب

خوف کی حالت بھی تین چیزوں سے مرکب ہے ؛ اول علم ، دوم حال ، سوم عمل ۔ علم سے وہ علم مقصود ہے جس سے ادراک اس سبب کا ہو جو برائی پہنچاوے ۔ مثلاً کسی شخص نے کسی بادشاہ کا قصور کیا اور پھر اس کے ہاتھ میں اسیر ہوا ، تو اس کو اپنے مارے جانے کا ڈر ہوگا ۔ ہر چند معاف ہو جانا اور بھاگ جانا بھی ممکن ہے ، الا اس کے دل کو خوف کا صدمہ اسی قدر ہوگا جس قدر قتل کے اسباب قوی ہوں گے ۔ اور وہ اسباب یہ ہیں کہ اپنے قصور کا بڑا ہونا ، بادشاہ کا بذات خاص کینہ ور اور غضب ناک اور انتقام کیش ہونا ، اور اس پر ایسے لوگوں کا محیط ہونا جو انتقام پر آمادہ کریں ؛ اور کسی سفارش کا اس کے باب میں وہاں نہ ہونا ، اور خود خائف کا تمام وسائل اور حسنات سے عاری ہونا جن سے اپنے قصور کا نشان صفحۂ خاطرِ بادشاہ سے مٹا سکے ۔ پس ان اسباب کا جمع ہونا اور ان کا علم مجرم کو ہونا سبب قوتِ خوف اور شدتِ صدمۂ دل کا ہے ۔ اور جتنے یہ اسباب ضعیف ہوں گے اتنا ہی خوف بھی کم ہوگا ۔ اور کبھی خوف ایک چیز کی خاصیت جاننے سے پیدا ہوتا ہے ۔ مثلاً کوئی شخص درندے کے پنجے میں گرفتار ہو تو اس کو درندے کا خوف اس جہت سے ہے کہ اس کو درندگی کا وصف معلوم ہے ۔ گو یہ وصف درندے کا اختیاری ہے ۔ کبھی خوف اس سبب سے ہوتا ہے کہ ڈر کی چیز سرشت میں داخل ہوتی ہے ۔ مثلاً آگ اور پانی کا خوف جن کی سرشت میں جلانا اور ڈبونا داخل ہے ۔

غرض برے اسباب کا علم اس بات کا سبب ہوتا ہے کہ اس سے سوزش دل اور درد درونی اٹھے ۔ اسی سوزش کا نام خوف ہے ۔ پس اسی طرح خدا کی صفات جاننے سے خوف الٰہی دل میں پیدا ہوتا ہے ۔ جتنا آدمی کو اپنے گناہوں کا اور خدا کی بزرگی کا علم

ہوگا ، اُتنا ہی خوف پیدا ہوگا - جب یہ علم ہوتا ہے تو خوف کی حالت طاری ہوتی ہے - کبھی بدن لاغر ہو جاتا ہے ، کبھی رنگ زرد ہو جاتا ہے ، کبھی بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے ، کبھی رونا چیخنا ، کبھی خوف کا صدمہ ایسا ہوتا ہے کہ پتّا پھٹ جاتا ہے اور آدمی مر جاتا ہے - ایسا خوف نہایت مفید ہوتا ہے اور طبیعت کو گناہوں سے روکتا ہے اور طاعات کے لیے مفید ہوتا ہے ، جس سے تلافیِ تقصیرِ گزشتہ اور استعدادِ آیندہ حاصل ہو - جو خائف یہ عمل نہیں کرتا اسے خائف نہیں کہتے - وہ خائف نہیں جو رو کر اپنی آنکھیں پونچھ ڈالے ، بلکہ خائف وہ ہے کہ جس چیز میں خوف سزا جانے اُس کو چھوڑ دے -

۳۸ - حکیم ابوالقاسم کا قول ہے کہ جو شخص کسی چیز سے ڈرتا ہے ، اُس سے دور بھاگتا ہے؛ مگر جو خدا سے ڈرتا ہے وہ اُسی کی طرف بھاگتا ہے -

ذوالنون مصری سے کسی نے پوچھا کہ بندہ خائف کیسا ہوتا ہے ؟ اُنھوں نے فرمایا کہ جیسا کہ کوئی اپنے تئیں مریض کی طرح بنا لے کہ زیادتیِ مرض کے خوف سے پرہیز کرتا ہے - خوف کے اثر سے صفات میں شہوات کی بیخ کنی ہو جاتی ہے - لذت مکدر معلوم ہوتی ہے ، یہاں تک کہ جو گناہ محبوب تھے وہ برے معلوم ہوتے ہیں - اعضا میں ادب آ جاتا ہے اور دل میں انکسار و تشویش و مسکنت آتی ہے - کبر ، حسد اور حقد دور ہو جاتی ہے بلکہ تمام ہمت اپنی خوف میں صرف کرتا ہے اور اپنے انجام کار کا خطر مد نظر رکھتا ہے -

۳۹ - ریا

ریا مشتق ''رؤیت'' سے ہے جس کے معنی دیکھنے کے ہیں - ریا کے اصلی معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو اچھی خصلتیں دکھا کر

اُن کے دلوں میں قدر و منزلت حاصل کرنی ۔ لیکن جاہ و منزلت کا دلوں میں حاصل ہونا سوائے عبادات کے اور اعمال سے بھی ہو سکتا ہے اور عبادات سے بھی ۔ لیکن بحکم عادت ریا خاص اسی صورت کا نام ہوگیا ہے جس میں دلوں کے اندر منزلت کی طلب عبادات کی جہت سے مقصود ہو ۔

پس ریا کی تعریف یہ ہوئی کہ خدا کی طاعت سے مخلوق کے دلوں میں اپنی قدر و منزلت کے پیدا کرنے کا ارادہ کرنا ۔ اب یہاں چار چیزیں ہیں : ایک ریا کرنے والا ، وہ تو عابد ہے ۔ ایک جس کے لیے ریا کیا جائے ، وہ آدمی ہیں کہ اُن کو دکھلانا منظور ہے اور اُن کے دلوں میں منزلت مطلوب ۔ اور ایک جس چیز کو دکھلانا منظور ہے ، وہ خصلتیں ہیں جو ریا کار ظاہر کرنا چاہتا ہے ۔ اور ایک خود ریا ہے ، یعنی اُن خصائل کے اظہار کا قصد ۔

جن چیزوں میں کہ ریا کو دخل ہے ، وہ پانچ قسم ہیں ، یعنی آدمی لوگوں میں نمود پانچ چیزوں میں کر سکتا ہے : بدن ، ہیئت ، قول ، عمل ، ساتھ کے لوگ اور اشیائے خارجی ۔ دنیا دار بھی انھیں پانچ قسموں میں نمود کرتے ہیں مگر اُن کا ریا خفیف ہے ۔ دین میں ریاکاری کے برابر کوئی برائی نہیں ۔

ریا کی دو قسمیں ہیں ؛ ایک جلی ، ایک خفی ۔ جلی وہ ہے کہ جو آدمی کو باعث عمل کا ہو ، گو قصد ثواب نہ ہو ۔ ریا کار خود جانتا ہے کہ میں نے ریا کیا ۔ ریائے خفی یہ ہے کہ اپنے عمل پر آدمیوں کے مطلع ہونے سے خوش ہو ۔ مثلاً بہت سے عابد ایسے ہیں کہ عمل میں اخلاص کرتے ہیں لیکن جب اس عمل پر لوگ مطلع ہوتے ہیں تو اُن کو سرور اور راحت معلوم ہوتی ہے اور دل پر سے عبادت کی محنت کا بوجھ اُتر جاتا ہے ، تو یہ

سرور ریاے خفی پر دلالت کرتا ہے ، اس لیے کہ اگر دل کا التفات لوگوں کی طرف نہ ہوتا تو اُن کے مطلع ہونے پر سرور ہرگز نہ آتا ۔ تو معلوم ہوا کہ جیسے آگ پتھر میں پوشیدہ رہتی ہے اسی طرح یہ ریا بھی دل میں پوشیدہ تھا کہ لوگوں کی اطلاع بہ منزلہ چقماق ہو گئی کہ اس میں سے فرحت و سرور کا اثر ظاہر کر دیا ۔ انسان کا ریا سے خالی ہونا بڑا دشوار ہے ۔ کچھ نہ کچھ اس کی عادت بچپنے سے پڑتی ہے اور[1] بڑی مشکل سے وہ دور ہو سکتا ہے ۔

ریا کی اصل تین چیزیں ہیں : اول تعریف کی لذت سے محبت ، دوم مذمت کے[2] رنج سے نفرت ، سوم طمع لوگوں کے قبضے کی ۔ عبادت کا اظہار ان چیزوں کے لیے تو معیوب ہے مگر ہاں اس نظر سے ہو کہ لوگ پیروی کریں تو برا نہیں ۔ آدمی کو چاہیے کہ ظاہر و باطن کو یکساں رکھے ۔ ایک ریا تو اپنی خوبیوں کے اظہار میں ہوتا ہے ، دوسرا ریا اپنے گناہوں کے چھپانے میں ہوتا ہے ۔ یوں تو ہر انسان اپنے دل اور اعضاے ظاہری سے گناہ کرکے چھپاتا ہے اور لوگوں کا اُن پر مطلع ہونا برا جانتا ہے ۔ یہ کچھ برا بھی نہیں کہ آدمی اپنے ہم جنس سے اپنے گناہ کو چھپائے ، کیونکہ جب آدمی سخت بے حیا ہو جاتا ہے تو اس کو اپنے گناہوں کے ظاہر ہونے کی پروا نہیں رہتی ۔ مگر ریا کار اپنے عیبوں کو اس لیے چھپاتا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ متقی اور پرہیزگار ہے ۔ وہ اپنے تقوے کی تعریف چاہتا ہے اور اس کا غم کرتا ہے کہ لوگ میرے متقی ہونے کی تعریف کیوں نہیں

---

۱ ۔ 'اور' اضافہ' مرتب ۔

۲ ۔ اصل میں 'کی' ہے ۔ مرتب

کرتے ، یہ امر نہایت مذموم ہے ۔

۴۰ ۔ جیسا ریا ہے ویسا ہی سمعت ہے ، یعنی بندہ اس سبب سے طاعت خداوند کرے کہ اس کا آوازہ لوگ سنیں اور تعریف کریں جس سے اس کو دنیاوی فائدے حاصل ہوں ۔ آدمی خوب سمجھ لے کہ آراستگیِ ظاہر کردار اور پاکیزگیِ جبہ و دستار روز شمار کو کچھ کام نہیں آئے گی ، جب تک کہ طاعت خالص نہ ہوگی ۔ جو لوگ انواع طاعات میں سعی بہت کرتے ہیں اور رات دن کوئی دقیقہ قیام و صیام میں نہیں چھوڑتے ہیں اور کیسۂ جان کو نقود طاعات سے پر کرتے ہیں اور اس کو متاع نجات جانتے ہیں ، ناگاہ طرار دنیا و دین سمعت و ریا کی کمند اُن کے اعمال کے گھر میں ڈال کر ان کی حیات کے نقود کو چرا کر لے جائے گا ۔

جو لوگ اعمال حسنہ سے تحصیل دنیا کی[1] غرض رکھتے ہیں اُن کا صلہ فقط یہی ہے کہ دنیاوی مرادیں اُن کی حاصل ہو جائیں اور اُن کے کاموں کا ثواب دنیا میں مل جائے ۔ خدا کی بندگی کا حال بیج کا سا ہے ۔ جب خاک کے اندر پنہاں ہوتا ہے تو اُگتا ہے اور جو خاک سے باہر ہوتا ہے وہ نہیں اُگتا ، یعنی جب بندگی مخفی ہوتی ہے وہ مثمر ثواب اور منتج رستگاری ہوتی ہے اور جو ظاہر ہوتی ہے وہ ضائع اور باطل ہوتی ہے ۔

۴۱ ۔ قلب و حفظ قلب

خانۂ دل کی کنجی ہزل میں نہیں ہے بلکہ جد و حقیقت میں ہے ۔ اگر دل باطل خیالات سے ناپاک ہو تو پھر اس سے کوئی کام نہیں نکلتا ۔ وہ دل کہ شراب و جامہ و خواب کے اسباب میں

---

[1] ۔ اصل میں 'کی' نہیں ہے ۔ مرتب

مصروف رہتا ہے ، وہ غافل و بد رگ ہے ۔ اور جس کا دل ایسا ہو اس میں ایک دیوانہ کتا بیٹھا ہے ۔ اس کی طبیعت و خو کتے[۱] کی سی ہے کہ استخوان اپنے آگے رکھتا ہے ۔ ایسے کتے کو بڑے عذاب دے کر مارنا چاہیے ۔ دل میں نور پیدا کرنا چاہیے کہ نار سے بچاؤ ہو اور خدا کے آگے خوار نہ ہو ۔ منزل دل میں زور تن کام نہیں آتا ۔ اس سے سوائے درد دل کچھ اور نہیں حاصل ہوتا ۔ باطن کا نام دل ہے ، وہ ظاہر سے باہر ہے ۔ جیسے دماغ میں مغز اور تخم کتاں اور فتیلے میں نور چراغ رہتا ہے ، اسی طرح دل میں دہن رہتا ہے ۔ جو دل نفس امارہ پر غالب ہوا ، وہ سرداروں کا سردار ہوا ۔ وہ دل دل ہی نہیں ہے کہ عقبیٰ کو تھوڑی دنیا کے لیے فروخت کرے اور حرص و آز میں گرفتار ہو ۔ دل آب و گل سے نہیں بنتا ۔ جس دل میں حرص و ہوس بھری ہو ، وہ علم ایزدی سے بے بہرہ ہے بلکہ ایک پارۂ گوشت گندہ ہے ۔ جب دل بد ہو جاتا ہے تو سلطنت بدن تباہ ہو جاتی ہے ۔ ضعیف بادشاہ سے لشکر ہمیشہ ضعیف ہو جاتا ہے ۔ انسان کا جسم ستم نہیں کرتا بلکہ دل کا کینہ ظالم کرتا ہے ۔ ایسا دل گرگ و سگ سے زیادہ سفلہ ہوتا ہے ۔ جیسا کتا طامع و گرگ درندہ ہوتا ہے ، ایسا سفلہ مکر و خوشامد کا بندہ ہوتا ہے ۔

۴۴ ۔ دل کو جھوٹی امیدوں سے الم میں نہ ڈال بلکہ ایسا تابع بنا جیسا کہ تیرے ہاتھ میں قلم ہے ۔ اگر اس کو راہ خدا میں نہ چلائے گا تو وہ زنگی کی طرح سیاہ ہو جائے گا ۔ جس کو مغز دل نہیں حاصل وہ دل میں دین نہیں رکھتا ۔ تو نے پارۂ گوشت کا نام دل رکھ چھوڑا ہے جس سے دل خجل ہوا جاتا ہے ۔ تو

---

۱ ۔ نسخۂ اول (صفحہ ۲۹۶) میں 'کھیتی' بے معنی ہے ۔ مرتب

دل ہے غافل و بے خبر ہے - دل اور ہے ، تو اور ہو رہا ہے -
دل کے پر و بال خرد سے ہوتے ہیں - تن بے دل کے مٹی کا بورا
ہے - جب درخت خرما کا دل کاٹ ڈالو تو وہ خشک و بے بر ، گل
میں کھڑا رہتا ہے - ایسے ہی انسان کے دل کی حقیقت ہے کہ
وہ ہی انسان کا باطن ہے - وہ باطل ہو جائے تو پھر کچھ باقی
نہیں رہتا -

دل میں دین اور دماغ میں عقل ہوتی ہے - دین روز ہے ، عقل
چراغ ہے ؛ روز کے لیے تو آفتاب انجم سوز چاہیے ، وہ چراغ سے
روشن نہیں ہو سکتا - دل منظر ربانی ہوتا ہے ، یہ حجرۂ دیواری
نہیں ہوتا - جو دل اس جہان کے ساتھ خوش بن رہا ہے وہ دل نہیں
ہے بلکہ پارۂ پوست ہے - جاہلوں نے شکل صنوبری کا نام دل
رکھ چھوڑا ہے - اس کا نام دل مجازاً ہے ، اس کو کتوں کے آگے
ڈال دے - دل وہ ہے جس کو عقل پر بھی مہتری ہے ، نہ اس
کی شکل صنوبری ہے -

۴۳ - دل ہمت[1] پیہم سے قوی نہیں ہوتا بلکہ تسلیم کی
معجون مفرح سے قوی ہوتا ہے - اولیا یہی معجون مفرح شفاخانۂ
رضا میں بناتے ہیں - یہاں دنیا میں آدمی مٹی کھاتے ہیں جس سے
زرد روئی حاصل ہوتی ہے ، سرخ روئی نہیں ہوتی - اس دنیا کے
نان و جامۂ سپید سے سیاہی دل زیادہ ہوتی ہے - جامۂ نرم سے
تیرا دل سخت ہونا ہے - خورشِ خوش تیری شرم کھوتی ہے -
پوست کی خوبی پر مغرور نہ ہو ، بہت سے دلق پوش تجھ سے زیادہ
خوش ہیں - خوش خوئی کچھ کلاہ و دیبا پر موقوف نہیں ہے -
جس دل میں غم کا گھر ہے ، وہ دل نہیں خانۂ خون ہے - جس

---

۱ - اصل میں ' ہمت' غلط ہے - مرتب

احمق کا دل حرص زیادہ کرتا ہے ، وہ زیادہ ڈھونڈتا ہے اور کم پاتا ہے ۔ تجھ کو اپنے دل کی تقویت خدا کی راہ سے کرنی چاہیے ۔

۴۴ ۔ طہارت

طہارت کے معنی ستھرائی کے ہیں ۔ اب ستھرائی دو طرح کی ہے ؛ ایک یہ کہ ظاہر بدن کو نجاست و فضلوں و غلاظت سے پانی بہا کر صاف و شستہ کریں جس سے ظاہری ستھرائی ہو جائے ۔ اس ستھرائی سے یہ فائدے ہیں کہ صورت پاکیزہ ہو جاتی ہے اور وہ صحت کی بھی معاون ہوتی ہے ۔

دوسری ستھرائی یہ ہے کہ باطن کو طاہر کرے پلیدیوں اور نجاستوں سے ، یعنی اخلاق بد اور خصائل ناپسندیدہ سے باطن بھر رہا ہے ، اسے پاک کرے ۔ جب تک دل اخلاق بد اور عقائد فاسد سے بھرا رہے گا ، پاک نہ ہوگا ، اس میں اخلاق حمیدہ کو جگہ نہیں ملے گی ۔ اس لیے ہر مذہب میں طہارت باطنی عبادت کے لیے ایک امر اہم قرار پایا ہے ، اور ظاہری طہارت کو باطنی طہارت کی تمہید بنایا ہے ۔ اس ظاہری طہارت کو عبادت سمجھنا ، جیسا کہ عوام سمجھتے ہیں ، غلط ہے ۔ وہ طہارت کا ادنیٰ درجہ ہے ۔ اوپر کے درجے کو آدمی جب تک نہیں پہنچتا جب تک کہ ادنیٰ درجے کو نہ پہنچے ۔ جو شخص ہاتھ منہ کی میل کچیل کو دھو کر صاف نہیں رکھ سکتا ، وہ کیسے باطن کو اخلاق ذمیمہ سے پاک کرکے صفات محمودہ سے معمور کرے گا ۔ یہ ظاہری اعضا کی طہارت باطن کی طہارت کے سکھانے کی ابتدا ہے ۔ جو کوئی اس ابتدا ہی میں رہ گیا وہ انتہا پر نہیں پہنچا ۔ جس قدر مقصود عزیز و شریف ہوتا ہے اسی قدر اس کا طریق اور مسلک مشکل اور طویل ہوتا ہے اور اس میں گھاٹیاں بہت ہوتی ہیں ۔ یہ خیال کرنا نہیں چاہیے کہ یہ باتیں آرزو سے حاصل ہو جاتی ہیں اور بدون کوشش

سہل الوصول ہوتی ہیں ۔ ہاں جس شخص کی چشم دل اندھی ہوتی ہے ، وہ طہارت صرف ظاہر کی طہارت کو سمجھتا ہے ، جس کو طہارت باطنی سے وہ نسبت ہے جو پوست کو مغز سے ۔

غرض آدمی کو چاہیے کہ اپنی تمام ہمت اور فکر دل کے پاک کرنے میں مشغول کرے اور ظاہری طہارت بقدر حاجت کرے ۔ زائد از حاجت سے کچھ فائدہ نہیں ۔ بلکہ جوہر نفیس اپنی عمر کا ، جس سے اور عمدہ فوائد لے سکتے ہیں ، رائگاں کرتا ہے ۔

نجاست ظاہری کے دور کرنے میں تین باتیں ہوتی ہیں : ایک جس چیز کو دور کریں اور ایک جس چیز سے دور کریں اور ایک جس طریق سے دور کریں ۔ اس پر تو ساری دنیا کا اتفاق ہے کہ پانی سے نجاست کو دور کرتے ہیں مگر اس میں اختلاف ہے کہ کون کون سی چیزیں نجس ہیں جنسے پاک کرتے ہیں ، اور کن طریقوں سے وہ دور ہو سکتی ہیں ۔

۳۵ ۔ تقلید

تقلید میں اپنے حال سے بے خبری اور اوروں کے حال پر توجہ کرنی ہوتی ہے ۔ دل پر اوروں کے پرتو پڑنے سے تقلید پیدا ہوتی ہے ۔ جب وہ پرتو پیاپے پڑتا ہے تو مقلد اس کو تحقیق جانتا ہے ۔ جب دل پر نقش تقلید جم جاتا ہے تو ہر نیکی پر آفت آ جاتی ہے ۔ تقلید خواہ کوہ کی طرح قوی ہو ، تو بھی کاہ کی طرح بے حقیقت ہے ۔ اندھا خواہ کیسا ہی فربہ اور تیز خشم ہو مگر بغیر آنکھوں کے وہ گوشت کا لوتھڑا ہی ہوتا ہے ۔ یہی حال عقلا کا ہے کہ خواہ بال سے زیادہ باریک باتیں وہ کہیے مگر اس کے دماغ کو ان سے خبر نہیں ہوتی ۔ مگر ہاں وہ اپنی باتوں سے آپ ہی مست ہوتا ہے ۔ اس کا حال ندی کا سا ہوتا ہے کہ خود تو پانی نہیں پیتی مگر اوروں کو پلاتی ہے ۔ اس میں جو

پانی جاری رہتا ہے اور قرار نہیں پکڑتا تو اس کا سبب یہی ہے
کہ وہ پیاسی اور آپ خور نہیں ہے۔ نے کی طرح وہ نالۂ زار کرتا
ہے مگر سب بے کار۔

مقلد و محقق میں بڑا فرق ہے؛ ایک لحن داؤدی ہے، دوسری
صدا ہے۔ مقلد کینہ آموزی کرتا ہے، محقق کی گفتار دل میں
سوز پیدا کرتی ہے۔ مقلد کا حال ایسا ہے جیسے کہ بیل یا
چھکڑے پر بوجھ کا۔ مقلد کو بھی اپنی نوحہ گری کی مزد مل جاتی
ہے۔ وہ حدیث پر نوحہ گر ہوتا ہے مگر سوائے طمع کے اس
خبیث کی کچھ اور غرض نہیں ہوتی۔ مومن و کافر خدا کہتے ہیں
مگر ان میں فرق بہت ہوتا ہے۔ گدا جو خدا خدا کرتا ہے،
صرف نان کے لیے ہے۔ متقی جو خدا کہتا ہے وہ جان کے واسطے۔
یہ نان خواہ برسوں خدا خدا کرتا ہے، جیسا گدھا گھاس کے لیے
مصحف کا بوجھ اٹھاتا ہے۔

ایک حکایت تہدید کے لیے لکھتے ہیں جس سے تقلید کی آفت
معلوم ہو:

ایک صوفی خانقاہ میں آترا؛ اس نے اپنے گدھے کو خوب دانہ
گھاس کھلا کے احتیاط سے باندھ دیا۔ وہاں خانقاہ میں ایک صوفیوں
کا گروہ اور آترا ہوا تھا۔ انھوں نے اس گدھے کو لے جا کر
بیچ ڈالا اور اس کی قیمت سے کھانا خرید کے لائے اور شمع روشن کی
اور مجلس سماع خوب جائی۔ پھر اس صوفی کو بلایا؛ کوئی اس کے
پاؤں پر گرتا تھا، کوئی ہاتھ چومتا تھا، کوئی اس کے چہرے پر سے
گرد جھاڑتا تھا، کوئی اس کو صدر مقام پر بٹھاتا تھا۔ پھر سب نے
کھانا کھایا۔ پھر سماع شروع ہوا۔ مطرب نے آخر میں یہ گانا
شروع کیا ''خربرفت و خربرفت و خربرفت'' تقلید کرکے اس
صوفی نے بھی یہ کہنا شروع کیا کہ ''خربرفت و خربرفت و

خربرفت ۔" پس جب مجلس ختم ہوئی ، خانقاہ خالی ہوئی ، صوفی اپنا اسباب حجرے سے نکال کر آمادۂ سفر ہوا ۔ آخر خر کے پاس گیا تو وہاں اُس کو نہ پایا ۔ آدمی کو تلاش کیا تو لوگوں نے کہا کہ وہ گدھے کو پانی پلانے گیا ہے ، کل گدھے نے کم پانی پیا تھا ۔ جب نوکر آیا تو صوفی نے پوچھا کہ گدھا کہاں ہے ؟ اُس نے کہا کہ میں کیا جانوں ۔ غرض لڑائی شروع ہوئی ۔ صوفی نے کہا کہ گدھا میں نے تیرے سپرد کیا تھا ، جو چیز میں نے تجھ کو دی تھی وہ میں تجھ سے لوں گا ، نہیں قاضی پاس پکڑ لے جاؤں گا۔ اُس نے کہا کہ صوفیوں نے مجھ پر حملہ کیا ۔ وہ قوی تھے ، مجھے جان کا خوف ہوا کہ صوفی مجھ سے زبردستی چھین کر لے گئے ۔ صوفی نے کہا کہ مجھے تم نے اُس کی خبر کیوں نہیں کی ۔ میں اپنا گدھا اُس سے واپس لیتا جو لے گیا تھا ۔ اب سب چلے گئے تو یہ کہتا ہے ۔ پہلے تو علاج تھے ، اب کوئی نہیں ۔ معلوم نہیں لوگ کدھر گئے ۔ اُس نوکر نے کہا کہ واللہ میں بار بار اس بات کے کہنے کے لیے آیا مگر آپ کی زبان سے جب سنا تو یہ سنا کہ "خربرفت و خربرفت" تو میں اُلٹا یہ جان کر چلا گیا کہ آپ کو معلوم ہے ۔ تو صوفی نے کہا کہ وہ سب ان الفاظ کو خوب طرح سے کہتے تھے ، مجھے بھی اس میں لذت آئی ، میں بھی تقلیداً کہنے لگا ۔ ایسی تقلید پر دو سو لعنت ہے ۔

۴۶ ۔ انسان کی سیرت ستودہ

جس انسان کی نیک سیرت نہیں وہ انسان نہیں ۔ جس کا مزاج سر تا پا زور ہے ، وہ آدمیت سے دور ہے ۔ آدمی کا نیک رو ہونا نیکی نہیں ہے بلکہ خوبے نیکو اُس کی نکوئی ہے ۔ جس آدمی کا باطن تیرہ اور ظاہر اچھا ہو ، وہ ایسا ہے جیسا کہ دیبا کا استر کنبل (پر) ہو۔ جیسے کہ زنگی کا روئے سیاہ ، کوڑھی کے روئے سفید

سے اچھا ہوتا ہے ، ایسا ہی وہ شخص اچھا ہوتا ہے جو ظاہر میں عیب رکھتا ہے اور باطن میں خوے نکو۔

بعض آدمی شراب کی طرح تلخ ہوتے ہیں مگر اُن میں صفائی اپنا منہ دکھاتی ہے۔ بعض آدمی بد خو نیک رو ہوتے ہیں ؛ اُن کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے کہ بد خط کلکِ منقش سے لکھا ہو۔ نیک خوئی سے ہلیلہ باوجود سخت و ترش ہونے کے روشنیِ چشم کا باعث ہوتی ہے۔ بد خو میں خشم و جفا جو خانہ خیز ہوتے ہیں ، کرم و لطف کا نام نہیں ہوتا۔ اس کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے کہ پرانی قبر کا کہ اُس کے دیکھنے سے آدمی کا دل گھبراتا ہے اور اُس پر جو پھول چڑھاتا ہے تو اُس سے کانٹا پیدا ہوتا ہے۔

جو بزرگ بزرگی رکھتے ہیں وہ چھوٹوں کی گرمی کو یخ پر رکھتے ہیں۔ اُن کا حال دریا کا سا ہوتا ہے کہ اُس کے سینے پر غبار نہیں ہوتا ، خواہ باران اس پر کیسی ہی سنگ باری[1] کرے۔ وہ سمندر کی سی صفائی رکھتے ہیں ، کوئی غلاظت اُن کو ناپاک نہیں کر سکتی۔ خوے نیک سے خدا کا نور چمکتا ہے۔ وہ بالوں کی طرح اپنی خوشبو سے سپید ہوتی ہے۔

کمینوں کا بزرگوں کو آزار پہنچانا ایسا ہے جیسے کہ بھیڑ کا بھیڑیے کی دم کا پکڑنا یا خس و خاشاک پر شمع و چراغ کا رکھنا۔ کمینے دفعتہً دولت پانے سے بزرگ نہیں ہو جاتے بلکہ ان کا حال اُس شعلے کا سا ہوتا ہے کہ دفعتہً اٹھتا ہے اور جلد بجھ جاتا ہے۔ یا چیونٹیوں کا سا ہوتا ہے کہ پر نکلتے ہی عدم کی طرف پرواز کرتی ہیں۔ جو کج طبع ہیں ، اُن کا حال دائرے کا سہ ہے کہ وہ بغیر کج روشی کے رہ نہیں سکتی۔ جس کی خلقت میں

۱۔ اصل میں 'سنگ ساری' ہے۔ مرتب

سیہ روئی ہو وہ ابٹنے اور غازے سے سرخ نہیں ہوسکتا ۔

زنگی کا چہرہ جو سیاہ ہوتا ہے ، وہ کیا شنگرف سے سرخ ہو سکتا ہے ؟ سانپ خواہ کنگرے پر ہو یا چاہ میں ، وہی اُس کی صورت رسی کی سی ہے ۔ اسی طرح کج خُلق خواہ کسی حال میں ہو ، بدکاری سے باز نہیں رہتا ۔ شیر جو شکار کی آفت جان ہے ، اُس کے دست و پا تیغ و خنجر ہیں ۔ ایسے بدکار کے دست و پا لوگوں کے لیے ایک آفت ہیں ۔ پس جب بدی دل کے اندر بیٹھ جاتی ہے تو وہ بدی ہی خود خیال میں نیک نظر آتی ہے ۔ جو گرگ کہ میش کا خون پیتا ہے ، وہ میش کے دل کے رنج کو نہیں جانتا ۔ نقب زن اپنی کاوش پر فخر کرتا ہے ، جواری اپنے داؤ[1] پر ۔ جیسے کہ بوم سایۂ مبارک نہیں رکھتا ، ایسے ہی شوم پیشۂ مبارک نہیں کرتا ۔ بد خو سیرت زیبا رکھ ہی نہیں سکتا ، ملک الموت مسیحا بن ہی نہیں سکتا ، سیہ رو کبھی سرخ رو ہو ہی نہیں سکتا ، مگر ہاں اُس کا پوست اُتارا جائے تو وہ سرخ ہو جائے ۔

جو ہنرور ہوتے ہیں وہ اپنے مقدور کے موافق دوسرے کا کام کرتے ہیں ۔ استاد ، پیر تپ زدوں کی نبض ہاتھ میں لے کر دست گیری کرتے ہیں ۔ اس دنیا میں تُو اوروں کے لیے نفع ڈھونڈ ۔ اگر تیرا نفس منع کرے تو اُس کو منع کر ۔ ہر تن میں خلق نیک کچھ ضرور ہوتا ہے لیکن نفس سر کش اس کا رہ زن ہوتا ہے ۔ اگر صندل کے درخت کو سانپ نہ گھیرتا تو وہ ہر جگہ پہنچتا ۔ اسی طرح انسان اپنی[2] خوش خلقی سے فائدہ پہنچاتا اگر

---

۱ ۔ اصل میں 'دانو' ہے ۔ موجودہ املا 'داؤ' ہے اور اسی کو ترجیح دی گئی ۔

۲ ۔ اصل میں 'اپنے' غلط ہے ۔ مرتب

اس کا نفس امارہ نہ بھکاتا ـ سیر ہونے سے کتے کا جوش جاتا رہتا ہے مگر مرد آسودہ اور فتنہ کوش ہو جاتا ہے - زر کا محک پتھر ہے اور آدمی کا محک زر ہے - جو مکرم ہیں وہ زمانے کی آفت خود اٹھاتے ہیں مگر آوروں کو منفعت پہنچاتے ہیں - ان کا حال موتی کا سا ہوتا ہے کہ کٹنے پسنے پر بھی وہ بے کار نہیں ہوتا ، سرمۂ چشم بنتا ہے - ناکس اگر باغ میں بھی ہو تو اس کا مال مردار بن کر دماغ کو پراگندہ کرتا ہے - جن آدمیوں میں ہنر سیکڑوں ہوا کرتے ہیں ، اگر ان کو سرزنش کرو تو وہ شرمندہ ہوتے ہیں - مگر جو حرام زدگی سے موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں ، وہ کبھی شرم و حیا کے پاس نہیں آتے ؛ مسخرے بنتے ہیں اور دھپے کھاتے ہیں - اس سے وہ کبھی بلند مرتبہ نہیں ہو سکتے - سگ کوے نشین ہونے سے شیر نہیں بن سکتا - جیسے چھانی سیکڑوں چھیدوں کے ہونے سے بے کار نہیں ہوتی اور لگن ایک چھید کے ہونے سے بے کار ہو جاتا ہے ، ایسے ہی بدکار اپنے تئیں بے کار سیکڑوں عیبوں سے نہیں جانتے اور نیکوکار اپنے میں ایک عیب کو دیکھتے ہیں تو اپنے تئیں بےکار جانتے ہیں - اگر ہنرور کو بے ہنروں سے پالا پڑتا ہے تو حسرت و افسوس نہیں کھاتا ہے کیوں کہ وہ کھانے کی چیزیں نہیں ؛ ان کے کھانے سے اور زیادہ گرسنگی ہوتی ہے - نیک آدمی حاسد کی سزا کے درپے نہیں ہوتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ حسد ہی اس کی سزا ہے -

۴۷ - نصیحت فرزند

اے فرزند ! تو ابتدائے عمر میں ہنر کو سیکھ ، وہ تجھے گنج و زر ہی نہیں دے گا بلکہ تیرے دل و جان سے رنج لے جائے گا - یہ خوب جان لو کہ سب کے نصیب میں ہنر نہیں ہوتا بلکہ وہ خاص زندہ دلوں کا حصہ ہے - جب ہنر آموزی شروع کرے

تو سب سے پہلے ادب سیکھ ۔ اول قرآن شریف کسی ایسے استاد سے پڑھ کہ وہ ادیب بھی ہو ، قرأت میں کامل ہو ، الفاظ میں وہ حسن ادا رکھتا ہو جس سے دل کو راحت ہو ۔ قرآن شریف میں سے جو کچھ ہو سکے یاد کر ۔ پھر تحصیل علوم کی طرف متوجہ ہو ۔ ہر فن میں سے کچھ مختصر یاد کر ، ہر گلشن کے پھولوں کی خوشبو سونگھ ۔ جو سبق پیش نظر ہو ، جب تک وہ سمجھ میں نہ آئے ، نظر سے دور نہ ہو ۔ علم کے ہزاروں طریقے ہیں ۔ کسی کے اندر حد سے پرے نہیں جانا چاہیے ۔

عمر تھوڑی ہے ، فضل اور ادب بہت ہیں ۔ ان میں سے جس کی تجھے ضرورت ہو وہ سیکھ ۔ جہان کی کدورتوں سے آزاد ہو کر استاد عاقل کے دروازے کے سوا کہیں اور قدم نہ رکھ ۔ اسی کی باتوں سے تجھے ادراک ہوگا ، تیرا خاق اسی کی صحبت سے پاک ہوگا ۔ اگر استاد سفیہ ہوگا تو اس سے طبع تیری خوے تباہ پیدا کرے گی ۔ تجھے خط سے بھی حظ اٹھانا چاہیے ۔ جو خط کہ حسن سے خالی ہے ، وہ کاغذ کی روسیاہی ہے ، خط نہیں ہے ۔ ایسا لکھو کہ لکھنے والے سے زیادہ آسانی سے پڑھنے والا اسے پڑھے ۔ قلم بھی انسان کے ہاتھ میں رزق کی عجیب کنجی ہے مگر قلم کی طرح تم خط میں ایسے مصروف نہ ہو کہ سوائے خط کے کوئی اور ہنر تم میں نہ ہو ۔

شعر و سخن میں اگر زبان خاموش رکھو تو بہتر ہے ۔ اگر وہ بحر بھی ہو تو اس سے لب تر نہ کرو ، اگر وہ کان بھی ہو تو اس سے گوہر نہ طلب کرو ۔ وہ تمھارے ہر ہنر کا کیسہ خالی کر دیں گے ۔ جوانی میں ہم دردی سیکھو اور مردمی اور جواں مردی میں کوشش کرو ۔ آدمی کا کام بہ جز بار کشی کے نہیں ہے ۔ اس میں کوئی منزل پیری پر پہنچتا ہے ۔ جب اس منزل

میں آؤ تو درویشوں کی خدمت میں دوڑنا چاہیے ۔ کحل بینش ان سے تلاش کرنا چاہیے ، صحبت ناخوش سے پرہیز چاہیے ، بری صحبت سے تنہائی بہتر ہے ۔ خود ہی سامع اور سائل اپنا بن ۔ خدا سے ہر حال میں ڈرتا رہ ؛ واعظ و ناصح سے ایسی باتیں سیکھ کہ جو راہ خدا میں تیرے قدموں میں قوت دیں اور کاہلی و غفلت تیری جبلت سے دور ہو ۔ نکات حکمت تجھے معلوم ہوں ۔

۳۸ ۔ ادب

ادب کے معنی ہر ریاضت محمودہ کے اور ہر کوشش و سعی کے ہیں جس سے کسب فضیلت ہو ۔ ہر چیز کی حد کی نگہداشت کو اور ہر فعل محمود کی تعظیم کو بھی ادب کہتے ہیں ۔ تو اپنے نفس کو وہ ادب سکھا کہ بے ادب اُسے دیکھ کر با ادب ہو جائیں ۔ جو ادب سکھانے کا ذوق رکھتا ہے ، وہ بے ادبوں کو اپنا ہی سا بنا لیتا ہے ۔ جیسے آہوے وحشی جو گھر میں دانہ کھاتا ہے وہ اَور آہوؤں کو پکڑ لاتا ہے ۔ جو اپنے اخلاق کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے ، اُس کا فکر استاد ہو جاتا ہے ۔ بزرگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے ۔ تو لالہ و گل کی طرح تھوڑا سا خندہ کر کہ سب کو مطبوع ہو ، نہ یہ کہ ایسے قہقہے لگائے کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں ۔ بے خرد جس کو مزاح کہتے ہیں وہ خردمندوں کے نزدیک نبرد و سلاح ہے ۔

اگر تمھاری ڈاڑھی کووں کے پروں کی طرح سیاہ ہو تو بڈھوں کی موچھوں کی ہنسی نہ اڑاؤ ۔ اگر تم سمن عارض اور گل عُذار ہو تو زنگی کے سامنے آئینہ رکھ کر نہ چھیڑو کیوں کہ کوئی زشت دنیا میں بے مصلحت نہیں ہوتا ۔

ایک چینی جس کا رنگ سرخ و سفید تھا ، ایک زنگی پر ہنسا تو زنگی نے جواب دیا کہ میرا ایک قطرہ تیرے چہرے

کے لیے زیب ہے اور تیرا ایک لفظ میرے لیے ایک عیب ہے۔ تجھے چاہیے کہ جو تیرا عیب بیں ہو تو اس کا ہنر دیکھ ، جو تجھے زہر دے اس کو نبات دے ، جو تجھے مارے آبِ حیات پلا ، تاکہ تیری عقل سلامت پسند ہو اور تیرے نام کا خطبہ اخلاق میں بآواز بلند پڑھا جائے۔ خدا سے توفیقِ ادب کی دعا مانگ ، بغیر ادب کے لطف رب سے آدمی محروم رہتا ہے۔ بے ادب اپنے ہی لیے برا نہیں ہوتا بلکہ اوروں کے لیے بھی۔ ادب انسان کو معصوم بناتا ہے ،گستاخی اور بے باکی غموں کا ہجوم لاتی ہیں۔

۴۹ ۔ آدابِ طعام

انسان کے لیے بدن کی سلامتی ضرور چاہیے اور بدن کی سلامتی غذا پر موقوف ہے کہ بھوک کے وقت بہ قدر حاجت کھانا مل جائے۔ کھانے ہی سے آدمی سب کام دنیا و دین کے کر سکتا ہے۔ اسی سے اس کی عقل ٹھکانے سے رہتی ہے۔

اب اس کھانے کی چار صورتیں ہیں :

اول آدمی تنہا کھائے ، دوم اپنے اہل و عیال کے ساتھ ، سوم ملنے والے دوست آشناؤں کے ساتھ ، چہارم تقریبوں کی دعوت میں۔

سب صورتوں میں مقدم بات یہ ہے کہ حلال کمائی سے کھانا پیدا کیا ہو۔ اب کھانے کے مختلف طریقے ہیں ؛ کوئی دسترخوان پر بیٹھ کر ہاتھ سے کھاتا ہے ، کوئی میز پر بیٹھ کر کانٹے چھری سے کھاتا ہے۔ کوئی کھانے کا طریقہ قابلِ اعتراض نہیں ، وہ سب رسم و رواج پر موقوف ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ جو روکھی سوکھی بری بھلی غذا خدا دے اسے خوشی سے کھائے ، ناک بھوں نہ چڑھائے ، اس کی مذمت نہ کرے۔ اچھے کھانے والے کے معنی یہی ہیں کہ وہ سب چیزوں کو خوشی سے کھائے۔

آدمی کو اس میں کوشش کرنی چاہیے کہ میرے دسترخوان پر بہت سے ہاتھ ہوں ؛ یعنی سب بیوی، بال بچے ساتھ کھائیں ۔ جب کھانا سامنے آئے تو جو شخص کہ بڑی عمر یا کسی کثرتِ فضیلت کے سبب تقدیم کا مستحق ہو ، پہلے بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرے ۔ کھانے میں عمدہ عمدہ لطائف اور ظرائف کی باتیں ہوتی جائیں ۔ کھانے میں دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دینی چاہیے ۔ مزے دار کھانے کو یہ نہ چاہیے کہ میں ہی کھا جاؤں بلکہ یہ چاہیے کہ اوروں کو کھلاؤں ۔ یہ اصرار نہ کرے کہ دوسرے کو قسمیں دے دے کر کھلائے ۔ جب مجمع کا کھانا ہو تو وہاں کوئی حرکت ایسی نہیں کرنی چاہیے جو دوسرے کو ناگوار ہو ۔ مثلاً تھوکنا یا انگلیوں کو چاٹنا ۔ جب تک آدمی کسی کے ساتھ کھانے کو نہ بیٹھے ، کہ اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ مجھے خوشی سے کھلاتا ہے ۔ کسی کے ہاں اس کے کھانے کا وقت تاک کر جانا ندیدہ پن ہے ۔

دستور کی بات ہے کہ کھانے کی صلاء آدمی دوسروں کو کرتا ہے مگر اس سے غرض یہ نہیں ہوتی کہ لوگ اس کے ساتھ کھانے لگیں ۔ جو لوگ اس صلاء پر جا بیٹھتے[1] ہیں تو صلاء کرنے والے کو ان کا کھانا ناگوار ہوتا ہے ۔ دعوت میں تکلف نہ کرے ۔ یہ بڑی حماقت ہے کہ لوگ قرض لے لے کر بڑی بڑی ضیافتیں کرتے ہیں ، ناحق تکلف کے تردد میں اپنے تئیں ڈالتے ہیں ۔ جب دوستوں کی دعوت میں تکلف ہوتا ہے تو ملاپ کم ہو جاتا ہے ۔ دوستوں کے سامنے جو ماحضر ہو وہ رکھ دے ۔ ان کے

---

۱ ۔ اصل میں 'جا بیٹھتے' کی جگہ 'چاہیے' غلط ہے ۔ صحت نامہ کے مطابق تصحیح کی گئی ۔ مرتب

واسطے وہ چیز جو پاس نہ ہو ، منگانی نہ چاہیے ۔ مہمان کو چاہیے کہ وہ میزبان پر کھانے کی فرمائش نہ کرے کیوں کہ اُس کو بعض اوقات اس فرمائش سے دقت اُٹھانی پڑتی ہے ۔ مگر بعض میزبان ایسے ہوتے ہیں کہ وہ مہمانوں کی فرمائش سے خوش ہوتے ہیں ، تو آنُ پر فرمائش کرنے کا مضائقہ نہیں ۔

مہمانوں کا بلانا اور بے تکلف اُن کی دعوت کرنا نیک عادتوں میں داخل ہے ۔ دعوت میں تونگر اور فقیر[1] دونوں کو بلانا چاہیے ۔ جو لوگ کہ دعوت قبول کرنے میں تکلف کریں ، اُن کے بلانے کی ضرورت نہیں ۔ بعض متکبر غریب آدمیوں کی دعوت قبول کرنے کو اپنی ذلت جانتے ہیں ۔ اس صورت میں دعوت کا منظور کرنا ذلت ہے کہ داعی مدعو کا منت کش نہ ہو بلکہ اپنا دعوت کرنا اُس پر احسان جانے ۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ دعوت ایسے شخص کے ہاں کھاؤ کہ وہ تمھارا ممنون ہو ۔ کسی مسلمان کو حقیر جان کر دعوت نہ قبول کرنی بڑی بدخلقی و تکبر ہے ۔ دعوت میں جاکر صدر مقام کی تلاش نہ چاہیے بلکہ فروتنی چاہیے ۔ جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جانا چاہیے ۔ دعوت کرنے والے کو اپنا انتظار نہ دکھانا چاہیے ۔ نہ جلدی قبل از وقت دعوت میں[2] جانا چاہیے ۔ اب دعوت میں کبھی کھانا سب طرح کا چن دیا جاتا ہے کہ جس کے دل میں جو آئے وہ کھائے ۔ کبھی ایک ایک کھانا سامنے آتا ہے ۔ غرض سب کھانے سب کے آگے آنے چاہئیں ، خواہ وہ کسی طرح آئیں ۔ بازاروں میں کھانا بعض بے تکلفی جانتے ہیں ، بعض اُس کو سفاہ و کمینہ پن ۔ بعض کا قول ہے کہ جہاں بھوک لگے وہاں

---

۱ ۔ اصل میں 'حقیر' ہے ۔ ۲ ۔ اصل میں 'میں' نہیں ہے ۔ مرتبہ

کھائے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ بھوک لگے بازار میں اور جاکر کھائیں گھر میں۔

۵۰ - شربِ خمر

شراب کا پینا ایمان و تقویٰ کی بنیاد کے واسطے سیل ہے اور دین اور دنیا[1] کی سعادت کے خرمن کے لیے آتش سوزاں ہے۔ اُس کے ہر جرعے میں بغض و عناد اور ہر قطرے میں فتنہ و فساد، ہر ساغر اُس کا رست کاریِ کونین کی کشتی کے لیے گرداب اور ہر شجر اس کا خجلتِ روز حساب کا عمان۔ اس کے پیمانے کا لب فرزانگی کے خون کا تشنہ، اس کے شیشے کا گلو مخلۂ دیوانگی کا سرکوچہ۔ اس کے پیمانے کی آنکھ طریق فنا ہے اور اُس کی صراحی کی گردن گمراہی کی راہ۔ اُس کے نوشا نوش کی آواز فتنے و شر کی منادی اور اُس کے سبو کی قلقل رحلتِ عقل و شعور کا نقارہ۔ اس سے چہرہ روشن کرنا دونوں جہان کی روسیاہی، اُس کی مستی باعث بے دماغی۔ یہ آتش آب دماغ کو ایسا جلا دیتا ہے کہ پھر اپنے مآل کی ایک دم فکر نہیں ہو سکتی۔

شراب ایک زہر شہد نما ہے۔ اُس کی شیرینی سے آدمی اپنی زندگی تلخ نہ کرے اور اُس کی قدح زنی سے اپنی حق پرستی کو نہ چھوڑے۔ وہ ایک برق خرد گداز ہے، اُس سے اپنے خرمن عمر کو نہ جلائے۔ حرکات بے خودانہ کرکے اپنے چراغ ایمان کو نہ بجھائے اور اپنے ہوش کی دستارِ سرافرازی کو پائے خم میں نہ گرائے اور اپنے ناموس کی پردہ دری شراب کے ہاتھ سے نہ کرائے اور اپنی آزادی کی برات کو آب انگور سے نہ دھوئے اور

---

[1] - اصل میں 'دین اور دینے کے' بے معنی ہے۔ 'دین اور دنیا کی' صحیح ہے۔ مرتب

اپنے اعتقاد کو شراب سے نہ مست کرے اور اپنی عقل کے بے قیمت گوہر کو ، جس کو اُستاد ازل نے دماغ میں جگہ دی ہے ، شراب کے سیلاب سے اُس کی جگہ نہ بدلے اور آئینۂ دل کو جس کی بنیاد صنع نے چار خیابان عناصر اربعہ میں رکھی ہے ، اُس کو عالم آب کی ہوا سے مکدر نہ کرے اور پیالے کی غبغب کے پکڑنے کی عادت ڈال کر اپنے حواس خمسہ کو معطل نہ کرے ۔

احکام مذہبی سے قطع نظر جو ارباب عقل و خرد اور صاحب تشخیص نیک و بد ہیں ، وہ اس آتش عقل سوز کی ہوس سے پرہیز اور احتراز واجب جانتے ہیں اور اپنے خردمند سر کو دونوں ہاتھوں سے اس شعلہ‌خو برق نہاد سے بچاتے ہیں ۔ اے عزیز ! عقل جیسی چیز کو شراب کے سر پر رکھتا ہے اور جان شیریں کو تلخی کے حوالے کرتا ہے اور فرمان فرمائے عقل کو شراب کے زور سے پیر ہر دماغ سے اتارتا ہے ؟ شراب پینا ، میخانوں میں پھرنا ، کوچہ و بازار میں مست ہونا ، آشناؤ بیگانہ میں اُفتاں و خیزاں چلنا ، رندی و بے باکی میں صلا مارنا اور اس شیوے کا نام بے تکلفی اور وسعت مشرب رکھنا ، بے ہنروں کی قوم میں ہنر شمار ہوتا ہے اور اُن کے کمالات کا ایک جزو گنا جاتا ہے نہ معلوم نہیں کہ دیوانہ ہونا ، نعرہ زنی کرنا ، ہرزہ و نامربوط بکنا ، کج چلنا اور ہردم کسی کو گالیاں دینا ، ہر قدم پر سرراہ گر پڑنا ، ہر لحظہ کسی کے کندھے کے سہارے چلنا اور ہر شب فرش پاکیزہ کو قے سے آلودہ کرنا ، روز آپس میں کارد و خنجر کھینچنا ، مستی میں سر کو بجائے پاؤں کے رکھنا ، مست و لایعقل ہونا ، صبح کو ہزار زحمت سے آنکھ کھولنا اور شام تک مردہ مبہم بزندگی رہنا کیا کمال و ہنر ہے کہ جس کے سبب

سے مدعی آتش و جہنم کے ہوتے ہیں -

۵۱ - سفر

اگرچہ سفر میں سقر[1] کی سی مشقت و رنج و تعب ہے[2] مگر آخر کو اس سے ظفر حاصل ہوتی ہے ، اس لیے سفر کرنا آدمی کو چاہیے - سفر ایک قسم کی حرکت اور اختلاط کا نام ہے اور اسی سبب سے اس میں فائدے اور آفتیں ہیں - جو فوائد کہ آدمی کو سفر پر آمادہ کرتے ہیں ، وہ یا تو کسی چیز سے گریز کرنا ہوتا ہے یا کسی چیز کا طلب کرنا ، یعنی مسافر جو سفر کرتا ہے تو اس کا سبب یا یہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز اس کو بہ زور اپنے مقام سے نکالے دیتی ہے - بالفرض اگر وہ نہ ہوتی تو یہ سفر بھی نہ کرتا ؛ مثلاً وبا ، ہیضہ ، بخار ، کسی فتنہ و خصومت کا برپا ہونا ، یا غلے کا گراں ہونا ، یا خاص شخص ، یا شہر کے لوگوں کا اس کی ایذا کے درپے ہونا - یا سفر کرنے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ کسی مقصد و مطلب کو حاصل کرے - یہ مطلب و مقصد بہت قسم کے ہوتے ہیں - اول علم حاصل کرنا ، دوم اخلاق و عادات کا درست کرنا ، سوم زیارت کرنا ، چہارم دولت و مال حاصل کرنا ، پنجم تفریح طبع ، ششم دنیا میں عجائب و غرائب قدرت کا دیکھنا -

علم کے واسطے سفر کرنا نہایت مفید و فائدہ مند ہوتا ہے - جیسے تحصیل علم گھر سے باہر نکل کر ہو سکتی ہے ، ایسی گھر میں نہیں ہوتی - اخلاق و عادات کا اظہار سفر ہی میں ہوتا ہے اس لیے اس کو سفر کہتے ہیں - اصل معنی سفر کے ظہور کے ہیں - جب تک آدمی وطن میں رہتا ہے ، برے اخلاق ظاہر نہیں

---

۱ - سقر : دوزخ -   ۲ - اصل میں 'ہیں' ہے - مرتب

ہوتے کیوں کہ طبیعت کے خلاف کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ جب آدمی سفر کی سختی اُٹھاتا ہے اور امور معمولی میں و معتاد میں فرق پاتا ہے تو اخلاق کی خفیہ آفات منکشف ہو جاتی ہیں اور اُن کے عیوب پر مطلع ہوتا ہے، تو اب اُن کا علاج بھی کر سکتا ہے۔ بقول شیخ سعدی علیہ الرحمتہ :

تا بدکان خانہ در گردی   ہرگز اے خام آدمی نشوی

سفر میں اختلاط مختلف قسم کے آدمیوں سے ہوتا ہے۔ کچھ مشکلیں اور مشقتیں بھی اُٹھانی پڑتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کی صنعتوں اور نشانیوں کے دیکھنے کے فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں، مگر کوہ و دشت، بحر و بر، اقسام اقسام کے حیوانات، نباتات، یہ سب کچھ دیکھنے میں آتے ہیں۔ جن کی آنکھیں ظاہری چیزوں کو دیکھتی ہیں، اُن کو بھی اس سے تفریح ہوتی ہے اور جن کی آنکھوں میں باطن کی روشنی ہے، وہ ان میں خدا کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کو دیکھتی ہیں۔ جو شخص اس غرض سے سفر کرتا ہے کہ جو صفحات قدرت پر خطوطِ الٰہی سے شہادتیں خدا تعالیٰ کی توحید کی لکھی ہوئی ہیں، وہ پڑھے، تو اُس کو بہت سفر نہیں کرنا پڑے گا بلکہ ایک جگہ ٹھہر کر، ایک گل کو دیکھ کر ہزار صنعت کردگار سمجھ لے گا۔

کبھی سفر عبادت کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ حج کا سفر۔ ایک سفر طلب مال کے لیے ہوتا ہے کہ جس کا مآل یہ ہوتا ہے کہ آدمی محتاجِ غیر نہ ہو، اہل و عیال کی پرورش کرے، دوست آشناؤں سے مروت کرے، عزت و جاہ حاصل کرے، محتاجوں کو خیرات دے۔ ایسے سفر سے جودت و تیزی طبع حاصل ہوتی ہے۔ سفر میں ایسی مشقتیں پیش آتی ہیں کہ اُن پر بجز قوی شخصوں کے اور کوئی قادر نہیں ہو سکتا کیوں کہ سفر میں مسافر

کو کبھی تو اپنے جاہ و جلال کا خطرہ ہوتا ہے ، کبھی اپنے مالوف و معتاد چیزوں کے جدا ہو جانے کا خیال ہوتا ہے کہ وہ سفر میں نصیب نہیں ہوتیں - روزمرہ کے کوچ و مقام کا تردد ایسا ہے کہ وہ خاطر کو ابتر کرتا ہے ، مگر باوجود ان تکالیف کے فوائد دین و دنیا کے ایسے حاصل ہوتے ہیں کہ سفر کو اقامت پر ترجیح ہے - سچ ہے ''السفر مفتاح الظفر[1] ہے''

۵۲ - طلاقت وجه و مزاح

طلاقتِ وجہ و مزاح مراد اس سے ہے کہ انقباض سے آدمی کبھی چیں بہ جبیں نہ ہو اور خوشی سے سخنان شیریں کہتا ہو - یہ خوے ناخوب کی نشانی ہے کہ پیشانی میں چیں ہو - شیریں باتوں سے خاموش ہونا ترش روئی ہے - نادانی سے آدمی کے دل میں گرہ پڑتی ہے تو وہ پیشانی پر نمودار ہوتی ہے - جب پانی کی تہ ناہموار ہوتی ہے تو رخِ آب پر گرہ نمودار ہوتی ہے - جب تک خاک میں تہِ آب جڑ نہیں ہوتی شاخ نہیں نکلتی - تیرے سر کہ جبین ہونے سے سب آدمیوں کی طبع تجھ سے بھاگتی ہے[2] - سرکے پر مکھی بھی نہیں بیٹھتی - تجھ کو چاہیے کہ کشادہ پیشانی رہ اور خستہ دلوں کو تنگ نہ کر - کسی کی صورت دیکھ کر شکر خندہ ہونا تو قند و شکر دینے سے بہتر ہے - قند و شکر سے تو دہن و لب میٹھے ہوتے ہیں مگر شکر خند سے جان کو آسائش ہوتی ہے - خنداں رہنا تو خرد مندوں کا آئین ہے - باغ خنداں گل خنداں ہی سے ہوتا ہے - خندہ آدمی کو کسی کوشش سے نہیں آتا - جد سے تو دل کو رنج ہوتا ہے ، اس کی اصلاح مزاح سے چاہیے - جد میں تو سفر میں پاؤں گھسنے ہوتے ہیں ، ایک لحظہ ہزل کرنے میں

---

۱ - یعنی سفر کامیابی کی کنجی ہے - ۲ - اصل میں 'ہے' ندارد - مرتب

قوام ملتا ہے ۔ اگر آسودگی رنج زوا نہ ہو تو پھر پاؤں رنج و تکلیف سے چلنے سے رہ جائیں ۔ لیکن ہزل وہ چاہیے کہ جس میں دروغ نہ ہو ، ورنہ وہ تیرے چہرے کو ۔ فروغ کر دے گا اور اس سے کینے کا بیج دل میں آئے گا اور شرمندگی کے مارے پسینا آئے گا ۔ ہزل بھی عقیل سے سیکھنا چاہیے ۔ مغز بادام کے اگر ٹکڑے کرو تو اس کو شکر سے آلودہ کرو ، ہزل میں جو بات کہو وہ سچ کہو مگر خوشی و شیرینی کے ساتھ ۔

۵۳ ۔ جمال

''اللہ جمیل ویحب الجمال'' (اللہ تعالٰی جمال والا ہے اور جمال کو دوست رکھتا ہے) ۔

گفت خاموش ہر آنکس کہ جمالے دارد
ہر کجا پائے نہد دست بدارندش پیش

''الصورت نصف الرزق[۱]'' ۔ جمال بھی کمال اور جاہ کی مانند ایک آلہ اور ذریعہ مقصود تک پہنچنے کا ہے ۔ اس میں ایک طرح کی قدرت ایسی پائی جاتی ہے کہ خوب صورت اپنی حاجت کے پورا کرنے میں بہ نسبت بد صورت کے زیادہ قادر ہے ۔ خوب رویوں کی طرف آدمیوں کو توجہ ہوتی ہے ، وہ ان کی حاجتیں جلد روا کر دیتے ہیں ۔ بد صورت کو مکروہ جانتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں ۔ حسن صورت میں نفس کی فضیلت پائی جاتی ہے کیوں کہ جب نفس کا نور خوب چمکتا ہے تو اس کا اثر بدن پر آ جاتا ہے ۔ اکثر ظاہر و باطن میں موافقت ہوتی ہے اس لیے اصحاب فراست نفس کی بزرگیوں کے مفہوم کرنے کے لیے بدن کی ہیئت[۲] کو اعتبار کیا

---

۱ ۔ یہ: شکل (اچھی) آدھا رزق ہے ۔
۲ ۔ اصل میں ہیات ہے ۔ مرتب

کہتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ چہرہ اور آنکھ آدمی کے باطن کا آئینہ ہے۔ چہرے سے دل کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ زر کی طرح منہ کا زرد ہونا دل کا درد بتلاتا ہے ۔ آدمی کے حال کا بڑا غماز چہرے کا رنگ ہے جو جرس کی طرح آواز دیتا ہے۔ آواز ایسی چیز ہے کہ جس سے گھوڑا ، گدھا معلوم ہو جاتا ہے۔ آدمی زبان سے پہچانا جاتا ہے۔ آدمی کی پیشانی پر دل کا حال عیاں ہوتا ہے۔ رنگ و رو حال دل کا نشان ؛ مثلاً غصہ ، سرور ، غم اگر جی میں ہوتا ہے تو اس کا اثر آنکھ اور چہرے پر معلوم ہوتا ہے۔ صبر و شکر دل میں ہو تو زرد روئی اور سرخ روئی اُن کو ایسا بتلاتی ہیں جیسے باغ کے پتوں کے رنگ ، بہار و خزاں (میں) ۔ کشادہ پیشانی نفس کے اچھے ہونے کا عنوان ہوتی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ جتنے بدصورت ہیں اُن کے لیے یہ کہنا کافی ہے کہ ''صورت بہ بیں حالش مپرس ۔''

۵۴ ۔ خوب صورتی کے پیچھے آفتیں بھی لگی ہوئی ہیں ۔ طاؤس کو اُس کے پروں کے لیے مارتے ہیں ۔ لومڑی کا پوست پوستین کے لیے اتارتے ہیں ۔ آہو نافۂ مشک کے لیے شکار کیے جاتے ہیں ۔ ہاتھی دندان و استخوان کے سبب سے شکاریوں کے ہاتھ کے زخم کھاتے ہیں ۔

۵۵ ۔ نصائح

ان دس خصلتوں کو اختیار کرو ، دنیا و آخرت میں اپنا کام بناؤ (۱) حق کے ساتھ صدق (۲) نفس کے ساتھ قہر (۳) خلق کے ساتھ انصاف (۴) بزرگوں کی خدمت (۵) مزدوروں کے ساتھ شفقت (۶) درویشوں کے ساتھ سخاوت (۷) دوستوں کو نصیحت (۸) دشمنوں کے ساتھ ملائمت (۹) جاہلوں کے ساتھ خاموشی (۱۰) عالموں کے ساتھ تواضع ۔

اور من لے کہ کسی کی روٹی نہ کھا ۔ اپنی روٹی کسی سے دریغ نہ رکھ ، زاہد جاہل پر اعتماد نہ کر ۔ خود شناسی کو سرمایۂ بزرگی نہ جان ۔ دشمن دوست رو سے حذر کر ، نادان مغرور سے اجتناب ۔ جو بات دیکھی یا سنی نہ ہو اسے نہ کہہ ۔ اپنے عیب پر نظر رکھ اور دوسروں کے عیب کو تلاش نہ کر ۔ دل کے بھید خدا جانتا ہے ، تو اس میں دخل نہ دے ۔

آدمیوں کو تین سبب سے رنج ہوتے ہیں : "اول آنکہ از وقت پیش می خواہند ، دوم از قسمت بیش ، سوم ہر چہ از آن دیگران است از خویش ۔"

جس طاعت سے عُجب ہو اس سے وہ معصیت مبارک ہے کہ آدمی عذر کرے ۔ نفس بت ہے اور قبول خلق زنار ۔

۵۶ ۔ سیاست

سیاست کا لفظ ہم نے بہت جگہ لکھا ہے اس لیے اس کے معنی لکھتے ہیں ؛ وہ اصول جن سے کہ آپس میں ناموس رہنے اور اجتماع کے لیے اور اسباب معیشت میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے اسباب مہیا کیے جاتے ہیں ، اس کو سیاست کہتے ہیں ۔ اب سیاست کے چار مرتبے ہیں جن سے خلق کی درستی ہوتی ہے اور دنیا و آخرت کی راہ راست بتلائی جاتی ہے : اول سیاست جو سب میں برتر ہے ، انبیاء علیہم السلام[1] کی ہے ، ان کا حکم خاص اور عام سب پر ظاہر و باطن میں ہر حال میں ہے ۔ دوم خلفا ، ملوک و سلاطین کی ہے ، ان کا حکم بھی خاص اور عام سب پر ہے مگر صرف ظاہر پر ہے ، باطن پر نہیں ۔ سوم سیاست علماء کی ہے ، ان کا حکم صرف خاص لوگوں کے باطن پر ہے ۔ عوام کی سمجھ کا

---

۱ ۔ نسخۂ اول میں 'کی' سے پہلے 'کے' زائد تھا ۔ مرتب

اتنا رتبہ نہیں کہ جو آن سے مستفید ہوں۔ اور نہ اُن کو یہ قوت کہ لوگوں کے ظاہر پر کسی بات کے لازم کرنے کا، خواہ روک دینے کا، تصرف کریں۔ چہارم واعظوں کی سیاست ہے۔ اُن کا حکم صرف عوام کے باطنوں پر ہے۔ فقط

باب دهم

عمر و وقت و موت

۱ - وقت کی قدر

اگر عاقل آدمی پاس کوئی عمدہ جوہر ہو ، وہ بے فائدہ ضائع جائے تو اُس کو افسوس ہوتا ہے ، اور اگر اُس کے جانے کے ساتھ خود وہ بھی برباد ہوجائے تو اُس کو رونا آتا ہے - اگر غور کرو تو عمر کی ہر ایک ساعت بلکہ ہر ایک سانس ایک جوہر نفیس ہے کہ اُس کا کچھ عوض اور بدل نہیں - اس واسطے کہ اُس میں یہ صلاحیت اور لیاقت ہے کہ آدمی کو سعادت ابدی پر لے جائے اور شقاوت دائمی سے بچائے - اس سے بڑھ کر اور کون سا جوہر نفیس ہوگا - پھر جب آدمی ایسے جوہر نفیس کو غفلت میں کھووے یا برے کاموں میں ضائع کرے تو اس سے زیادہ اور کیا امر قابل افسوس ہو سکتا ہے -

۲ - عمر کی شرافت اور بے ثباتی ، بے اعتباری و بے بقائی

گزرتی عمر ہے یوں دور آسمانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتی دخانی میں

ذوق اس بحر جہاں میں کشتی عمر رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارہ ہوگیا

جو لوگ بادۂ جوانی میں مست ہو رہے ہیں اور دنیا سازی میں مشغول ہیں اور خیال بازی کے معرکوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں ، گہری نیند سو رہے ہیں - طولِ املِ عیش و طرب میں روز و شب مصروف ہیں ، باطل پرستی و حق ناشناسی اُن کا کام

ہے ۔ وہ جواہر انفاس کی قدر نہیں کرتے اور یہ نہیں جانتے کہ زندگی کا ہر دم ایسا گوہر ہے کہ اُس کو جہان کی سلطنت کے عوض نہیں خرید سکتے ۔ اہل دل اور ہوش مند کامل جانتا ہے کہ دنیا موج سراب اور نقش بر آب سے زیادہ بے اصل ہے ۔ لڑکوں کے کھیل کی طرح بے حاصل اور باطل ہے ۔ جب تک ان غافلوں کے گریبان میں اجل ہاتھ نہیں ڈالتی ، وہ وقت کو جنس خطیر اور گوہر بے نظیر نہیں جانتے ۔ جب زندگانی بے بہا کے خرمن کو نفسوں کی باد صرصر برباد کرتی ہے اور مزرعۂ عمر بے بدل کو برقِ جاں سوز اجل جلاتی ہے تو طبیبان حاذق علاج سے ہاتھ کھینچتے ہیں ، یاران موافق رشتۂ امید توڑتے ہیں ؛ تلشبن قبض روح کرتی ہے ، ہاشویہ جان سے ہاتھ دھوتا ہے ، نور نظر شمع سحر کی طرح مردہ ہوتا ہے ، رنگ چہرے کا دھوپ کے مارے ہوئے گل کی طرح پژمردہ ہوتا ہے ، جوہری زبان دکان دہان کے دونوں پٹوں کو قفل خموشی لگاتا ہے ، دیگ دماغ میں خیال خام کا جوش آتشِ زندگانی بجھنے سے سرد ہوتا ہے ، بدن کے کارخانے میں روزی خواروں کا راتبہ بند ہوتا ہے ، مستوفی قضا نسخۂ بقا سفیدیِ کفن و کافور سے لکھ دیتا ہے ، جان جسم سے رخصت ہوتی ہے ، جسم گور کے مار و مور کے حوالے ہوتا ہے ۔ اُس وقت آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے گنج شائگاں اپنی عمر کا کیا مفت رائگاں کھویا ہے ۔

۳ ۔ زندگی کا ہر دم کیوں نہ کل عالم سے بہتر ہو کہ سلطنت تمام عالم کی اس کے ساتھ منوط[1] ہے اور تحصیل سعادت دین و دنیا اُس پر مشروط ہے ۔ ہر دم اس کا دو جہان کی کامرانی کا سرمایہ

---

۱ ۔ منوط : منسلک ، وابستہ ۔

ہے اور ہر نفس اس کا جسم و جان کی کتاب کا شیرازہ ہے ۔ آدمی کی عمر چند سال کی ہوتی ہے اور ہر سال میں چند شبانہ روز ہوتے ہیں اور ہر شبانہ روز میں ساعتیں ہوتی اور ہر ساعت میں چند نفس ہوتے ہیں ۔ پس انھی میں تمام وہ فضائل حاصل کرتے ہیں کہ کوئی بادشاہی اُن کی برابری نہیں کر سکتی ۔ جتنی دنیا کی نعمتیں اور مایحتاج اور ضروریات ہیں اُن کا بدل اور عوض آدمی کو مل سکتا ہے کہ اس سے حاجت گزاری ہو سکتی ہے ، مگر عمر کا بدل اور قائم مقام کوئی چیز نہیں ہو سکتی ۔

اگر جامۂ اطلس نہ ہو تو گدڑی سے کام چل سکتا ہے ، اگر مزعفر قند و مشک پڑا ہوا نہ ملے تو روکھی سوکھی روٹی اور چٹنی سے پیٹ بھر سکتا ہے ، اگر پانی کا برتن سونے کا نہ ہو تو اوک سے پانی پیا جا سکتا ہے ، اگر گھوڑا نہ ہو تو اپنے پاؤں سے چل سکتا ہے ، اگر نوکروں چاکروں کی دورباش نہ ہو تو نصرت خلق کی دورباش کافی ہے ، اگر قصر زرنگار نہ ہو تو کنج غار میں بسر ہو سکتی ہے ، اگر فرش ابریشمی نہ ہو تو پرانے بوریے سے کام نکل سکتا ہے ، اگر بالوں میں کرنے کے لیے کنگھی نہ ہو تو اُنگلیوں سے کنگھی ہو سکتی ہے ۔ غرض دنیا میں جس چیز کو دیکھو اُس کا عوض ہے جس سے غرض نکل سکتی ہے مگر جہان میں جو چیز بے عوض ہے ، وہ عمر ہے ۔ تجھے اُس کی قدردانی ضرور ہے ۔ روزگار میری عمر خریدنے آیا ، میں نے اُس سے کہا کہ میں عمر کو دنیا کے عوض نہیں بیچتا ، مگر اُس نے وہ ڈھب لگایا کہ میری ساری عمر کو تھوڑا تھوڑا کرکے خرید لیا ۔ ایسے سودے پر تبرا ہے کہ فروشندہ سراسر نقصان میں رہا اور خریدار کو وہ مفت ہاتھ لگ گیا ۔ عمر جو گزر جائے اُس کا پتا نہیں لگتا ۔

سراغ عمر گزشتہ کو ڈھونڈیے گر ذوق
تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے

سراغ عمر رفتہ ہو تو کیوں کر
کہیں جس کا نشان پا نہ پایا

جویندۂ ہر چیز ہے یابندہ جہاں میں
جز عمر گزشتہ کہ وہ ڈھونڈھو تو کہاں ہے

۴ - وہ مرد مردہ دل ہے جو ایک دیوار شکستہ کے سائے میں خاطر جمعی سے بیٹھا دنیا پر دل لگا رہا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ تار عمر بڑا زود گسل و بے وفا ہے - باوجود گراں قیمتی کے بہت ہی سبک خیز و بے بقا ہے - شفق کی طرح ادھر رنگ پکڑا اور ادھر اڑا - بجلی کی طرح ادھر چمکا ادھر فنا ہوا - اس کی جوانی شعلۂ خس سے بھی زیادہ بے اعتبار اور امتداد زمان اس کا شہاب سے زیادہ ناپائدار ہے - اس کی صحبت سپند کی سی ہے کہ ادھر بیٹھا اور ادھر اٹھا اور تار عنکبوت کی طرح ادھر بندھا ادھر ٹوٹا - ایام جوانی شب ہائے بہار کی طرح کم زندگانی رکھتے ہیں - موسم پیری اس کا آفتاب زمستانی سے زیادہ سرد رو ہے - زمان نوخطی اس کا رنگ خضاب سے زیادہ بے وفا و زود گسل ، اس کی سفید روئی کا دوران صبح کاذب کی طرح بے اصل و باطل ، مدت شباب اس کی شدت مرض کی طرح بالکل بے شعوری و نادانی ، عہد پیری اس کا بالکل ضعیفی و ناتوانی - طائر عمر کے دو پر روز و شب ایسے ہیں کہ اس کو اڑائے لیے جاتے ہیں -

دنیائے فانی کی بے ثباتی ایسی ہے جیسے کہ سبزے کی چند روز طراوت و خرمی رہتی ہے ، پھر اس کے بعد خشکی و زردی [illegible] ہے - زندگی کا اعتبار ایک دن کا نہیں - صبح کو نہیں کہہ سکتے

کہ رات کو ہم یہ کریں گے اور رات کو یہ نہیں کہہ سکتے
کہ صبح کو یہ کام کریں گے ۔ عمر خواہ کتنی دراز ہو ، وہ
چھوٹی معلوم ہوتی ہے ۔ اگر کوئی آدمی ساٹھ ستر برس جیے تو
آدھے دن ، یعنی راتیں خواب و آسائش بدن میں تلف ہوتی ہیں
جس کو زندگی میں شمار کرنا نہیں چاہیے ۔

نیند اور موت دونوں بہنیں ہیں ۔ ان میں کوئی کام اپنے
اختیار سے نہیں کر سکتا ۔ پندرہ سال ایام طفلی میں گزرتے ہیں
جو بے شعوری اور نادانی کا زمانہ ہے جن میں پانچ سات برس
بچپنے کے ایسے ہوتے ہیں کہ پرائے بس میں ہوتے ہیں ۔ پھر ایسی
عمر میں معاش کے واسطے کوئی پیشہ و حرفہ سیکھنا پڑتا ہے
جس کی تحصیل و تکمیل کی محنت و مشقت میں لہو پانی ایک کرنا
پڑتا ہے ۔ اور دس سال جوانی کے ہیں کہ ان میں آمال و آمانی
کا غلبہ ہوتا ہے اور تحصیل مایحتاج و کسب مال و سامان و وجہ
معیشت اہل و عیال میں صرف ہوتے ہیں ۔ کبھی ان میں کامیابی
کی مسرت ، کبھی ناکامی کی کلفت ۔ باقی پیری و مجبوری جن میں
مردہ بدست زندہ ہوتا ہے ۔ پھر ارتحال و انتقال ۔ ساٹھ سے ستر سال
تک جس کو عشرۂ شومہ کہتے ہیں ، آدمی کم جیتے ہیں ۔ آدمی
کی عمر جب پچاس سال کی ہوتی ہے تو روز بروز قویٰ اور حواس
ضعیف و زبون اور مزاج کے احوال درہم و برہم اور دگرگوں
ہوتے ہیں ۔ قوت سامعہ کا زاہد گوشہ گزین ہوتا ہے ، نور بصر
کا شاہد مستور پردہ نشین ۔ ہاتھ میں جب تک عصا نہ ہو ، پاؤں
رستہ چلنے میں کام نہیں دیتا ۔ معدے کا ضعف غذا کو ہضم نہیں
ہونے دیتا ، دانت سستی کے سبب سے لقمے کی گرہ کو نہیں کھولتے ،
تن ناتوانی کے سبب سے ضرورت کے لیے بھی حرکت کرنے میں
اپنا بوجھ عصا پر ڈالتا ہے ۔

نشاط عمر باشد بہ سی سال[1]
چہل چون شد فرو ریزد پر و بال
پس از پنجہ نہ باشد تندرستی
قصر تن کندی پزیرد ہائے سستی[1]
چون شصت آمد نشست آمد بدیوار
چو ہفتاد آمد افتاد است از کار

یہ حال تو جب ہے کہ عمر ستر برس کی ہو اور حوادث و امراض مہلکہ سے جان بچی رہے ورنہ ہر روز و ہر شب و ہر ساعت و ہر نفس ممکن ہے کہ امراض غارت گر، تیغ جاں ستاں لے کر سر پر آن کھڑا ہو اور جسم کی سرائے میں سے کل متاع جان کو لوٹ لے جائے۔ عمر تو ایسی بودی پرانی رسی ہے کہ اس کے استحکام پر ایک لحظہ بھروسا نہیں ہوسکتا، اور حیات ایسی دیوار بے گسستہ ہے کہ اس کے سائے کے نیچے ایک لحظہ بھی بیٹھنے کا اعتبار نہیں ہو سکتا۔ الحاصل زندگانی اس قدر عزیز و گران بہا بہت ہی سبک خیز و کم بقا ہے۔ پس اس سے زیادہ کیا بلاہت[2] و نادانی و بے پروائی و سفاہت ہوگی کہ ایسی عزیز چیز کو رائگاں اور باطل کھوویں۔ اور اس میں کوئی کام دین و عقبیٰ کا نہ کریں۔ ایسی شراب غفلت پئیں، اس کا خمار مرگ بصورت زندگی ہو اور دونوں جہان میں شرمندگی ہو۔ عمر بھر سال و ماہ غفلت میں گزارتے ہیں، حال اور مآل پر تامل نہیں کرتے۔ نہ مرگ کو یاد کرتے ہیں، نہ اس سفر کے لیے تہیے کا اندیشہ کرتے ہیں۔ اس وقت خبردار ہوں گے کہ مرض گلا پکڑے گا۔ بڑے بڑے حاذق حکیم معالجے سے جواب دیں گے، یاران مہربان کوئی تدبیر

۱۔ مصرع اول و چہارم کذا۔ ۲۔ بلاہت: بے وقوفی۔ مرتبہ

نہ کر سکیں گے ۔ دعا و صدقہ کے توسل سے واقعۂ عظمیٰ کو دفع نہ کر سکیں گے ۔ موت ایسی نہیں کہ ایک ساعت کا اس میں توقف ہو سکے ۔ اس کے آنے پر ایک روز بھی حیات کو نہیں رکھ سکتے ۔ اس واقعۂ ناگزیر سے ہم کہیں بھاگ نہیں سکتے ۔ اس کے پالہنگ[1] کو کسی زور سے توڑ نہیں سکتے ۔ ہر چند چشم امید کو ادھر ادھر پھرائے ہیں مگر کوئی حامی نظر نہیں آتا کہ اس سے بچائے ۔ گوش ہوش سب طرف لگاتے ہیں ، کوئی شفاعت کی آواز نہیں آتی ۔ ناچار جان کے دینے میں تن دہی کرتے ہیں ۔ اس وقت جانتے ہیں کہ عمر کیا چیز تھی ، وہ کیا ہمارے ہاتھ سے گئی ہے ۔ ہم اس فرصت تنگ اور عمر پرشتاب میں خیر و صواب کے کاموں سے غافل رہے ، باطل کاموں میں پھنسے رہے ۔ مگر اس وقت جاننے سے کیا فائدہ ہوتا ہے ۔ آدمی کو چاہیے کہ جب آنکھیں کھولے تو خدا کی درگاہ میں اشک باری کرے اور جب زبان چلتی ہو تو اپنے خدا کے روبرو عذر کرے ۔ جان لے کہ نہ بدن میں ہمیشہ جان رہے گی ، نہ دہن میں زبان ہمیشہ چلے گی ۔ حاصل اس کلام کے مضمون کا یہ ہے کہ انسان پہلے اس سے کہ موت کا پیغام آئے ، اپنے تمام حقوقِ واجب کو ادا کرے ۔

راست کن کار خود امروز کہ فردا چوں تیر
گرم رفتن چو شدی روے بہ پس نتواں کرد

۵ ۔ آدمی کو چاہیے کہ پانچ چیزیں پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانے : جوانی کو پیری سے پہلے ، تندرستی کو بیماری سے پہلے ، مال داری کو مفلسی سے پہلے ، فراغت کو شغل سے پہلے ، حیات کو موت سے پہلے ۔ قوتِ جوانی ، صحتِ جسمانی ، مکنت[2]

---

۱ پالہنگ : باگ ، ڈور ۔ ۲ ۔ مکنت : قوت ، طاقت ۔ مرتب

مالی داری ، فرصت و فراغت ، بقائے زندگانی ، یہ پانچ نعمتیں بے بدل ہیں ۔ جب وہ موجود ہوتی ہیں تو اُن کے اضداد مفقود ہوتے ہیں ۔ کمال بے عاقلی اور نہایت بے باکی و بے حاصلی ہے کہ کوئی شخص اُن کی قدر جیسی کہ چاہیے نہ کرے اور ان نعمتوں کا شکر نہ بجا لائے ، اور وہ جس صرف میں آ سکتی ہیں اُن کو نہ لائے ۔ عمر کی رات اور دن کو ہرزہ گوئی و بیہودگی میں ضائع نہ کرو اور خوب سمجھ لو :

کارِ امروز میںنداز بہ فردا زنہار
کہ بفردا چو رسی نوبت کار دگر است

۶ - پیری و جوانی

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

جنت ہے زندگی میں زمانہ شباب کا
پیری ہے پہلے مرگ سے ہونا عذاب کا

پیری میں بالوں کی سفیدی ، چہرے کی جھریاں ، باصرہ و سامعہ کا ضعف ، بشرہ کا تغیر ، دانتوں کا گرنا ، قد کا کبڑا ہونا ، یہ سب موت کے آنے کی خبر دیتے ہیں ۔ بالوں کا پنبہ ہونا اور قد کا کمان ہونا بتلاتے ہیں کہ اجل کا دھنیا دھننے کے لیے کھڑا ہے ۔ پھر کبر سن میں بدن پر امراض غالب ہوتے ہیں جیسے تنگی نفس ، دردِ کمر ، سستی زانو ، خارش بدن اور اس کی مثل ۔ بڈھے یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ امراض بھی جوانی کے امراض کی طرح عارض ہوتے ہیں ، وہ علاج پزیر اور قابل تدبیر ہیں اور اس سبب سے وہ ہر روز مردہ نفس کسی حکیم و طبیب کی تلاش میں ہوتے ہیں ۔ معجونوں کے بنانے کا خیال خام پکاتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ ان مرضوں میں سے ہر ایک پلنگ اجل کا پنجہ ہے ، اس سے رہائی ممکن نہیں ۔

اگر بالفرض استعمال دوا سے کسی مرض میں دو تین روز تخفیف بھی ہوگئی ، پھر وہ عود کرے گا ۔

جب آدمی کی عمر ساٹھ برس کی ہو جائے تو سوائے مر جانے کے کوئی اس کا طبیب نہیں ۔ جس شخص کی عمر ستر سے بڑھی وہ بے مرض و علت کے بیمار ہے ۔ پیری وہ مصیبت و بیماری ہے جس کی عیادت و تعزیت کوئی نہیں کرتا ۔

ایک بڈھے نے طبیب کے سامنے اپنا یہ حال بیان کیا کہ "پیری کے سبب سے میرے دانت سست ہوگئے ہیں ، اس سبب سے کھانا چبایا نہیں جاتا ۔ جب لقمہ دہن میں نرم نہیں ہوتا تو وہ معدے میں ہضم نہیں ہوتا ۔ جب معدے میں ہضم نا تمام ہوتا ہے تو اعضا میں طعام قوت نہیں بخشتا ۔ حکیم صاحب! آپ کا بڑا احسان میری جان پر ہوگا اگر میرے دندان سے مرض کو دور کر دیں ۔" اس حکیم دانش ور نے بڈھے سے کہا کہ "اگرچہ مرض سے تیرا دل دونیم ہو رہا ہے ، مگر تیرے مرض کا علاج اسّی برس عمر کے بعد سوائے اس کے نہیں ہے کہ جوانی پھر تیری عود کرے اور یہ محال ہے ۔ اگر اس ہشتاد سال سے واپس چلا جائے تو دانت قوی ہو جائیں لیکن واپس جانا ممکن نہیں ، اس لیے دانتوں کی سستی کو غنیمت جان ۔

پس جو دانش مند ہوتے ہیں ، وہ یہ آثار پیری جب نمایاں دیکھتے ہیں تو وہ طبع کودک خصلت کو سمجھا کے دنیا کی طفلانہ بازی چھوڑ دیتے ہیں ۔ جو اُن کے زندگی کے دن باقی رہتے ہیں اُن کو عقبیٰ کے کام میں لگاتے ہیں ۔ بالوں کی سفیدی سے کافور و کفن کی فکر میں رہتے ہیں ، دانتوں کے گرنے سے دندانِ طمع زندگی سے کند کرتے ہیں ، ضعف چشم سے مرگ کو بچشم خود دیکھتے ہیں ، گرانیِ گوش سے ندائے الرحیل اپنے کانوں سے سنتے

ہیں ، قدِ خمیدہ کے ناخن سے دنیا کی دل بستگی کی گرہ کھولتے ہیں[۱] -

خلاصہ یہ ہے کہ اوپر کی بیماریاں پیری کو لازم ہیں - وہ بدن کی کہنہ سرائے کو شکستہ کرتی ہیں اور اس کے ڈھینے کے لیے دلیل نمایاں - اس کی تمثیل یہ خوب کسی نے دی ہے کہ ایک شخص ہمیشہ اپنے گھر سے کہتا تھا کہ تو دفعۃً نہ گر پڑنا ، مجھے پہلے سے خبر کر دینا - لیکن ایک رات کو ناگاہ مکان گر پڑا - اس پر آدمی نے کہا کہ میں تجھ سے ہمیشہ نہ کہا کرتا تھا کہ تو اپنے گرنے کی خبر مجھے کرنا ؟ تاکہ میں اپنے اہل و عیال کے لے جانے کی تجویز کہیں کر لوں ، مگر تو نے حق صحبت ادا نہ کیا اور گر کر مجھے اور زیادہ زار ونزار کیا - مکر گھر نے بھی کیا فصیح جواب دیا کہ میں نے رات دن میں کئی دفعہ تجھ کو خبر کی مگر تو خبردار نہ ہوا - جس طرف کہ میں اپنا دہن شگاف کی صورت میں کھولتا تھا تو میں پکار پکار کہتا تھا کہ اب میرے گرنے کا وقت قریب ہے ، تو ہوشیار ہو - مگر تو اپنے حرص سے میرے منہ میں مٹی بھر کے میرے شگافوں کو دیوار بنا دیتا تھا - جہاں میں دہن کھولتا ، وہیں تو اس کو بند کر دیتا اس لیے آخر کو تیری یہ نوبت پہنچی -

پس یہ سمجھ لو کہ تن تو خانہ ہے اور رنج و بیماریاں اس کے شگاف ہیں - تو ان بیماریوں کے شگافوں کو دوا سے پُر کرتا ہے اور ان میں معجون اور مقوی غذاؤں کی مٹی بھرتا ہے - تن تو اپنا منہ کھول کھول کر کہتا ہے کہ اب میں جاتا ہوں مگر طبیب اس کی گفتار کو بند کر دیتا ہے - پس عمر پر اعتماد کرنا کمال نادانی اور بے خردی ہے -

---

۱ - متن (صفحہ ۳۲۰) کذا - مرتب

ے - پہلے اس سے کہ موت کے درد بے درماں میں مبتلا ہو ،
اپنے دم واپسیں کی کارسازی کے واسطے چارہ سازی کر - پس
کہولت میں فسق و فجور کرنا بہت ہی زشت و زبون و ناخوش
ہے - اس وقت میں جوانی کا خاتمہ ناتوانی کرتی ہے - شہوت ہائے
نفسانی کی آگ بجھ جاتی ہے - ''پس از پنجہ نباشد تندرستی -'' ایسے
وقت میں تمام لہو و لعب و تن پرستی کا چھوڑ دینا آسان ہے -
جو ایسی حالت میں بھی گناہوں کا مرتکب ہوگا ، اس سے سخت
مواخذہ ہوگا - مگر انسان ایسا کم بخت ہے کہ وہ اپنے تئیں ایسی
ایسی حالت کو بھی آغاز جوانی سمجھتا ہے - اپنے عیش و کامرانی
میں دل و جان سے کوشش کرتا ہے - پھر شیخوخت کا زمانہ آئے
تو اس میں اور بھی بد افعالی سے احتراز چاہیے - انسان جب کودکی
کی حالت سے نکل کر خود شناس و جوان ہوتا ہے تو جہالت سے
لہو و لعب و شہوات نفسانی سے اشتغال[1] رکھتا ہے اور کہتا
ہے کہ پیرانہ سالی میں توبہ کرکے خدا سے دل لگاؤں گا - جب
بڑھاپا آتا ہے تو وہی جوانانہ مستی میں مصروف رہتا ہے -
طفلی پستی ، جوانی مستی ، پیری سستی ہے[2] - خدا پرستی کسی[3]
زمانے میں نہیں ہے - جوان اس بات کو افسانہ جانتے ہیں اور کب
سمجھتے ہیں کہ کل بڑھاپا آئے گا - نہ کان سنیں گے ، نہ آنکھیں
دیکھیں گی ، نہ پاؤں چلیں گے ، نہ ہاتھ پکڑیں گے - تن جان سے
سیر ہوگا اور جان تن سے دل گیر ہوگی - آشیانۂ سر سے طائر ہوش
اڑ جائے گا - غنچۂ دل کھلنے کی حسرت گور میں لے جائے گا -

---

۱ - اصل میں 'اشتعال' غلط ہے -
۲ - اصل میں 'ہی' غلط ہے -
۳ - اصل میں 'کسے' بے معنی ہے - مرتب

بھی اس روز واپسیں کے لیے کام پہلے سے کر رکھنا چاہیے۔

جوانی بر سر کوچ است دریاب ایں جوانی را
کہ کس ہرگز نمی بیند دوبارہ زندگانی را
خمیدہ پشت ازاں گردید پیران جہاں دیدہ
کہ اندر خاک می‌جویند گم کردہ جوانی را

مغرور جوانان شوخ و شنگ، جو در و دیوار سے جنگ کرتے ہیں، نقد جان کو بیہودہ خرچ کرتے ہیں۔ فرصت زندگی کی قدر نہیں کرتے۔ ایام جوانی کو ہوس ہائے نفسانی میں صرف کرتے ہیں۔ اسپ و زیں کی تقطیع میں دل لگاتے ہیں۔ مندیل وقبا کی رنگ ریزی پر مرتے ہیں، تن آرائی اور خود سازی میں فرصت کار سازی کو صرف کرتے ہیں، پوشش سے چسپیدگی رکھتے ہیں۔ جو جوان عاقل روزگار دیدہ ہیں، وہ اپنی جوانی کو جانتے ہیں کہ جلد چلی جائے گی، اس لیے وہ خدا کی بندگی کا اہتمام کرتے ہیں۔ دنیا کے علاوے کی رسی کو تقویٰ و دین کی قوت سے توڑتے ہیں، خدا کی عبادت میں شکستہ رنگ ہو کر خوش ہوتے ہیں، اپنے گناہوں سے شرمندہ ہو کر توبہ کرتے ہیں۔ وہ نفس سرکش کو حرام سے منع کرتے ہیں اور دل بے غیرت کو غیرت دلا کے معصیت سے بچاتے ہیں۔ اکثر جاہل جوانوں کی طرح وہ یہ نہیں کہتے کہ ہمارا عہد جوانی ہے، کیوں اس میں بڈھوں کے سے کام کریں۔ چند روز عیش و عشرت کریں، جب بڈھے ہوں گے توبہ کریں گے؛ تلافی مافات آسان ہے، توبہ سے عصیان و طاعت یکساں ہو جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ عہد جوانی بہت شریف و عزیز ہوتا ہے۔ اس کو لہو و لعب و نفس پرستی میں بسر کرنا نہایت عیب فاحش ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ ”الشباب شعبۃ من الجنون“ (جوانی

ایک قسم کی دیوانگی ہے) - خدا تعالیٰ اپنے فضل سے تمام جوانوں کو ہوس ہائے جوانی کی مستی سے بچائے ، سعادت دوجہانی سے بہرہ مند کرے !

۸ - عہد جوانی میں جو باتیں ہوتی ہیں

باغ میں موسم بہار میں جو باتیں ہیں ، وہی آدمی کے اندر عہد جوانی میں ہوتی ہیں کہ رخسارے مثل گل اور تن مانند سمن ، قد مثل سرو ، بنا گوش مثل نسرین ، گیسو کی خوشبو نسیم سحر ، غنچۂ لب خندہ زن ، نرگس چشم مست ، دل میں شوخی و چستی - جب پیری کی نوبت آتی ہے تو دل میں خوش دلی و عیش کا جوش فرو ہو جاتا ہے ؛ رخسار کا رنگ زرد ، آتش معدہ سرد ، موے سپید اجل کا پیغام لاتے ہیں اور پشت خم مرگ کا سلام پہنچاتی ہے - تمام اعضا میں شکست آ جاتی ہے ، ہاتھ پاؤں سستی سے لرزتے ہیں ، دانتوں میں رخنے پڑ جاتے ہیں ، آنکھیں اندر دھنس جاتی ہیں - قدم چلنے سے جواب دیتے ہیں ، کان سننے سے - تن کا زور گھٹتا ہے ، دل کی قوت ٹوٹ جاتی ہے ، کھال ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ڈھیلے کپڑے ، بتوں کے عشق کا ہار کندھے سے گر پڑتا ہے ، ہوس کی دیگ میں جوش نہیں رہتا ، آنکھوں کی روشنی کی مشعل بجھ جاتی ہے ، کعبتین سے دل مصلی کی طرف کھنچ آتا ہے - پھر معشوقوں کی ہوس نہیں رہتی - میل طبیعت اس طرف کھینچ لیتا ہے ، رعونت کم ندامت زیادہ ہوتی ہے -

جب چالیس برس سے عمر آگے بڑھتی ہے ، جوانی ڈھلتی ہے - دس برس کی عمر تک بازی و نادانی ہوتی ہے ، بیس سے پریشانی کا آغاز ہوتا ہے - بیس سے چالیس تک اگر ورع اور زہد کی عادت ڈال لی تو دل اس کا خو پزیر ہو جاتا ہے - جب چالیس سے آگے عمر بڑھتی ہے تو محال ہے کہ آدمی اپنا سکہ بدل سکے - پچاس

برس کی عمر میں سب چیزوں کی شکست آ جاتی ہے ، پھر ساٹھ پر تو حال اور ہی بدتر ہو جاتا ہے ۔ ستر برس کے بعد تو جینا مشکل ہوتا ہے ۔ اسّی برس کے بعد حد بقا نہیں ، نوے برس کے آدمی تو بہت تھوڑے جیتے ہیں ۔ اُن کا جینا مرنا برابر ہے ۔ اگر سو برس کی عمر ہو تو اس زندگی سے مردگی اچھی ہے ۔ زندگی خواہ سو برس کی ہو یا پچاس برس کی ، وہ زاد راہ کی تیاری کے لیے ہوتی ہے ۔ اگر زاد راہ نہیں تیار کیا ، تو عمر خواہ دس کی ہو یا سو کی ، سب برابر ہے ۔

۹ ۔ دھنیے کے بال سفید ہو جاتے ہیں تو اُس سے وہ پیر نہیں بن جاتا ۔ پس بالوں کی سفیدی سے پیر نہیں ہوتا جب تک وہ پیرانہ سری میں مثل کافور سر بسر اندر اور باہر سے پاک نہ ہو ۔ اگر بال سفید ہوئے اور دل سیاہ ہؤا تو نور خدا تیرا چراغ شب سیاہ میں نہیں بالے گا ۔ پیری میں جوانوں کی طرح لہو و لعب نہایت برا ہوتا ہے ۔ پیری میں تو پیشۂ پیری اچھا ہوتا ہے ۔ جو پیر جوانوں کی طرح بسر کرتا ہے تو وہ مردہ ہے ، اگرچہ اُس میں سو جانیں ہوں ۔ جو جوان تذویر سے پیر بنتا ہے وہ طفل ہے ، گو بالوں کے لحاظ سے پیر ہو ۔ بوڑھا جوان ہونا بالوں پر موقوف نہیں ہے بلکہ کاموں پر اور حسن اخلاق پر ۔ جو جوان بالوں کو گلاب سے سفید کرتے ہیں وہ ایسے ہی بوڑھے مسخرے ہیں جو بالوں کو خضاب سے سیاہ کر کے جوان بنتے ہیں ۔ کچھ عمر ایسے حیلوں سے نہیں بڑھ جاتی ، پھر ان رنگوں کے بدلنے سے کیا فائدہ ہے ۔ بڈھے جو ہنستے ہیں اُن کو کیا دیکھتا ہے ، اُن کی موت تو ہنس کر 'یٰسین' پڑھ رہی ہے ۔ آسمان کی چکی بڑی تیز چل رہی ہے ، اُس میں کوئی دانہ ، کیا نیا کیا پرانا ، بچ کر رہے گا نہیں ۔ دنیا میں جو آج 'الحمد' پڑھ رہے ہیں ، کل اُن پر 'یٰسین'

بڑھنے کی نوبت آ جائے گی ۔

موت کی راہ بڑی مخوف[1] ہے ۔ اے جوان! تو سو نہیں ۔ اٹھ کاروان پل پر سے اتر گیا ۔ اسباب کو پھینک دے اور پاؤں جلد اٹھا تاکہ راہ میں نہ رہ جائے ۔ ابھی سپیدی نہیں نمودار ہوئی ہے ، تو رات ہی کو جاگ ۔ جوانی ہی میں تقویٰ بھلا لگتا ہے ۔ بڑھاپے میں تو خوبان نازنین تجھ سے ناز نہیں کرتے ، خواہ مخواہ نماز میں دل لگتا ہے ۔ مطرب کہنہ چپکا نہ بیٹھے تو کیا کرے ، وہ نے میں اپنے نفس کو پھونک ہی نہیں سکتا ۔ پیروں کا آئین کاہلی ، جوانوں کی عادت رنج کشی ہوتی ہے ۔ نقد بقا کے واسطے عمل کر ، قیمت فردا آج جمع کر ۔ جو جوانی میں چراغ روشن نہیں کرتا اس کا بڑھاپے میں گھر تاریک رہتا ہے ۔ جوانی میں زکواۃ دے ، تیری تھیلی بھری ہوئی ہے ۔ تیرے قد راست کی زکواۃ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ راستی سے پیش آ ، خدا کی راہ میں اس کو خم کر ۔ بہتر ہے کہ جوانی میں کمان قد تواضع کے لیے بن ، پیری میں تو خود ایسا ہو جائے گا ۔ ایک تیر قد نے کسی پیر کمان قد سے ہنسی سے پوچھا کہ یہ کمان آپ نے کتنے کو مول لی ؟ اس نے کہا کہ مجھ مفلس سے کیا پوچھتا ہے ؟ تیرے پاس وہ مفت آ جائے گی ۔

۱۰ ۔ فصول عمر

جیسے سال کی چار فصلیں ہوتی ہیں ، ایسی زندگانی کی بھی چار فصلیں ہیں :

فصل اول آغاز تولد سے بیس سال تک ؛ یہ فصل بمنزلۂ بہار ہے کہ جس میں رطوبت مزاج پر غالب ہوتی ہے اور بدن کے نونہال بستان وجود میں اپنے جوارح و اعضا کی شاخیں اور

۱ ۔ مخوف : ڈراؤنی ۔ ۲ ۔ اصل میں 'ختم' غلط ہے ۔ مرتب

حواس و قویٰ کے پتے نکالتے ہیں اور وہ خوب بڑھتے ہیں اور قوت پکڑتے ہیں ؛ قابلیت و استعداد و تعلیم کے شگوفے دم بہ دم کھلتے ہیں اور طراوت پاتے ہیں -

فصل دوم بیس سال سے چالیس تک ہے جو ایام جوانی ہیں - فصل تابستان ہے کہ حرارت مزاج میں کمال ہوتی ہے - ہوا و ہوس کی سموم آرام سوز حد اعتدال سے باہر ہوتی ہے - سعادت دوجہانی اور ہنر و کمالات انسانی ، قوت سے فعل میں آن کر شادابی و حلاوت ایسی حاصل کرتے ہیں کہ ان کا ذائقہ دل پسند ہوتا ہے اور یہی انسان کی زندگانی کا حاصل ہے -

فصل سوم چالیس سال سے ساٹھ برس تک ہے کہ اس کو سن کہولت کہتے ہیں - وہ بہ منزلہ فصل خریف کے ہے کہ اس میں میوے خاطر خواہ باغ عمر میں نہیں لگتے اور اعضا اور جوارح کی شاخوں پر حواس اور قوت کے پتے روز بروز خشک و پژمردہ ہوتے جاتے ہیں اور جو جو مہینے اور برس ان پر گزرتے ہیں وہ جھڑتے جاتے ہیں -

فصل چہارم ساٹھ برس سے آخر عمر تک ہے - وہ فصل زمستاں ہے کہ مزاج میں نہایت برودت ہوتی ہے جس میں حرکت اعضا اور بدن کے کارکنوں پر بڑی مصیبت ہوتی ہے - زمانے کی سرد روئی سے دیدۂ طبیعت اشک ریز ہوتا ہے اور خنکی زمانہ سے مدنظر کے لیے شیشۂ عینک یخ بن جاتا ہے -

۱۱ - اختفاے مدت عمر

مدت عمر سب سے پنہاں ہے - اگر کوئی اپنی عمر کوتاہ سے واقف ہوتا[۱] تو اس کو اپنی حیات ناگوار ہوتی ، زندگی تلخ کٹتی - جب کسی شخص کو اپنے مال پر زوال آنے کا وقت معلوم ہوجاتا

۱ - اصل میں "واقف ہو" ہے - مرتب

ہے تو رات دن غم تنگ دستی اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ آٹھوں پہر مال ہی کے خیال میں گزرتے ہیں۔ جب جان جانے کا یقین ہوتا تو کیا حال ہوتا۔

کیسہ خالی اگر ہو زر سے تو ہو
رنج ایسا نہیں ہے لوگوں کو
ہو تہی نقد جاں سے کیسۂ تن
یہ ہے دشوار بہر مرد و زن

مال کے فنا ہونے کی حالت میں تو آدمی مترصد پھر اس کے حاصل ہونے کا ہوتا ہے مگر فنائے زیست کا یقین ہو تو عود حیات کا وہم بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی آدمی کو اپنی عمر دراز کا حال معلوم ہوتا تو وہ دنیا کی لذتوں میں محو ہوتا اور یہ سمجھتا کہ اب تو گناہوں کا اصرار کرو، جب وقت آئے گا، توبہ کرلیں گے، گناہ سب معاف ہو جائیں گے۔

۱۲ - موت

موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انساں
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

سچ یہ ہے کہ جیسا انسان موت کے ہاتھ سے ناچار ہے، ایسا کسی اور سے نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر اس دم تک کوئی آدمی ایسا نہیں پیدا ہوا کہ جس نے ذائقۂ موت نہ چکھا ہو: دوھا

چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روے
دو پاٹن کے بیچ آ ثابت بچا نہ کوے
یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

ایک تانتا لگا ہوا ہے، ایک کے بعد ایک چلا جاتا ہے۔

اپنے ہم عمروں کو دیکھو کہ وہ ایسے بچھڑے ہیں کہ پھر کبھی ملنے کی امید نہیں ۔ وہ پیاری طرح سے چلا پھرا بولا کرتے تھے مگر نہ اب ان کے پاؤں کا پتا ہے نہ زبان کا نشان ہے ۔ ان کو کیڑے کھاتے ہیں ، دانتوں کو مٹی چاٹ رہی ہے ، سارے جوڑ ٹوٹے پڑے ہیں ، دہن شکستہ ، دندان ریختہ ، زبان بستہ ، سارے اعضا زخم خوردہ ، مرغ روح دمیدہ ، سبزۂ حسرت برنگ دمیدہ (؟) ، خاک تیرہ بر خواب خیرہ ۔ خانماں خراب ، منزل مکان سراب ، بدن کے پرزے پرزے ، ہڈیاں مٹی ۔ نہ کوئی یگانہ و بیگانہ پاس ، کیڑے مکوڑے آس پاس ۔ انسان کے حق میں موت نعمت عظمیٰ ہے ، وہی اس کی تمام غفلتوں پر تازیانہ لگاتی ہے ، خدا کا خیال دلاتی ہے ۔ اگر موت نہ ہوتی تو نہ وہ خدا کو یاد کرتا ، نہ کسی اور برے کام سے ڈرتا ۔ باوجودیکہ انسان کے پیچھے روز آفرینش سے تا دم مرگ ہزاروں خطرے ، آفتیں ، مصیبتیں لگی ہوئی ہیں مگر ان میں بھی اس کو وہ لذت آتی ہے کہ اس دنیا کے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا :

نہیں جز بے مزگی کوئی مزا دنیا میں
پر مزے دار بنا دیتے ہیں غفلت کے مزے

جب زندہ تھا تو کہتا کہ :

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

مگر جب موت آتی ہے تو دنیا کے چھوڑنے کے وقت بڑے حسرت و افسوس کرتا ہے ۔ اگر موت پر انسان کو قدرت ہوتی ہے :

نفس بے مقدور کو قدرت ہو اگر تھوڑی سی
دیکھ پھر سامان اس فرعون بے سامان کا (؟)

موت سب کو برابر کر دیتی ہے :

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے
خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے

اب موت کا آنا ناگزیر ہے - اب یہ سوچنا چاہیے کہ بعد مرگ وہ کون سی یادگار اچھی ہے جو چھوڑنی چاہیے - اس کا ذکر آگے دیکھو -

۱۳ - آدمی کو مرنے کے بعد کون سی یادگار چھوڑنی سب سے اچھی ہوتی ہے ؟

جب آدمی کی روح آب و خاک کے لباس سے مجرد ہو اور جسم اس کا زندان عدن میں قید ہو ، اس کی خاک خاک میں مل جائے اور تمام کاموں سے اس کو کوتاہ دست کر دے ، تو تین چیزیں اس کی باقی رہ سکتی ہیں ؛ اول صدقۂ جاری ، یعنی خوان جو ایسا آراستہ کرے کہ جس سے اخوان قوت و قوت پائیں - دوسرا علم جو نفع پہنچائے ، یعنی اندھیرے میں ایسا نور جو کبھی گھٹے نہیں ، روشن کرے - جو اوروں کا چشم و چراغ جان بنے - تیسری اولاد صالح - یہ تینوں باتیں اس تصنیفات میں پائی جاتی ہیں کہ جو فائدۂ عام پہنچائے - اس کا نفع متعدی ہو نہ لازمی - اس واسطے کہ تصنیفات کے صدق گفتار سے کون سا زیادہ صدقہ جاری ہوگا - اور دسترخوان تو اجسام کے لیے بچھتے ہیں ، یہ تصنیفات کا دسترخوان ارواح کے لیے بچھتا ہے - اور میزبان تو وہ چیزیں کھلاتے ہیں جو طبیعت میں گرانی کرتی ہیں مگر تصنیفات کا مائدہ تو جانوں کے روبرو بچھتا ہے جو اس سے محظوظ ہو کر مسرور ہوتی ہیں - علم کا نفع تو خاص اس میں موجود ہوتا ہے - فرزند سعادت مند تصنیفات سے زیادہ کون ہوگا کیوں کہ وہ جوہر بسیط سے ترتیب پاتے ہیں ، نہ اجسام مرکب سے ترکیب پاتے ہیں - جو

عاقل فرزانہ ہیں وہ فرزند فرزانگی کی نسل کو نہیں قطع کرتے۔ بلکہ ان فرزندوں کی پروا نہیں کرتے جو جسمانی ہوتے ہیں ۔ وہ تو روحانی فرزندوں کی پرورش و تربیت میں اپنی ہمت صرف کرتے ہیں ۔ پس جو تصنیفات کہ نفع عام پہنچائے ، اس سے بہتر کوئی یادگار نافع انسان کے لیے نہیں ہو سکتی ۔ عمارات جو یادگار کے لیے بنائی جاتی ہیں ، ان کا حال ایسا پائدار نہیں ہوتا جیسا کہ تصنیفات کا ۔

حکایات

۲ ۔ اندھوں کی کہانی

ملک غور کے قریب ایک بڑا شہر تھا ، اس میں سب آدمی اندھے رہتے تھے ۔ ایک بادشاہ کا وہاں گزر ہوا اور اس کا لشکر وہیں خیمہ زن ہوا ۔ اس میں ایک ہاتھی بھی بڑا ہیبت ناک تھا ۔ اندھوں نے سنا کہ لشکر میں ایک عجیب جانور آیا ہے جس کا نام ہاتھی ہے ۔ انھوں نے کبھی پہلے اس کا نام بھی نہ سنا تھا ، اس لیے انھوں نے آپس میں کہا کہ اس کو پہچاننا اور ٹٹول کر دیکھ لینا ضروری ہے ۔ غرض ان میں سے چند اندھے تلاش کرکے اس پاس پہنچے ۔ اس کو ٹٹول کر اور ہاتھوں سے مل مل کر دیکھنے لگے ۔ بعض کا ہاتھ اس کے پاؤں پر پڑا اور بعضوں کا کان پر ۔ ہر ایک نے اپنے خیال میں ہاتھی کی صورت کا تصور باندھ لیا ۔ جب وہ پھر کر اپنے اہل شہر کے پاس آئے تو انھوں نے پوچھنا شروع کیا کہ ہاتھی کیسا جانور ہے ؟ ہر ایک نے مختلف جواب دیا ۔ جس نے پاؤں ٹٹولا تھا ، اس نے تو یہ کہا کہ ہاتھی ایک کھردرے[1] ستون کے موافق ہے مگر اس سے کچھ نرم ہوتا ہے ۔ جس نے دانت کو ہاتھ لگائے تھے ، اس نے کہا کہ جیسا یہ شخص کہتا ہے ، ہاتھی ایسا نہیں بلکہ سخت ہوتا ہے ۔ نرمی اس میں نام کو بھی نہیں ہوتی ، چکنا ہوتا ہے کھردرا[1]

---

۱ ۔ اصل میں 'کھردھرا' ہے لیکن اگلے ہی جملے میں موجودہ املا کے مطابق 'کھردرا' استعمال ہوا ہے لہذا اسی کو ترجیح دی گئی ۔ مرتب

نہیں ، اور موٹائی میں ستون جیسا نہیں موسل جیسا ہوتا ہے ۔ جس
نے کان ٹٹولا تھا اس نے کہا کہ وہ کھردرا اور نرم ہوتا ہے مگر
موسل اور ستون کی طرح نہیں ہوتا ، موٹے چمڑے کی طرح پھیلا
ہوا ہوتا ہے ۔

اب اگر ان سب بیانوں کو دیکھو تو من وجہ وہ سچ ہیں
کیوں کہ جس قدر جس کو معلوم تھا اس نے بیان کیا اور سب
نے ہاتھی ہی کے اوصاف کہے ۔ مگر سب کے بیان میں قصور ہے ۔

بس یہی خدا تعالیٰ کی ذات کا حال ہے کہ کسی کو معلوم نہیں
کہ وہ کیا ہے ۔ ہر ایک اپنے علم کے موافق اسے بیان کرتا ہے ۔
اس کی ذات کے بیان میں جو اختلافات ہیں وہ اسی قسم کے ہیں ۔

بعض نے اس داستان کو یوں بیان کیا ہے کہ اندھیرے میں
ہاتھی تھا ، اس کو آنکھوں والوں نے جا کر اس طرح دیکھا جیسا
کہ اوپر بیان ہوا ہے ۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے ۔

۲ ۔ حکایت احول[1]

ایک استاد نے اپنے احول شاگرد سے کہا کہ ''گھر کے اندر
جا کر شیشہ لا ۔'' یہ حکم سنتے ہی وہ گھر میں گیا اور پھر وہاں
سے آن کر استاد سے کہا کہ ''وہاں دو شیشے ہیں ، جس
کا پتا دیجیے وہ لے آؤں ۔'' استاد نے کہا کہ ''وہاں دو شیشے
نہیں ہیں ، ایک ہی ہے ۔ اپنی احولی کو چھوڑ اور افزوں بیں
نہ ہو ۔'' شاگرد نے عرض کی ''حضرت مجھ پر احول ہونے
کا طعنہ نہ دیجیے ''۔ استاد نے کہا کہ ''ایک شیشے کو توڑ
ڈال اور دوسرے کو لے آ ۔'' اس نے جب ایک شیشہ توڑ ڈالا تو
دونوں شیشے اس کی نظر سے غائب ہو گئے ۔

---

۱ ۔ احول : بھینگا ۔ مرتب

پس یہی حال انسان کا ہے کہ اُس کو خشم و شہوت نے احول کر رکھا ہے اور استقامت سے روح کو مبدل ۔

۳ ۔ حکایت

اونٹوں کی قطار جاتی تھی ، اُن میں سے ایک شتر مست ہو کر بیابان میں بھاگا اور ایک نادان کے پیچھے پڑا ۔ نادان آگے آگے اور شتر پیچھے پیچھے بھاگتا تھا ۔ رستے میں چاہ[1] آیا ، مرد اس میں پناہ کے لیے گھسا ۔ گھاس کو ہاتھ میں پکڑ کر لٹکا ۔ کنویں[2] کی تہ میں جو دیکھا تو ایک اژدہا منہ کھولے پڑا ہے ، اُس کے پاؤں کے نیچے چار سانپ سو رہے ہیں اور ایک کالے سفید چوہوں کا جوڑا گھاس کو کتر رہا ہے جس سے آدمی کنوے میں نیچے گر پڑے ۔ مردِ نادان نے جب یہ حالِ بد دیکھا تو کہا "یا رب! یہ کیا حالت ہے ، میں کیا کروں ۔ میں اژدہے کے منہ میں جاؤں یا سانپوں سے کٹواؤں ۔ شتر مست برسر چاہ کھڑا ہے"۔ یہ کہہ رہا تھا کہ گھاس کے ایک کونے میں ترنجبین لطیف دیکھی کہ موجود ہے ۔ اُس نے اُس میں سے تھوڑی لے کر منہ میں ڈالی جس کی لذت سے وہ بے ہوش ہوگیا اور سارا خوف فراموش ۔

پس ہر انسان سمجھ لے کہ وہ مردِ نادان میں ہوں اور دنیا چاہ ہے ۔ چار طبیعت چار سانپ ہیں اور وہ سیاہ سفید چوہے رات دن ہیں کہ ہر دم عمر کی جڑ کو کاٹتے ہیں ۔ تہِ چاہ میں جو اژدہا ہے وہ گور تنگ ہے ۔ سر چاہ پر شتر مست موت ہے جو منتظر کھڑی ہے ۔ گھاس عمر یعنی زیست ہے ۔ ترنجبین شہوت ہے جس نے دونوں جہان سے غافل کر دیا ہے ۔

---

۱ ۔ یعنی کنواں ۔
۲ ۔ اصل میں 'کنوے' ہے ۔ مرتب

۴ ـ حکایت
دنیا کی حقارت

ایک دین دار نے عاجز ہو کر ایک مال دار سے دینار کا سوال کیا ـ اس ناہنجار نے کچھ جواب نہ دیا ـ جب اس مردار سے دو تین دفعہ سائل نے سوال کیا تو اس کا جواب یہ دیا کہ اگر تو حق پرست ہے تو چپ لگا[1] اور دین و دنیا دونوں حق سے طلب کر ـ دین دار نے جواب دیا کہ دین خوب ہے اور دنیا زشت ہے ـ خدا سے نیک چیز طلب کرتا ہوں اور تجھ سے زشت ، کیوں کہ حق سے حق اور باطل سے باطل طلب کرنا چاہیے ـ 'تو باطل پر[2] ہے اور میں حق پر ہوں ، اپنا حصہ تجھ سے طلب کرتا ہوں ـ دین کو دل دے رکھا ہے کہ حق اس کی پرورش کرے اور وہ حق کے سامنے اپنا درد بیان کرے ـ اگر بدن کا غم لگا ہو تو دین نہیں حاصل ہوگا ـ دین کا کابین[3] طلاقِ تن ہے ـ

۵ ـ حکایت بقال[4]

ایک بقال کی دکان میں مال بہت تھا ـ شکر کے خم کے خم بھرے تھے اور گل بھی کھانے کی تھی ـ ایک بے وقوف شکر مول لینے اس کی دکان پر آیا ـ بقال کو ایک درم دیا اور کہا کہ اس کی شکر دے دے ـ بقال نے ترازو اٹھائی تو اس میں پاسنگ کا پتھر نہ تھا اس لیے اس نے گل کو پاسنگ میں چڑھا کر دھڑا کیا اور بٹ چڑھایا ـ مگر اس احمق نے اس گل کو چرایا تو بقال مسکرایا کہ اس مسکین کو یہ خبر نہیں کہ جتنی گل ایک

---

۱ ـ 'چپ لگانا' آج کل کی بول چال نہیں ہے ـ
۲ ـ اصل میں 'پر' نہیں ہے ـ ۳ ـ کابین : حق مہر ـ
۴ ـ بقال : سبزی فروش لیکن یہاں کریانہ فروش مراد ہے ـ مرتب

پلڑے میں سے چراؤں گا اُتنی شکر دوسرے پلڑے میں کم چڑھے گی یہ اپنے زیاں کو سود جانتا ہے۔

پس اہل دنیا بھی اس بھول میں پڑے ہوئے ہیں کہ سود کے واسطے زیان کے سامنے اس جہان کے بدلے میں اُس جہان کو دے کر برباد ہوتے ہیں۔

۹ - بہرہ کی عیادت ہمسایہ کی

ایک فرزانے نے بہرے سے اشاروں میں کہا کہ تیرا ہمسایہ بیمار ہے۔ یہ سمجھ کر بہرے نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے اس بیمار کا حال کیا معلوم ہوگا؛ خصوصاً ایسی حالت میں کہ بیماری کے سبب سے اُس کی آواز اور ضعیف ہوگئی ہوگی، مگر وہاں جانے میں کچھ برائی نہیں۔ جب اُس کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھوں گا تو میں اپنی عقل سے قیاس کر لوں گا کہ وہ کیا کہتا ہے۔ جب میں اس سے پوچھوں گا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ تو وہ یہ ضرور کہے گا کہ میں خوش و نیک ہوں، تو میں جواب میں کہوں گا کہ شکر ہے۔ پھر اُس سے پوچھوں گا کہ آپ نے کیا کھانا کھایا؟ تو وہ کوئی شربت یا کوئی کھانا بتلائے گا، تو میں کہوں گا کہ اُس سے خدا تم کو صحت دے۔ پھر پوچھوں گا کہ کون طبیب تمھارا علاج کرتا ہے؟ تو وہ کسی طبیب کا نام لے گا، تو میں کہوں گا کہ وہ بہت مبارک قدم ہے، اُس کے علاج سے آپ کو آرام ہو جائے گا، میں نے دیکھا ہے کہ وہ جس کا علاج کرتا ہے، اچھا ہو جاتا ہے۔

یہ قیاسی جواب اُس نے اپنے دل میں ٹھہرا لیے مگر وہاں سب باتیں بالعکس ہوئیں۔ بیمار کی خاطر اس بہرے سے رنجیدہ ہوئی۔ یہ بہرہ جب بیمار کے پاس آیا اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا کہ آپ کا مزاج کیسا ہے؟ تو اُس نے کہا کہ مرتا

ہوں ۔ اس نے کہا شکر ۔ اس پر بیمار بے مزہ ہوا کہ یہ شخص میرا دشمن ہے جو ایسی بات پر شکر کرتا ہے ۔ پھر پوچھا کہ کیا کھایا ؟ بیمار نے جواب دیا کہ زہر ۔ اس نے کہا کہ نوشت باد ۔ اس پر بیمار اور بگڑا ۔ پھر پوچھا کہ کون طبیب علاج کرتا ہے ؟ اس نے کہا کہ عزرائیل ۔ اس نے کہا کہ اُن کا قدم تو بڑا مبارک ہے ۔ تم کو بہت خوش ہونا چاہیے کہ ایسا طبیب حاذق مل گیا ۔ میں اُس سے ابھی مل کر تمھارے پاس آیا ہوں اور اُس پر تاکید کر دی ہے کہ تمھارا علاج بڑی غم‌خواری کے ساتھ کرے ۔

اب یہ بہرہ اپنے گھر پر بڑا خوش آیا ۔ اپنے بہرے ہونے کے سبب سے سارے قیاس اُس کے معکوس تھے ۔ بیمار نے کہا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ بہرا میرا دشمن ہے ۔ عیادت دل آرامی کے واسطے ہوتی ہے ، یہ عیادت نہیں ہے بلکہ عداوت ہے کہ اپنے دشمن کو آدمی زار و نزار دیکھے ، جس سے اُس کی خاطر قرار پائے ۔

پس یہی حال بہرے کا سا لوگوں کا ہے کہ بدی کرتے ہیں اور نکوئی جانتے ہیں ۔ خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے خدمت کی ہے ، ہمسائے کا حق ادا کیا ہے ۔ یہ نہیں جانتے کہ ہم نے آگ جلائی ہے اور اُس سے ہمسائے کا دل جلایا ہے ۔

۷ ۔ حکایت

حضرت یوسف علیہ السلام کی ملاقات کے لیے آشنا کا آنا

حضرت یوسف علیہ السلام کے ایک دوست لڑکپن کے ، ملاقات کو تشریف لائے اور حضرت کو اُن کے بھائیوں کے جور اور حسد کی باتیں یاد دلائیں ۔ حضرت نے فرمایا کہ ہم کو قضا سے کچھ گلہ نہیں ہے ۔ میں شیر تھا وہ زنجیر تھے ۔ شیر کو زنجیر سے کچھ ننگ و عار نہیں ۔ شیر کے گلے میں گو زنجیر پڑ جائے تو بھی وہ

زنجیر سازوں پر غالب ہی ہوتا ہے - پھر اس نے پوچھا کہ آپ پر زندان اور چاہ میں کیا کیا گزرا ؟ انھوں نے جواب دیا کہ مجھ پر وہ گزرا جو چاند پر محاق[1] میں گزرتا ہے - اگرچہ وہ اس سے ہلال ہو جاتا ہے مگر پھر تھوڑے دنوں میں بدر ہو جاتا ہے - موتیوں کو ہاون میں کوٹتے ہیں ، تو بھی وہ دل اور آنکھوں کے نور کا باعث ہوتے ہیں - خاک کے تلے گیہوں کے دانوں کو دباتے ہیں تو خاک سے ان کے خوشے اٹھاتے ہیں - اور پھر ان خوشوں کو چکی میں پیستے ہیں تو ان کی قیمت کو بڑھاتے ہیں - اور پھر جب ان کی روٹی کو دانتوں تلے چباتے ہیں تو عقل و جان و فہم کو وہ سودمند ہوتے ہیں - اسی طرح جتنی مصیبتیں مجھ پر پڑیں میں بہتر ہوتا گیا - اب میرے عنایت فرما! یہ فرمائیے کہ میرے لیے کیا ارمغان[2] لائے ہیں کیوں کہ دوست پاس خالی ہاتھ جانا ایسا ہے جیسے کہ چکی پاس بن گیہوں کے جانا - دوست نے کہا میں نے آپ کے واسطے بہت سے ارمغان تلاش کیے مگر کوئی آپ کے لائق میری نظر میں نہ آیا جو لاتا - کان کے پاس حبہ اور دریا کے پاس قطرہ کیا ہدیہ لاتا - دل و جان آپ کے لیے ہدیے میں دینا ایسا ہے جیسے کرمان کو زیرہ - میرے نزدیک کوئی دنیا میں تحفہ آپ کے لیے بہتر نہیں تھا ، اس لیے میں نے یہی تحفہ لائق دیکھا کہ آئینہ لے جاؤں جس میں آپ اپنا روے خوب دیکھیں اور مجھے یاد کریں - یہ کہہ کر بغل سے آئینہ نکال کر رکھ دیا - روے خوب آئینے سے مشتعل ہوتا ہے -

---

۱ - محاق : چاند کا گھٹنا ، ماہ قمری کی آخری تین تاریخیں -
۲ - ارمغان : تحفہ ، ہدیہ ، سوغات - مرتب

باب دوازدہم

ضمیمۂ متفرقات

۱ - علم تاریخ کے فوائد

انسان اپنی عقل اور حواس سے اشیا کو جانتا ہے کہ جتنی چیزیں کہ محسوسات میں داخل ہیں ، اُن میں بعض مشاہدات ہیں ، باقی اور مسموعات - اب یہ سب عقل‌مند جانتے ہیں کہ عالم کا احوال ہم فقط عقل سے ، جیسا کہ چاہیے ، نہیں دریافت کرسکتے ہیں - اور یہ بھی ممکن نہیں کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے ، کوئی اُس کا رہنے والا اہل دنیا کے حالات اور واقعات مشاہدہ کرے اور اُن کی خیر و شر کو اپنی آنکھوں سے معائنہ کرے - پس معلوم ہوا کہ عالم اور اہل عالم کا احوال اور اوضاع و اطوار کا علم اُسی علم سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ مسموعات پر مبنی ہو اور وہ علم تاریخ کا عام ہے -

حواس انسانی میں سمع و بصر کا بڑا مرتبہ ہے - جیسے کہ آنکھیں حسن صورت کو دیکھ کر محظوظ ہوتی ہیں اور کبھی اُن سے ملول نہیں ہوتیں ، ایسے ہی کان خبروں کے سننے سے محظوظ ہوتے ہیں اور اُن کو ہر لحظہ مسرت اور خوشی اُن سے حاصل ہوتی ہے ، اس لیے کہ انسان کی جبلت میں اخبار و استخبار داخل ہے ، اور اُس کی طبیعت میں رغبت اور میلان موجود ہے ، اس لیے انسان[1] کو علم تاریخ سے خوشی اور بشاشت حاصل ہوتی ہے اور

---

۱ - 'انسان' سے پہلے 'وہ' زائد تھا - مرتب

دل سے ملالت اور کلفت دور ہوتی ہے ۔ کان کبھی خبروں سے بھرتے نہیں تھکتے ۔ مثل مشہور ہے کہ "لا یشبع العین من نظر و السمع من خبر و الارض من مطر" (آنکھیں دیکھنے سے، کان سننے سے، زمین بارش سے کبھی سیر نہیں ہوتی) ۔ جس آدمی کو فن تاریخ میں مہارت حاصل ہوگی، حق اور باطل میں تمیز حاصل ہوگی ؛ اس لیے کہ اس کے سامنے اقوال مختلفہ پیش ہوتے ہیں تو وہ ان میں سے جس بات کا راوی ثقہ اور معتبر جانے گا، اس کو سچا جانے گا اور اس کے برخلاف جو ہوگا اسے جھوٹا ۔

فن تاریخ میں باوجودیکہ بہت فائدے ہیں لیکن اس کی تحصیل میں بہت محنت و مشقت نہیں اٹھانی پڑتی ۔ اس علم کی بنا حفظ کرنے پر ہے ۔ جب آدمی واقعات گزشتہ کا محافظ ہو تو ان کی تتبع کرنے سے وہ اپنے مقصد و مطلب پر جلد پہنچ سکتا ہے ۔

فضائل انسانی میں تجربہ بھی داخل ہے اور اسی کے سبب سے انسان کی عقل اور رائے کو پختگی اور کمال حاصل ہوتا ہے ۔ حکما نے عقل کے مرتبے مقرر کیے ہیں اور پھر ان کے مناسب نام رکھے ہیں ۔ چناں چہ ایک عقل کا نام عقل تجاربی رکھا ہے ۔ پھر تجربے کے تین درجے مقرر کیے ہیں : اول یہ کہ ایک شخص خود کوئی کام کرے جس کا نفع اور ضرر اسی کی ذات پر عائد ہو ۔ دوم دوسرے کو دیکھے کہ وہ ایک کام کر رہا ہے جس کا نیک و بد اسی کی طرف راجع ہے ۔ سوم احوال متقدمین کا سن کر معلوم کرے کہ ان کی نحوست و سعادت و عطا و بلا کے کیا کیا اسباب تھے ۔ ان تینوں درجوں میں اس سے بڑھ کر تجربے کا کوئی درجہ نہیں ہے کہ کوئی شخص خود ہی صاحب واقعہ ہو اور بذاتہ تجربہ کیا ہو ۔ لیکن تاریخ میں اخبار سلف موجود ہوتے ہیں اور ان پر اعتبار ہو سکتا ہے کہ کیا کیا پہلے تجربے ہوئے، اس لیے یہ تجربہ ثالثہ

غور تام متعلم تجربۂ اول کا ہو سکتا ہے۔
جب کسی گروہ کی حزم و کاردانی کی حکایت ایسی پڑھی جائے گی کہ جس سے اُس کو کامرانی اور فوز مطالب اور حسنِ عافیت حاصل ہوئی تو جو عقل مند ہوشیار ہیں اُس کی اقتدا کریں گے اور اپنے کاموں میں بھی اُس تجربے کو کام میں لا کر بخیر و خوبی اُن کو انجام دیں گے۔ اور جب کسی قوم یا جماعت کی سستی تدبیر اور ضعف رائے و غفلت و نادانی دیکھیں گے کہ جس سے اُن کی شامت آئی تو "فاعتبروا یا اولی الابصار" پر عمل کریں گے۔ غرض اوروں کے تجربے کو کام میں لا کر اپنا مطلب نکالیں گے۔

علم تاریخ میں جو تامل و غور کرتے رہتے ہیں، اگر کوئی واقعہ اُن کو پیش آتا ہے تو وہ اُس کے لیے پہلے عقلائے عالم کے ساتھ مشورہ کر سکتے ہیں اور اس قسم کے مشورے[1] کی برتری ابنائے عصر کی مشورت پر ظاہر ہے، اس لیے کہ اکابر پیشین کا تجربہ بے غرض خاص مصلحتوں کی رعایت سے مشورہ دیتا ہے۔ اہل زمانہ مشورت دینے میں اپنے منافع کو غیر کے منافع پر ترجیح دیتے ہیں اور اپنے احوال کے صواب اندیش زیادہ تر بہ نسبت غیر کے ہوتے ہیں۔ اس سبب سے مشورۂ مذکورۂ سابق بہ نسبت مشورۂ حال کے اولی اور انفع ہوتا ہے۔

پس جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے اور علم تاریخ سے اُس کا استکشاف کیا جاتا ہے تو تمام عقلا کا نتیجۂ عقل اُس میں شامل ہوتا ہے۔ غرض جو چراغ پہلے لوگ روشن کر گئے ہیں اُن کی روشنی میں چلنے سے وہ گمراہ و سرگشتہ و پریشان نہیں ہوتا۔ علم تاریخ زیادتیِ عقل کا سبب اور ازدیادِ فضل کا واسطہ اور

۱۔ اصل میں 'شورہ' غلط چھپا ہے۔ مرتب

صحت رائے و تدبیر کا وسیلہ ہوتا ہے ۔ بزرجمہر[1] حکیم نے لکھا ہے کہ علم تاریخ رائے صواب کا مؤید و معین ہے اس لیے کہ احوال سلف کا علم خلف کی صحت رائے کے لیے شاہد عادل اور گواہ مقبول ہے ۔

جو شخص علم تاریخ سے ماہر ہوگا ، جب کوئی سخت حادثہ اس کو رونما ہوگا تو وہ اس سے مضطر و بے قرار نہ ہوگا ۔ وہ زمانۂ گزشتہ کی تاریخ میں دیکھ چکا ہے کہ انسانوں کو ہزاروں دفعہ مشکل معاملات پیش آئے مگر وہ آسان اور سہل ہوگئے ہیں ، اس لیے وہ مصیبت و صعوبت میں اپنی توقع فتح کو منقطع نہیں کرے گا ۔ زمانہ ہزاروں رنگ دکھاتا ہے جس میں سے ہمارے تصور میں ایک بھی نہیں ہوتا ۔

اخبار تواریخ پر جو شخص مطلع ہوگا ، وہ رضا اور صبر پر فائز ہوگا ۔ جب وہ انبیائے کرام اور رسل عظام کے حالات کو دیکھے گا کہ کیسے کیسے مصائب سخت ان پر واقع ہوئے اور کس صبر و رضا سے انھوں نے ان کو جھیلا ، یہ بھی اپنے میں یہ اوصاف پیدا کرے گا ۔

سلاطین اور بادشاہ اور ارکان دولت اور اعیان مملکت کو اگر غرائب انقلابات اور عجائب تحویلات پر علم تاریخ سے اطلاع ہوگی ، تو وہ اس میں خدا کی یہ قدرت دیکھیں گے کہ نعمت و نقمت و محبت و محنت کو کچھ بقا نہیں ہے ۔ تعاقب اقبال پر

---

۱ ۔ اصل میں 'بزرچمہر' ہے لیکن صحیح لفظ 'بزرجمہر' ہے جو 'بزرگ' اور 'مہر' سے مرکب ہے ۔ یہ نوشیروان بادشاہ ایران کا وزیر اعظم مشہور ہے ۔ مشہور کتاب 'کلیلہ دمنہ' اسی کے حکم سے ہندوستان سے ایران لائی گئی جس کا اس نے ترجمہ کروایا ۔ (مرتب)

مغرور اور تواتر ادبار پر ملول نہ ہونا چاہیے ۔ اصحاب قدرت پر یہ امر ظاہر ہو جائے گا کہ امور جہان داری میں نیکوکاری کے کیا ثمرے ہیں اور بدکاری کے کیا پھل ہیں ۔ وہ یہ جان کر مذموم کاموں سے بچیں گے اور محمود کاموں کی طرف رغبت کریں گے ۔

۲ ۔ علم تاریخ کی احتیاج سب سے زیادہ ارباب فرمان کو ہے

اہل فرمان سے زیادہ کوئی فرقہ فن تاریخ کا محتاج نہیں ہے ۔ اس کی یہ وجوہ ہیں : اول مصالح کلیہ عوام کے[1] اہل فرمان کی رائے و رؤیت پر مفوض ہیں ۔ وہ مامور اور متکلف ایسی بات پر ہوتے ہیں کہ خیر کے کام کریں اور شر کے کاموں سے آدمیوں کو بچائیں ۔ اس لیے ان کو وقائع اور حوادث ملکی و مکائد حروب اور تدابیر اصحاب رائے سے چارہ نہیں ہے اور یہ تمام حالات فن تاریخ ہی سے معلوم ہوتے ہیں ۔

دوم جب وہ اس فن میں تامل کریں اور جب محصول مہمات اور جریان امور ملوک سابقہ و حکام گزشتہ کا ان کے کان میں پہنچے گا تو وہ محاسن اخلاق ، عدل و رافت و رعیت پروری اور جو اسباب بقائے ملک داری ہیں ، ان میں کوشش کریں گے ، اور جو باتیں کہ موجب محنت و آفت و زوال منصب و حکومت کا ہوں گی ان سے اجتناب و احتراز کرنا واجب جانیں گے ۔ اور جو صاحب دولت بلند ہمت ہوں گے وہ لوگوں کی خوش اخلاقی میں کوشش کرکے چاہیں گے کہ ہم وہ کام کریں کہ جن سے قوم سابق سے زیادہ فائق ہو جائے ۔

سوم جب اہل دول کے معاملات میں طبیعت الجھتی ہے اور

---

۱ ۔ اصل میں 'عام کی' ہے ۔ مرتب

پریشان ہوتی ہے تو تاریخ کے سننے سے اُن کی پریشانی دور ہو جاتی ہے -

۳ - علم تاریخ پر اعتراض

اکثر جاہل علم تاریخ پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ مورخ کی برابر کوئی جھوٹا نہیں ہوتا - تاریخ و اخبار پر اعتبار کرنا نہیں چاہیے - وہ سارے قصوں اور افسانوں سے بھری ہوئی ہیں - اور جب خبر کی شان سے یہ ہو کہ اُس میں جھوٹ سچ کا اور خطا و صواب کا احتمال ہو تو پھر اُن میں سچ کی تمیز کرنی دشوار ہے - اور اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں حاصل ہوتا - لیکن یہ سمجھنا چاہیے کہ اُس علم کی بنا راستی پر رکھی گئی ہے - جو علماے اخبار ہیں وہ افترا اور کذب کو اپنے کلام میں نہیں داخل ہونے دیتے اور نہ اُن کو مفتریات اور مصنوعات کے داخل کرنے کی جرأت ہوتی ہے - وہ وہی باتیں لکھتے ہیں جن کی نوبت تواتر کو پہنچ گئی ہے اور وہ سب طرح سے خلل اور زلل سے محفوظ ہیں - اگر کوئی مفتری کذاب اپنے دل سے گھڑ کر خبیث معاملات ناموجہ کا بیان اکابر سلف پر لگاتا ہے اور اُن اوراق پر نقش کر دیتا ہے تو اس علم کے جو نقاد ہیں وہ اُس کے افترا اور بہتان کو ظاہر کر دیتے ہیں تاکہ سب پر ظاہر ہو جائے کہ یہ تصنیف بے توصیف سر بسر حشو و لغو ہے -

۴ - تدوین علم تاریخ کے لیے کیا شرائط ضرور ہیں ؟

سب عاقل عالم جانتے ہیں کہ تصنیف کرنا اور تالیف سے شغل کرنا خود ایک امر بزرگ ہے - خصوصاً جمع و ترتیب تاریخ اور زیادہ دشوار ہے - اس سبب سے کہ وہ پادشاہان ذوی الاقتدار اور امراے عالی مقدار کی اور علما و فضلا کی نظر سے گزرتی ہیں - پس جہاں مصنف ذرا چوکا وہیں اُس پر لعنت ملامت

ہونے لگتی ہے - اس لیے تاریخ لکھنے کے لیے یہ چند شرائط ضروری ہیں :

شرط اول تاریخ نویس سالم العقیدہ و پاک مذہب ہو کیوں کہ بہت سے بے دین مشہور و مہجور و مردود و مقبول باتیں اپنی تصنیفات میں داخل کر کے آدمیوں کو فریب دے دیتے ہیں - اور جس شخص کو اُن کے اصل کید و خدع پر اطلاع نہیں ہوتی وہ اُس کی سب باتوں کو صحیح جانتا ہے -

شرط دوم : مورخ جو کچھ لکھے وہ بیان واقعہ ہو اور تمام حالات کو قید کتابت میں لائے - جیسے اعیان اور اکابر کے فضائل و خیرات و عدل و احسان کا بیان ہو ، ایسے ہی اُن کے رذائل اور عیوب کا ذکر ہو - اُن میں سے کوئی چھپایا نہ جائے - اگر دوسری بات کو بالتصریح نہ بیان کرسکے تو رمز و کنایہ و ایما و اشارت سے بیان کرے -

شرط سوم : مدح و ذم افراط تفریط سے خالی ہو - اپنے جلب منفعت اور دفع مضرت پر نظر نہ ہو بلکہ صدق معاملہ اور صحت واقعہ پر توجہ ہو -

شرط چہارم : تاریخ نویس جو کچھ لکھے اُس میں تکلف و بناوٹ نہ ہو اور سیاق کلام ایسا اختیار کرے کہ اُس کے کلمات وافی اور تقریرات شافی ہوں - اور عبارت پاک ، سلیس ، عام فہم ہو اور رکاکت کلمات و ذنائت الفاظ اور لغات نازہ و عبارات سافلہ سے استبعاد اور اجتناب لازم جانے تاکہ ہر ایک آدمی عوام میں سے بہ قدر اپنی عقل و فہم کے اس سے لطف اٹھائے - ایسی تالیفات[۱] اکثر مقبول ہوتی ہیں اور یہ نہیں ہوتا کہ وہ تھوڑے دنوں کے

۱ - اصل میں "تالیف" ہے - مرتب

چند مرفوع ہو جائیں ۔

شرط پنجم : تاریخ نویس امانت و دیانت میں معروف اور صدق گفتار اور حسن کردار میں مشہور ہو، کیوں کہ قضایائے سلاطین کوئی سند نہیں رکھتے، سوائے اس کے کسی معتبر و متدین شخص سے سنے جائیں ۔ پس مورخ پر یہ اعتبار ضروری ہونا چاہیے کہ وہ اپنی راستی کو دنیا کے لیے نہیں فروخت کرے گا اور جھوٹ لکھ کر اپنے تئیں بدنام نہیں کرے گا ۔

۵ ۔ قدیم ویران عمارتیں

آدمی کو ویران عمارتوں کو بھی دیکھ کر عبرت[1] پکڑنی چاہیے اور نفس کو جو ہوائے نفسانی میں اڑ رہا ہے ، اس کے کان میں یہ آواز پہنچانی چاہیے کہ یہ وہی عمارتیں ہیں جن میں کل سلاطین ذی شان رہتے تھے ، آج وہ بے نشان ہیں ۔ جہاں ان میں گل ریزی ہوتی تھی ، وہ خار زار ہیں ۔ جن میں لاکھوں چراغ روشن ہوتے تھے ، وہ بے چراغ ہیں ۔ وہ لوگ کہاں مٹ گئے جو سو شوق و ذوق سے یہ در و دیوار بناتے تھے ، اپنی عمر کی سست بنیادی کا کبھی خیال نہیں کرتے تھے ۔ انھوں نے ان حصاروں کے بنانے میں سیکڑوں گناہوں کے حصار بنائے اور ان کے برج بنا کے اپنی حجابات کے برج اڑائے ۔ ان درگاہوں کے بنانے میں انھوں نے اپنے لیے خدا کی محبت کا دروازہ بند رکھا ۔ یہ وہ دہلیزیں ہیں کہ جن پر صبح و شام خلقت کا ازدحام امیروں اور وزیروں کے انتظار میں رہتا تھا ۔ ان حصاروں سے کیا گیرودار کی آوازیں نکلتی تھیں ، وہ سب خاک میں مل گئے ۔ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ قوم کہاں مٹ گئی

---

[1] اصل میں "غیرت" غلط ہے ۔ مرتب

اور کہاں چلی گئی۔ وہ سب مر گئے اور اُن کے خانماں کوئی متمتع
ان عمارتوں سے نہ لے گئے ۔ اے غافل ! تو بھی انسان ہے اور
اُن کے ساتھ خلقت میں یکساں ہے ۔ کل مرگ بے اماں کی سیل تجھے
بھی مٹائے گی اور عالم فنا میں لے جائے گی ۔ نہ تیرا نام رہے گا ،
نہ نشان ، نہ مغز ، نہ استخوان ۔ بس ہوشیار ہو ، خدا سے دل لگا ،
مرگ کو یاد کر ۔

۹ ۔ نجوم و فال و شگون

ایک گروہ آدمیوں کا ایسا ہے کہ وہ نجوم و فال و شگون
سے احکام لگاتے ہیں ، گردش نجوم کا حساب کرتے ہیں ، مہ و
سال سے سعد و نحس کی فال نکالتے ہیں ، انجم و افلاک کی جاسوسی
کرتے ہیں ۔ جو معلوم ہوتا ہے اُس کو قلم سے تختہ و خاک پر
لکھتے ہیں ۔ اپنے اپنے حکم لگاتے ہیں ۔ خود را و یاوہ سرا ہوتے
ہیں ۔ فریب و زرق کا دم بھر کے رزق پیدا کر لیتے ہیں ، مکر ان
کا رہبر ہے ۔ حکیم جالینوس کو وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ کوس پر فغان
اور تہی میان تھا ۔ اس حکیم بے بضع کی وضع اختراع سے ناواقف
ہیں کہ آخر جو اُس نے جنم پترہ بنانے کے قواعد شرف و وبال و
صعود و ہبوط پر موقوف رکھے ہیں ، اُس نے راہ دکھلائی ہے مگر
دروازہ بند رکھا ہے ۔ اُس نے اپنے عمل تباہ سے ایک خلق کو
سرگردان کیا ہے ۔ جب انسان عدم سے وجود میں آتا ہے ، اُس کا
خانۂ نحس و سعد ماں باپ کا گھر ہوتا ہے ۔ آسمان پر کوئی ستارہ
نہیں ہوتا ۔ اُسے جن بھائیوں سے کام پڑتا ہے ، وہی اُس کے رنج و
غم کے سبب ہوتے ہیں ، پھر شادی ہوتی ہے ، اولاد ہوتی ہے ،
وہی خانۂ دوست و خانۂ دشمن سمجھو ۔ غرض یہ ساری شادی و
غم و درد و الم ، دوست دشمن ، سعد و نحس گھر میں موجود ہیں ۔
آسمان پر تلاش کرنے کیوں جاتے ہو اور بیہودہ باتیں بناتے ہو ۔

۔ ایک بادشاہ نے ایک منجم کو بلا کے اپنے آگے بٹھایا ۔ اس سے باتیں نجوم کی کیں ۔ بادشاہ بڑا زیرک اور نہاں بین تھا ۔ اس نے منجم سے کہا کہ اپنی تقویم کو خوب دیکھ بھال کر ایک دن ایسا تجویز کر کہ کواکب کمال پر ہوں اور وبال سے بالکل خالی ۔ طالع کو سرتاسر شرف ہو ، کوئی نکبت کی نشانی نہ ہو ۔ اس وقت خوشی خوشی میرے پاس آؤ کہ میں تم کو خلعت دوں اور فقر و فاقہ تمھارا دور کر دوں ۔

۔ یہ احمق منجم تقویم میں ایسا وقت دیکھ کر بادشاہ کے روبرو گیا ۔ جب بادشاہ نے اسے دل شاد دیکھا تو اس کی گردن اڑانے کا حکم دیا ۔ وہ بے چارہ خود نہیں جانتا تھا کہ کون سا دن نیک اور کون سا بد ہوتا ہے ۔ فقط تقلید اس کی امام تھی ، خرد پیشوا نہ تھی ۔ ہر شخص کے واسطے حیلہ حوالہ رزق چاہیے ۔ پس یہ علم بھی ذریعہ معاش ہے ۔ اسی سے ایک گروہ روٹی کما لیتا ہے ۔ مگر وہ دنیا کے کاموں سے غافل ہوتا ہے اور اپنے کام میں بیدار دل نہیں ہوتا ۔

۷ ۔ طبیب

بعض طبیب عالم ہوتے ہیں ۔ وہ استاد کی تعلیم کو قبول کرتے ہیں ۔ اور بہت سے اصول کی کتابیں پڑھتے ہیں ، ریاضی اور طبیعی سے آگاہ ہوتے ہیں ، اسرار علمی و عملی سے واقف ہوتے ہیں ۔ خلافی و جدلی مسائل کو جانتے ہیں ۔ صورت کو دیکھ کر مرض پہچان جاتے ہیں ۔ باہر سے اندر کا حال جان جاتے ہیں ۔ علت و امراض کو دیکھ کر جواہر و اعراض کے اسباب سمجھ لیتے ہیں ۔ رنگ رو ، نبض ، قارورہ کی علامات سے اسباب مرض کو پہچان جاتے ہیں ۔ لیکن اکثر طبیب ایسے علم طب سے خالی ہوتے ہیں کہ نوبت نبض کو نہیں جانتے ، قاروروں کی نوع

کبھی سستی نہیں ، نبض دیکھنی نہیں آتی ، تبریہ و عقوبات تیل تمیز نہیں ، سرد و گرم و تر و خشک سے غافل ، سوکھی و پتلک آن کے نزدیک یکساں ۔ امراض میں جو چیزیں نفع و ضرر کرتی ہیں آن سے غافل ۔ اگر آن سے پوچھیے کہ یہ خلط و مرض کیوں پیدا ہوا ہے تو لڑنے کو موجود ہوتے ہیں ، بخدا کبھی جواب نہیں دیتے ۔ گو حکما نے سواد بیاض میں پچاس امراض کی تعریف لکھی مگر جاہل طبیبوں کو ایک بھی معلوم نہیں نے اپنے جہل کے سبب شور مچاتے ہیں اور اپنے اندھے و بہرے ہونے کو نہیں جانتے ۔ ہر سال لاکھوں مریضوں کو اپنی نادانی سے ہلاک کرتے ہیں ۔ حضرت عزرائیل کے بڑے دوست ہیں ۔ وہ قاتل ہیں ، خلق قتیل ہے ۔ افسوس اس حاجت مندی پر ہے جو ان الدعوں کے پاس لے جاتی ہے ۔ ایسے حکیموں سے خدا اپنے فضل سے خلق کو رہا کرے جو شہروں کو ویران کرکے قبرستان آباد کرتے ہیں ۔ بہتر ہو کہ وہ خود ہی ویران ہو جائیں ۔

۸ ۔ تکلف

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

تکلف کی کیفیت بلحاظ آدمیوں کی حالت کے مختلف ہوتی ہے ۔ ایک ہی چیز ایک شخص کے نزدیک تکلف میں داخل ہے ، دوسرے شخص کی ضروریات میں ۔ امیروں کے لیے جو چیزیں ضروریات زندگی میں داخل ہیں وہ غریبوں کے لیے تکلفات ہیں ۔ مگر تکلفات میں سراسر تکلیف ہے ۔ ایک کھانے کو دیکھو کہ جب اس میں تکلف کیا جاتا ہے تو وہ معدے میں اصلاً فساد پیدا کرتا ہے کہ مدتوں تک اس کا خمیازہ اٹھانا پڑتا ہے ۔ جو کھانے میں تکلف نہیں کرتے وہ بیمار نہیں ہوتے ۔ اگر بیمار ہوتے بھی ہیں تو

صحیح علاج کرکے اچھے ہو جاتے ہیں - برخلاف امرا کے کہ اگر وہ کبھی بیمار مبتلا ہوتے ہیں تو پھر ہفتوں منضج پیتے ہیں ، مہینوں ماءاللحم میں پڑے کھاتے ہیں - ہزار دوا کی ایک دوا غذائے سادہ ہے - غریبوں کو دیکھ لو کہ وہ بیمار کم ہوتے ہیں اور کیسے موٹے تازے ہٹے کٹے ہوتے ہیں - اُن کی غذا میں کچھ تکلف نہیں ہوتا -

۹ - ڈاڑھی

ڈاڑھی بھی بنی آدم کو زینت دیتی ہے - وہ مردوں کی ایسی زیبائش ہے کہ عورتوں سے اُن کو ممتاز کرتی ہے - کبھی تو ریش دراز آدمی کی تعظیم کا سبب ، کبھی وہ لڑکوں کی ریش خند کا باعث ہوتی ہے - لمبی ڈاڑھی والے کو بز اخفش[1] جان کے اُس سے ہنسی اور مسخراپن کرتے ہیں - بعض آدمی ڈاڑھی کے دراز ہونے کو حماقت کی نشانی اور عقل کے رخصت ہونے کی علامت جانتے ہیں - طرح طرح سے لوگ اُس کو رکھتے اور منڈواتے ہیں ؛ کوئی بڑھاتا ہے ، کوئی خشخاشی رکھتا ہے ، کوئی گل مچھے ، کوئی متوسط ، کوئی[2] یک مشت و دو انگشت ، کوئی اُس کے کتروانے کے بڑے اہتمام کرتا ہے ، اپنی صنعتیں اُن میں حجام دکھاتا ہے - جن لوگوں کو یہ شوق ہے کہ ہم کم عمر

---

۱ - بز خفش : اخفش کا بکرا - اخفش عربی نحو کا امام مانا جاتا ہے - اس نے عربی علم نحو پر سالہاسال تحقیقات کی - اُس کے متعلق یہ کہانی مشہور ہے کہ اُس نے ایک بکرا پال رکھا تھا - وہ جب اپنے نظریات کو مستحضر کرنا چاہتا تو بکرے کو سامنے کھڑا کرکے دہراتا جاتا - مرتب

۲ - اصل میں "کوئی" ندارد - مرتب

معلوم ہوں ، وہ جوانی میں ڈاڑھی منڈواتے ہیں کہ اَمرد معلوم ہوں ۔ بڑھاپے میں خضاب کرتے ہیں کہ جوان معلوم ہوں ۔ جوانی میں وقار اور شائستگی کے سبب سے بوڑھوں کی صورت بنانی تو اچھی ہے مگر بڑھاپے میں سفید بالوں کو ، جن سے چہرہ نورانی معلوم ہوتا ہے ، خضاب سے سیاہ کرکے جوانوں کی صورت بنانی معیوب ہے ۔ خضاب لگانے کا برا بھلا ہونا انسان کی نیت پر موقوف ہے ۔ اگر وہ بڑھاپے کو اس سبب سے چھپاتا ہے کہ میں جوان سپاہی معلوم ہوں کہ جس سے دشمنوں پر ہیبت ہو تو اچھا ہے لیکن اگر خواہش نفس اور شہوت کی پابندی سے ہے تو خضاب لگانا نہیں ہے ، منہ کالا کرنا ہے ۔ زیادہ تر لوگ خضاب اسی نظر سے لگاتے ہیں کہ عورتوں کو جوان معلوم ہوں اور وہ ہم کو پسند کریں ۔ بعض نئے دولھا بننے کے لیے خوب ڈاڑھی کو خضاب سے سیاہ کرکے جوان دلھن بیاہ لاتے ہیں مگر جب کھونٹیاں نکلتی ہیں تو قلعی کھلتی ہے ۔ دلھن اپنے نصیبوں کو روتی ہے ۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ گندھک سے بالوں کو سفید کرتے ہیں ، اس لیے کہ جلدی سے عمر زیادہ معلوم ہو ؛ اس خیال سے کہ عمر میں زیادہ ہونا عزت پیدا کرتا ہے ۔ مگر یہ حماقت کا خیال ہے ۔ احمق جاہل کی عمر زیادہ ہونا اُس کی جہالت و حماقت کو بڑھاتا ہے ۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ :

کودکے کو بہ عقل پیر بود نزد اہل خرد کبیر بود

اگر اُن کی سرشت میں حماقت ہے تو کیا یہ بالوں کا سفید کرنا اُن کی سرشت کو بدل دے گا ؟ اور حمق کو دور کرکے عقل مند بنا دے گا ؟ ہرگز نہیں ۔

بعض آدمی جن کی ڈاڑھی ہی نہیں نکلتی یا کہیں اُس میں بال نہیں نکلتے تو وہ سیکڑوں اُس کے علاج کرتے ہیں اور ایسے

بنائی ڈاڑھی کے ہوتے ہیں کہ اگر دس پانچ ہزار روپے کو ڈاڑھی
بکتی ملتی ہو تو وہ مول لینے کو موجود ہوتے ہیں ۔ بعض شوقین
نوجوان جن کی چکی ڈاڑھی ہوتی ہے ، اُس کو اس لیے خوب
گھٹواتے ہیں کہ وہ چہرے پر بدنما معلوم ہوگی ۔ ڈاڑھی پر لوگ
بڑی بڑی چوٹیں کرتے ہیں ؛ غصے میں ڈاڑھی پر تھوکتے ہیں ۔
ریشش بدست دیگر است ۔ ریش خود را بدست دیگرمدہ ۔ ریش در
آسیا سفید کردہ ۔ ریش آمد باجی شد'' سیکڑوں گالیاں اس ڈاڑھی
کے اوپر بنائی گئی ہیں ۔

خاتمہ

جب اس کتاب کی ایک کاپی کاتب نے مجھے دی اور میں اُسے
صحیح کرنے بیٹھا تو میری نظر آخر صفحہ کے ہندسے ۳۴۴ پر جا
پڑی تو مجھے حیرت ہوئی کہ اس کتاب کی نوبت اس صفحہ (۳۴۴)
تک آن پہنچی! جو میرے اندازے سے باہر تھا ، اس لیے میں نے اس
چند سطروں کا خاتمہ لکھ کر کتاب کو ختم کر دیا ۔

مجھے یقین تھا کہ اگر ایسی کتاب کا میں مصنف ہوں گا تو وہ کسی
ارباب علم کے[۱] پسند خاطر نہ ہوگی ۔ اس لیے میں اس کا مؤلف و مہتمم
بنا اور یہ اہتمام کیا کہ ایسی اخلاق کی باتیں نہ چھپائی جائیں
جو اندر ہی اندر آدمیوں کے دلوں میں گھاؤ ڈال کر ناسور بنا
دیتی ہیں ۔ ہر قسم کے آدمیوں کے خصائل وہ بیان کیے جائیں جو
اُن میں ہوتے ہیں اور جو اُن میں ہونے چاہئیں ۔ پیر ہوں ، حکیم
ہوں ، طبیب ہوں ، نجومی ہوں ، محتسب ہوں ، واعظ ہوں ، غرض
کوئی ہو ، اُن کے اصلی اخلاق کے باب میں جو ارباب فضل
کمال نے اپنے مختلف خیال ظاہر کیے ہیں ، اور اُن کی دلائل ظرافت

---

۱ ۔ اصل میں 'کو پسند خاطر' ہے ۔ مرتب

لطافت ، فصاحت ، ذکاوت کے ساتھ مدلل لکھی ہیں ، اُن کو نقل کردوں ۔ اور اس مقصد اعظم کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھوں کہ یہ بھید کو معلوم ہو جائے کہ کیوں کر حق ، نیکی ، عصمت ، عزت کے زیوروں سے آدمی آراستہ ہوا کرتے ہیں ۔

یہ امر ضرور ہوتا ہے کہ جب رذیل خصائل کا بیان ہوتا ہے تو بد خصالوں پر سخت لعنت ملامت کی جاتی ہے ۔ اس کا بیان اس انداز سے ہوتا ہے جیسے کوئی بڑا مقدس نیک نہاد ستودہ صفات برائی سے سخت متنفر بروں کی برائیاں بیان کرتا ہے ۔ پس بہ مجبوری میں نے بھی اس شیوے کو اختیار کرکے اپنے گناہوں پر ریاکاری کا گناہ اور اضافہ کیا ہے ۔ جہاں برائی کا بیان کیا ہے وہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا خوش خصال ، نیک افعال بدی کی مذمت شد و مد سے کرتا ہے ۔ جن برائیوں کا رواج ہو جاتا ہے اُن کے دور کرنے کے لیے جو حملہ آوری میں آزادی کا برتاؤ ہوتا ہے ، تو وہ لوگوں کو سخت ناگوار ہوتا ہے ۔ اس باب میں خواہ حسن بیان کیسا ہی مدلل ہو ، وہ دلوں پر اثر نہیں کرتا ۔ مگر ہاں بزرگوں کا کلام ایسے موقع پر تاثیر سے خالی نہیں ہوتا اور مقبول ہوتا ہے ۔

پس اگر اس کتاب کے مقبول ہونے کی امید ہو سکتی ہے تو فقط اس سبب سے کہ اس میں وہ اصول اور دلائل و براہین ، حسن اخلاق کے نقل ہوئے ہیں جو مقدس ، متبرک ، پاک نہاد بزرگوں نے لکھے ہیں ۔ اس لیے اگر یہ کتاب مقبول ہو تو میرا افتخار نہیں ہے بلکہ اُنھی بزرگوں کے کلام کی برکت کا اظہار ہے ۔ فقط ۶ جنوری ۱۸۹۱ع ۔